دولتِ عثمانیہ

جلد اوّل

مرتبہ

ڈاکٹر محمد عزیر

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی شبلی روڈ اعظم گڈھ (ہند)

بسلسلۂ تاریخ اسلام

جلد اوّل

از عثمان اوّل ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء تا مصطفیٰ رابع ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء

سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل

مرتبہ

ڈاکٹر محمد عزیر، پی، اے، ڈی

سابق رفیق دار المصنفین، اعظم گڑھ

دار المصنفین شبلی اکیڈمی، شبلی روڈ، اعظم گڈھ (ہند)

سلسلۂ دارالمصنفین نمبر: ۶۵

نام کتاب	:	دولت عثمانیہ جلد اوّل
نام مصنف	:	ڈاکٹر محمد عزیر، پی.ایچ.ڈی
صفحات	:	۴۳۹
ایڈیشن	:	طبع جدید ۲۰۰۹ء
مطبع	:	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)
ناشر	:	دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)
قیمت	:	۲۰۰؍روپے

ISBN : 978-93-80104-26-3

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. : 19
SHIBLI ROAD, AZAMGARH - 276 001 (U.P.)
e-mail : shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

دولتِ عثمانیہ جلد اوّل

محمد فاتح

۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء-۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء

تاریخ دولتِ عثمانیہ

دارالمصنّفین نے تاریخ اسلام کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی آخری کڑی تاریخ دولتِ عثمانیہ ہے، جس کو ہمارے رفیق مولوی محمد عزیر صاحب ایم، اے نے تقریباً سات برس کے محنت و مطالعہ کے بعد لکھا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کی یہ پہلی تاریخ ہو، جو اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اس سے پہلے ہماری زبان میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض یورپین مصنّفوں کے تراجم اور خیالات تھے۔

اس تاریخ کی دوسری خصوصیت اس کی جامعیت ہے، یعنی یہ کہ ترکوں کی شروع سے موجودہ زمانہ کی پوری تاریخ ہے اور اس لحاظ سے بھی اس کی حیثیت اہم ہے۔

دارالمصنّفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کی مختلف جلدیں جیسے تیار ہوتی جائیں گی، چھپتی جائیں گی، چنانچہ اس کا پہلا حصہ چھپ چکا ہے، دوسرا زیر طبع ہے۔

تاریخ دولتِ عثمانیہ دو حصوں میں ختم ہوگی، پہلا حصہ آج شائع ہو رہا ہے اور دوسرا پریس میں جانے کو تیار ہے۔

سید سلیمان

(ناظم دارالمصنّفین)

۷رشوال ۱۳۵۸ھ

دیباچہ

عثمانی ترک جن کا یہ نام کسی نسل یا قوم کی طرف نہیں بلکہ ان کے پہلے فرماں روا عثمان خان کی طرف منسوب ہے، ایشیائے کوچک میں پہلے خانہ بدوشوں کی حیثیت سے داخل ہوئے، پھر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتوں میں شمار کی جانے لگی، تین سو برس گزرنے نہ پائے تھے کہ عثمانی سلطنت وسعت اور طاقت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان سلطنت بن گئی، اس کے عروج کا دور مشرق میں سلطان سلیم اوّل اور مغرب میں سلیمان اعظم کی فتوحات پر ختم ہوتا ہے، جس کی حکومت ایشیا، یورپ اور افریقہ کے وسیع حصوں میں قائم تھی، اس عہد میں عثمانی ترک ایک مرکزی یورپین طاقت تھے، ہنگری ان کے زیرنگیں تھا اور آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کی دیواروں تک ان کی فوجیں پہنچ چکی تھیں، ان کی ہیبت سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھی۔

لیکن سلیمان اعظم کی زندگی ہی میں سلطنت کے اندر بعض کمزوریوں کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، جو اس کی وفات کے بعد روز بروز نمایاں ہوتے گئے، سلیمان کے بعد جتنے سلاطین تخت پر بیٹھے، ان میں سے معدودے چند کے علاوہ کسی میں سلطنت

عثمانیہ کی فرماں روائی کی اہلیت جیسی چاہیے نہ تھی، چنانچہ جس طرح آہستہ آہستہ اس سلطنت کا عروج ہوا تھا، اسی آہستگی کے ساتھ اس کا زوال بھی شروع ہوا اور اس کے زوال کی مدت بھی اس کے عہد عروج کی طرح تین سو سال ہے، ان میں سے آخری ڈیڑھ سو برس میں سلطنت عثمانیہ اپنے سے کہیں زیادہ طاقت ور سلطنتوں کا مقابلہ کرتی رہی، مگر اندرونی کم زوریوں کے باعث ایسی پے در پے شکستیں اٹھائیں کہ بالآخر ۱۹۱۸ء میں اس کا خاتمہ ہوگیا۔

حال میں جمہوریہ ترکیہ نے اپنے چند سالہ قیام میں ان تمام کم زوریوں کو جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی کا باعث ہوئی تھیں، دور کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اس کی کام یابی تاریخ عالم کے حیرت انگیز کارناموں میں سے ہے، اس نے گذشتہ سلطنت کے کھنڈر پر ایک مستحکم قلعہ تعمیر کرلیا ہے جو ترکی قوم کے عزم کو استقلال کی ایک زندہ مثال ہے یورپ کا ''مردِ بیمار'' دم توڑنے کے بعد نہ صرف جی اٹھا بلکہ اس کے اندر صحت و شباب کی ساری قوتیں عود کر آئیں تا آں کہ بیسویں صدی کی عیسائی دنیا کو بھی اس معجزہ کا قائل ہونا پڑا۔

ذیل کے صفحات ان ہی واقعات کی تفصیل پر مشتمل ہیں، یہ سرگذشت بارہا بیان ہوچکی ہے، تاہم اپنے اندر کچھ ایسی کیفیت رکھتی ہے کہ تکرار سے جی نہیں گھبراتا ترکوں نے اسلام کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، دفاع و جہاد کے فرض کو جس سرفروشی سے ادا کیا ہے، اس کا اعتراف جتنی بار بھی کیا جائے کم ہے، صرف یہی ایک چیز ہر اس تالیف کے لیے معقول وجہ ہوسکتی ہے، جو عثمانی ترکوں کے کارناموں پر ترتیب دی جائے لیکن اگر اس کے علاوہ صحت روایات کا بھی حتی الامکان پورا پورا اہتمام کیا گیا ہو اور محض واقعات کے بیان کرنے پر قناعت نہ کی گئی ہو، بلکہ اسباب و علل کی تلاش بھی رہی ہو اور اس قوم کے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ عبرت کی نظر سے کیا گیا ہو تو مرتب کے لیے شاید کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔

ان صفحات کی ترتیب میں عثمانی ترکوں کی تاریخ سے متعلق انگریزی، عربی اور فارسی کی مستند ترین کتابوں نیز بعض منتخب ترکی اور فرانسیسی تاریخوں کے ترجموں سے مدد لی گئی ہے اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ حتی الامکان فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔

محمد عزیر (علی گڑھ)

۱۴/اگست ۱۹۳۹ء

ترک

ترک اول چھٹی صدی عیسوی میں روشناس ہوتے ہیں، یہ ایک خانہ بدوش قوم تھی جو مشرقی ایشیا اور وسط ایشیا میں گھومتی پھرتی تھی اور وقتاً فوقتاً مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کی آبادیوں پر حملہ آور ہو کر انہیں ویران کر دیتی تھی، چھٹی صدی عیسوی میں اس نے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی، جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی، اس سلطنت کے بانی کا نام چینی تاریخوں میں ''تومین'' (Tumen) اور ترکی کتبوں میں ''بومین'' (Bumin) درج ہے، تومین ۵۵۲ء میں مرگیا، اس کے بھائی نے جس کا نام ''استامی'' (Istami) تھا، مغرب میں فتوحات حاصل کیں، دونوں بھائی الگ الگ حکومتوں پر حکم راں تھے، اہل چین ان حکومتوں کو شمالی ترکوں کی سلطنت اور مغربی ترکوں کی سلطنت کہتے تھے، پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں ان دونوں حکومتوں کو سلطنت چین کی اطاعت قبول کرنی پڑی لیکن ۶۳ھ (۶۸۲ء) میں شمالی ترکوں نے چین کی فرماں روائی سے آزاد ہو کر اپنی سابق خود اختیاری پھر حاصل کر لی ''کتبات اورخان'' جو منگولیا کے دریائے اورخان کے نام سے منسوب ہیں اور ترکی زبان کی قدیم ترین یادگار ہیں، ترکوں کی

اسی شمالی سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سلطنت ۱۲۶ھ (۷۴۴ء) تک قائم رہی، مغربی ترکوں میں ''ترگیش'' (Turgesh) کا قبیلہ سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس کے سرداروں نے پہلی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے آخر میں خاقان کا لقب اختیار کرلیا تھا لیکن ۱۲۱ھ (۷۳۷ء) میں عربوں نے نصر بن سیار کی قیادت میں ترگیش کی حکومت کا خاتمہ کردیا۔

ترک اسلام میں ترکوں اور عربوں کے تعلقات پہلی صدی ہجری میں ولید اول کے عہدِ خلافت سے شروع ہوئے، اسی عہد میں قتیبہ بن مسلم نے پقیذ، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) فرغانہ، شاش (تاشقند) اور کاشغر کے ترکی علاقے فتح کرکے وہاں اسلامی حکومت قائم کی لیکن ان فتوحات کا اثر ترکوں کے قبولِ اسلام پر بہت کم پڑا اور وہ بدستور بت پرستی کرتے رہے، البتہ سمرقند میں قتیبہ کی بت شکنی نے بت پرستی کا خاتمہ بھی کردیا، جب قتیبہ وہاں پہنچا تو اسے بہت سے بت خانے نظر آئے جن کی نسبت عام طور پر یقین کیا جاتا تھا کہ ان کے ساتھ بے ادبی کرنے والا فوراً ہلاک ہوجائے گا، قتیبہ نے ان بت خانوں میں آگ لگادی، مگر اس پر کچھ آنچ نہ آئی، یہ دیکھ کر بت پرستوں نے اسلام قبول کرلیا[1]۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے مختصر عہد خلافت ۱۰۱-۹۹ھ مطابق ۲۰-۷۱۷ء میں اشاعت اسلام کی خاص طور پر کوشش کی تو من جملہ اور ممالک کے انہوں نے ماوراء النہر کے (ترک) بادشاہوں کو بھی اسلام کی دعوت دی اور ان میں سے بعض اسلام لائے[2]، پھر عبداللہ ابن معمر الیشکری کو دعوتِ اسلام کے لیے ماوراء النہر بھیجا اور وہاں کے بعض قبیلے مسلمان ہوگئے، اس کے بعد خلیفہ ہشام کے عہد (۱۲۵-۱۰۵ھ مطابق ۴۳-۷۲۴ء) میں ابوصیداء کی تبلیغ سے ماوراء النہر کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے، سمرقند اور بخارا وغیرہ سے جو ترکستان کے علاقے تھے، جزیہ اور خراج کی رقمیں بیت المال میں

---

۱ دعوت اسلام از آرنلڈ، مطبوعہ علی گڑھ، ص ۲۳۸ (The Preaching of Islam By T. W. Arnold)

۲ فتوح البلدان از بلاذری، مطبوعہ قاہرہ، ص ۴۳۲۔

آتی تھیں، خراج کے سلسلہ میں ترکستان سے لونڈیاں اور غلام بھی بھیجے جاتے تھے، جو رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے لگے، پھر بھی معتصم باللہ کی خلافت (۲۱۸-۲۲۷ھ مطابق ۸۳۳-۸۴۲ء) تک ترکوں میں اسلام کی اشاعت عام طور پر نہ ہو سکی، سب سے پہلے خلیفہ منصور (۱۳۶-۱۵۸ھ مطابق ۷۵۴-۷۷۵ء) نے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا لیکن اس کے عہد میں ان کی جماعت بہت قلیل تھی اور فوج اور حکومت میں صرف عربوں اور ایرانیوں کا اقتدار تھا، ہارون الرشید کے زمانۂ خلافت میں اہل عرب اور اہل روس کے درمیان جو حریفانہ کشمکش پیدا ہوئی اس نے امین کے زوال کے ساتھ عربوں کی قوت کا بھی خاتمہ کر دیا اور مامون کے عہد میں جس کی ماں ایرانی النسل تھی ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا، اس کے بعد جب معتصم خلیفہ ہوا تو اس نے ایرانیوں کے اقتدار سے خائف ہو کر ترکوں سے مدد حاصل کرنی چاہی اور چوں کہ اس کی ماں ترک تھی، اس لیے طبعاً اسے ترکوں کی جانب میلان بھی تھا، چنانچہ اس نے ہزاروں ترک غلام خرید کر انہیں اسلامی تعلیم اور فوجی تربیت دی اور اب فوج میں ترکوں کی تعداد اور قوت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی، گبن لکھتا ہے کہ ''معتصم نے جو اس خطرناک مثال کا سب سے پہلا بانی ہے، پچاس ہزار سے زیادہ ترکوں کو دارالخلافت میں لا کر آباد کیا''[1] اس نے ان کے لیے طلاکار ریشمی لباس تجویز کیا اور زریں ٹپکے وردی میں شامل کیے جس کی وجہ سے ترکی دستے دوسری فوجوں سے ممتاز معلوم ہوتے تھے، ہر سال ہزاروں ترک غلام پایہ تخت میں لائے جاتے تھے، ان میں سے کچھ محافظ شاہی دستہ میں شامل کیے جاتے تھے اور باقی فوج میں بھرتی ہوتے تھے، جو اپنی قابلیت میں زیادہ ممتاز ہوتے تھے وہ فوجوں کے سپہ سالار مقرر کیے جاتے تھے، جوں جوں ترکوں کی قوت فوج میں بڑھتی گئی، عربی دستے کم ہوتے گئے، ترکوں کو چوں کہ خلیفہ کی خاص سرپرستی حاصل تھی،

---

[1] تاریخ زوالِ رومہ از گبن، جلد ۴، ص ۷۴، مطبوعہ فریڈرک وارن اینڈ کمپنی، لندن، ۱۸۹۰ء - (Decline and Fall of The Roman Empire By E. Gibbon Vol IV, Fredrich Warne & Co. London, 1890.

اس لیے وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور بغداد کی سڑکوں پر بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے تھے، جس سے اکثر عورتیں اور بچے ٹکرا کر زخمی ہو جاتے تھے اور بعض اوقات مر بھی جاتے تھے، اس لیے بغداد کے باشندے ان کے مظالم سے بہت جلد عاجز آ گئے، جب معتصم کے پاس ان کی شکایتیں کثرت سے پہنچنے لگیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ ترکوں کے لیے بغداد سے باہر ایک چھاؤنی بنائی جائے، اس غرض کے لیے اس نے سامرا کا مقام پسند کیا، جو بغداد سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، یہ مقام اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے اس کا نام بدل کر سرمن رائے (جس نے دیکھا خوش ہوا) رکھ دیا، فوجی بارکوں کے علاوہ خلیفہ اور وزراء کے لیے بھی عالی شان محل تیار کیے گئے اور چوں کہ معتصم نے بغداد کا قیام ترک کر کے اپنی ترک سپاہ کے ساتھ سامرا میں رہنا شروع کر دیا تھا، اس لیے رعایا کے ہر طبقہ کے لوگ اسی نئے شہر میں آ کر آباد ہونے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں سامرا ایک نہایت پر رونق شہر بن گیا، وہ ۲۲۱ھ سے لے کر ۲۷۹ھ (۸۳۶ تا ۸۹۴ء) تک سات خلفائے عباسیہ کا دار السلطنت رہا، جب معتمد تخت پر بیٹھا تو اس نے سامرا کو چھوڑ کر پھر بغداد کو پایۂ تخت بنایا۔

معتصم کی ترک نوازی کی وجہ سے رفتہ رفتہ ترکی شہزادے اور امراء بھی ترکستان سے آ کر سامرا میں آباد ہونے لگے، جن میں بعض بت پرست اور بعض آتش پرست تھے اور بعض مسلمان ہو گئے تھے، دار الخلافت میں رہنے کے بعد غیر مسلم ترکوں میں بھی اسلام پھیلنے لگا اور اس تعلق سے ماوراء النہر کے ترکوں میں جو اپنے وطن میں مقیم تھے، اسلام کی اشاعت ہونے لگی، ترک سرداروں کے اسلام قبول کر لینے سے ان کے جرگے اور قبیلے بھی مسلمان ہوتے گئے، چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں ترک بطوعِ خاطر بکثرت اسلام میں داخل ہوئے، ۳۴۹ھ (۹۲۰ء) میں دو لاکھ ترک گھرانے (خیمے) مسلمان ہوئے[1]، ابن اثیر کا بیان ہے کہ ماوراء النہر کی ایک ترکی قوم کے دس ہزار گھرانے جو بلاساغون اور کاشغر کے نواح میں

---

[1] ابن اثیر، جلد ۸، ص ۳۵۶، مطبع بریل، تجارب الامم، از ابن مسکویہ، جلد ۲، ص ۱۸۱۔

اسلامی علاقوں پر دھاوے مارا کرتے تھے، صفر ۴۳۵ھ (دسمبر ۱۰۴۳ء) میں اسلام لائے[1]۔

خلیفہ معتصم کے بعد ترکوں کا اقتدار فوج و حکومت میں روز بروز بڑھتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خلیفہ بغداد کا عزل و نصب تمام تر ان ہی کے ہاتھ میں آ گیا، نہ صرف تخت بلکہ خلیفہ کی زندگی بھی ان ہی کے رحم و کرم پر تھی، انہوں نے متعدد خلفاء کو ذلیل کر کے تخت سے اتارا اور بعضوں کو قتل بھی کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دولت عباسیہ کا زوال سلطنت کے ہر حصہ میں نمایاں ہونے لگا، مختلف صوبوں کے گورنروں نے پایۂ تخت سے آزاد ہو کر اپنی اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں، مثلاً ایرانی گورنروں نے خراسان میں طاہریہ، فارس میں صفاریہ، ماوراء النہر میں سامانیہ، آذربیجان میں ساجیہ اور جرجان میں زیاریہ کی جداگانہ حکومتیں قائم کر لیں، اسی طرح ترکوں نے مصر میں طولوینہ، ترکستان میں ایلکیہ، پھر مصر میں اخشیدیہ اور افغانستان و ہند میں دولت غزنویہ کی بنیاد ڈالی، یہ تمام حکومتیں تیسری صدی کے وسط سے چوتھی صدی ہجری کے وسط تک قائم ہو گئیں، پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں ترکوں کے ایک گروہ نے خراسان میں دولت سلجوقیہ کا بنیاد رکھا۔

آلِ سلجوق آلِ سلجوق کا مورثِ اعلیٰ دقاق تھا جو کاشغر کے ترکی قبائل کا ایک رئیس تھا، سلجوق، جس کے نام سے یہ خاندان مشہور ہے اسی کا لڑکا تھا، سلجوق اپنے غیر مسلم ترک فرماں روا کو چھوڑ کر بخارا کی اسلامی مملکت میں چلا آیا اور یہاں وہ اور اس کا پورا قبیلہ مسلمان ہو کر بخارا کے قریب مقام جند میں قیام پذیر ہوا، اس کے بعد اس نے غیر مسلم ترکوں پر فتوحات حاصل کر کے اپنی قوت بہت بڑھا لی۔

سلجوق نے اپنی وفات کے وقت تین لڑکے چھوڑے، ارسلان، میکائیل اور موسیٰ، دولت سلجوقیہ کے وارث میکائیل کے تین لڑکے ہوئے، پیغو، طغرل بیگ، جغرو بیگ لیکن سلطنت کی فرماں روائی طغرل بیگ کو ملی، جس نے اپنے زور و قوت کا سکہ گرد و پیش کے

[1] ابن اثیر، جلد ۹، ص ۳۵۵، مطبع بریل۔

ملکوں پر بٹھا دیا، محمود غزنوی نے سلجوقیوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر ان سے جنگ شروع کر دی لیکن چند عارضی فتوحات کے بعد اس کو اور اس کے لڑکے مسعود کو شکستیں اٹھانی پڑیں اور آل سلجوق تمام خراسان پر قابض ہو گئے، اس کے بعد انہوں نے جرجان، طبرستان اور خوارزم پر بھی قبضہ کر لیا اور پھر طغرل بیگ نے اصغان، تبریز اور حلوان کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب بغداد میں ترکوں اور آل بویہ کی باہمی مخاصمت نے سخت بدامنی پھیلا رکھی تھی، خلیفہ معتصم کے بعد دولت عباسیہ پر روز بروز ترکوں کا تسلط بڑھتا گیا لیکن چوتھی صدی ہجری سے آلِ بویہ نے اپنا اقتدار خلافت بغداد پر قائم کرنا شروع کیا، جس سے ترکوں کی قوت پر اثر پڑنے لگا، ان حریفوں کی کشمکش نے تمام سلطنت میں ہنگامہ برپا کر دیا اور بغداد کی حالت خصوصیت کے ساتھ بد سے بدتر ہونے لگی، مجبور ہو کر ترک سرداروں نیز خلیفہ قائم بامراللہ نے طغرل بیگ کے اس فتنہ کے فرو کرنے کے لیے طلب کیا، چنانچہ طغرل بیگ رمضان ۴۴۷ھ (دسمبر ۱۰۵۵ء) میں بغداد میں داخل ہوا اور ملک رحیم کو گرفتار کر کے دولت آلِ بویہ کا خاتمہ کر دیا، اب بغداد میں آلِ سلجوق کا اثر قائم ہو گیا، خلیفہ نے ''سلطان شرق وغرب'' کے خطاب سے طغرل بیگ کی عزت افزائی کی، اس کے بعد طغرل بیگ نے عراق، موصل اور دیارِ بکر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، پھر الپ ارسلان کے دورِ حکومت میں ایشیائے کوچک اور شام بھی فتح ہو گیا اور ملک شاہ نے ۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) میں عدن اور یمن پر بھی قبضہ کر لیا، اس طرح سے پانچویں صدی سے ساتویں صدی ہجری تک خلیفہ بغداد کے ایشیائی مقبوضات کا بیشتر حصہ آلِ سلجوق کے زیر نگیں رہا۔

سلاجقۂ روم | اس خاندان کا بانی سلیمان بن قطلمش تھا، قطلمش طغرل بیگ کے سرداروں میں تھا لیکن بعد میں اس نے الپ ارسلان کے خلاف بغاوت کر کے خود مختاری حاصل کر لی اور بالآخر ۴۵۶ھ (۱۰۶۴ء) میں رے کے قریب جنگ میں مارا گیا، اس کا بیٹا سلیمان قسمت آزمائی کے لیے ایشیائے کوچک میں چلا آیا اور ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) میں نائیسا پر جو

بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور شہر تھا، قبضہ کر کے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا اور ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، ۴۷۷ھ (۱۰۸۴ء) میں اس نے انطاکیہ کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا لیکن پہلی جنگ صلیبی میں سلاجقۂ روم کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا، ۴۹۰ھ (۱۰۹۷ء) میں نائسیا ان کے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا اور اسی کے ساتھ ایشیائے کوچک کے مغربی حصہ میں بھی ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس علاقہ پر بازنطینیوں کا قبضہ ہو گیا، اب صرف ایشیائے کوچک کا اندرونی حصہ ان کے پاس رہ گیا تھا لیکن وہاں بھی دانش مندیوں سے مقابلہ تھا، غرض چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں سلاجقۂ روم کی حالت بہت نازک نظر آتی تھی لیکن مسعود بن قلیج ارسلان نے اس گرتی ہوئی سلطنت کو سنبھالا اور قونیہ کو پایۂ تخت بنا کر ایک مضبوط حکومت قائم کی، اس کے جانشین قلیج ارسلان ثانی نے اپنی فتوحات سے سلطنت میں اضافہ کیا اور دانش مندیوں کو مغلوب کر کے انہیں اپنا محکوم بنایا، ۵۷۸ھ (۱۱۸۲ء) میں قلیج ارسلان ثانی کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا بیٹا غیاث الدین کیخسرو اول تخت نشین ہوا، اس نے بازنطینیوں سے جنگ کر کے انطاکیہ کے بندرگاہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد اس کے جانشین عزالدین کیکاؤس اول نے سنوپ کو بھی فتح کر لیا، عزالدین کیکاؤس اور اس کے بعد علاء الدین کیقباد کا دورِ حکومت شان و شکوہ کے لحاظ سے سلاجقۂ روم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا لیکن غیاث الدین کیخسرو ثانی ہی کے عہد (۶۴۴-۶۳۶ھ مطابق ۱۲۴۶-۱۲۳۸ء) سے سلطنت کا زوال شروع ہو گیا جو پھر نہ رکا، اس دوران میں تاتاری طوفان ایشیائے کوچک کی سرحد تک پہنچ چکا تھا اور ارض روم اور سرحدی قلعوں پر تاتاریوں کا قبضہ ہو گیا تھا، آخر کار ۶۴۱ھ مطابق ۱۲۴۳ء میں کوزاواخ کی جنگ نے دولت سلجوقیہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور آلِ سلجوق کی آزادی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، صلح کے بعد تاتاری چلے گئے لیکن ۶۴۳ھ (۱۲۴۵ء) میں کیخسرو ثانی کی وفات پر جب اس کے تینوں لڑکوں کی مشترکہ حکومت کی وجہ سے سلطنت میں بدنظمی پیدا ہوئی تو تاتاریوں نے پھر حملے شروع کر دیے، اس

درمیان میں ایک لڑکا مر گیا اور تخت کے دعوے دار بقیہ دولڑکے عزالدین اور رکن الدین رہ گئے، ہلاکو نے سلطنت کو ان دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا، مغربی صوبے عزالدین (کیکاؤس ثانی) کو اور مشرقی رکن الدین (قلیج ارسلان رابع) کو دیے لیکن حکومت دراصل تاتاریوں کی تھی اور سلاطین سلجوق کا عزل ونصب ان ہی کے ہاتھوں میں تھا، تاتاریوں کے تشدد سے عاجز آکر امرائے سلطنت نے اہل مصر سے مدد کی درخواست کی اور مصریوں نے ایشیائے کوچک میں تاتاریوں کو شکست دے کر بھگا دیا لیکن ان کی واپسی کے بعد تاتاریوں نے پوری طرح انتقام لیا اور دولت سلجوقیہ کے رہے سہے اقتدار کو بھی خاک میں ملا دیا، سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر متعدد امراء نے مختلف صوبوں میں خودمختار حکومتیں قائم کر لیں ان میں بنوکرمان اور بنواشرف اپنی قوت واثر کے اعتبار سے زیادہ ممتاز تھے، تاتاریوں نے بارہا ان خودسر امیروں کو زیر کرنے کی کوشش کی مگر عارضی شکستوں کے بعد یہ اپنا اقتدار پھر قائم کر لیتے تھے اور ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے زوال پر انہوں نے مستقل حکومتیں قائم کر لیں، چنانچہ دولت سلجوقیہ کے خاتمہ کے قریب ایشیائے کوچک میں صاردخان، قروسی، ایدین، تکہ، حمید، کرمانیہ، کرمیان، قسطمونی اور منتشا کی خودسر حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔

ارطغرل

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کی ابتدا میں شاہان خوارزم کی قوت اوجِ شباب پر تھی، وہ ایران و خراسان اور شام و عراق میں آلِ سلجوق کے بیش تر مقبوضات پر قابض ہو چکے تھے اور ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو فتح کر لینا چاہتے تھے لیکن عین اس وقت جب وہ اس حوصلہ کی تکمیل کے لیے تیار ہو رہے تھے، چنگیز خانی طوفان اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ اٹھا اور سلطنت خوارزم کو پاش پاش کر ڈالا، اس سلطنت کی تباہی کے بعد ترکی قبائل جنوب کی طرف بھاگے، ان میں بعض ایران اور شام میں پہنچے اور وہاں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں بہت کچھ اقتدار حاصل کیا اور ترکمانی مشہور ہوئے اور بعض جنوب کی طرف بڑھے اور مصر کے سلاطین مملوک سے معرکہ آرا ہوئے، جو خود ترکی النسل تھے لیکن مصر میں انہیں شکست ہوئی اور وہاں سے واپس ہو کر وہ ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں سے آملے، ان ہی ترکی قبائل میں جو چنگیز خاں کے حملہ کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے، ارطغرل کا قبیلہ بھی تھا، یہ قبیلہ ترکانِ اوغوز کے قبیلہ کا ایک جزو تھا جو ارطغرل کے باپ سلیمان شاہ کی سرکردگی میں اپنے وطن خراسان کو چھوڑ کر مختلف ملکوں میں گھومتا ہوا شام کی طرف جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلیمان شاہ ڈوب کر ہلاک ہو گیا، قبیلہ کا بیش تر حصہ اس وقت منتشر ہو گیا لیکن جو لوگ رہ گئے وہ ارطغرل اور اس کے بھائی دوندار کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے اور

سلطان علاء الدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہو گئے۔

پہلا معرکہ یہ جماعت جو صرف چار سو بیس[1] گھرانوں پر مشتمل تھی، سلطان علاء الدین کے زیر سایہ پناہ لینے کے لیے پایہ تخت قونیہ کی طرف جا رہی تھی کہ راستہ میں انگورا کے قریب ارطغرل کو دو فوجیں مصروف جنگ نظر آئیں، وہ کسی فریق سے واقف نہ تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ ان میں سے ایک تعداد کے لحاظ سے کم زور اور دوسری قوی ہے، اپنے سواروں کے مختصر دستہ کے ساتھ جن کی مجموعی تعداد صرف چار سو چوالیس تھی، کم زور فریق کی حمایت کے لیے بڑھا اور اس جاں بازی سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا، فتح حاصل کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ جس فریق کی اس نے یوں بر وقت مدد کی تھی، وہ سلطان علاء الدین سلجوقی کی فوج تھی، جسے تاتاریوں کی ایک بڑی فوج نے گھیر رکھا تھا۔

سنگ بنیاد ارطغرل کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان علاء الدین نے اسے سغوت کا زرخیز علاقہ جو دریائے سقاریہ کے بائیں جانب بازنطینی سرحد کے قریب واقع تھا، جاگیر میں عطا کیا اور سغوت کا شہر بھی اسے دیا، اس علاقہ میں ارطغرل اور اس کے ساتھیوں نے، جو خراسان اور آرمینیا سے آئے تھے، بود و باش اختیار کی، علاء الدین نے ارطغرل کو اس جاگیر کا سپہ دار بھی مقرر کیا، چوں کہ ارطغرل کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی، اس لیے بازنطینی قلعہ داروں سے اکثر جنگ کی نوبت آتی رہتی تھی، ارطغرل نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی شجاعت کا سکہ بٹھا دیا اور اس کی فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے ترکی قبائل ایشیائے کوچک میں پہلے سے آباد تھے، اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے اور اس کی لڑائیوں میں شریک ہونے لگے، اس طرح اس کی قوت روز بروز بڑھتی گئی اور اس کا اقتدار گرد و پیش کے علاقوں میں قائم ہونے لگا۔

سلطان علاء الدین کے لیے ایک جاگیر دار کا اس طرح قوت و اقتدار حاصل کر لینا

---

[1] ترکی سلطنت از لارڈ ایورسلے، ص ۱۳ (The Turki Empire By Lord Eversley)

تشویش کا باعث ہوتا لیکن ایشیائے کوچک میں دولت سلجوقیہ اندرونی اختلال اور امراء کی بغاوتوں کے سبب زوال کی آخری منزل میں تھی، اگرچہ قونیہ میں سلاجقۂ روم کی قدیم شان و شوکت اب بھی نمایاں تھی تاہم حکومت کا دائرہ بہت محدود رہ گیا تھا، ایک طرف تاتاریوں نے جنوبی اور مشرقی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا تو دوسری طرف عیسائیوں نے شمال اور مشرق کے قدیم بازنطینی صوبوں کے اکثر حصے واپس لے لیے تھے، اوسطی اور جنوبی حصہ میں متعدد سلجوقی سرداروں نے خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں، سرحدی علاقوں میں جنگ کا سلسلہ عموماً جاری رہتا تھا اور تاتاری حملوں کا خطرہ کبھی دور نہیں ہوتا تھا، ایسی حالت میں ارطغرل جیسے دلیر سردار اور نائب کی فتوحات سے علاء الدین کو بجائے تشویش کے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور اس نے ارطغرل کو مزید انعامات عطا کیے، چنانچہ جب نبی شہر اور بروصہ کے درمیان ایک جنگ میں ارطغرل نے علاء الدین کے نائب کی حیثیت سے تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو شکست دی تو سلطان نے اس کے صلہ میں اس کے شہر کو بھی اس کی جاگیر میں دے دیا اور پوری جاگیر کا نام سلطانونی (صدر سلطانی) رکھا، نیز ارطغرل کو اپنے مقدمۃ الجیش کا سپہ سالار مقرر کیا، اس وسیع علاقہ میں بکثرت چراگاہوں اور زرخیز زمینوں کے علاوہ متعدد قلعے بھی تھے، مثلاً قراجہ حصار، بلے جیک، اینی وغیرہ لیکن سلطانونی کے اکثر حصوں پر خودسر امیروں کا قبضہ تھا اور اس جاگیر پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے ارطغرل اور اس کے بعد عثمان کو مدتوں جنگ کرنی پڑی، ہلال سلطان علاء الدین کے علم کا نشان تھا، ارطغرل نے بھی اس کے نائب کی حیثیت سے اسی نشان کو اختیار کیا جو آج تک ترکوں کی عظمت کا قومی نشان ہے۔[1]

۶۸۷ھ (۱۲۸۸ء) میں ارطغرل نے نوّے سال کی عمر میں انتقال کیا اور سغوت کے قریب دفن ہوا۔

---

[1] تاریخ ترکانِ عثمانی، از کریسی، جلد اول، ص ۷۵ (History of The Othomani Turks By Edward Creasy)

عثمان خان اوّل

۶۸۷ھ تا ۷۲۶ھ مطابق ۱۲۸۸ء تا ۱۳۲۶ء

ارطغرل کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا عثمان اس کا جانشین ہوا، یہ دولت عثمانیہ کا بانی اور سلطنت عثمانیہ کا پہلا تاج دار ہے، ارطغرل نے اپنے زورِ قوت اور دولت سلجوقیہ کے تفرق و انتشار کے باوجود کبھی خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا اور گو سلجوقی امراء نے سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر متعدد خودسر حکومتیں قائم کرلی تھیں لیکن وہ خود آخر دم تک سلطان قونیہ کا وفادار اور جاگیردار ہی رہا، عثمان نے بھی یہی روش اختیار کی اور اپنی فتوحات سے سلطان کی شان و شوکت کو ایک حد تک محفوظ رکھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دولت سلجوقیہ دم توڑ رہی تھی اور ایشیائے کوچک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اس بنا پر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع عثمان کو نہیں مل سکتا تھا لیکن اس نے اپنی توجہ زیادہ تر بازنطینی علاقوں کی طرف مبذول رکھی جس کے مختلف اسباب تھے، پہلی وجہ تو یہ تھی کہ خود اس کی جاگیر بازنطینی سرحد سے متصل واقع تھی اور بازنطینی سلطنت کی کمزوری روز بروز نمایاں ہوتی جارہی تھی، یہ اسی کمزوری اور شہنشاہ قسطنطنیہ کی ایک سیاسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ کوہِ آلمپس (Olympus) کے دروں کی حفاظت نہ ہوسکی اور ترک بتھینیا (Bithynia) کے میدانوں میں داخل ہوگئے، شہنشاہ پلیلوگس (Palaeblogus)

کے عہد تک ان دروں کی حفاظت اس علاقہ کے ردیف (میلیشیا) کے سپرد تھی اور وہ لوگ اس خدمت کے معاوضہ میں ٹیکسوں سے بری تھے لیکن اس کے بعد شہنشاہ نے اس رعایت کو منسوخ کر دیا اور دروں کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی، نیز خراج کی رقم سختی سے وصول کرنی شروع کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دروں کی حفاظت میں غفلت ہونے لگی اور وہ جفاکش پہاڑی لوگ محض کسان ہو کر رہ گئے، جن میں نہ کوئی جوش باقی رہا اور نہ فوجی نظم و تادیب[1]، بازنطینی سلطنت جو کسی زمانہ میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی، فرقہ وارانہ جنگوں اور انتہائی بدنظمیوں میں مبتلا تھی، جس کے باعث اس میں کسی طاقت ور حریف کے مقابلہ کی قوت باقی نہیں رہی تھی، ایشیائے کوچک میں اس کے سابق مقبوضات میں سے صرف چند شہر مثلاً بروصہ، نائسیا، نائکومیڈیا اور ان کے نواحی اضلاع باقی رہ گئے تھے، جو شمال مغرب میں واقع تھے، نیز باسفورس اور بحر مارمورا کے ساحلی خطے ابھی تک قسطنطنیہ کے زیر حکومت تھے، اناطولیہ کے بقیہ کے تمام علاقے جو پہلے بازنطینی سلطنت میں داخل تھے، اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے، عثمان کے لیے بازنطینی علاقوں کی طرف متوجہ ہونے کی دوسری وجہ اسلام کی تبلیغ تھی، تیسری وجہ بازنطینیوں سے برسرِ پیکار ہونے کی یہ تھی کہ عثمان کے لیے دوسری جانب قدم بڑھانے کی گنجائش نہ تھی، سلجوقی امراء جنہوں نے خودسر حکومتیں قائم کر لی تھیں، طاقت میں اس سے بڑھے ہوئے تھے۔

قراجہ حصار لیکن ان ترغیبات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ عثمان نے با اقتدار ہونے کے ساتھ ہی حملے شروع کر دیے، اس کی لڑائیاں ابتداءً مدافعانہ تھیں، بازنطینی قلعہ دار دولت سلجوقیہ کے سرحدی علاقوں پر وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتے رہتے تھے، سلطان قونیہ کے ایک نائب کی حیثیت سے عثمان کو ان حملہ آوروں سے مقابلہ کے لیے آگے بڑھنا پڑا، پہلے ہی سال قراجہ حصار کا معرکہ پیش آیا، عثمان نے اس قلعہ کو فتح کر کے بازنطینیوں کو آئندہ کے لیے متنبہ

[1] گبن تاریخ زوال روما، جلد ۴، ص ۳۸۱۔

کر دیا، سلطان علاء الدین نے قراجہ حصار اور اس کے گرد و پیش کی تمام آراضی جو عثمان نے بزور شمشیر حاصل کی تھی، اسے جاگیر میں دے دی، نیز بک کے خطاب سے سرفراز کر کے اسے اپنا سکہ جاری کرنے اور اپنا نام جمعہ کے خطبہ میں شامل کرنے کی بھی اجازت دی، اس طرح لقب کے علاوہ بادشاہی کے تمام امتیازات عثمان کو حاصل ہو گئے۔

استقلال یہ کمی بھی چند سالوں کے بعد پوری ہو گئی، ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) میں تاتاریوں نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا اور اسی جنگ میں سلطان علاء الدین مارا گیا، بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا قاتل خود اس کا لڑکا غیاث الدین تھا، جس نے تخت سلطنت کی خاطر ایسا کیا[1]، بہر حال تاتاریوں نے غیاث الدین کو بھی قتل کر دیا اور ایشیائے کوچک میں دولت سلجوقیہ کا خاتمہ ہو گیا، اب عثمان بالکل آزاد اور خود مختار تھا اور آئندہ اس نے تمام فتوحات ایک خود مختار فرماں روا کی حیثیت سے حاصل کیں۔

سلجوقی امراء میں عثمان کا سب سے بڑا حریف امیر کرمانیہ تھا، چنانچہ ایشیائے کوچک کے ترکوں کی سرداری اور پورے ملک کی حکومت کے لیے فریقین کے درمیان عثمان کی زندگی ہی میں جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جو اس کے متعدد جانشینوں کے عہد تک جاری رہا، خود عثمان نے بھی امیر کرمانیہ کو کئی بار نیچا دکھایا لیکن سلطنت بازنطینی کے زرخیز مقبوضات زیادہ تر اس کی توجہ کا مرکز تھے اور اس کی زندگی کے آخری چھبیس سال کے کارناموں میں بازنطینی ہی شہروں اور قلعوں کی فتوحات نمایاں ہیں۔

عثمان کے کارنامے تاہم عثمان کا مقصد زندگی صرف فتوحات کا حاصل کرنا اور گرد و پیش کی ریاستوں کو اپنا مطیع بنانا نہ تھا، ۶۹۰ھ (۱۲۹۱ء) سے ۶۹۷ھ (۱۲۹۸ء) تک اس نے اپنی توجہ تمام تر حکومت کے انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی، حکومت کے مختلف شعبے قائم کر کے حکام کا تقرر کیا اور رعایا کے فلاح و بہبود کے انتظامات میں مصروف رہا لیکن

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ، از محمد فرید بک، مطبوعہ مصر، ۱۳۱۴ھ، ص ۴۱۔

دوسرے ترک سرداروں نے، جو عثمان کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھے، اس کی خاموشی کو ضعف پر محمول کیا اور بازنطینی قلعہ داروں سے اتحاد کر کے اس کے مقبوضات پر حملہ آور ہوئے، اس طرح جنگ کا جو سلسلہ ۶۹۷ھ (۱۲۹۸ء) میں چھڑا وہ ابتداءً عثمان کی طرف سے بالکل مدافعانہ تھا لیکن ان حملہ آوروں کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگیا، عثمان نے ان سب کو شکست دی، نواح کے چھوٹے چھوٹے سرداروں کو مطیع کیا، بازنطینی قلعے یکے بعد دیگرے فتح کیے اور بالآخر ینی شہر پر قبضہ کر کے اسے اپنی مملکت کا پایۂ تخت بنایا، ۷۰۱ھ (۱۳۰۱ء) میں عثمان کو نائیکومیڈیا سے متصل قیون حصار کے مقام پر پہلی بار شہنشاہ قسطنطنیہ کی باقاعدہ افواج سے مقابلہ پیش آیا، جس میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور چھ سال کے اندر اس کی فتوحات کا دائرہ بحر اسود کے ساحل تک پہنچ گیا، بازنطینی قلعے پے در پے مسخر ہوتے گئے اور بروصہ، نائسیا اور نائیکومیڈیا کے گرد فوجی چوکیوں کا ایک مضبوط حصار قائم ہوگیا، اس خطرہ کو دور کرنے کی غرض سے بازنطینیوں نے تاتاریوں کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا، عثمان نے اپنے لڑکے اورخان کو حملہ آوروں کے مقابلہ میں بھیجا، تاتاریوں کو سخت شکست ہوئی اور بازنطینیوں کی امید کی یہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔

فتح بروصہ اور عثمان کی وفات | ۷۱۷ھ (۱۳۱۷ء) میں عثمان نے بروصہ کا محاصرہ کیا جو ایشیائے کوچک میں سلطنت بازنطینی کا ایک نہایت اہم شہر تھا، محاصرہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، بالآخر ۷۲۶ھ (۱۳۲۶ء) میں عاجز آ کر محصورین نے ہتھیار ڈال دیے اور شہر کو خالی کر دیا اور ترکی فوج اورخان کی سرکردگی میں فاتحانہ طور پر بروصہ میں داخل ہوئی، عثمان اس وقت سغوت میں بستر مرگ پر تھا لیکن وفات سے قبل اورخان یہ خوش خبری لے کر اس کے پاس پہنچ گیا، عثمان نے اورخان کی ہمت و شجاعت کی داد دے کر اسے اپنا جانشین مقرر کیا اور بلا تفریق تمام رعایا کے ساتھ یکساں عدل و انصاف اور بھلائی کرنے کی وصیت کی، پھر یہ ہدایت کی کہ اسے بروصہ میں دفن کیا جائے اور اس شہر کو عثمانی مملکت کا پایۂ تخت بنایا جائے، چنانچہ اس

وصیت کے مطابق اسے بروصہ میں دفن کیا گیا اور اس کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

سلطنت | عثمان دولت عثمانیہ کا پہلا تاج دار ہے، اس بنا پر عموماً اس کے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کر دیتے ہیں لیکن خود اس نے اور اس کے بعد اورخان اور مراد اول نے صرف ''امیر'' ہی کا لقب اختیار کیا[1]، ارطغرل کی وفات پر اس کے مقبوضات کا دائرہ سغوت، اس کی شہر اور چند مواضعات پر ختم ہو جاتا تھا، عثمان نے اپنی اڑتیس سال کی حکومت میں اس دائرہ کو جنوب میں کوتاہیہ اور شمال میں بحر مارمورا اور بحر اسود کے ساحلوں تک وسیع کر دیا، اس کی قلم رو کا طول تقریباً ۱۲۰ میل اور عرض تقریباً ۶۰ میل تھا[2]، آبادی صرف ترکوں پر مشتمل نہ تھی، بلکہ بیش تر علاقے چوں کہ سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات سے حاصل کردہ تھے، اس لیے آبادی میں ایک بڑی تعداد یونانی اور سلافی باشندوں کی بھی تھی، جو بخوشی مسلمان ہو کر ترکوں میں شامل ہو گئے تھے، ایور سلے لکھتا ہے کہ یہ عیسائی کسی جبر سے اسلام نہیں لائے کیوں کہ تاریخ میں نہ تو قیدیوں کے قتل عام کا کوئی ذکر ہے اور نہ بحیثیت غلام انہیں فروخت کرنے کا بلکہ ان کے اسلام لانے کی وجہ یہ ہوئی کہ قسطنطنیہ کے یونانیوں نے جو فطری طور پر ان کے محافظ تھے، انہیں چھوڑ دیا تھا[3]، اسلام میں داخل ہونے کے بعد فاتح اور مفتوح کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہو گئے اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی، جو دوسری ترکی ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی اور اپنے کو ''عثمانی'' کہتی تھی۔

عثمان کا اسلام | اس موقع پر خود عثمان اور اس کے قبیلے کے اسلام لانے کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے، اب سے بیس بائیس سال قبل تک یہ امر عموماً مؤرخین کے نزدیک مسلم تھا کہ ارطغرل اور اس کے ساتھی ایشیائے کوچک میں داخل ہونے سے پہلے ہی مسلمان تھے لیکن

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۱۷ [2] ترکی سلطنت، از لارڈ ایور سلے، ص ۱۵، مطبوعہ لندن، ۱۹۲۴ء (The Turkish Empire By Lord Eversley) [3] ترکی سلطنت از لارڈ ایور سلے، ص ۱۶، مطبوعہ لندن، ۱۹۲۴ء۔

۱۹۱۶ء میں مسٹر ہربرٹ گبنس نے اپنی مستند تالیف ''اساس سلطنت عثمانیہ''[1] کو شائع کر کے یہ تازہ تحقیق پیش کی کہ سغوت میں بودو باش اختیار کرنے کے وقت عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ بت پرست تھے، مسٹر گبنس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدا میں خراسان اور ماوراالنہر کے دوسرے علاقوں کی جو قومیں ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر نمودار ہوئیں ان کے اسلام لانے کا کوئی صریح ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا، ان سے پہلے کے ترک حملہ آور جب اس ملک میں داخل ہوئے تو وہ کئی پشتوں سے عربی اسلام کے زیر اثر رہتے آئے تھے، چنانچہ آل سلجوق بھی مسلمان ہی تھے لیکن بعد کے آنے والے ترک جن میں عثمان پیدا ہوا، کچھ بہت زیادہ اسلام کے زیر اثر نہیں رہے، خود عثمانیوں کے مؤرخ نشری کے بیان سے بھی صاف اشارہ ملتا ہے کہ عثمان کا مورث اعلیٰ سلیمان شاہ اور اس کے ساتھی جو اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور پچاس ہزار گھرانوں پر مشتمل تھے، غیر مسلم تھے، وہ کہتا ہے کہ ان میں سے کچھ شامی ترکمانوں کے آباء واجداد تھے اور بقیہ ان تمام خانہ بدوش قوموں کے جو روم میں ادھر ادھر پھرا کرتی تھیں اور خود نشری کے زمانہ میں بھی موجود تھیں، بارہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے سیاحوں کی بکثرت شہادتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قومیں بت پرست تھیں، ان مختلف ترکی قبیلوں نے جو اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے، جب عثمان کا قبیلہ وہاں آیا، ملک کے مغربی حصہ میں پہنچ کر اپنے آپ کو ایک اسلامی ماحول میں پایا، وہ تعداد میں تھوڑے تھے، ان کے لیے اس سے زیادہ قدرتی بات کوئی نہ تھی کہ اپنے سلجوقی اقرباء کا مذہب اختیار کر لیں، یہ اتنی قدرتی بات تھی کہ اس کے ذکر کی کوئی ضرورت سمجھی ہی نہیں گئی، عثمان اور اس کے قبیلہ کے اسلام لاپنے سے عثمانی قوم پیدا ہوئی کیوں کہ اسلام ہی نے ان مختلف قوموں کو جو ایشیائے کوچک کے شمالی مغربی گوشہ میں آباد تھیں، متحد کر کے ایک قوم بنا دیا، یہ سلاجقہ قونیہ کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس تبدیل

---

[1] The Foundation Of The Othman Empire By H. Adams Gibbns, New York, 1916.

مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں شروع ہوگئیں، حالاں کہ اس سے سغوت کی زندگی کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے خالی تھی، ارطغرل اور عثمان ایک دیہاتی سردار کی حیثیت سے سغوت میں سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے تمام حوصلے اپنے چھوٹے سے گاؤں ہی تک محدود تھے، ان کی اس زمانہ کی کسی جنگ یا فتح کا ذکر تاریخ میں موجود نہیں، ارطغرل کے ساتھ چار سو سپاہی تھے اور عثمان کے ہم راہ اس سے زیادہ سپاہیوں کے ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی، اس کے تعلقات اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بالکل صلح و دوستی کے تھے، نشری کا بیان ہے کہ اس ملک کے کافر و مسلم دونوں ارطغرل اور اس کے لڑکے کی عزت کرتے تھے، کافر و مسلم کا کوئی سوال ہی نہ تھا، پھر دفعۃً ہم عثمان کو اپنے پڑوسیوں پر حملہ آور ہوتے اور ان کے قلعوں کو فتح کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) سے ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) تک وہ اپنے مقبوضات کو وسیع کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی سرحد بازنطینی علاقوں سے مل جاتی ہے، اس کے سپاہیوں کی تعداد چار سو سے بڑھ کر چار ہزار تک پہنچ جاتی ہے، ہم ایک قوم کا ذکر سننے لگتے ہیں، جو ترک نہیں بلکہ اپنے سرداروں کے نام پر ''عثمانی'' کہلاتی ہے، اس سردار کا نام خود بھی اس کی قوم ہی کے نام کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، یہ لوگ یونانیوں (بازنطینیوں) اور تاتاریوں دونوں کے یکساں دشمن ہیں اور متعین طور پر اسلام سے وابستہ ہیں، ان میں ایک ایسا تبلیغی جوش ہے جو صرف ان ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جنہوں نے حال ہی میں مذہب تبدیل کیا ہو، ان کی باہمی وحدت اور ایشیائے کوچک کے دوسرے ترکوں سے ان کا قطعی طور سے مختلف ہونا، چودہویں صدی کے ابتدائی ساٹھ سالوں میں اس قدر نمایاں ہو جاتا ہے کہ یورپ انہیں بحیثیت ایک قوم کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، ایشیائے کوچک کی دوسری جماعتوں کی بہ نسبت چوں کہ یہی لوگ یورپ کے سامنے زیادہ آئے، اس لیے اہل یورپ نے انہیں محض ''ترک'' کہنا شروع کیا اور ان کو اناطولیہ کے تمام ترکوں کا نمائندہ سمجھنے لگے۔[1]

---

[1] اساس سلطنت عثمانیہ، از ہربرٹ گینس، ص ۲۹-۲۵۔

پروفیسر گرمانس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، لکھتے ہیں: ”اپنے پیش رووں کی طرح جنہوں نے ایشیائے کوچک میں بودوباش اختیار کرلی تھی“ کے خان لی“ بھی ترک ہی تھے، البتہ ان کی بولی ذرا ان سے مختلف تھی، ایک اور فرق یہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لا چکے تھے لیکن یہ نوارد ہنوز اپنے قدیم خانہ بدوشی کے مسلک پر قائم تھے، ان کے سردار طغرل کے بیٹے عثمان کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ہے، اس سے ہمارا یہ قیاس حق بہ جانب ہے کہ انہوں نے ایشیائے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ہونے کے بعد اسلام قبول کیا[1]۔

مال خاتون وہ روایت یہ ہے کہ اس شہر کے قریب اتر دنی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک خدارسیدہ عالم اوہ بالی رہا کرتے تھے، عثمان اپنی نوعمری کے زمانہ میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا، ان کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی جس کا نام مال خاتون تھا، ایک روز اتفاق سے عثمان کی نظر اس دوشیزہ پر پڑ گئی اور وہ دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہوگیا، اس نے نکاح کا پیغام دیا لیکن اوہ بالی چوں کہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لیے فرق مراتب کا لحاظ کر کے انہوں نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا، دو سال تک عشق ومحبت کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا اور عثمان نے اوہ بالی کے گھر کی آمدورفت جاری رکھی، اس درمیان میں چند اور ترک سرداروں نے بھی، جو طاقت اور وجاہت میں عثمان سے بڑھے ہوئے تھے، مال خاتون سے شادی کی خواہش کی لیکن اوہ بالی نے ان کو بھی صاف جواب دیا، بالآخر ایک رات جب عثمان اوہ بالی کے یہاں مقیم تھا، اس نے یہ عجیب وغریب خواب دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کر اوہ بالی کے سینہ سے نکلا اور رفتہ رفتہ بدر کامل بن کر اس کے سینہ میں اتر آیا، پھر اس کے پہلو سے ایک زبردست درخت نمودار ہوا، جو بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحروبر پر چھا گئیں، درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہ رہے تھے اور چار بڑے

---

[1] ترکوں کی اسلامی خدمات از ڈاکٹر جولیس گرمانس، ص ۱۰، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۲ء۔

بڑے پہاڑ کوہ قاف، کوہ بلقان، کوہ طور اور کوہ اٹلس اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے، دفعۃً ایک نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رخ جو شکل میں تلوار سے مشابہ تھیں، ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا، یہ شہر جو دو سمندروں اور دو براعظموں کے اتصال پر واقع تھا، مثل ایک انگوٹھی کے دکھائی دیتا تھا، جس میں دو نیلم اور دو زمرد جڑے ہوئے تھے، عثمان اس انگوٹھی کو پہننا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، بیدار ہونے کے بعد اس نے یہ خواب اوہ بالی سے بیان کیا، اوہ بالی نے اس میں عثمان کے شان دار مستقبل کی تعبیر دیکھ کر نیز اسے ایک اشارۂ غیبی سمجھ کر مال خاتون کو اس کے نکاح میں دے دیا، اوہ بالی ہی کی تلقین سے عثمان اور اس کے قبیلہ کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔

ذاتی اوصاف عثمان میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک بانی سلطنت کے لیے ضروری ہیں، اس کی ہمت اور شجاعت غیر معمولی تھی، اسے قیادت کا ملکہ خداداد حاصل تھا، میدان جنگ میں اس کی بہادری سپاہیوں میں دلیری کی روح پھونک دیتی تھی اور انتظام حکومت میں اس کی دانش مندی رعایا کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی، اس کے عدل وانصاف کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، اس کی عدالت میں ترک وتاتار، مسلم وعیسائی سب برابر تھے، رعایا کی بہبودی اس کا نصب العین اور ملک کی خوش حالی اس کا مطمح نظر تھا، قرون اولیٰ کے مجاہدوں کی طرح اس کا طرزِ زندگی نہایت سادہ اور نمائش سے یکسر پاک تھا، دولت اس نے کبھی جمع نہیں کی، تمام مال غنیمت غریبوں اور یتیموں کا حصہ نکالنے کے بعد سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا تھا، ینی شہر میں اس کے رہنے کا جو مکان تھا، اس میں سونے، چاندی یا جواہرات کی قسم سے کوئی چیز بھی اس کے مرنے کے بعد نہیں ملی، صرف ایک کفتان، ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمک دان، چند خالص عربی گھوڑے، زراعت کے لیے چند جوڑ بیل اور بھیڑوں کے کچھ گلے، علم اور اسلحہ کے علاوہ، بس یہی اس کی ساری کائنات تھی، وہ نہایت فیاض، نہایت رحم دل اور نہایت مہمان نواز تھا، ان خصوصیات کی وجہ سے اس کی ہر دل عزیزی

عام تھی، چنانچہ تخت نشینی کے موقع پر جب اس کی تلوار جو ابھی تک محفوظ ہے، اس کے جانشینوں کی کمر سے باندھی جاتی تھی تو ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کی جاتی تھی کہ ''خدا اس میں بھی عثمان ہی جیسی خوبیاں پیدا کر دے۔''

لیکن ان خوبیوں کے ساتھ عثمان کے دامن پر ایک بے گناہ کے خون کی چھینٹیں بھی نظر آتی ہیں، ۶۹۸ھ (۱۲۹۹ء) میں جب اس نے یونانیوں کے قلعہ کوہ پری حصار پر حملہ کا عزم کیا تو پہلے اپنے فوجی سرداروں کو بلا کر مشورہ طلب کیا، اس مجلس میں اس کا بوڑھا چچا دوندار بھی تھا، اس نے یونانیوں کی قوت کا اندازہ کر کے حملہ کرنے کے خلاف رائے دی، عثمان نے اس خوف سے کہ مبادا دوندار کے مشورہ سے دوسرے سرداروں کی ہمتیں بھی پست نہ ہو جائیں، فوراً ایک تیر مار کر اسے ہلاک کر دیا، بوڑھے چچا کا یہ قتل آج خواہ کتنا ہی معیوب نظر آئے لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے یہ ایک بالکل معمولی واقعہ تھا اور اگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی کم ہو جاتی ہے۔

پہلی مسجد | عثمان نے اپنے ابتدائی عہد حکومت میں ایک مسجد اس شہر میں تعمیر کرائی جو سلطنت عثمانیہ کی پہلی مسجد ہے۔

اورخان

۷۲۶ھ تا ۷۶۰ھ مطابق ۱۳۲۶ء تا ۱۳۵۹ء

عثمان نے اپنی وفات کے وقت اپنے چھوٹے بیٹے اورخان کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، اورخان کی عمر اس وقت ۴۲ رسال کی تھی اور وہ فن سپہ گری میں عثمان کے زیر نگرانی مہارت اور کمال حاصل کر چکا تھا، اس کے بڑے لڑکے علاء الدین نے اپنا وقت علوم دینیہ کی تحصیل میں صرف کیا تھا، فن حرب سے اس کو مناسبت نہ تھی، تاہم عثمان کی وفات کے بعد اورخان نے سلطنت کا باہم تقسیم کر لینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن علاء الدین نے باپ کی وصیت نیز اپنی سکون پسند طبیعت کی بنا پر اس کو نامنظور کیا اور اورخان کے اصرار پر صرف انتظام مملکت کی ذمہ داری قبول کی، یعنی تخت سلطنت سے کنارہ کش ہونے کے باوجود بارِ سلطنت کا اٹھانا قبول کیا اور دولت عثمانیہ کے پہلے وزیر کی حیثیت سے آئین ملک کی ترتیب و تنظیم میں مشغول ہوا۔

اصلاحات علاء الدین نے تین چیزوں پر خاص طور سے توجہ کی، سکہ، لباس اور فوج، اگرچہ سلطان علاء الدین سلجوقی نے عثمان کو خطبہ کے علاوہ اپنے نام کا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی، تاہم عثمان نے صرف خطبہ ہی پر قناعت کی تھی اور اپنا سکہ جاری نہیں کیا تھا، اورخان کی تخت نشینی کے وقت تمام ایشیائے کوچک میں صرف سلجوقی سکے رائج تھے، اب

علاء الدین نے بادشاہت کے اس امتیاز کو بھی اختیار کیا اور اسلامی مملکت میں اورخان کے نام کے سکے جاری کیے[1]، اب تک لوگوں کے لباس میں بھی کوئی خاص فرق و امتیاز نہ تھا، علاء الدین نے رعایا کے مختلف طبقوں کے لیے مختلف قسم کے لباس تجویز کر کے ان کے متعلق قوانین نافذ کیے، شہری اور دیہاتی، مسلم اور غیر مسلم ہر طبقہ کا لباس الگ الگ مقرر کیا[2]۔

فوج لیکن علاء الدین کا سب سے بڑا کارنامہ وہ فوجی اصلاحات ہیں، جن سے دولت عثمانیہ کی طاقت دفعۃً بڑھ گئی اور جو تین سو برس تک اس کی حیرت انگیز فتوحات کی ضامن رہیں، ارطغرل اور عثمان کے زمانہ میں کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی، بلکہ یہ دستور تھا کہ جب کوئی جنگ پیش آنے والی ہوتی تو پہلے سے اعلان کر دیا جاتا کہ جو شخص لڑائی میں شریک ہونا چاہے وہ فلاں روز فلاں مقام پر حاضر ہو جائے، چنانچہ یہ رضا کار سوار مقررہ وقت اور مقررہ مقام پر جمع ہو جاتے تھے اور لڑائی ختم ہونے کے بعد واپس چلے جاتے تھے، انہیں کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ جو مال غنیمت ہاتھ آتا تھا، وہی ان کی خدمت کا معاوضہ ہوتا تھا، ان کی کوئی مخصوص وردی بھی نہیں تھی، بایں ہمہ یہ سپاہی اعلیٰ درجہ کے شہ سوار ہوتے تھے اور مضبوطی کے ساتھ صف قائم کر کے ایک دیوار کی طرح میدان جنگ میں آگے بڑھتے تھے[3]، عثمان کے عہد تک تو اس طریقہ سے کام چلتا رہا لیکن اس کے بعد سلطنت کی توسیع اور استحکام کے لیے یہ نظام ناکافی ثابت ہوا اور ایک باقاعدہ اور مستقل فوج کی ضرورت محسوس ہونے لگی، چنانچہ علاء الدین نے تنخواہ دار پیادوں کی ایک فوج مرتب کی، جن کا نام ''پیادے'' تھا، یہ دس دس، سو سو اور ہزار ہزار کے دستوں میں تقسیم تھی، اس کی تنخواہیں اونچی اونچی تھیں لیکن اس کے قیام کو زیادہ روز نہ ہوئے تھے کہ اس میں اپنی قوت کا بے جا احساس پیدا ہو گیا اور اس کی سرکشی خود اورخان کے لیے تشویش کا باعث ہونے لگی، چنانچہ اورخان نے اس

---

[1] ترکی قدیم و جدید از سدلینڈ منزلیس، جلد ا، ص ۵۷ (Turkey Old And New By Sutherland Menzies, London, Vol I, P 57
[2] گبن، جلد ۴، ص ۳۸۱ [3] ہربرٹ گبنس، ص ۸۱۔

امر میں علاء الدین اور قرا خلیل سے (جو خاندان شاہی سے ازدواجی تعلق رکھتا تھا اور علاء الدین کے بعد وزیر سلطنت ہو کر خیر الدین پاشا کے نام سے مشہور ہوا) مشورہ کیا، قرا خلیل نے جو تجویز پیش کی، اس نے نہ صرف پیادوں کی طرف سے مطمئن کر دیا بلکہ آئندہ تین صدیوں کے لیے عثمانی فتوحات کی رفتار میں ایک سیلاب کی قوت و سرعت بھی پیدا کر دی۔

ینی چری وہ تجویز یہ تھی کہ عیسائی اسیران جنگ میں سے دس بارہ سال کے قوی اور ہونہار لڑکوں کی ایک تعداد منتخب کر کے اسلام میں داخل کی جائے اور پھر باقاعدہ فوجی تعلیم دے کر ان کی ایک مستقل فوج قائم کی جائے، اورخان کو یہ رائے پسند آئی اور اس نے ایک ہزار عیسائی لڑکوں کو منتخب کر کے انہیں فوجی تعلیم و تربیت دینی شروع کی، دوسرے سال ایک ہزار لڑکے اور چنے گئے اور یہ سلسلہ تین سو برس تک برابر جاری رہا، جب کبھی ہزار لڑکوں کی یہ سالانہ تعداد ان لڑکوں سے پوری نہ ہو سکتی جو اس سال کی جنگ میں قید ہوتے تو عیسائی رعایا کے لڑکوں سے کمی پوری کر لی جاتی لیکن سلطان محمد رابع کے عہد حکومت میں یہ نظام بدل گیا اور ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) سے خود ان ہی سپاہیوں اور ترکوں کے لڑکے اس فوج میں داخل کیے جانے لگے، اس فوج کا ترکی نام ینی چری (نئی فوج) ہے، جو عربی میں انکشاری ہو گیا ہے، اورخان نے جب اسے مرتب کیا تو نوعمر سپاہیوں کے پہلے دستہ کو حاجی بکطاش کی خدمت میں جو ملک میں اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے مشہور تھے، لے گیا اور ان سے دعا کی خواہش کی، حاجی موصوف نے اس فوج کے لیے فتح و نصرت کی دعا کی اور اس کا نام ینی چری رکھا، سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی تین صدیوں میں جو اس کے عروج و ترقی کا زمانہ تھا، ینی چری کی قوت شباب پر تھی اور سلطنت کی تمام فتوحات زیادہ تر اسی فوج کے زور بازو کی رہین منت تھیں، جو لڑکے اس فوج کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، پہلے انہیں ایسے ماحول میں رکھا جاتا تھا کہ وہ خود بخود اسلام کی طرف مائل ہوتے جائیں، اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں سلطان کی خاص نگرانی میں فن حرب کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، ان کی فوجی تربیت میں حد

درجہ سختی برتی جاتی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہر قسم کے شدائد کو آسانی سے برداشت کر لیتے تھے، اپنے والدین، وطن اور مذہب سے چھوٹنے کے بعد ان کی تمام امیدیں سلطان کی اطاعت، دولت عثمانیہ کی خدمت اور اسلام کی حمایت سے وابستہ ہو جاتی تھیں اور یہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا، سلطان کو ان پر پورا اعتماد تھا اور وہ ہمیشہ ان کو انعام واکرام سے سرفراز کرتا رہتا تھا، ینی چری کے متعلق مزید حالات آگے آئیں گے۔

جاگیردار اور بے ضابطہ پیادے ینی چری کے بعد علاء الدین نے دوسری فوجوں کی تنظیم شروع کی، اب تک ''پیادوں'' کی مستقل فوج کو تنخواہیں دی جاتی تھیں لیکن اس خیال سے کہ ان کو مفتوحہ علاقوں کی حفاظت سے ایک خاص وابستگی پیدا ہو جائے، علاء الدین نے اب تنخواہ کے بجائے انہیں جاگیریں دے دیں اور فوجی خدمت کے علاوہ ان جاگیروں سے متصل سڑکوں کی مرمت بھی ان کے فرائض میں داخل کر دی، پیدل سپاہیوں کی ایک بے ضابطہ فوج بھی مرتب کی گئی، اس کو نہ تو ینی چری کی طرح تنخواہیں ملتی تھیں اور نہ ''پیادوں'' کی طرح جاگیریں، میدانِ جنگ میں سب سے آگے ان ہی کا دستہ ہوتا تھا اور دشمن کے پہلے حملہ کی باڑھ آگے بڑھ کر یہی روکتے تھے، جب ان سے مقابلہ کرنے میں غنیم کی قوت کمزور ہو جاتی یا ان کے میدان کے چھوڑ کر بھاگنے کی وجہ سے اسے اپنی فتح کا یقین ہونے لگتا، اس وقت دفعۃً ینی چری کی آہنی فوج اس کے سامنے نمودار ہوتی اور جنگ کا سارا نقشہ دیکھتے دیکھتے بدل جاتا، عموماً ان بے ضابطہ سپاہیوں ہی کی نعشوں پر سے گزر کر ینی چری آخری حملہ اور فتح کے لیے آگے بڑھتے تھے۔

تنخواہ دار اور جاگیردار سوار پیادوں کی طرح سواروں کی بھی دو تقسیمیں تھیں، باضابطہ اور بے ضابطہ، مستقل تنخواہ دار سوار چار دستوں میں تقسیم کیے گئے تھے، ان کی تعداد ابتداء میں دو ہزار چار سو تھی لیکن سلیمان اعظم کے عہد میں چار ہزار تک پہنچ گئی تھی، وہ سلطان کے داہنے اور بائیں چلا کرتے تھے اور جنگ میں اس کے محافظ دستہ کا کام دیتے تھے، شاہی

سواروں کے دستوں میں ایک دستہ ''سپاہیوں'' کا تھا، ''سپاہی'' کا لفظ عموماً سوار فوج کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن شاہی سواروں کا ایک خاص دستہ بھی اس نام سے موسوم تھا، تنخواہ دار سواروں کے علاوہ علاء الدین نے جاگیردار سواروں کی بھی ایک فوج مرتب کی، ان کی جاگیروں کو زعامت اور تیمار کہتے تھے۔

انکنجی تنخواہ دار اور جاگیردار سواروں کے علاوہ بے ضابطہ سواروں کی بھی ایک فوج تھی جو انکنجی کہلاتے تھے، ان کو نہ تنخواہیں ملتی تھیں نہ جاگیریں، جنگ میں لوٹ مار کر جو کچھ حاصل کر لیتے وہی ان کا معاوضہ تھا، قدیم دستور کے موافق عثمانی فوجوں کی روانگی کے وقت یہ ایک بڑی تعداد میں بلائے جاتے تھے، یہ گویا مقدمۃ الجیش تھے اور باقاعدہ افواج کے لیے پہلے ہی سے راستہ صاف کر رکھتے تھے، دشمن کے دلوں میں ان کی دہشت بھی ینی چری اور سپاہیوں سے کم نہ تھی لیکن ان ہی کو سب سے زیادہ خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

عثمانی فوج کے مخصوص امتیازات علاء الدین نے اپنی فوجی اصلاحات سے ترکوں کی ایک باضابطہ اور مستقل فوج تیار کر دی، جس کی نظیر ایک صدی تک یورپ میں پیدا نہ ہو سکی، چارلس ہفتم شاہ فرانس کے پندرہ فوجی دستے جو عہد جدید کی پہلی مستقل فوج سمجھی جاتی ہے اورخان کی مستقل اور تنخواہ دار سپاہ سے پورے سو برس بعد وجود میں آئے[1] مسٹر ہربرٹ گبنس نے عثمانیوں کے اس امتیاز سے جسے عموماً تمام مؤرخین تسلیم کرتے آئے ہیں، انکار کیا ہے اور ایڈورڈ سوم شاہ انگلستان کی باقاعدہ پیدل فوج کا ذکر کیا ہے، جس نے ۱۳۴۶ء میں جنگ کریسی میں حصہ لیا تھا لیکن جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، ایڈورڈ نے ایک ایسی فوج مرتب کی تھی، جو صرف ضرورت کے وقت جنگ کے لیے طلب کی جا سکتی تھی[2]، برخلاف اس کے اورخان کی فوج ایک مستقل فوج تھی جسے باقاعدہ تنخواہیں دی جاتی تھیں اور جو ہمہ وقت جنگ کے لیے مستعد اور تیار رہتی تھی، چنانچہ یہ امر مسٹر گبنس کو بھی تسلیم ہے کہ فوج کی مکمل تنظیم اور

---

[1] کریسی، جلد ا ص ۲۸ [2] ہربرٹ گبنس، نوٹ، ص ۸۲۔

اسے ہمیشہ جنگ کے لیے تیار رکھنے کی اولیت عثمانیوں ہی کو حاصل ہے[1]، علاء الدین کے فوجی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ بادشاہ اور فوج کے درمیان براہ راست تعلق پیدا ہو گیا اور درمیانی اشخاص کی ضرورت باقی نہیں رہی، جن کی وساطت سے عثمان اور طغرل کے سپاہی فراہم ہوتے تھے، بے ضابطہ پیدل اور سوار فوجوں کے علاوہ جو صرف لڑائی کے موقعوں پر بلائی جاتی تھیں بقیہ تمام فوج تنخواہ دار یا جاگیر دار تھی اور سب کی کمان سلطان کے ہاتھ میں تھی، مسٹر گبنس نے ایک قدیم اور واقف کار سیاح بروکیئے (Broguiere) کا بیان نقل کیا ہے کہ عثمانیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ عیسائی فوجیں کب آ رہی ہیں اور کہاں ان سے مقابلہ کرنا مفید ہوگا، وجہ یہ تھی کہ عثمانی جنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے اوران کے چاؤش اور جاسوس صحیح رہنمائی کرتے تھے، سیاح مذکور لکھتا ہے: ”وہ (عثمانی) دفعۃً روانہ ہو سکتے ہیں اور سو عیسائی سپاہی بہ نسبت دس ہزار عثمانیوں کے زیادہ شور کریں گے، طبل بجتے ہی وہ فوراً کوچ کر دیتے ہیں اور جب تک حکم نہ ملے ہرگز اپنے قدم نہیں روکتے، ہلکے اسلحہ سے مسلح ہونے کی وجہ سے وہ ایک رات میں اتنی مسافت طے کر لیتے ہیں جتنی ان کے عیسائی حریف تین دن میں طے کرتے ہیں[2]۔“

پاشا علاء الدین پہلے عثمانی ترک ہے جسے پاشا کا خطاب ملا، اس کے بعد یہ خطاب اورخان کے سب سے بڑے لڑکے سلیمان کو دیا گیا، شروع میں پاشا کا خطاب عثمانی فرماں روا کے بڑے لڑکے کے لیے مخصوص تھا لیکن مراد اول کا بڑا لڑکا چوں کہ باغی ہو گیا تھا اور بقیہ لڑکے اس وقت نابالغ تھے، اس لیے مراد نے یہ خطاب قرا خلیل کو دیا، اس کے بعد ولی عہد کی تخصیص جاتی رہی اور بڑے بڑے فوجی اور ملکی عہدے داروں کو بھی یہ خطاب دیا جانے لگا، اسی طرح وزارت کا عہدہ بھی علاء الدین کے بعد شاہی خاندان سے نکل گیا[3]۔

نائیکو میڈیا اور نائیسیا کی فتح اورخان نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال (۲۶ےھ

---

[1] ہربرٹ گبنس، نوٹ، ص ۱۸۲ [2] ہربرٹ گبنس، ص ۶۴ [3] ایضاً ص ۷۲-۷۱۔

مطابق ۱۳۲۶ء) میں نائیکومیڈیا پر قبضہ کرلیا، بروصہ چند مہینے قبل فتح ہو چکا تھا، سلطنت بازنطینی کے ایشیائی مقبوضات میں اب صرف ایک ہی بڑا شہر نائیسیا رہ گیا تھا، جو اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے قسطنطنیہ سے دوسرے درجہ پر تھا، اورخان نے اس کا بھی محاصرہ شروع کیا اور ۷۳۰ھ (۱۳۳۰ء) میں اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، اورخان نے نائسیا کے باشندوں کو اجازت دے دی تھی کہ اگر چاہیں تو اپنا تمام مال و اسباب لے کر کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں لیکن بروصہ کے باشندوں کی طرح یہ لوگ بھی بکثرت اسلام میں داخل ہو گئے اور اپنے وطن ہی میں مقیم رہے۔

قراسی پر قبضہ ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں ترکی ریاست قراسی کے امیر نے انتقال کیا، اس کے بڑے لڑکے نے تخت پر قبضہ کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کرادیا، اورخان چھوٹے لڑکے کا طرف دار تھا، اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے وہ قراسی پر حملہ آور ہوا، بڑا لڑکا شکست کھا کر بھاگا اور ۷۳۷ھ (۱۳۳۶ء) میں پوری ریاست پر اورخان کا قبضہ ہو گیا، اس کے بعد اورخان نے اناطولیہ کے شمالی مغربی گوشہ کی چند اور چھوٹی چھوٹی ترکی ریاستیں بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کرلیں، قراسی اور ان دوسری ترکی ریاستوں کی آبادی زیادہ تر ترکوں پر مشتمل تھی لیکن ساحلی علاقوں میں ایک خاصی تعداد یونانیوں کی بھی تھی، جنھوں نے بروصہ اور نائسیا کے اکثر باشندوں کی طرح اسلام قبول کرلیا۔

زمانۂ امن کے کارنامے ان فتوحات کے بعد تقریباً بیس سال تک کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی، اورخان پوری توجہ کے ساتھ ملکی اور فوجی آئین کی تنظیم اور تکمیل میں مصروف رہا، اس نے تمام ملک میں امن و امان قائم کیا، مسجدیں، مدرسے اور رفاہِ عام کی مختلف شان دار عمارتیں بنوائیں، بروصہ میں ایک نہایت عالی شان مسجد، ایک بڑا مدرسہ اور ایک شاہی اسپتال تعمیر کرایا، بڑے بڑے فضلا اور اہل کمال کو طلب کیا اور بروصہ کی شہرت اتنی پھیلی کہ ایرانی اور عربی طلبہ علومِ مشرقیہ کے قدیم مدرسوں سے آ کر وہاں تعلیم

حاصل کرنے لگے[1]، نائسیا میں بھی ایک مسجد تعمیر کی اور اس کے متصل ایک مدرسہ قائم کیا، جو دولت عثمانیہ کا پہلا مدرسہ تھا اور بہت مشہور ہوا، اسی شہر میں اورخان نے غریبوں کے لیے پہلا لنگر خانہ بھی جاری کیا[2]۔

حکومت کی پالیسی جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے، خاندان عثمانی کے ابتدائی تاج داروں کی ایک بڑی خصوصیت، جس کا اثر سلطنت کے استحکام پر نمایاں طور سے پڑا، یہ تھی کہ جب وہ کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو قبضہ کے بعد ہی اس کے اندرونی نظم و نسق میں مصروف ہو جاتے تھے، ان کا مقصد محض فتوحات حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ وہ مفتوحہ علاقوں کو اپنے آئین و ضوابط کے مطابق تنظیم دے کر مکمل طور پر سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس طرح بجائے اس کے کہ اپنی فتوحات سے مختلف صوبوں اور بے میل آبادیوں کو ایک غیر مرتب شکل میں اکٹھا کرتے، انہوں نے ایشیائے کوچک میں ایک مرتب اور پائیدار حکومت قائم کرلی، عہد قدیم وجدید کی دوسری مشرقی سلطنتوں کے مقابلہ میں دولت عثمانیہ کے زیادہ مدت تک قائم رہنے کی ایک بڑی وجہ اس کے ابتائی فرماں رواؤں کی یہی پالیسی ہے اور چوں کہ اس پالیسی پر یورپ، شام اور مصر سے زیادہ ایشیائے کوچک کی فتوحات میں عمل کیا گیا، اس لیے وہیں عثمانیوں کی حکومت کو زیادہ استقلال بھی نصیب ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ ایشیائے کوچک میں استقلال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں ترکوں کی آبادی کثرت سے پھیلی ہوئی تھی لیکن سلطنت کے استحکام میں فاتحین عثمانی کی اس دانش مندانہ پالیسی کو بھی کچھ کم دخل نہ تھا۔

سلطنت بازنطینی سلطنت کے اندرونی انتظامات سے فارغ ہوکر اورخان یورپ کی جانب متوجہ ہوا اور اس کی زندگی کے آخری چند سال سلطنت بازنطینی کے یورپین علاقوں میں قدم جمانے کی کوشش میں صرف ہوئے، یہ سلطنت آٹھویں صدی ہجری (چودھویں

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۲۸۱ [2] ترکی قدیم وجدید، ارمنزلیس، ج ۱، ص ۵۹۔

صدی عیسوی) کے وسط میں نہایت کم زور ہو چکی تھی، اس کے مقبوضات جو صدیوں تک یورپ میں دریائے ڈینوب اور ایشیا میں اناطولیہ اور شام تک پھیلے ہوئے تھے، اب صرف تھریس، مقدونیا کے ایک جز جس میں سالونیکا شامل تھا اور یونان میں سوریا کے ایک بڑے حصہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے، ایشیائی مقبوضات تقریباً کل کے کل عثمانیوں کے قبضہ میں جا چکے تھے، یورپ میں بھی سرویا کا بااقتدار فرماں روا اسٹیفن ڈوشن (Stephen Dushen) جزیرہ نمائے بلقان کے نصف سے زیادہ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر کے سالونیکا اور اس کے بعد قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا حوصلہ کر رہا تھا، خانہ جنگیوں نے سلطنت کو اور بھی کم زور کر دیا تھا، ۷۳۹ھ (۱۳۳۸ء) میں شہنشاہ اینڈرونیکس کے انتقال پر اس کا گرینڈ چانسلر کنٹا کوزین اس کے نابالغ لڑکے جان پلیولوگس کا ولی اور ملکہ اینا کے ساتھ اس کا مدارالمہام مقرر ہوا، کنٹا کوزین نے اس پر قناعت نہ کر کے ۷۴۴ھ (۱۳۴۳ء) میں نیکوٹیکا میں اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا، ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور اس نے اس کی مخالفت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں لڑائی چھڑ گئی اور دونوں نے اورخان سے مدد کی درخواست کی، اس سے پہلے بھی بعض ترکی امیروں نے تختِ قسطنطنیہ کے مختلف دعوے داروں میں سے کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دیا تھا، کنٹا کوزین نے اورخان سے چھ ہزار عثمانی سپاہی مانگے اور اس حمایت کے عوض اپنی لڑکی تھیوڈورا کو اس کی شریکِ زندگی بنانے کے لیے پیش کیا، اورخان نے یہ شرط منظور کی اور ۷۴۶ھ (۱۳۴۵) میں چھ ہزار سپاہی کنٹا کوزین کی مدد کے لیے یورپ میں بھیجے، کنٹا کوزین نے ان سپاہیوں کی مدد سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا، جو ملکہ کے قبضہ میں تھا، ایک سال کے محاصرہ کے بعد خود شہر کے بعض لوگوں کی غداری کی وجہ سے کنٹا کوزین فوج کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوا اور ملکہ کو مجبوراً صلح کے لیے راضی ہونا پڑا، صلح اس بات پر قرار پائی کہ کنٹا کوزین اور اس کی بیوی نیز ملکہ اینا اور شہزادہ جان پلیولوگس تخت نشین کر دیے جائیں، چنانچہ چاروں کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی، اس اتحاد کو اور زیادہ مضبوط

کرنے کے لیے کنٹا کوزین نے اپنی چھوٹی لڑکی کی شادی نوجوان شہنشاہ جان سے کر دی اور خان کا نکاح بھی شہزادی تھیوڈورا سے ہو گیا، اور خان نے تھیوڈورا کو اس کے آبائی مذہب مسیحیت پر قائم رہنے کی اجازت دی۔

یورپ میں پہلا قدم صلح کے بعد اور خان کے چھ ہزار سپاہی جو اس نے کنٹا کوزین کی مدد کے لیے بھیجے تھے، واپس آ گئے لیکن چند ہی سال کے بعد ان کی ضرورت پھر پیش آئی، ۷۵۰ھ (۱۳۴۹ء) میں اسٹیفن ڈوشن شاہ سرویا نے سالونیکا پر حملہ کیا اور یقین تھا کہ اسے فتح کرنے کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے گا، اس نازک موقع پر کنٹا کوزین اور جان پلیولوگس دونوں نے اور خان سے مدد کی درخواست کی، اب کی بار اور خان نے بیس ہزار سپاہی روانہ کیے، ان کی مدد سے سالونیکا میں اسٹیفن کو شکست ہوئی اور قسطنطنیہ کی فتح کا حوصلہ جو اس کے دل میں بار بار پیدا ہوتا تھا، اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، جنگ کے خاتمہ پر عثمانی سپاہی پھر واپس بلا لیے گئے، مگر چار سال کے بعد اور خان کو اپنی فوجیں آبنائے باسفورس کے مغربی ساحل پر بھیجنے کا ایک اور موقع ہاتھ آیا جو یورپ میں عثمانیوں کے قدم جمنے کا سبب ثابت ہوا، کنٹا کوزین تاج و تخت میں جان پلیولوگس اور ملکہ اینا کی شرکت کو زیادہ دنوں تک گوارا نہ کر سکا اور ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) میں اس نے حکومت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینے چاہے، جان نے اس کی شدید مخالفت کی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی، کنٹا کوزین نے حسب دستور سابق اور خان سے پھر مدد کی درخواست کی اور اس کے معاوضہ میں یورپین ساحل کا ایک قلعہ پیش کیا، اور خان نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کی سرکردگی میں بیس ہزار سپاہی روانہ کیے، ان کی مدد سے کنٹا کوزین نے جان پلیولوگس کو شکست دے کر قسطنطنیہ کے تخت پر قبضہ کر لیا، سلیمان پاشا نے حسب معاہدہ قلعہ زنپ (Tzympe) پر قبضہ کر کے اس میں عثمانی دستے متعین کر دیے، اس کے چند ہی دنوں بعد تھریس میں زلزلہ آیا جس سے بہتیرے شہروں کی شہر پناہیں منہدم ہو گئیں، ان ہی میں گیلی پولی بھی تھا، دو درِ دانیال کے

مغربی ساحل پر سب سے زیادہ اہم قلعہ تھا اور زنپ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھا، سلیمان پاشا نے اسے تائید غیبی خیال کیا اور گیلی پولی پر فوراً قبضہ کرلیا، قلعہ کے یونانی دستوں نے یہ سمجھا کہ خدا کی مرضی یوں ہی تھی، نیز وہ ترکوں کے دفعۃً پہنچ جانے سے اس قدر سراسیمہ ہوئے کہ کوئی مزاحمت نہ کرسکے، اس درمیان میں کنٹا کوزین نے سلیمان پاشا سے دس ہزار دوکات کے عوض زنپ سے قبضہ اٹھا لینے کی خواہش کی اور سلیمان پاشا نے اسے منظور بھی کرلیا، مگر اس معاملہ کی تکمیل سے قبل ہی گیلی پولی کا واقعہ پیش آگیا، جس کے بعد سلیمان پاشا نے زنپ کی واپسی سے بھی انکار کردیا اور گیلی پولی کی شہر پناہ کو درست کرکے اس میں ترکی فوج کا ایک مضبوط دستہ متعین کردیا، اس کے بعد اس نے تھریس کے چند اور مقامات بھی فتح کرلیے اور بہت سے ترکوں اور عربوں کو لاکر ان مقبوضات میں آباد کردیا۔

گیلی پولی کی فتح سے ترکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء) میں انہوں نے پہلی بار فاتح کی حیثیت سے یورپ میں قدم رکھا اور مسیحی یورپ میں ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے ویانا کی دیواروں تک پھیل گئی، قرونِ اولیٰ کے مجاہدوں نے دینِ حق کے پیغام سے مغربی یورپ کو بہرہ اندوز کیا تھا اور اپنے علوم کی روشنی ان کے ظلمت کدہ میں پہنچائی تھی لیکن مشرقی یورپ پر ہنوز تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی سرزمین ایک مشعلِ ہدایت کی منتظر تھی، یہ سعادت عثمانیوں کے ہاتھوں کے لیے مقدر ہوچکی تھی، عرب مجاہدوں نے جس فرض کی تکمیل یورپ کے مغربی حصہ میں کی تھی، ترک مجاہدوں نے اسے مشرق میں پورا کیا۔

جان پلیولوگس ان واقعات سے کنٹا کوزین کے خلاف قسطنطنیہ میں سخت برہمی پھیلی جس نے بغاوت اور انقلاب کی شکل اختیار کرلی، ہر شخص اس پر غداریِ وطن کا الزام عائد کرتا تھا اور اسی کو ترکوں کے یورپ میں لانے کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا، آخر رائے عامہ سے مجبور ہو کر اسے تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا، اس نے اپنی زندگی کے بقیہ تیس سال ایک

خانقاہ میں گزار دیے اور اس مدت میں اپنے عہد کی ایک تاریخ لکھ ڈالی، اس کی ملکہ راہبہ بن گئی، قسطنطنیہ کے لوگوں نے جان پلیولوگس کو بلا کر تخت پر بٹھایا، اس نے پچاس سال تک حکومت کی لیکن اس طویل مدت میں سلطنت بازنطینی کی حالت روز بہ روز زیادہ خراب ہوتی گئی اور ترکوں کا تسلط بڑھتا ہی گیا، انہوں نے قلعہ شورلو اور ڈیموٹیکا کو فتح کرنے کے بعد پھر خالی کر دیا لیکن جنوبی تھریس پر ان کا مستقل قبضہ ہو گیا اور شہنشاہ جان کو مجبوراً اورخان سے صلح کر کے اس قبضہ کو تسلیم کرنا پڑا، اس کے بعد سلطنت بازنطینی گویا دولت عثمانیہ کی ایک باج گزار حکومت بن گئی۔

سلیمان شاہ اور اورخان کی وفات ۷۵۹ھ (۱۳۵۸ء) میں سلیمان پاشا شکار کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور اس کے صدمہ سے جاں بر نہ ہو سکا، یہ شہزادہ فن سپہ گری وسپہ سالاری میں ممتاز اور خاندانِ عثمانی کے تمام اعلیٰ اوصاف کا حامل تھا، اورخان کو اس کی وفات کا سخت صدمہ ہوا اور دوسرے ہی سال اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

اورخان نے اپنے تینتیس سال کے دور حکومت میں عثمانی مقبوضات کو بہت زیادہ وسعت دی، اس نے نہ صرف ایشیائے کوچک کے بقیہ بازنطینی علاقوں پر قبضہ کر لیا اور بعض ترکی ریاستیں مملکت عثمانیہ میں کر لیں، بلکہ یورپ میں داخل ہو کر تھریس کا ایک حصہ بھی فتح کر لیا، جو اس براعظم میں عثمانی فتوحات کا ایک شاندار مقدمہ تھا، جن فوجی اور ملکی آئین پر سلطنت عثمانیہ کی عظمت قائم ہوئی ان کا بنیادی پتھر اسی نے اپنے ہاتھوں سے رکھا، عثمان کی حیثیت ایک امیر سے زیادہ نہ تھی لیکن اورخان کے کارناموں نے اسے بادشاہی کا حق دار ثابت کر دیا۔

تاہم اس پادشاہی میں بھی درویشی کی شان بدستور قائم رہی اور اس وصف میں وہ عثمان ہی کا مثیل تھا، مسٹر گبنس لکھتے ہیں کہ نائیسیا میں وہ غریبوں کو روٹی اور شوربہ اپنے ہاتھوں سے تقسیم کرتا تھا، علوم وفنون کی سرپرستی آلِ عثمان کی ایک خاص خصوصیت تھی، اورخان کا یہ

امتیاز بھی بہت نمایاں تھا، بڑے بڑے مشہور علما اور مشائخ اس کی صحبت میں رہا کرتے تھے، ان ہی میں سے بعض کو وہ اپنے قائم کردہ مدرسوں میں مدرس مقرر کرتا مثلاً ملا داوٗد قیصری اور تاج الدین کرد، جو کیے بعد دیگرے نائیسیا کے مدرسہ میں مدرس اول مقرر ہوئے، بروصہ کے علم و فضل کی شہرت اس وقت بھی قائم رہی، جب یہ دولت عثمانیہ کا پایہ تخت نہ رہ گیا اور مدتوں یہ شہر اہل فضل و کمال کا مرکز بنا رہا، یہیں عثمانیوں کے اولین شعراء نے اپنے کلام سنائے اور یہیں ان کے بڑے بڑے شیوخ وابدال کے مزارات پر آج بھی عقیدت کی پھول چڑھائے جاتے ہیں۔

مراد اوّل

۷۶۰ھ تا ۷۹۱ھ مطابق ۱۳۵۹ء تا ۱۳۸۹ء

اورخان کی وفات پر اس کا چھوٹا لڑکا مراد چالیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس میں ملک گیری اور حکم رانی کی وہ تمام خصوصیات بدرجۂ غایت موجود تھیں جو آلِ عثمان کے ابتدائی فرماں رواؤں کا طرۂ امتیاز تھیں، اس کی غیر معمولی فوجی قابلیت نے ایک قلیل مدت میں یورپ کی متعدد مملکتوں کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا اور انتظامِ حکومت کے خداداد ملکہ نے ان مفتوحات کو سلطنت کا ایک مستقل جزء بنادیا۔

اورخان نے اپنے عہد میں سلطنت کو بہت کچھ وسعت دی تھی لیکن اناطولیہ کی بعض ترکی ریاستیں رقبہ میں اب بھی اس سے بڑھی ہوئی تھیں، مراد کی تخت نشینی کے وقت سلطنت عثمانیہ ایشیائے کوچک کے شمالی مغربی حصہ اور یورپ میں زنپ، کیلی پولی اور تھریس کے بعض دیگر مقبوضات پر مشتمل تھیں، جہاں سلیمان پاشا نے ترکوں اور عربوں کی نوآبادیاں قائم کردی تھیں، اس کا مجموعی رقبہ بیس ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھا اور آبادی بھی دس لاکھ سے کم ہی تھی[1]، مراد نے صرف تیس سال کی مدت میں سلطنت کا پانچ گنا بڑھا دیا۔

ایشیائے کوچک میں بغاوت عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد مراد نے سب سے پہلے یورپ کی طرف بڑھنے کا قصد کیا لیکن امیر کرمانیہ نے اس قدیم بغاوت کی بنا پر جو

[1] ایورسلے، ص ۳۱۔

اس کے خاندان اور آلِ عثمان کے درمیان چلی آتی تھی، ایشیائے کوچک میں مراد کے خلاف بغاوت کردی، جسے فرو کرنے کے لیے مراد کو یورپ کا قصد ملتوی کرنا پڑا، اس نے فوراً موقع پر پہنچ کر بغاوت کا استیصال کیا، ادھر سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد وہ یورپ کی طرف متوجہ ہوا اور ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) میں درِ دانیال کو عبور کرکے فتوحات کا وہ حیرت انگیز سلسلہ شروع کیا جو ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں صرف اس کی شہادت پر جنگ کسووا میں ختم ہوا۔

فتوحاتِ تھریس | مراد کی تخت نشینی کے وقت سلطنت بازنطینی کی حالت نہایت ابتر تھی، اس کے تمام ایشیائی مقبوضات پر ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور یورپ میں قسطنطنیہ کے علاوہ صرف شمالی تھریس اور مقدونیا اور موریا کے کچھ حصے باقی رہ گئے تھے، باہمی عداوتوں کے باعث ابتدا میں کوئی عیسائی حکومت ترکوں کے مقابلہ میں اس کی مدد کے لیے آمادہ نہ ہوئی، یہ سلطنت بلاشبہ ایک مسیحی سلطنت تھی اور ترکوں کا حملہ مذہبی نقطۂ نظر سے نہایت خطرناک تھا، لیکن یورپ میں محاربات صلیبی کی قدیم روح تقریباً فنا ہو چکی تھی اور یونانی اور لاطینی کلیساؤں کی شدید مخاصمت نے اتحاد عمل کے لیے بہت کم گنجائش باقی رکھی تھی۔

ان حالات میں مراد نے درِ دانیال کو عبور کرکے ایک زبردست فوج کے ساتھ تھریس میں قدم رکھا اور سب سے پہلے قلعۂ شورلو پر قبضہ کیا، جو قسطنطنیہ سے صرف پانچ میل کے فاصلہ پر واقع تھا، اس کے بعد دوسرا قلعہ کرک کلیسے (Kirk Kilisse) فتح ہوا، پھر ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) میں اس کی بابا کے مقام پر بازنطینیوں کے ساتھ ایک سخت معرکہ پیش آیا جس میں مراد نے انہیں بری طرح شکست دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اورنہ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور تقریباً تمام تھریس مراد کے قبضہ میں آگیا، اس کے بعد عثمانی جنرل لالہ شاہین نے بلغاریا میں داخل ہو کر فلپو پولس کو فتح کر لیا جو کہ کوہِ بلقان کے جنوب میں سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا اور شہنشاہ قسطنطنیہ کو مجبور ہو کر مراد سے صلح کرنی پڑی، اس معاہدہ کیا کہ تھریس کے جو علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں انہیں دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا،

عثمانیوں کے آئندہ حملوں میں سرویا اور بلغاریا کو مدد نہ دے گا اور اناطولیہ کے ترکی امراء کے مقابلہ میں مراد کی اعانت کرے گا، اس کے بعد مراد بروصہ کو واپس گیا۔

جنگ مارٹیز یورپ میں مراد کا مقابلہ اس وقت تک صرف بازنطینیوں سے تھا اور دوسری مسیحی حکومتوں نے ترکوں کی مدافعت میں سلطنت بازنطینی کو مطلق مدد نہیں دی تھی، یہاں تک کہ یورپ میں بھی جس نے اس سے پیش تر محاربات صلیبی کی تحریک میں اس قدر نمایاں حصہ لیا تھا، مراد کی ان فتوحات پر کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا بلکہ یونانی کلیساؤں کے پیروؤں کی تباہی کو اطمینان کی نظر سے دیکھتا رہا، مگر اب فلپو پولس کی فتح نے معاملہ کی صورت بالکل بدل دی، یہ شہر اگرچہ سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا، تاہم بلغاریا میں واقع تھا، اس کی فتح نے عثمانی فوجوں کے لیے بلغاریا کا راستہ کھول دیا، ترکوں کا یہ اقدام بالآخر کلیسائے رومہ کے زیر سایہ حکومتوں کے لیے بھی تردد کا باعث ہوا اور پوپ اربن پنجم (Pope Urban V) نے ہنگری، سرویا، بوسنیا اور ولاچیا کے فرماں رواؤں کو آمادہ کیا کہ ترکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کے لیے اپنی فوجیں روانہ کریں، چنانچہ اتحادیوں نے ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) میں بیس ہزار فوج تھریس روانہ کی اور یہ اعلان کیا کہ وہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر چھوڑیں گے، مراد اس وقت اناطولیہ میں تھا، یہ خبر سن کر وہ فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا، مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی لالہ شاہین نے ایک مختصر فوج کے ساتھ، جو تعداد میں مسیحی لشکر کی نصف تھی، ان کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اور روز رات کو جب کہ اتحادی فوجیں اورنہ سے قریب دریائے مارٹیزا کے ساحل پر اپنے خیموں کے اندر شراب و کباب کی سرمستیوں میں مبتلا تھیں، دفعۃً حملہ آور ہو کر تقریباً سب کو تہ تیغ کر دیا، جو لوگ لالہ شاہین کی تلوار سے بچ گئے انہوں نے دریا کو عبور کرنے کی کوشش میں ڈوب کر جان دی، یوں گویا پوری عیسائی فوج ہلاک ہوگئی، شاہ ہنگری جو موقع پر موجود تھا، بہ مشکل جان بچا کر بھاگ سکا۔

یہ پہلا معرکہ تھا جو عثمانیوں کو یورپ کی سلافی قوموں کے ساتھ پیش آیا، اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوہِ بلقان کے جنوب کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا گیا، اس سے عیسائیوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا اور مراد نے یہ فیصلہ کرلیا کہ آئندہ اپنی سلطنت کو بجائے ایشیا کے یورپ میں وسعت دینے کی کوشش کرے گا، اسی غرض سے اس نے اب ڈیموٹیکا کو جو تھریس میں واقع تھا، پایہ تخت بنایا اور پھر تین سال کے بعد اورنہ کو دارالسلطنت قرار دیا، اس کی یہ حیثیت فتح قسطنطنیہ تک قائم رہی، اورنہ سے مراد نے بلقانی ریاستوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، جنگ مارٹیزا کے بعد مراد اور شہنشاہ قسطنطنیہ کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا جس کی رو سے شہنشاہ نے سلطان کا باج گزار ہونا منظور کیا اور آئندہ جنگوں میں عثمانی فوج کی حمایت میں اپنی فوج کا ایک دستہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔

شہنشاہ کی ناکامی کچھ دنوں تک تو شہنشاہ قسطنطنیہ خاموشی کے ساتھ خراج ادا کرتا رہا لیکن پھر اسے اپنی محکومی ناقابل برداشت محسوس ہونے لگی، چنانچہ اے۷ھ (۱۳۶۹ء) میں اس نے رومہ کا سفر کیا اور پوپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یورپ کی مسیحی حکومتوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارنے کی درخواست پیش کی، اس نے پوپ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی ذلت گوارا کی، یونانی کلیسا کے ان تمام عقائد سے بتری ظاہر کی جو کلیسائے رومہ سے مختلف تھی اور مذہبی معاملات میں کلیسائے رومہ کی برتری بھی تسلیم کرلی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کا مقصد حاصل نہ ہوا اور مسیحی حکومتیں ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوئیں، شہنشاہ ناکام و نامراد قسطنطنیہ کو واپس ہوا اور واپسی میں جب وہ وینس سے گزر رہا تھا تو وہاں کے بعض ساہوکاروں نے جن سے رومہ کے سفر کے لیے اس نے روپیہ قرض لیا تھا، اسے گرفتار کرلیا، اس کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ قرض ادا کر سکے، اس کا بڑا لڑکا اینڈرونیکس جسے وہ قسطنطنیہ میں اپنا جانشین بنا گیا تھا، حکومت کی لذت سے آشنا ہو کر باپ کی رہائی کا خواہش مند نہ تھا، اس لیے اس نے بھی قرض ادا کرنے کی

کوشش نہ کی لیکن چھوٹے لڑکے مینوئل نے اپنی املاک فروخت کر کے قرض کی رقم فراہم کی اور شہنشاہ کو آزاد کرایا، قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد شہنشاہ نے اینڈرونیکس کو حکومت کے تمام منصبوں سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ مینوئل کو مقرر کر کے اسے اپنے ساتھ تاج وتخت کا شریک بھی قرار دیا۔

صادوجی کی بغاوت

اینڈرونیکس کا لڑکا جس کا نام بھی اینڈرونیکس تھا، اپنے باپ کی اس حق تلفی پر سخت برافروختہ ہوا اور اس نے مراد کے سب سے چھوٹے لڑکے شہزادہ صادوجی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ دونوں مل کر شہنشاہ اور مراد کو تخت سے اتار دیں اور ان کی جگہ خود فرماں روا بن جائیں، مراد اس وقت ایشیائے کوچک میں تھا اور صادوجی اس وقت یورپ میں ترکی سپاہ کا افسر اعلیٰ تھا، اس نے مراد کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر فوراً بغاوت کا اعلان کر دیا، ادھر اینڈرونیکس نے بھی نوعمر بازنطینی امراء کی ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر شہنشاہ کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کی، ان شہزادوں کی متحدہ بغاوت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی، مراد اس خبر کو سنتے ہی یورپ پہنچا، شہنشاہ اینڈرونیکس کے جرم سے اپنی برائت پیش کی اور اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے پوری آمادگی ظاہر کی، اس نے مراد کی یہ تجویز بھی منظور کر لی کہ گرفتاری کے بعد دونوں شہزادے اپنی بینائی سے محروم کر دیے جائیں، صادوجی کی فوج نے اپنے سلطان کی زبان سے معافی کا وعدہ سن کر باغی شہزادہ کا ساتھ چھوڑ دیا، صادوجی، اینڈرونیکس اور نوجوان بازنطینی امراء گرفتار کر کے مراد کے سامنے لائے گئے، مراد نے پہلے صادوجی کی آنکھوں میں گرم سیسہ پلا کر اسے اندھا کر دیا اور پھر اسے قتل بھی کرا دیا، بازنطینی امراء دریائے مارٹیزا میں غرق کر دیے گئے، اینڈرونیکس شہنشاہ کے پاس بھیج دیا گیا، اس نے حسب وعدہ ان کی آنکھوں میں بھی سیسہ ڈلوا دیا لیکن اس طرح کی خفیف سی بینائی باقی رہ گئی۔

ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو ایک جدید معاہدہ کرنا پڑا، جس کی رو

سے اس نے دولت عثمانیہ کی باج گزاری از سرنو تسلیم کی، عثمانی لشکر میں فوجی خدمت انجام دینے کا وعدہ کیا اور ضمانت کے طور پر اپنے لڑکے مینوئل کو مراد کی خدمت میں بھیج دیا۔

فتوحات بلغاریا، مقدونیا و سرویا اگرچہ بلغاریا نے جنگ مارٹیزا میں شرکت نہیں کی تھی تاہم تھریس کی فتح اور عیسائیوں کی شکست نے اس کو بھی نہایت اہم خطرات میں مبتلا کر دیا، خصوصاً اورنہ اور فلپو پولس پر قبضہ ہو جانے کے بعد بلغاریا اور مقدونیا کی راہ ترکوں کے لیے کھل گئی، ریاستہائے بلقان کے باہمی بغض و عناد نے ان کی قوتوں کو کم زور کر دیا تھا، اس لیے مراد کو شروع میں ان کی متحدہ طاقت سے مقابلہ پیش نہیں آیا، ۷۶۸ھ (۱۳۶۶ء) اور ۷۷۱ھ (۱۳۶۹ء) کے درمیان وہ بلغاریا میں بڑھتا چلا گیا اور کوہِ روڈوپ تک وادی مارٹیزا پر قابض ہو گیا، سرویا اب تک بلغاریا کا شریک نہ تھا لیکن مراد کی ان فتوحات کے بعد اس نے بلغاریا سے مل کر ترکوں کا سدباب کرنا چاہا، ۷۷۳ھ (۱۳۷۱ء) میں لالہ شاہین نے صوفیا کے قریب ساکوف کے میدان میں بلغاری اور سروی افواج کا مقابلہ کیا اور ان کو سخت شکست دی، اس جنگ کے بعد کوہِ بلقان تک بلغاریا کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، دوسرے سال لالہ شاہین اور عثمانی فوج کے دوسرے مشہور جنرل افرینوس نے مقدونیا پر حملہ کیا جو اسٹیفن ڈوشن کے زمانہ سے سرویا کا ایک صوبہ تھا اور کوالا ڈروما اور سریز کے شہروں کو فتح کرتے ہوئے دریائے دروار کو عبور کر کے قدیم سرویا، البانیا اور بوسینا میں داخل ہوئے، لازار شاہ سرویا نے شکست کے بعد مراد کی اطاعت قبول کر لی، بلغاریا کے بادشاہ سیسمان نے بھی اپنی لڑکی حرمِ سلطانی میں پیش کر کے صلح کی درخواست کی، چنانچہ بلغاریا کا وہ حصہ جو کوہِ بلقان کے شمال میں واقع تھا اور اس وقت تک سلطنت عثمانیہ میں شامل نہیں کیا گیا تھا، اس کی حکومت میں رہنے دیا، اس کے بعد ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) تک مراد اپنے ایشیائی مقبوضات کی توسیع و استحکام میں مصروف رہا، ۷۸۳ھ میں اس نے پھر سرویا کا رخ کیا اور عثمانی فوج نے دریائے دروار کو عبور کر کے موناستر پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد ۷۸۷ھ

(۱۳۸۵ء) میں صوفیا فتح ہوا، ییسمان کو اپنی ملکہ اور خاندان کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر مراد سے رحم کی درخواست کرنی پڑی[1]، مراد نے سالانہ خراج قبول کر کے اسے بلغاریا کے تخت پر قابض رہنے کی اجازت دے دی، ۷۸۷ھ (۱۳۸۶ء) میں پچیس روز کے شدید محاصرہ اور سخت جنگ کے بعد نیش پر بھی جو سرویا کے قلب میں ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا، نیز قسطنطین اعظم کے مولد ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا تھا، مراد کا قبضہ ہو گیا، سرویا کو اب مقاومت کا یارانہ رہا، اس نے ہزار پونڈ نقرئی سالانہ خراج اور عثمانی لشکر کے لیے ہزار سوار دینے کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔

امن و اصلاحات کا زمانہ ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) سے ۷۸۳ھ (۱۳۸۱ء) تک کا زمانہ مراد کے دورِ حکومت میں امن کا زمانہ تھا، اس مدت میں اس نے کوئی جنگ نہیں چھیڑی اور اپنی توجہ زیادہ تر سلطنت کے انتظام و استحکام کی جانب مبذول رکھی، اس نے فوجی نظام میں اصلاحات جاری کیں اور جاگیری نظام کو مکمل کیا، مفتوحہ علاقوں میں جاگیریں قائم کر کے سپاہیوں کو دیں اور ہر جاگیر دار کو جنگ کے موقعوں پر ایک یا ایک سے زیادہ مسلح سوار فراہم کرنے کا ذمہ دار بنایا، یہ فوجی جاگیریں چھوٹی اور بڑی دو قسموں کی تھیں، چھوٹی کو تیمار اور بڑی کو زعامت کہتے تھے[2]، اس نے شاہی زمینیں الگ کیں اور مسجدوں نیز دوسرے مذہبی اداروں کے لیے بہت سی زمینیں وقف کر دیں، مراد نے عیسائی رعایا کی ایک جماعت بھی ادنیٰ فوجی خدمات کے لیے مرتب کی، اصطبل وغیرہ کی صفائی، خیموں کو نصب کرنا اور اکھاڑنا، سامان کی گاڑیوں کی دیکھ بھال اور اسی قسم کے دوسرے کام ان لوگوں کے فرائض میں داخل تھے، مراد ہی کے عہد میں سپاہیوں کے علم کے لیے سرخ رنگ تجویز ہوا، جو عثمانی فوجوں کا قومی رنگ ہو گیا[3]۔

---

[1] بلقان از ولیم ملر سلسلہ ''اسٹوری آف دی نیشنس''، ص ۱۸۸ [2] ان کے متعلق تفصیلات آئندہ آئیں گی۔

[3] کریسی، جلد ا، ص ۳۸۔

اناطولیہ میں سلطنت کی توسیع لیکن امن کے زمانہ میں مراد توسیع سلطنت کی تدبیروں سے غافل نہ تھا، ۷۷۸ھ (۱۳۷۶ء) میں اس نے شہزادہ بایزید کا نکاح امیر کرمیان کی لڑکی سے کر دیا، عروس کو ریاست کرمیان کا بڑا حصہ اور قلعہ کوتاہیہ جو اپنے مقام کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا، جہیز میں ملا اور یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، شادی کی تقریب بروصہ میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی، اناطولیہ کی تمام ترکی ریاستوں کے نمائندے اور سلطان مصر کے سفیر شریک ہوئے، یہ لوگ اپنے ساتھ عرب کے صبا رفتار گھوڑے، یونان کی حسین کنیزیں اور اسکندریہ کے حیرت انگیز ریشمی کپڑے نذر کے طور پر لائے تھے، من جملہ اور تحائف کے سونے اور چاندی کے ظروف بھی تھے، جن میں طلائی اور نقرئی سکے بھرے ہوئے تھے، نیز پیالے اور طشت تھے جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے، یہ تمام چیزیں مراد نے اپنے مہمانوں میں تقسیم کر دیں لیکن جب عروس نے کرمیان کے قلعوں کی کنجیاں پیش کیں تو انہیں اپنے ہی پاس رکھا[1]، ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں مراد نے ریاست حمید کے امیر کو آمادہ کیا کہ اپنی ریاست کا ایک بڑا حصہ اس کے ہاتھ فروخت کر ڈالے، جس میں آق شہر کا ضلع بھی شامل تھا، ریاست حمید کا یہ علاقہ شامل کر لینے سے سلطنت عثمانیہ کی سرحد ریاست کرمانیہ سے بالکل متصل ہو گئی، کرمانیہ اور آلِ عثمان کی آویزش ابتدا سے چلی آتی تھی، اسے دور کرنے کے خیال سے مراد نے اپنی لڑکی نفیسہ کا عقد علاء الدین امیر کرمانیہ سے کر دیا، چنانچہ تقریباً دس سال یہ صلح قائم رہی لیکن ان میں سے ہر فریق اناطولیہ کے ترکوں کی سرداری کا دعوے دار تھا اور باوجود اس کے کہ ایشیائے کوچک کی متعدد ترکی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں، امیر کرمانیہ کی خودسری اور شورش انگیزی مراد کو اس کے ایشیائی مقبوضات کی طرف سے مطمئن نہیں ہونے دیتی تھی، چنانچہ ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور قونیہ میں علاء الدین کو بری طرح شکست ہوئی، مراد اگر

---

[1] ترکی از لین پول، سلسلہ ''اسٹوری آف دی نیشنس''، ص ۴۱۔

چاہتا تو علاء الدین کو قتل کر کے اس کی ریاست پر قابض ہو جاتا لیکن نفیسہ کی التجاؤں سے متاثر ہو کر اس نے علاء الدین کا قصور معاف کر دیا اور اس کی ریاست اسے پھر بخش دی، علاء الدین نے مراد کو اپنا آقا تسلیم کیا، اسی جنگ میں شہزادہ بایزید نے اپنے حملوں کی حیرت انگیز سرعت اور شدت کی بنا پر یلدروم (بجلی) کا لقب حاصل کیا تھا، اس کے بعد مراد بروصہ کو واپس گیا اور اب اس کی خواہش تھی کہ بقیہ عمر آرام اور یادِ الٰہی میں گزار دے، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے ریاست تکہ پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا اور جس فوجی افسر نے یہ تجویز پیش کی تھی اسے یہ جواب دیا کہ ''امیر تکہ بہت غریب اور کم زور ہے، مجھے اس سے جنگ کرنے میں شرم آنی چاہیے، شیر مکھیوں کا شکار نہیں کرتا'' لیکن بہت جلد اس بوڑھے شیر کو دوسرے شیروں کے مقابلہ کے لیے اپنی آرام گاہ سے نکلنا پڑا۔

مسیحی حکومتوں کا اتحاد یورپ میں اس وقت ۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء) تک تقریباً تمام قدیم تھریس اور جدید رومیلیا سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا، اس کے علاوہ بعض دوسری اہم فتوحات بھی حاصل ہو چکی تھیں، ان علاقوں میں ترک اور عرب نو آبادیاں قائم کر دی گئی تھیں اور وہاں کے اکثر باشندے دوسرے مقامات کو منتقل کر دیے گئے تھے، ان نو آبادیوں نے عیسائیوں میں ایک عام بے چینی پیدا کر دی، ینی چری کے لیے ہر سال ایک ہزار عیسائی لڑکوں کے مطالبہ سے اس بے چینی میں برہمی بھی شامل ہو گئی، ترکوں کے خلاف غصہ کا جذبہ پورے جوش کے ساتھ موجود تھا، اسے مشتعل کرنے کے لیے جس چنگاری کی ضرورت تھی وہ بھی جنگ قونیہ کے بعد ہاتھ آ گئی، اس جنگ میں عثمانی فوج کے ساتھ سرویا کے دو ہزار سپاہی بھی شریک تھے، جو سابق معاہدہ کی رو سے طلب کیے گئے تھے، کوچ سے پہلے ہی مراد نے فوج میں اعلان کرا دیا تھا کہ کرمانیہ کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد بھی ریاست کے عام باشندوں کی جان و مال کو ہرگز کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے اور جو شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا وہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا لیکن سروی سپاہیوں نے جو یورپ کے دستور کے

مطابق دشمن کے ملک میں پہنچ کر ہر قسم کی غارت گری کو بالکل جائز خیال کرتے تھے، اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا اور راستہ میں نہایت وحشیانہ طریقہ پر لوٹ مار شروع کر دی، مراد نے ان میں سے بہتوں کو سخت سزائیں دیں اور بعضوں کو قتل بھی کرا دیا، اس کا یہ فعل فوجی قانون کی رو سے بالکل جائز تھا لیکن اہل سرویا کے لیے یہ سخت اشتعال کا باعث ہوا اور شاہ سرویا نے جس کی سلطنت اسٹیفن ڈوشن کے عہد میں بلغراد سے دریائے یارنڑا تک اور بحر اسود سے بحر ایڈریاٹک تک پھیلی ہوئی تھی، عیسائی حکومتوں کا ایک عظیم الشان اتحاد قائم کر کے ترکوں کے استیصال کا بیڑا اٹھایا، اس اتحاد میں سرویا، بوسنیا اور بلغاریا کی حکومتیں آگے ہوئیں، البانیا، ولاچیا اور ہنگری نے پوری قوت کے ساتھ شرکت کی، پولینڈ نے بھی اپنی فوج بھیجی، سلافی قوموں کا اتنا زبردست اتحاد اس سے پہلے کبھی قائم نہیں ہوا تھا، سرویا نے مغربی یورپ کی حکومتوں کو بھی شرکت کی دعوت دی لیکن وہ مختلف وجوہ سے ادھر متوجہ نہ ہو سکیں، محاربات صلیبی کا قدیم جوش فرو ہو چکا تھا اور ہنوز ارض مقدس کو ترکوں سے آزاد کرانے کا سوال پیدا نہ ہوا تھا، علاوہ بریں چودہویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ کی مغربی سلطنتوں کی اندرونی حالت اور ان کے حکم رانوں کی ذاتی کمزوریاں اس اتحاد کی شرکت سے مانع تھیں لیکن اس وقت تمام یورپ کے متحد نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب لاطینی کلیسا کا وہ شدید افتراق تھا جس نے کل مغربی سلطنتوں کو دو متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک جماعت پاپائے رومہ کے زیر فرمان تھی اور دوسری اس کے حریف پوپ کی حلقہ بگوش تھی، جس نے اونیاں (واقع فرانس) کو اپنے جدید کلیسا کا مرکز قرار دیا تھا۔

جنگ کسووا بہر حال سرویا نے مشرقی حکومتوں کے اتحاد سے جو قوت فراہم کر لی تھی، وہ بہ ظاہر ترکوں کو یورپ سے نکال دینے کے لیے کافی تھی، مراد نے اس اجتماع کی خبر بروصہ میں سنی اور گو اس کی عمر ستّر سال کی ہو چکی تھی، تاہم عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے فوراً روانہ ہو گیا، اتحادیوں نے مراد کے پہنچنے سے پہلے ہی بوسنیا میں ایک عثمانی فوج پر حملہ کیا اور من جملہ بیس

ہزار ترک سپاہیوں کے پندرہ ہزار کو تہ تیغ کر ڈالا، اس کے بعد فوراً ہی علی پاشا مراد کے حکم کے مطابق درہ دربند کی راہ سے کوہِ بلقان کو عبور کر کے بلغاریا میں داخل ہوا اور شوملہ اور ترانو پر قبضہ کر کے دریائے ڈینوب کی طرف بڑھا، سلیمان شاہ نے بلغاریا سے بھاگ کر نائیکو پولس میں پناہ لی لیکن بہت جلد اسے مراد سے معافی مانگ کر صلح کر لینی پڑی، شرائط صلح یہ تھے کہ سلسٹریا کا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا جائے گا اور بلغاریا سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا، سیسمان کی علاحدگی کے باوجود شاہِ سرویا نے استقلال کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور سلیمان بھی چند ہی دنوں میں معاہدہ کو توڑ کر پھر سرویا سے مل گیا، اس نے سلسٹریا سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا اور ایک فوج سرویا کی مدد کے لیے روانہ کی، مراد نے علی پاشا کو اس کے مقابلہ میں بھیجا، سیسمان پھر نائیکو پولس میں پناہ گزیں ہوا اور یہ اہم قلعہ دوبارہ فتح ہوا، مراد نے اس مرتبہ بھی سیسمان کی جان بخشی کی لیکن اس کی بار بار کی غداری کی سزا میں بلغاریا کا جنوبی حصہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، لازار شاہ سرویا نے اپنے دوسرے حلیفوں کے ساتھ برابر ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا، بالآخر اس نے تمام اتحادی افواج کو جمع کر کے ایک فیصلہ کن معرکہ کا تہیہ کیا اور اپنے لشکر کی کثرت وقوت پر اعتماد کر کے مراد کے پاس آخری جنگ کا پیغام بھیجا، چنانچہ ۱۵ر جون ۱۳۸۹ء (۷۹۱ھ) کو کسووا کے میدان میں وہ آخری مقابلہ پیش آیا جس نے اتحادیوں کا شیرازہ پراگندہ کر کے سرویا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، جنگ اختتام کے قریب تھی کہ میلوش کوبیلووچ (Miloshe Kobilovich) نامی ایک سروی امیر عثمانی لشکر کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور وہاں شاہ لازار کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے اس نے یہ بیان کیا کہ مجھے کچھ نہایت اہم باتیں سلطان سے کہنی ہیں، چنانچہ وہ مراد کی خدمت میں لایا گیا لیکن قدم بوسی کے وقت اٹھ کر دفعتہً اس نے مراد پر خنجر سے حملہ کیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر بھاگ جانے کی کوشش کی، سپاہیوں نے چشم زدن میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، مگر مراد کو زخم کاری پہنچ چکا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر کا مہمان اور ہے، اسی

حالت میں اس نے آخری حملہ کا حکم دیا، جس نے جنگ کا فیصلہ کر دیا، وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات پورے کر رہا تھا کہ لازار گرفتار کر کے اس کے سامنے لایا گیا، اس نے اس کے قتل کا حکم دیا اور کچھ دیر بعد خود بھی جاں بحق تسلیم ہوا، میلوش کے واقعہ کے بعد سے یہ قاعدہ ہو گیا کہ جب کوئی اجنبی شخص سلطان کے حضور میں لایا جاتا تو دو آدمی اس کے بازو پکڑے رہتے تاکہ وہ فریب نہ کر سکے، انیسویں صدی سے اس قاعدہ کی پابندی جاتی رہی، تاہم گذشتہ صدی میں بھی غیر ملکوں کے سفیروں کو سلطان کے بہت قریب جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی[1]۔

جنگ کسووا کے بعد پانچ سو برس تک اہل سرویا نے پھر کبھی متحد ہو کر ترکوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں کی، بہتیرے بھاگ کر جبل اسود (مونٹی نیگرو) میں پناہ گزیں ہوئے اور وہاں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے برابر جنگ کرتے رہے، بہت سے بوسنیا اور ہنگری میں جا کر آباد ہو گئے لیکن بہ حیثیت ایک خود مختار حکومت کے سرویا کا خاتمہ ہو گیا، اگرچہ اس کے بعد بھی ستّر سال تک سرویا کی عنانِ حکومت ملکی فرماں رواؤں کے ہاتھ میں رہی تاہم اس کی حیثیت محض ایک باج گذار مملکت کی تھی۔

مراد کے کارنامے مراد کا عہد حکومت تاریخ آل عثمان کے اہم ترین عہدوں میں ہے، اس نے تیس سال تک حکومت کی، ان میں سے چوبیس سال میدانِ جنگ میں صرف کیے اور ہر جنگ میں کامیاب رہا، مراد سے پہلے ترکوں کا مقابلہ یورپ کی قوموں میں سے صرف بازنطینیوں سے ہوا تھا، جن کی سلطنت اپنے زوال کے آخری منزلیں طے کر رہی تھی لیکن مراد کی ظفریاب فوجیں ان ملکوں میں بھی پھیل گئیں جو یورپ کی نہایت طاقت ور سلافی قوموں کے زیر نگیں تھے اور بلغاریا، سرویا اور بوسنیا پر دولت عثمانیہ کا تسلط قائم ہو گیا، مراد ہی کے عہد میں اول بار آلِ عثمان اور اہل ہنگری کا مقابلہ پیش آیا، جس میں موخر الذکر کو سخت شکست اٹھانی پڑی، مراد کی فتوحات نے سلطنت عثمانیہ کے دائرۂ اقتدار کو دریائے ڈینوب تک پہنچا دیا اور گو

---

[1] ترکی از لین پول، ص ۴۵۔

بعض ریاستوں مثلاً سرویا اور بوسنیا سے محض خراج قبول کرنے پر قناعت کی گئی، تاہم تھریس، مقدونیا اور جنوبی بلغاریا کی ریاستیں مکمل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں۔

مسٹر گبنس لکھتے ہیں:

> ''تیس سال تک مراد نے عثمانیوں کی سیادت ایسے سیاسی تدبر کے ساتھ کی کہ اس عہد کا کوئی مدبر اس پر فوقیت نہ حاصل کر سکا، محض اس لیے کہ مراد کی بہ نسبت محمد فاتح اور سلیمان اعظم سے متعلق ہماری معلومات بہت زیادہ ہیں، مراد کا صحیح مقام کہ وہ خاندان عثمانی کا سب سے زیادہ ممتاز وکامیاب ماہر سیاست اور محارب تھا، کبھی پہچانا نہ جا سکا، جب ہم ان دشواریوں کا جن کا اس نے مقابلہ کیا، ان مسائل کا جنہیں اس نے حل کیا اور اس کے عہد حکومت کے نتائج کا موازنہ اس کے زیادہ پرشکوہ جانشینوں کے کارناموں سے کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اگر وہ ان سے بڑھ کر نہیں تو ان کے برابر ضرور ہے، جو تغیر اس نے اپنی مدتِ حیات کے اندر کر دیا، وہ تاریخ کے نہایت حیرت انگیز واقعات میں سے ہے، اس کی فتوحات کو پانچ صدیوں تک قائم رہنا تھا، ۱۸۷۸ء کے معاہدۂ برلن تک، ان میں سے بعض حال کی جنگ بلقان کے طوفان کے بعد بھی باقی رہ گئی ہیں[1]۔''

مراد نے مسیحی علاقے فتح کر کے ان میں اسلامی حکومت قائم کی لیکن عیسائیوں کو بہ جبر اسلام میں داخل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، برخلاف اس کے اس نے انہیں پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی، جس کی واضح شہادت اس خط میں محفوظ ہے جو ۷۸۷ھ (۱۳۸۵ء) میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو لکھا تھا، بطریق مذکور نے اقرار کیا ہے کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی بخش دی تھی، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) اور ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) کے درمیان بطریق اعظم کے دفتر میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کی بدسلوکی کی درج نہیں ملتی[2]۔

---

[1] ہربرٹ گبنس، ص ۱۷۸ [2] ایضاً۔

بایزید اوّل یلدرم

۷۹۱ھ تا ۸۰۵ھ مطابق ۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء

مراد کی شہادت کے بعد ہی جنگ کسووا کا بھی خاتمہ ہو گیا، شہزادہ بایزید جب اتحادیوں کو پوری طرح شکست دینے کے بعد اپنے لشکر میں واپس آیا تو فوج کے تمام سرداروں نے اس کا خیر مقدم وارثِ تاج وتخت کی حیثیت سے کیا لیکن تخت نشین ہونے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ یعقوب کو جس نے اس جنگ میں شجاعت اور فوجی قابلیت کے اعلیٰ جوہر دکھائے تھے، فوراً قتل کرا دیا، باپ کی لاش ابھی سرد بھی نہیں ہوئی تھی کہ **الفتنة اشد من القتل** کی آڑ پکڑ کر یعقوب کے وجود کو سلطنت کے لیے فتنہ قرار دیا گیا اور صادو جی کی بغاوت نظیر میں پیش کی گئی، تخت سلطنت کی خاطر آلِ عثمان میں یہ پہلا قتل تھا، جس نے آئندہ کے لیے مثال قائم کر دی۔

سرویا سے صلح اتحادیوں کی شکست کے بعد بھی سرویا نے کچھ دنوں تک جنگ جاری رکھی لیکن بالآخر اسے صلح کر لینی پڑی، بایزید نے سرویا کی خود مختاری قائم رکھی اور صرف اس کے باج گزار ہونے پر اکتفا کی، لازار کے جانشین شاہ اسٹیفن نے سالانہ خراج کے علاوہ پانچ ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ سلطان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رکھنے کا معاہدہ کیا، نیز اپنی بہن شہزادی ڈیسپینا کو بایزید کے نکاح میں دے دیا، اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سلطان کی تمام لڑائیوں میں وہ اپنی فوج لے کر خود شریک ہوا کرے گا، چنانچہ آخر وقت تک وہ اس

معاہدہ پر قائم رہا اور نائیکو پولس اور انگورہ کی معرکتہ الآرا جنگوں میں اسٹیفن بایزید کے دوش بہ دوش لڑتا رہا اور سروی افواج کی خدمات حد درجہ وقیع اور موثر ثابت ہوئیں۔

شہنشاہ سے جدید صلح نامہ سرویا سے صلح کرنے کے بعد بایزید قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا اور اینڈرونیکس کو تخت پر بٹھانے کی دھمکی دے کر شہنشاہ پلیولوگس کو ایک جدید صلح نامہ پر مجبور کیا، جس نے بازنطینی سلطنت کی رہی سہی حیثیت بھی خاک میں ملا دی، جان اور اس کے لڑکے مینوئل نے جو تخت سلطنت میں اپنے باپ کا شریک تھا، معاہدہ کیا کہ تیس ہزار طلائی سکے بطور خراج ہر سال ادا کرتے رہیں گے اور بارہ ہزار کا ایک فوجی دستہ بایزید کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رکھیں گے، ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کے مقبوضات میں سے اب صرف ایک قلعہ فلاڈلفیا باقی رہ گیا تھا، اس صلح نامہ میں وہ بھی بایزید کے نام لکھ دیا گیا لیکن اس قلعہ کے یونانی افسر نے شہنشاہ کے حکم کے باوجود قلعہ خالی کرنے سے انکار کر دیا، بایزید نے شہنشاہ کو مجبور کیا کہ وہ خود اپنی فوج کے ذریعہ سے قلعہ خالی کرا دے، چنانچہ دولت بازنطینیہ کے انتہائی زوال کا یہ عبرت ناک واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ یونانی سپاہیوں نے فلاڈلفیا پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے بایزید کے حوالے کر دیا۔

اناطولیہ کی فتوحات ایشیائے کوچک کی اکثر ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکی تھیں، بایزید نے باقی ماندہ پر بھی قبضہ کر لینا چاہا اور سب سے پہلے ایدین کی طرف بڑھا، ایدین کو فتح کرنے کے بعد اس نے امنتشا اور صادرخاں کا رخ کیا، ان ریاستوں کے امیروں نے بھاگ کر امیر قسطمونی کے پاس پناہ لی اور امنتشا اور صادرخاں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں، ایدین، امنتشا اور صادرخاں کی فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عثمانی ترک بحر اٰتجین کے ساحل تک پہنچ گئے، یہیں سے عثمانی بحری طاقت کی ابتدا ہوئی ہے، گو بایزید کے عہد میں اس کو ترقی نہ ہو سکی، ساٹھ جہازوں کا پہلا عثمانی بیڑا ۷۹۲ھ (۱۳۹۰ء) میں روانہ ہو کر جزیرہ کیوس (Chios) پر حملہ آور ہوا،[1]

---

[1] ہربرٹ گبنس، ص ۱۸۶۔

اس کے بعد بایزید نے سمرنا پر حملہ کیا، یہ شہر یروشلم کے مبارزین سینٹ جان کا مقبوضہ تھا، بحری قوت کے ناکافی ہونے کی وجہ سے بایزید کو چھ ہفتوں کے بعد سمرنا کا محاصرہ اٹھالینا پڑا، ریاست تکہ کے ایک حصہ پر مراد کے زمانہ میں قبضہ ہو چکا تھا، بایزید نے بقیہ علاقہ کو بھی اپنی حدودِ سلطنت میں لے لیا، اب صرف دو ریاستیں کرمانیہ اور قسطمونی سلطنت عثمانیہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، بایزید نے کرمانیہ پر بھی حملہ کیا، حالاں کہ کرمانیہ کے امیر علاء الدین سے اس کی بہن بیاہی ہوئی تھی اور پایہ تخت قونیہ کا محاصرہ کرلیا، علاء الدین نے کرمانیہ کا ایک ٹکڑا جس میں آق شہر بھی شامل تھا، بایزید کی نذر کر کے صلح کر لی۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ ان فتوحات کے بعد جن کا اکثر حصہ بغیر کسی جنگ کے ہاتھ آیا تھا، بایزید پھر دردانیال کو عبور کر کے اورنہ چلا گیا، اس درمیان میں جان پلیولوگس نے قسطنطنیہ کے تین گرجے مسمار کرا دیے تھے اور وہ ان کے سامان سے نئے قلعے تعمیر کرنا چاہتا تھا، بایزید نے اس ارادہ سے شہنشاہ کو بہ جبر باز رکھا، چند ہی دنوں کے بعد جان کا انتقال ہو گیا، اس کا لڑکا مینوئل جو کچھ عرصہ سے بایزید کے دربار میں مامور تھا، شہنشاہ کے انتقال کی خبر سن کر چپکے سے بھاگ کر قسطنطنیہ پہنچا اور اپنے باپ کا جانشین ہوا، بایزید کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا، سات مہینہ تک محاصرہ جاری رہا، پھر چوں کہ بایزید کو بلغاریا میں سجمنڈ شاہ ہنگری کے جارحانہ اقدام کو روکنے کے لیے فوجیں درکار تھیں، اس لیے اس نے دس سال کے لیے صلح کر کے محاصرہ اٹھالیا، شرائط صلح بہت سخت تھے، سالانہ خراج کی رقم تیس ہزار طلائی کراون مقرر ہوئی، مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی، جس میں بایزید نے ایک ترکی قاضی مقرر کیا اور کلیسائے مشرق کے اس مرکز میں ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کی گئی، جس کے میناروں سے توحید اسلامی کا اعلان ہونے لگا[1]، مسٹر گبن نے لکھا ہے کہ مینوئل نے شہر کے سات سو مکانات بھی مسلمانوں کو دے دیے اور غلطہ کا نصف

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۳۹۲۔

حصہ بایزید کے حوالہ کر دیا، جس میں اس نے چھ ہزار عثمانی فوج متعین کر دی، شہر کے باہر جو انگور کے باغ اور ترکاریوں کے کھیت تھے، ان کی پیداوار کا عشر بھی صلح نامہ کی رو سے عثمانی خزانہ کو دے دیا گیا، اسی وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا[1]۔

ولاچیا اس کے بعد بایزید نے ولاچیا کا رخ کیا اور اسے دولت عثمانیہ کا باج گزار بنا کر بوسنیا اور ہنگری کی طرف بڑھا، ابتدا میں ترکوں کو بوسنیا اور ہنگری کی متحدہ افواج سے شکست ہوئی اور نائیکو پولس کا مضبوط قلعہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا لیکن سجمنڈ کی یہ کامیابی بالکل عارضی تھی اور چند ہی دنوں کے بعد اسے شکست کھا کر بھاگنا پڑا، نائیکو پولس پر پھر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

بلغاریا کی فتح ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں بایزید نے اپنے سب سے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کو بلغاریا کی طرف روانہ کیا، بلغاریا کا جنوبی حصہ مراد ہی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا، بایزید نے شمالی حصہ پر بھی قبضہ کر لینا چاہا، شاہ سلیمان نے جم کر مقابلہ کیا لیکن تین ہفتہ کے محاصرہ کے بعد پایہ تخت ترنوا فتح ہو گیا اور پورے ملک پر ترکوں کا تسلط ہو گیا، اب شمالی بلغاریا بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا، بلغاریا کا شاہی خاندان ختم ہو گیا، بلغاریا کا اسقف اعظم جلاوطن کر دیا گیا اور بلغاری کلیسا قسطنطنیہ کے یونانی کلیسا کا ماتحت بنا دیا گیا اور اس کی یہ محکومی ٹھیک پانچ سو برس تک قائم رہی، بلغاریا کے جن باشندوں نے اسلام قبول کر لیا، ان کی زمینیں ان ہی کے قبضہ میں چھوڑ دی گئیں، باقی سارا علاقہ فوجی جاگیروں کی شکل میں ترکوں کو دے دیا گیا۔

ویدین اور سلسٹریا نائیکو پولس پہلے ہی فتح ہو چکا تھا، بایزید نے ویدین اور سلسٹریا پر بھی قبضہ کر لیا، یہ تینوں قلعہ ہنگری کی سرحد پر واقع تھے، ان کی فتح کے بعد ترکوں کے ہنگری کے سرحدی علاقہ میں چھوٹے چھوٹے حملے شروع کر دیے، بایزید اب ہنگری پر حملہ کرنے

---

[1] ہربرٹ گینس، ص ۱۹۹۔

کی تیاری کرر ہا تھا کہ دفعۃً اسے ایشیائے کوچک کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔

کرمانیہ کرمانیہ اور آلِ عثمان کی عداوت بدستور چلی آتی تھی، مراد نے اپنی ایک لڑکی کا نکاح علاء الدین سے کر کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اناطولیہ کے ترکوں کی سرداری اور آلِ سلجوق کی قائم مقامی کا حوصلہ امیر کرمانیہ کو چین نہیں لینے دیتا تھا، وہ ہر موقع پر دولتِ عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا، مراد کے عہد میں بھی وہ ایک سے زائد بار اپنی دشمنی کا ثبوت دے چکا تھا اور اب بایزید کے مقابلہ میں بھی اس نے اپنی وہی قدیم روش قائم رکھی، چنانچہ بایزید جب ہنگری کی فتح کی تیاری کرر ہا تھا، علاء الدین نے اناطولیہ کے عثمانی علاقوں پر حملہ کر دیا، انگورہ اور بروصہ کے درمیان سخت معرکہ ہوا، جس میں عثمانی فوج کو بری طرح شکست ہوئی اور تیمور تاش پاشا جو سالارِ عسکر اور ایشیائے کوچک میں بایزید کا نائب سلطنت تھا، علاء الدین کے ہاتھ میں گرفتار ہوا، یہ خبر سن کر بایزید سرعت کے ساتھ اناطولیہ پہنچا اور آق چائی کے مقام پر کرمانی لشکر کو شکست دے کر علاء الدین اور اس کے دو لڑکوں محمد اور علی کو قید کر لیا، علاء الدین اور اس کے دونوں لڑکے تیمور تاش پاشا کی حراست میں رکھے گئے اور اس نے بایزید کی اجازت کے بغیر تینوں کو پھانسی دے دی، بایزید یہ معلوم کر کے بہت برہم اور رنجیدہ ہوا لیکن پھر اس مقولہ کو یاد کر کے خاموش ہو گیا کہ ''ایک امیر کی موت اتنی بری نہیں جتنا ایک صوبہ کا نقصان'' لارڈ ایورسلے نے اس ترکی مقولہ کو قرآن کریم کی ایک آیت قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس آیت کے بموجب بایزید نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کرمانیہ کی پوری ریاست پر قبضہ کر کے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا جائے[1]، اسلام کی دشمنی میں اتنا سفید جھوٹ جو بیسویں صدی کے ایک انگیریز مورخ کے قلم سے نکلا ہے، قرونِ وسطیٰ کے مسیحی مفتریوں کو بھی نہ سوجھا ہوگا، بہر حال کرمانیہ پر بایزید کا قبضہ ہو گیا اور ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کی قائم مقامی کے لیے اب آلِ عثمان کا کوئی حریف باقی نہ رہا۔

---

[1] لارڈ ایورسلے، ص ۴۸۔

بقیہ ترکی ریاستیں اس کے بعد ۹۶-۹۵ ۷ھ (۹۴-۱۳۹۳ء) میں بایزید نے سیواس، سمسون اور اماسیا میں اپنی فوجیں روانہ کیں اور ان علاقوں کو بھی فتح کر لیا، اب صرف ریاست قسطمونی سلطنت عثمانیہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھی، دوسری مفتوحہ ریاستوں کے امراء قسطمونی میں جا کر پناہ لیتے تھے، بایزید نے اسی امر کو بنائے مخالفت قرار دے کر قسطمونی پر بھی حملہ کیا اور اناطولیہ کی اس آخری ترکی ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

سلطان بایزید ان فتوحات کے بعد امیر کا لقب جسے اب تک عثمانی فرماں روا اختیار کرتے آئے تھے، بایزید کو اپنی عظمت و شان کے مقابلہ میں فروتر معلوم ہونے لگا، چنانچہ اس نے مصر کے عباسی خلیفہ کی اجازت سے سلطان کا لقب اختیار کر لیا، خلیفہ کو عملاً اگرچہ کوئی اقتدار حاصل نہ تھا، تاہم اسلامی دنیا میں اس کی مذہبی حکم رانی اب بھی تسلیم کی جاتی تھی اور بایزید جیسے بادشاہ کو بھی جو اپنی سطوت میں یورپ اور ایشیا کے بڑے سے بڑے فرماں رواؤں کا حریف تھا، سلطان کے لقب کو جائز قرار دینے کے لیے خلیفہ ہی کا فرمان حاصل کرنا پڑا۔

اس موقع پر لین پول عام مؤرخوں سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آلِ عثمان میں بایزید پہلا شخص نہیں ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، بلکہ برٹش میوزیم اور دوسرے مقامات پر عثمانیوں کے جو سکے محفوظ ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اورخان اور مراد اول بھی اپنے سکوں پر سلطان کا لقب کندہ کراتے تھے، عثمان کے نام کا کوئی سکہ موجود نہیں، (کیوں کہ اگرچہ سلطان علاء الدین سلجوقی نے اسے اپنا سکہ جاری کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی، تاہم اس نے اس حق کو استعمال نہیں کیا) اور غالباً پہلا عثمانی سکہ اورخان کے عہد میں جاری ہوا، پس بایزید کے لیے سلطان کا لقب صرف اس بنا پر ایک نئی چیز ہو سکتا ہے کہ اس نے اس کے لیے خلیفہ اسلام کی اجازت بھی حاصل کر لی[1]۔

دقیقہ عیش یورپ اور ایشیا، ان عظیم الشان فتوحات کے بعد بایزید نے کچھ دنوں آرام

---

[1] لین پول، ص ۵۰، فٹ نوٹ۔

کرنے کا قصد کیا اور ہمہ تن محل سرا کے عیش و نشاط میں محو ہو گیا، شہزادی ڈیسپیا کی ترغیب سے اس نے شراب بھی شروع کر دی تھی[1]، جسے اس وقت تک کسی عثمانی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، شراب کا سرور عیش کے دیگر لوازم کا بھی متقاضی ہوا اور پھر تو اس سلسلہ کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو باقی رہی ہو لیکن جام و سبو کی یہ تمام سرمستیاں بایزید کے قوائے عمل کو مضمحل نہ کر سکیں اور جب اس نے سنا کہ یورپ نے ایک زبردست صلیبی اتحاد قائم کر کے سلطنت عثمانیہ کے استیصال کا بیڑا اٹھایا ہے، تو عیسائیوں کے مقابلہ کے لیے یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے کوئی خواب شیریں سے آسودہ ہو کر تازہ قوت کے ساتھ بیدار ہوتا ہے۔

صلیبی اتحاد جنگ کسووا کے بعد سرویا کی تسخیر نے ہنگری کی آزادی کو تخت خطرہ میں ڈال دیا تھا، خصوصاً نائیکوپولس، ویدین اور سلسٹریا کے فتح ہو جانے کے بعد ترکوں کے لیے ہنگری کا راستہ کھل گیا تھا، ان کے متواتر حملوں سے عاجز آ کر سجمنڈ شاہ ہنگری نے یورپ کی عیسائی سلطنتوں سے مدد کی درخواست کی، چوں کہ ہنگری کلیسائے رومہ سے وابستہ تھا، اس لیے پوپ نے بھی اس کی سرپرستی کی اور ترکوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی، اب تک ترکوں کے خلاف عیسائیوں کا جو اتحاد قائم ہوا تھا، اس میں مغربی یورپ کی حکومتوں نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا، اس مرتبہ سجمنڈ کی خاص کوشش یہ تھی کہ فرانس بھی اس کی مدد کے لیے اپنی فوجیں روانہ کرے، اتفاق سے اس زمانہ میں فرانس اور انگلستان کے درمیان جنگ موقوف تھی، جس کی وجہ سے فرانس کو اس اتحاد کی شرکت میں تامل نہ ہوا، فرانس اور برگنڈی کے پر جوش نوجوان بھی مشرقی یورپ کے میدانوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھانے کے لیے بے چین تھے، طے یہ پایا کہ ڈیوک آف برگنڈی کا لڑکا کونٹ ڈی نیورس (Count De Neuers) ایک فوج لے کر شاہ ہنگری کی مدد کے لیے روانہ ہو اور وہی فرانسیسی اور دوسرے سوار دستوں کا سالارِ عسکر مقرر کیا جائے، ان بہادروں کے پیش نظر صرف ہنگری

---

[1] نولس (Knolles) بہ حوالہ لین پول، ص ۴۹۔

کی مدد نہ تھی، بلکہ منصوبے یہ تھے کہ ہنگری میں بایزید کی قوت کو توڑنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بڑھیں اور پھر دردانیال کو عبور کر کے شام میں داخل ہوں، ارضِ مقدس پر قبضہ کریں اور یروشلم اور درگاہ شریف کو مسلمانوں کے ہاتھ سے آزاد کرائیں، غرض شہرت اور نام وری کے شوق میں مبارزین جوق در جوق اکٹھا ہونے لگے، شاہی خاندان اور فرانسیسی امراء کے ممتاز اشخاص جو فنِ سپہ گری میں خاص شہرت رکھتے تھے، اس مقدس مہم میں شریک ہوئے، یہ منتخب فوج ۷۹۸ھ (مارچ ۱۳۹۶ء) میں فرانس سے روانہ ہوئی، راستہ میں جرمنی سے گزرتے ہوئے جرمنی کے شاہی خاندان کے بعض افراد مثلاً فریڈریک، کاؤنٹ آف ہونزولرن (Count of Hohenzollern) اور روڈس کے مبارزین سینٹ جان کا افسر اعلیٰ بھی ایک مضبوط دستہ لے کر شامل ہو گیا، ان کے علاوہ سجمنڈ نے بویریا اور اسٹائریا کے سوار دستے بھی فراہم کر لیے تھے، مغربی یورپ کے مسیحی مجاہدوں کی مجموعی تعداد دس بارہ ہزار تھی اور وہ سب کے سب اپنی شجاعت کے نشہ میں اس قدر سرشار تھے کہ ان کا دعویٰ تھا کہ اگر آسمان بھی گرنے لگے تو وہ اپنے نیزوں کی نوک پر اس کو روک لیں گے، سجمنڈ نے اپنی مملکت سے جس قدر فوج ممکن تھی، فراہم کی اور امیر ولاچیا کو بھی اس صلیبی اتحاد میں شریک ہونے پر آمادہ کیا، حالاں کہ تھوڑے ہی دنوں پہلے ولاچیا اور دولتِ عثمانیہ میں صلح ہو چکی تھی اور امیر ولاچیا سالانہ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کر کے اپنی خود مختاری برقرار رکھ سکا تھا، مسیحی فوجوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ تھی[1]۔

ابتدائی فتوحات اتحادی فوجیں بوداواقع ہنگری میں اکٹھا اور وہاں سے کچھ ٹرانسلوینیا اور ولاچیا کی راہ سے اور کچھ سرویا کے راستہ سے عثمانی مقبوضات کی طرف روانہ ہوئیں، چوں کہ سرویا کا بادشاہ بایزید کا حلیف تھا اور کامل وفاداری کے ساتھ اپنے معاہدہ پر قائم تھا، اس لیے ان مسیحی مجاہدوں نے سرویا کے باشندوں کے ساتھ بھی جو تمام تر عیسائی ہی تھے،

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۳۸۸۔

وحشیانہ قتل وغارت گری کا وہی سلوک کیا جو وہ ترکوں کے ساتھ کرتے، سب سے پہلے سجمنڈ نے ویدین پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے ستوڈا اور ارسودا پر قبضہ کرتا ہوا نائیکوپولس کی طرف بڑھا، نائیکوپولس پہنچ کر فوراً اس کا محاصرہ کرلیا، نائیکوپولس کے کمانڈر یوغلان بے نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا اور محاصرہ کی انتہائی شدت کے باوجود حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، اسے یقین تھا کہ بایزید اس کی مدد کو ضرور پہنچے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بایزید جو اس درمیان میں اپنی بہترین فوج کے ساتھ روانہ ہو چکا تھا، برقی سرعت کے ساتھ محاصرہ کے سولھویں دن نائیکوپولس پہنچ گیا۔

مسیحی لشکر میں قمار بازی اور مے خواری کا ایک ہنگامہ برپا تھا، اس نشہ کو ابتدائی فتح کے جرعات نے اور بھی تیز کردیا تھا، عیسائیوں خصوصاً فرانسیسیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ بایزید اس قدر جلد آپہنچے گا، وہ علانیہ کہتے تھے کہ اسے ان کے مقابلہ میں آبنائے باسفورس کے عبور کرنے کی بھی جرأت نہ ہوگی، وہ ترکی فوجوں کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے تھے اور انہیں اپنا حریف مقابل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو اپنی کامیابی کا اس درجہ یقین تھا کہ انہوں نے یہ دریافت کرنے کی بھی مطلق فکر نہ کی کہ ترک آتو نہیں رہے ہیں، ان مجاہدین صلیب کے ساتھ ان کی طوائفیں بھی آئی تھیں[1]، جن کی عشوہ طرازیوں نے فوجی کیمپ کو نشاط محل بنا رکھا تھا۔

معرکۂ نائیکوپولس ۲۳ ؍ذی قعدہ ۷۹۸ھ مطابق ۲۴ ؍ستمبر ۱۳۹۶ء کو کانٹ ڈی نیورس اپنے فرانسیسی ساتھیوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً اسے یہ اطلاع ملی کہ ترکی فوج قریب آگئی، سب کے سب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑائی کے لیے ہتھیار باندھنے لگے، وہ چاہتے تھے کہ بلا تاخیر ترکوں پر حملہ کردیں، سجمنڈ عثمانیوں کے اصولِ جنگ سے واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ سب سے آگے بے قاعدہ اور غیر مرتب دستے ہوتے ہیں جو

---

[1] ایورسلے، ص ۴۹۔

دشمن کے پہلے حملے کا زور توڑنے کے لیے آگے رکھے جاتے ہیں، اصلی اور باقاعدہ فوج ان کے پیچھے ہوتی ہے، اسی بناء پر اس نے فرانسیسی فوج کو مشورہ دیا کہ ان بے قاعدہ سواروں پر حملہ کر کے اپنی قوت کو ضائع نہ کریں، بعض فرانسیسی کمانڈروں نے اس رائے سے اتفاق کیا لیکن دوسروں نے اس بدگمانی کی بنا پر کہ سجمنڈ پہلے خود حملہ کرنا چاہتا ہے، یہ گوارا نہیں کیا کہ فرانسیسی دستے ہنگری کی فوج سے پیچھے رہیں اور اس مشورہ کی مخالفت کی، فرانس کے نوعمر بہادروں نے بھی اس رائے کی پرجوش مخالفت کی اور اسی جوش میں ان ترک قیدیوں کو جوان کے قبضہ میں تھے اور جنہوں نے امن کے وعدے پر ہتھیار ڈالے تھے، قتل کر ڈالا۔

بایزید نے عیسائی لشکر سے تھوڑے فاصلہ پر اپنی خاص فوج کو روک کر پہلے بے قاعدہ فوج دشمن کے مقابلہ میں روانہ کی اور ان کی مدد کے لیے ینی چری اور سواروں کا ایک دستہ آگے بڑھایا، فرانس کے نوعمر نائٹ ترکوں کے اصولِ جنگ سے بالکل ناواقف تھے، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ عثمانیوں کی اصلی فوج بے قاعدہ فوج کے پیچھے ہوتی ہے، سجمنڈ نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر انہوں نے اس کی ایک نہ سنی اور پوری قوت کے ساتھ ترکوں کے مقدمۃ الجیش پر ٹوٹ پڑے، آسانی کے ساتھ اسے شکست دیتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور پھر ینی چری اور سواروں کی صفوں کو چیرتے ہوئے جنہیں بایزید نے پہلے روانہ کر دیا تھا، اسی جوش میں اتنی دور نکل گئے کہ باقی ماندہ اتحادی فوجوں سے ان کا تعلق تقریباً منقطع ہو گیا، دفعۃً انہیں بایزید کی چالیس ہزار بہترین فوج نظر آئی، جسے دیکھتے ہی ان کو اپنی شدید غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے فوراً واپس ہونے کی کوشش کی، مگر واپسی اب ان کے اختیار سے باہر تھی، آگے سلطان کی تازہ دم فوج تھی اور پیچھے سے وہ ترکی دستے جنہیں وہ منتشر کر چکے تھے، دوبارہ جمع ہو کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر کہ اب جان بچانا کسی طرح ممکن نہیں، وہ مایوسانہ طور پر نہایت بے جگری سے لڑے اور ان چھ ہزار بہادروں میں سے تقریباً سب کے سب مارے گئے، جو بچ رہے وہ قید کر لیے گئے، صرف چند ایسے تھے جو بھاگ کر عیسائی لشکر میں پہنچ سکے، اس کے بعد

بایزید بجمنڈ کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا، اسے دیکھتے ہی اتحادی فوجوں کے دونوں بازو فوراً بھاگ کھڑے ہوئے، البتہ قلب لشکر نے جو ہنگری، بویریا اور اسٹائریا کے دستوں پر مشتمل تھا اور جس کی کمان خود بجسمنڈ کے ہاتھ میں تھی، جم کر مقابلہ کیا لیکن یہ جنگ تین گھنٹہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکی، اتحادیوں کو بری طرح شکست ہوئی، ان کے ہزاروں سپاہی کام آئے اور دس ہزار گرفتار کر لیے گئے، بجسمنڈ چند سرداروں کے ساتھ بمشکل جان بچا کر بھاگا، اس جنگ میں اسٹیفن کی سروی فوج سے جو بایزید کی حمایت میں لڑ رہی تھی، عثمانی فوج کو بڑی مدد پہنچی۔

فتح کے بعد بایزید نے میدانِ جنگ کا معائنہ کیا، اس وقت اسے مقتول ترکوں کی تعداد کا اندازہ ہوا، نیز یہ معلوم کر کے کہ ابتدائے جنگ میں جن ترکوں نے مغلوب ہو کر جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیے تھے، انہیں بھی عیسائیوں نے نقض عہد کر کے قتل کر ڈالا، اس کا رنج و غصہ اور بھی زیادہ ہوا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ ان کے خون کا بدلہ عیسائی قیدیوں سے لے کر رہے گا، چنانچہ دوسرے روز صبح کو اس نے تمام عیسائی قیدیوں کو جن کی تعداد دس ہزار تھی، اپنے سامنے کھڑا کر کے ان کے قتل کا حکم دیا، قیدیوں میں کانٹ ڈی نیورس بھی تھا، بایزید نے اسے قتل سے مستثنیٰ کر دیا اور اسے اجازت دی کہ قیدیوں میں سے چوبیس عیسائی شرفاء کو منتخب کر لے اور ان سب کی بھی جان بخشی کر دی، اس کے بعد قتل شروع ہوا جو چار بجے شام تک جاری رہا، جب ہزاروں قتل ہو چکے تو امرائے سلطنت کی درخواست پر بایزید نے جلادوں کو ہاتھ روکنے کا حکم دیا اور جو قیدی بچ رہے تھے ان میں سے ایک خمس سلطان کا حصہ علاحدہ کرنے کے بعد بقیہ ان مسلمان سپاہیوں کو تقسیم کر دیے، جنہوں نے ان کو جنگ میں گرفتار کیا تھا، کانٹ ڈی نیورس اور اس کے چوبیس ساتھی ایک سال تک زیر حراست رہے لیکن بایزید نے ان کی حیثیت کے مطابق انہیں عزت و احترام کے ساتھ رکھا، اور جب ان کا زرِ فدیہ فرانس سے آ گیا تو انہیں وطن جانے کی اجازت دے دی، رخصت کے وقت جب یہ لوگ بایزید کے لطف و عنایت اور حسن سلوک کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس

کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس نے جان کانٹ ڈی نیورس کو مخاطب کر کے یہ تقریر کی:

''جان! مجھے خوب معلوم ہے کہ تو اپنے ملک میں ایک بڑا سردار اور ایک طاقت ور رئیس کا لڑکا ہے، تو نوجوان ہے اور ابھی تیرے لیے امید کے بہت سے سال باقی ہیں، ممکن ہے کہ میدان جنگ میں تیری اس پہلی کوشش کی ناکامی پر لوگ تجھے قابل الزام ٹھہرائیں اور تو اس اتہام کو رفع کرنے اور اپنی شہرت و نیک نامی کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک طاقت ور فوج اکٹھا کر کے میرے مقابلہ میں جنگ کے لیے آئے، اگر میں تجھ سے ڈرتا تو تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے تیرے ایمان اور عزت پر حلف لے لیتا کہ نہ تو اور نہ وہ کبھی میرے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائیں گے لیکن نہیں، میں ایسی حلف کا مطالبہ نہ کروں گا، برخلاف اس کے میں خوش ہوں گا، اگر تو اپنے ملک میں واپس پہنچ کر ایک فوج جمع کرے اور اسے لے کر یہاں آئے، تو مجھے ہمیشہ میدانِ جنگ میں اپنے مقابلہ کے لیے تیار پائے گا، جو بات میں اس وقت کہہ رہا ہوں، اسے تو جس شخص سے بھی چاہے نقل کر دینا کیوں کہ میں ہمیشہ جنگی کارناموں نیز اپنی فتوحات کی توسیع کے لیے تیار اور خواہش مند رہتا ہوں[1]۔''

کانٹ ڈی نیورس اور اس کے ساتھیوں میں سے صرف ایک نائٹ مارشل بوسیلکا (Boucicaul) نے بایزید کی یہ دعوت قبول کی، وہ ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں چند جہاز اور بارہ سو نائٹ اور پیدل فوج لے کر قسطنطنیہ پہنچا اور شہنشاہ کو شہر کی مدافعت میں مدد دی، اس کے علاوہ کسی اور کو بایزید کے مقابلہ میں آنے کی پھر کبھی ہمت نہ ہوئی۔

مزید فتوحات جنگ نائیکوپلس کے بعد عثمانی فوجوں نے ولاچیا، اسٹائریا اور ہنگری پر حملے شروع کیے اور پیٹر وارڈین کے شہر پر قبضہ کرلیا، ایک ترکی دستہ نے سرمیا پر یورش کی اور ساحل ڈینوب کے جو قلعے عیسائیوں نے لے لیے تھے ان کو دوبارہ حاصل کیا، بایزید خود بوداپر چڑھائی کی تیاری کرر ہا تھا لیکن دفعۃً بیمار پڑ گیا اور ہنگری کی یہ مہم ملتوی کر دی گئی۔

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۶۸۔

یونان کی فتح اس کے بعد بایزید اورنہ کو واپس ہوا اور وہاں پہنچ کر مینوئل، شہنشاہ قسطنطنیہ کو مجبور کیا کہ جان کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائے، ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) میں وہ دفعۃً یونان پر حملہ آور ہوا اور آسانی کے ساتھ تھسلی، فوسیس، ڈوریس اور لوکریس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد اس کے دو جنرلوں یعقوب اور افرنیوس نے خاکنائے کورنتھ کو طے کر کے جنوب کا رخ کیا اور تمام موریا کو فتح کر لیا، موریا کے تیس ہزار یونانی باشندے بایزید کے حکم سے ایشیائے کوچک میں منتقل کر دیے گئے اور ان کی جگہ ترکوں کی نوآبادیاں قائم کر دی گئیں، موریا پر تھیوڈور پلیولوگس شہنشاہ قسطنطنیہ کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا، اس نے بایزید کی سیادت قبول کر لی اور دولت عثمانیہ کا باج گزار بن گیا۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ یونان کی فتح کے بعد بایزید پھر اورنہ لوٹ آیا اور اب اس نے قسطنطنیہ پر فوراً قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا، اس سے قبل بھی وہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکا تھا اور شہنشاہ کو اپنا پایہ تخت محفوظ رکھنے کے لیے بہت سخت شرائط پر دس سال کے لیے صلح کر لینی پڑی تھی لیکن اس مدت کے ختم ہونے سے پہلے ہی یونان کی فتح سے فارغ ہو کر بایزید پھر قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے ایک خاص ایلچی کے ذریعہ سے شہنشاہ کے پاس یہ پیام بھیجا کہ وہ تاج و تخت سے دست بردار ہو جائے ورنہ شہر بہ زور شمشیر فتح کر لیا جائے گا اور اس وقت وہاں کے باشندے رحم و کرم کے مستحق نہ سمجھے جائیں گے، اس نے یہ بھی کہلایا کہ قسطنطنیہ کے معاوضہ میں شہنشاہ اپنے لیے کوئی دوسری حکومت پسند کر لے جو اسے دے دی جائے گی، قسطنطنیہ کے باشندے بایزید کی قوت سے واقف ہونے کی وجہ سے چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہو جنگ کی نوبت نہ آنے دیں لیکن جان کو امید تھی کہ عیسائی حکومتیں قسطنطنیہ کی مخالفت میں اس کی مدد سے دریغ نہ کریں گی، اس لیے اس نے ایلچی کو یہ جواب دے کر رخصت کر دیا ''اپنے آقا سے کہہ دو کہ باوجود اس کے کہ ہم ضعیف و ناتواں ہیں، ہم خدا کے سوا کسی دوسری طاقت سے نہیں ڈرتے، وہی کم زور کی حفاظت کرتا ہے اور طاقت ور کا

غرور توڑتا ہے، سلطان کو اختیار ہے، جو چاہے کرے'' اس جواب کے بعد بایزید نے فوراً قسطنطیہ کا محاصرہ کرلیا، اسی محاصرہ کے دوران میں مارشل بوسیلکا شہنشاہ کی مدد کے لیے فرانس سے آیا تھا۔

حالات کا انقلاب لیکن عین اس وقت جب بایزید قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا، اس کے ایشیائی مقبوضات میں نہایت انقلاب انگیز حالات رونما ہو رہے تھے، جن سے مجبور ہو کر اسے محاصرہ اٹھالینا پڑا، اب تک بارہ سال کی مدت حکومت میں جو مسلسل جنگوں پر مشتمل تھی، بایزید کو ہمیشہ کامیابی ہوتی گئی، اس نے ایشیائے کوچک کے بڑے حصہ مقدونیا، شمالی بلغاریا اور تھسلی کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا اور سلطنت بازنطینی سرویا، ولاچیا، بوسنیا اور یونان کے بیش تر حصہ کو دولت عثمانیہ کا باج گزار بنالیا تھا، نائیکوپولس کے میدان میں اس نے یورپ کی متحدہ اور بہترین فوجوں کو نہایت سخت شکست دے کر صلیبی اتحاد کی قوت کو پاش پاش کر ڈالا تھا، اس وقت تک کسی جنگ میں اسے ناکامی نہیں ہوئی تھی لیکن آئندہ دو سالوں میں جو اس کی حکومت کے آخری سال تھے، اسے اتنی زبردست شکست اٹھانی پڑی کہ اس کی تمام فتوحات پر پانی پھر گیا اور کچھ دنوں کے لیے سلطنت عثمانیہ کی عظمت خاک میں مل گئی، خود بایزید کا خاتمہ بھی قید کی حالت اور بے کسی کے عالم میں ہوا، اس تباہی اور بربادی کا سبب وہ آویزش ہوئی جو بایزید اور تیمور کے درمیان پیدا ہوگئی تھی۔

تیمور تیمور کی سلطنت دیوار چین سے لے کر ایشیائے کوچک کی سرحد تک اور بحر ارل سے دریائے گنگا اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی، اس کی زندگی کے ابتدائی سال اپنے ہم سایہ تاتاری امراء سے جنگ کرنے میں گزرے، پینتیس سال کی عمر میں اس نے سب کو زیر کر کے سمرقند کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اس کے بعد فتوحات کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کی وسعت کے سامنے سکندر، سیزر، اٹیلا، چنگیز خاں، شارلیمین اور نپولین کی سلطنتیں حقیر معلوم ہوتی تھیں، اس نے پینتیس سال سے کم مدت میں ستائیس مملکتیں فتح کرلی تھیں اور نو شاہی

خاندانوں کو فنا کر دیا تھا، اس کی یہ حیرت انگیز جہاں گیری صرف ذاتی شجاعت اور اعلیٰ فوجی قابلیت کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اس کے تدبر اور ملکہ حکم رانی کو بھی اس میں بہت کچھ دخل تھا، اس کا مجموعۂ قوانین جسے اس نے فوج، عدالت اور مالیہ کے انتظام کے لیے مرتب کرایا تھا، اس کے تدبر اور صحیح غور و فکر کا ثبوت پیش کرتا ہے، اس کے جاسوس مختلف بھیسوں میں خصوصاً زائرین اور درویشوں کے لباس میں ہر طرف گھومتے رہتے تھے اور ان کی مکمل رپورٹیں احتیاط کے ساتھ دفتر میں درج کی جاتی تھیں، اس طرح تیمور کو اپنے دشمنوں کی قوت اور کمزوری کی صحیح اطلاع بہم پہنچتی رہتی تھی، اسے اپنے سپاہیوں پر اس قدر اقتدار حاصل تھا کہ وہ اس کے حکم پر نہ صرف بڑی سے بڑی سختی برداشت کرنے اور اپنی جانیں نثار کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے بلکہ عین فتح کے موقع پر اگر وہ حکم دیتا تو لوٹ مار سے بھی ہاتھ کھینچ لیتے اور مال غنیمت سے دست بردار ہو جانے میں مطلق پس و پیش نہ کرتے، اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس کا سلوک شریفانہ اور فیاضانہ تھا لیکن جو لوگ اس کی مخالفت کرتے انہیں سخت سزائیں دیتا، جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے:

> ''تیمور نے دہشت انگیزی کو بھی فتح کا ایک خاص ذریعہ بنا رکھا تھا اور جو سزائیں وہ پوری پوری آبادیوں کو دیتا ان سے اکثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی فوری اشتعال کا نتیجہ نہ تھیں، بلکہ پہلے سے سمجھ بوجھ کر طے کر لی گئی تھیں۔''

جنگ نائیکوپولس کے بعد بایزید کے بعض فوجی افسروں نے ایشیائے کوچک کے مشرق میں فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کی سرحد جارجیا تک پہنچ گئی تھی، ادھر تیمور کی حکومت اس سے پہلے ہی جارجیا اور بحر کاسپین کے دوسرے مغربی ممالک میں قائم ہو چکی تھی، دونوں سلطنتوں کے ہم سرحد ہو جانے کی وجہ سے ان کے درمیان جلد یا بہ دیر تصادم کا واقع ہونا ناگزیر تھا، تیمور کی سلطنت کے بعد بایزید ہی کی سلطنت اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت تھی، بایزید اپنی سابق فتوحات

کے نشہ میں اتنا سرشار تھا کہ اس نے تیمور کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا اور ایک ایسے فاتح کو برانگیختہ کردیا جس کے نام کی دہشت سے بڑے بڑے بادشاہوں کے تخت متزلزل ہوجاتے تھے، سرحدی جھگڑوں کے علاوہ آویزش کے اور بھی اسباب تھے، مثلاً ایک دوسرے کے باج گزار رئیسوں کو حملہ کی دھمکی دینا اور ایک دوسرے کے باغیوں کو پناہ دینا، باغیوں سے مراد وہ امراء تھے جن کی ریاستوں پر بایزید نے قبضہ کرلیا تھا اور وہ بھاگ کر تیمور کے پاس پناہ گزیں ہوئے تھے، اسی طرح وہ امراء بھی باغی سمجھے جاتے تھے جن کی ریاستیں تیمور نے فتح کرلی تھیں اور جنہیں بایزید نے اپنے دربار میں پناہ دی تھی، یہ لوگ اپنی ریاستوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے تیمور اور بایزید کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، اسی سلسلہ میں دونوں کے درمیان نہایت تلخ خط و کتابت شروع ہوئی اور بالآخر نوبت جنگ کی آ گئی۔

سیواس ۸۰۳ھ (۱۴۰۰ء) میں تیمور نے آرمینیا کی طرف سے عثمانی سرحد میں داخل ہوکر سیواس کا محاصرہ کرلیا جو چند سال پہلے بایزید کے قبضہ میں آیا تھا، اس شہر کی دیواریں نہایت مضبوط تھیں اور ترکی دستہ نے بایزید کے سب سے بڑے لڑکے ارطغرل کی سرکردگی میں اس کی محافظت بھی ایسی جاں بازی کے ساتھ کی کہ تیمور کی سات آٹھ لاکھ فوج شروع میں کامیاب نہ ہوسکی لیکن آخر میں تیمور نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس کا جواب محصورین کے پاس نہ تھا، اس نے چھ ہزار مزدور لگا کر دیواروں کی بنیادیں کھدوانا شروع کردیں اور اس درمیان میں شہتیروں کی تھونی لگا کر دیواروں کو گرنے سے روکے رکھا، جب کھدائی کا کام پورا ہوگیا اور بنیادوں کے اندر بڑی بڑی سرنگیں تیار ہوگئیں تو شہتیروں میں آگ لگوا دی اور تمام دیواریں دیکھتے دیکھتے ان ہی سرنگوں میں بیٹھ گئیں، حملہ آوروں کے لیے اب کوئی روک نہ تھی اور شہر پر فوراً قبضہ ہوگیا، تیمور نے سیواس کے اس محافظ دستہ سے دل کھول کر انتقام لیا، ان میں سے چار ہزار آرمینیوں کو اس نے زندہ دفن کرادیا اور ارطغرل اور بقیہ ترک سپاہیوں کو قتل کردیا۔

بایزید اس وقت قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، سیواس کے مفتوح ہونے اور ارطغرل کے قتل کی خبر سن کر وہ فوراً وہاں سے روانہ ہوا اور تیمور کے مقابلہ کے لیے ایشیائے کوچک پہنچا لیکن تیمور اس درمیان میں شام اور مصر کی طرف روانہ ہو چکا تھا، دو سال کے بعد وہ پھر لوٹا اور سیواس پہنچنے کے بعد بایزید اور اس کے درمیان خط و کتابت دوبارہ شروع ہوئی جو پہلے سے بھی زیادہ تند اور تیز تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین نے ایک فیصلہ کن جنگ کا عزم کرلیا۔

جنگ انگورہ بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ تیمور کے مقابلہ کے لیے سیواس کی طرف بڑھا لیکن تیمور کی کثیر فوج کے لیے جس کی تعداد سات آٹھ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے، سیواس کا میدان تنگ تھا، اس لیے وہ بایزید کے پہنچنے سے پہلے ہی انگورہ کی طرف روانہ ہوگیا اور وہاں پہنچ کر فوراً انگورہ کا محاصرہ کرلیا، اسے یقین تھا کہ بایزید انگورہ کو بچانے کی ضرور کوشش کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور محاصرہ کی اطلاع پا کر بایزید نے بجائے سیواس جانے کے فی الفور انگورہ کی طرف کوچ کردیا، وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ تیمور شہر کے شمال مغرب کی جانب جو فوجی نقطۂ نظر سے میدان کا بہترین حصہ ہے، اس کا انتظار کررہا ہے، تیمور نے صرف یہی نہیں کیا کہ میدان کے اس حصہ پر قبضہ کرلیا بلکہ اس نے بایزید کے مقابلہ کے لیے اور تمام ضروری اور احتیاطی تدبیریں بھی کرلی تھیں، وہ بایزید کی قوت سے پوری طرح واقف تھا، اس لیے ہر ممکن طریقہ سے اسے کم زور کرنے کے ذرائع اختیار کرچکا تھا، بایزید کی فوج میں ایک بڑی تعداد تاتاریوں کی بھی تھی، تیمور کے خفیہ ایجنٹ بھیس بدل کر عثمانی لشکر میں جاتے تھے اور ان تاتاریوں کو اندر اندر بایزید کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کی عصبیت برانگیختہ ہوگئی اور وہ عین جنگ کی حالت میں ٹوٹ کر تیمور کی فوج سے جا ملے، بایزید کی جزرسی اور بخل کی وجہ سے فوج میں پہلے ہی سے بددلی پھیلی ہوئی تھی، جسے تیمور کے جاسوسوں کی ریشہ دوانیوں نے اور بھی تیز کردیا تھا، عثمانی فوج کے افسروں نے یہ حالت دیکھ کر بایزید کو جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر اس نے مطلق

التفات نہ کیا اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں تیمور کی فوجی طاقت کا صحیح اندازہ بھی نہ کر سکا، اس نے یہ بھی نہ کیا کہ اس موقع پر فراخ دلی سے کام لے کر سپاہیوں کو انعام و اکرام سے خوش کرتا، برخلاف اس کے تیمور کے مقابلہ میں محض اپنی شانِ استغنا کا مظاہرہ کی غرض سے وہ انگورہ پہنچنے کے بعد ایک روز پوری فوج کو ساتھ لے کر شکار کے لیے روانہ ہو گیا، جس مقام پر یہ شکار طے پایا تھا وہاں پانی بہت کم تھا اور پانچ ہزار عثمانی سپاہی پیاس کی شدت سے مر گئے، جو باقی رہ گئے وہ بھی گرمی اور پیاس کی تکلیف سے بہت خستہ ہو رہے تھے۔

بایزید جب شکار سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی لشکر گاہ پر تیمور کا قبضہ ہے اور جس چشمہ سے عثمانی فوج پانی لے سکتی تھی، اس کا رخ بھی تاتاریوں نے پھیر دیا ہے، جس کی وجہ سے پانی بہت کم دست یاب ہو سکتا ہے، حالات کی نامساعدت میں اس واقعہ نے اور بھی اضافہ کیا، بایزید کے لیے اب بلا تاخیر جنگ شروع کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ چہار شنبہ ۱۷؍ ذی الحجہ ۸۰۴ھ (۲۰؍ جولائی ۱۴۰۲ء) کو وہ فیصلہ کن معرکہ پیش آیا جس نے بقول گبن تیمور کی شہرت و عظمت کو حیاتِ ابدی بخش دی اور بایزید کی ذلت و رسوائی کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا، لڑائی طلوع فجر سے قبل شروع ہو گئی تھی اور غروبِ آفتاب کے بعد تک جاری رہی، اس روز بایزید نے سپہ گری اور سپہ سالاری کے جوہر خوب خوب دکھائے، اس کی خاص فوج نے بھی غیر معمولی شجاعت سے کام لیا اور نہایت جان بازی کے ساتھ تاتاریوں کا مقابلہ کرتی رہی لیکن تیمور کی فوجی قابلیت اور اس کی فوج کی کثرت کے سامنے بایزید کی ساری کوششیں بے سود نظر آنے لگیں، علاوہ بریں سب سے زیادہ نقصان اسے خود اپنے سپاہیوں سے پہنچا، اس کی فوج کے تاتاری دستے پہلے ہی سے غداری کے لیے آمادہ تھے، وہ لڑائی شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد تیمور کی فوج سے جا ملے، اناطولیہ کی ترکی ریاستوں مثلاً ایدین، منتشا، صارو خاں اور کرمیان کے دستے بھی جن کو بایزید نے بہ جبر اپنی فوج میں بھرتی کیا تھا، عین موقع پر غدار ثابت ہوئے اور سب

کے سب بھاگ کر اپنے اپنے امیروں کے علم کے نیچے پہنچ گئے، جو تیمور کی فوج میں بایزید کے فوج کے خلاف لڑ رہے تھے، البتہ اسٹیفن اپنے سروی دستوں کے ساتھ وفاداری اور جاں بازی کا حق ادا کرتا رہا لیکن لڑائی ختم ہونے سے پہلے ہی اسے بھی راہِ فرار اختیار کرنی پڑی، اب صرف بایزید دس ہزار ینی چری کے ساتھ میدان میں باقی رہ گیا تھا، اس مختصر فوج نے سات آٹھ لاکھ تاتاریوں کے مقابلہ میں جیسی حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا، اس کی مثال خود ینی چری کی تاریخ میں کم نظر آتی ہے لیکن آخر کار گرمی اور پیاس کی شدت نے ان کے بازو کم زور کر دیے اور تاتاریوں کی کثرت غالب ہو کر رہی، بایزید کے بعض افسروں نے لڑائی کی حالت دیکھ کر چند گھنٹے پیش تر ہی اسے میدانِ جنگ چھوڑنے کی رائے دی تھی لیکن اس نے اس مشورہ کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا، اب جب کہ وقت نکل چکا تھا، بایزید نے بھاگنے کی کوشش کی مگر محمود خان چغتائی نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا، اس کے پانچ لڑکوں میں سے جو لڑائی میں شریک تھے، تین دشمن کی زد سے بچ کر نکل گئے، شہزادہ سلیمان نے یورپ کا رخ کیا، شہزادہ محمد نے اماسیا پہنچ کر دم لیا اور شہزادہ عیسیٰ کرمانیہ کی طرف بھاگا، شہزادہ موسیٰ گرفتار ہوا، پانچویں لڑکے شہزادہ مصطفیٰ کا حشر معلوم نہ ہو سکا، ممکن ہے لڑائی میں مارا گیا ہو، بہر حال وہ ایسا غائب ہوا کہ کسی کو اس کا سراغ نہ ملا۔

قیدی سلطان آلِ تیمور کا مؤرخ شرف الدین علی بیان کرتا ہے کہ جب بایزید قیدی کی حیثیت سے دست بستہ تیمور کے سامنے لایا گیا تو تیمور نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اس کے ہاتھ کھلوا کر عزت و احترام کے ساتھ اپنے قریب بٹھایا، پھر اس کی حالت پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا کہ:

> ”اگرچہ احوالِ عالم تمام تر خداوند تعالیٰ کے ارادہ و قدرت کے مطابق پیش آتے ہیں اور کسی دوسرے کو حقیقتاً کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے، تاہم انصاف اور حق یہ ہے کہ تم پر جو مصیبت آئی ہے، وہ خود تمہاری لائی ہوئی ہے، تم نے بارہا اپنے حد سے باہر قدم

رکھا اور بالآخر مجھے انتقام پر مجبور کر دیا، پھر بھی چوں کہ تم اس دیار میں کفار سے جہاد کر رہے تھے، میں نے بہت کچھ تحمل کیا اور ان حالات میں جو فرض ایک خیر اندیش مسلمان کا تھا، اسے بجالایا، میری خواہش تھی کہ اگر تم فرماں برداری کی راہ اختیار کرو تو مال ولشکر کی جس قدر ضرورت تمھیں ہو اس سے تمہاری مدد کروں تاکہ تم اطمینان وقوت کے ساتھ جہاد میں مشغول رہ سکو اور دیارِ اسلام کے اطراف واکناف سے بے دینوں کے شرک کی شوکت کو فنا کر دو...... لیکن تم نے سرکشی اور عناد اختیار کیا، حتیٰ کی معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، سب جانتے ہیں کہ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور یہ قوت وغلبہ جو خداوند تعالیٰ نے مجھ کو بخشا ہے تم کو حاصل ہوتا تو اس وقت مجھ پر اور میرے لشکر پر کیا گزرتی لیکن اس فتح کے شکرانے میں جو خدا کے فضل وعنایت سے مجھے حاصل ہوئی ہے، میں تمہارے اور تمہارے آدمیوں کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ نہ کروں گا، دل کو مطمئن رکھو[1]۔''

بایزید نے انفعال کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آئندہ کے لیے اطاعت کا وعدہ کیا، تیمور نے اسے خلعت شاہانہ پہنا کر مزید لطف وعنایت کی توقع دلائی، اس کی خواہش پر شہزادہ موسیٰ بھی جو قید میں تھا، آزاد کر کے اس کے پاس بھیج دیا گیا اور تیمور نے ان کے رہنے کے لیے اپنے خیمہ کے قریب ایک عالی شان خیمہ نصب کرایا اور بعض عالی مرتبت امراء کو ان کی خدمت میں مامور کیا، بروصہ سے جب حرم سلطانی لایا گیا تو تیمور نے شہزادی ڈیسپینا اور اس کی لڑکی کو بھی بایزید کے پاس بھجوا دیا۔

بایزید کی موت لیکن یہ مراحم خسروانہ بایزید کے زخم دل کے لیے نمک کا کام دے رہے تھے اور شاہی خیمہ بھی اس کے لیے قید خانہ سے کم نہ تھا، اپنی سابق عظمت وسطوت کی یاد اسے کسی لمحہ چین نہیں لینے دیتی تھی، اضطراب یہاں تک بڑھا کہ اس نے آخر کار بھاگنے کا عزم کر لیا لیکن اس کی اس کوشش کی اطلاع تیمور کو ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس کی نگرانی سخت

[1] ظفرنامہ از مولانا شرف الدین علی یزدی، جلد دوم، ص ۴۳۸-۴۳۹، کلکتہ، ۱۸۸۸ء۔

کے ساتھ کی جانے لگی، تاتاری لشکر جب ایک مقام سے دوسرے مقام کو کوچ کرتا تو تیمور بایزید کو بھی ساتھ لیتا جاتا لیکن تشہیر سے بچنے کے لیے بایزید ایک پالکی میں سفر کرتا تھا، جس پر پردہ پڑا رہتا تھا، اس پالکی میں لوہے کی جالی کا کام تھا، جس کی بنا پر مشہور ہو گیا کہ تیمور قیدی سلطان کو لوہے کے پنجرے میں بند رکھتا ہے اور جہاں جاتا ہے اپنے ساتھ اس پنجرے کو بھی لے جاتا ہے، بہر حال بایزید کے قلب و دماغ پر اپنی قید و رسوائی کا اس قدر جاں کاہ اثر پہلے ہی پڑ چکا تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک اسے برداشت نہ کر سکا اور صرف آٹھ مہینے بعد اس کی روح قفسِ عنصری اور قفسِ فولادی دونوں سے بیک وقت آزاد ہو گئی، تیمور کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اس فاتح کشور کشا کے لیے بھی جس نے لاکھوں انسانوں کو قتل کرا دیا اور دل میں تاثر کی خفیف سی لرزش بھی محسوس نہ کی، آلِ عثمان کے اتنے جلیل القدر سلطان کی یہ عبرت انگیز موت ایک دردناک واقعہ تھی، تیمور نے موسیٰ کو آزاد کر کے بایزید کی نعش شاہانہ احترام کے ساتھ بروصہ کو روانہ کی جہاں وہ سابق تاج داران عثمانی کے پہلو میں سپردِ خاک کر دی گئی، خود تیمور بھی اس کے بعد دو ہی سال زندہ رہا۔

سلطنت عثمانیہ کا ظاہری خاتمہ

جنگ انگورہ نے صرف بایزید کی زندگی کا خاتمہ نہیں کیا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت عثمانیہ بھی نیست و نابود ہو گئی، تیمور نے ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی تھیں، پھر ان کی حکومتوں پر برقرار کر دیا اور ایشیائے کوچک کا کوئی علاقہ آلِ عثمان کے ہاتھ میں باقی نہ رہا۔

محمد اوّل

۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ مطابق ۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۱ء

سلطنت کی حالت بایزید کے انتقال کے وقت سلطنت عثمانیہ بظاہر فنا ہو چکی تھی، ایشیائے کوچک عثمانیوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا، اس کے کچھ حصے ترکی امیروں کے قبضہ میں واپس جا چکے تھے اور کچھ ابھی تک تاتاریوں کی قتل و غارت گری کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے، یورپ میں بھی سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کی حالت امید افزانہ تھی، بلغاریا، بوسنیا اور ولاچیا کی رعایا بغاوت کے لیے آمادہ تھی اور سلطنت بازنطینی اپنے مقبوضات کو واپس لینے کا حوصلہ کر رہی تھی لیکن پریشانی اور ناامیدی کے ان حالات میں بھی سلطنت عثمانیہ نے اپنی غیر معمولی قوت بقا کا ثبوت دیا اور دس بارہ سال کی قلیل مدت میں اس نے نہ صرف اپنے تمام قدیم مقبوضات واپس لیے بلکہ پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ رونما ہوئی۔

تیموری فوجوں نے ایشیائے کوچک کی غارت گری کے بعد دوسری سمت کا رخ کیا، ان کے واپس جانے کے بعد ایشیائے کوچک میں ان کا کوئی نشان باقی نہ رہا، میدان پھر عثمانیوں اور قدیم ترکی امیروں کی قوت آزمائی کے لیے خالی ہو گیا۔

شہزادوں کی باہمی جنگ بایزید کے چھ لڑکوں میں سے پانچ اس کے ساتھ جنگ انگورہ میں شریک تھے، ان میں ایک مصطفیٰ نامی غالباً لڑائی میں مارا گیا تھا، دوسرا موسیٰ بایزید کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا، باقی تین جان بچا کر بھاگ گئے، ان میں سب سے بڑا لڑکا سلیمان

وزیر اعظم علی پاشا کو ساتھ لے کر اورنہ پہنچا اور بایزید کے انتقال کے بعد سلطنت عثمانیہ کے یورپی حصہ کا مالک بن بیٹھا اور اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، دوسرا لڑکا عیسیٰ بروصہ آیا اور اس نے وہاں بایزید کی جانشینی کا اعلان کر دیا، محمد سب سے چھوٹا لیکن سب سے لائق تھا، وہ ایشیائے کوچک کے شمال مشرق میں اماسیا کے چھوٹے سے علاقہ پر قابض ہو گیا، بایزید کے انتقال کے بعد ان تینوں میں سلطنت کے لیے کشمکش ہونے لگی، کچھ دنوں کے بعد چوتھا بھائی موسیٰ بھی جسے تیمور نے بایزید کی وفات پر رہا کر دیا تھا، تاج و تخت کے لیے قسمت آزمائی کرنے لگا۔

شروع میں محمد اور عیسیٰ کے درمیان جنگ چھڑی، محمد ایشیائی مقبوضات کو برابر برابر تقسیم کر لینا چاہتا تھا لیکن عیسیٰ پوری سلطنت کا دعوے دار تھا، جنگ میں عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر سلیمان سے مدد طلب کرنے کے لیے یورپ پہنچا، سلیمان عیسیٰ کی حمایت میں فوج لے کر ایشیائے کوچک میں داخل ہوا، ابتدا میں محمد کو دشواری پیش آئی لیکن بالآخر اس نے موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ یورپ میں داخل ہو کر سلیمان کے مقبوضات پر حملہ کر دے، یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور سلیمان عیسیٰ کو چھوڑ کر اپنے مقبوضات کی حفاظت کے لیے فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا، عیسیٰ کو شکست ہوئی اور وہ خدا جانے کہاں غائب ہو گیا اور پھر کہیں اس کا پتہ نہ چلا۔

یورپ میں سلیمان اور موسیٰ کے درمیان جنگ شروع ہو گئی، سلیمان کا برتاؤ اپنی فوج کے ساتھ بہت سخت تھا اور سپاہیوں میں اس کی طرف سے عام بے زاری پھیلی ہوئی تھی، اس کی سختی سے عاجز آ کر فوج باغی ہو گئی اور اسے قتل کر دیا، سلیمان کے قتل کے بعد موسیٰ اورنہ کے تخت کا مالک بن بیٹھا اور اس نے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد موسیٰ نے قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاری شروع کی، شہنشاہ نے محمد سے مدد کی درخواست کی اور محمد اپنی ترکی فوج اور سرویا کے ایک دستہ کے ساتھ شہنشاہ کی مدد کے لیے یورپ میں داخل ہوا، یہ بھی عجیب منظر تھا، ایک ترکی فوج موسیٰ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کا

محاصرہ کیے ہوئے تھی اور دوسری محمد کی قیادت میں قسطنطنیہ کی محافظت کر رہی تھی۔

آخر کار موسیٰ کو محاصرہ اٹھا کر پسپا ہونا پڑا، محمد نے اس کا تعاقب کیا، سرویا کی سرحد پر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بہت قریب پہنچ گئیں اور جنگ کی نوبت آنے والی ہی تھی کہ موسیٰ کے فوجی سرداروں نے جو اس سے بہت نالاں تھے، بغاوت کا اعلان کر دیا اور پوری فوج محمد سے جا ملی، موسیٰ زخمی ہو کر بھاگا اور تلاش کے بعد اس کی نعش ایک دلدل میں پائی گئی۔

محمد کی تخت نشینی تخت سلطنت کے لیے محمد کا کوئی حریف اب باقی نہیں رہا، اس کے سلطان ہونے کا اعلان کیا گیا اور ایشیا اور یورپ کی تمام رعایا نے اس کا خیر مقدم کیا، بہ حیثیت سلطان کے اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس مختصر مدت میں بھی اس نے غیر معمولی اہلیت کا ثبوت دیا، اس نے نہ صرف اپنی سلطنت کے انتشار کا خاتمہ کیا بلکہ اپنی خداداد فوجی اور آئینی قابلیت سے دولت عثمانیہ کو ویسا ہی طاقت ور اور مستحکم بنا دیا جیسا کہ تیمور کے حملہ سے قبل وہ تھی، سلطنت کے استحکام کے لیے اس نے امن و صلح کو ضروری سمجھا اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر گرد و پیش کی تمام مملکتوں سے صلح کے معاہدے کیے، اس نے بازنطینی سلطنت کے چند مقبوضات شہنشاہ کو واپس کر دیے اور اس سے آخر وقت تک صلح قائم رکھی۔

لیکن کبھی کبھی اسے میدانِ جنگ میں آنے کے لیے بھی مجبور ہونا پڑا اور اس وقت اس نے ثابت کر دکھایا کہ تدبر اور نظم و نسق کی اہلیت کے علاوہ فوجی قابلیت میں بھی وہ اپنے کسی پیش رو سے کم نہیں ہے، کرمانیہ، کرمیان اور دوسری ترکی ریاستیں تیمور کے حملہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے آزاد ہو گئی تھیں، محمد نے ان سب کو تاتاریوں کی حمایت سے الگ کر کے دولت عثمانیہ کی فرماں روائی قبول کرنے اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا، امیر کرمانیہ نے کئی بار بغاوت کی لیکن محمد نے ہر بار اسے شکست دے کر معاف کر دیا اور صرف اظہارِ اطاعت پر قناعت کر کے اس کی جان بخشی کی، اس نے درویشوں کے گروہ کو جس نے بہت زیادہ طاقت حاصل کر لی تھی اور آخر میں بغاوت کا اعلان کر دیا تھا، شکست دے کر اس فرقہ کا

استیصال کر دیا۔

ذاتی اوصاف محمد کے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کی شہادت دینے میں تمام مؤرخین متفق اللفظ ہیں، وہ بے حد کشادہ دل اور منصف مزاج تھا، اپنے وعدوں کو سخت پابندی سے پورا کرتا، اس کی عدالت میں ہر مذہب، ہر قوم اور ہر فرقہ برابر تھا، اس کی رعایا ہر جگہ خوش حال تھی، عیسائی رعایا کی بہبودی کا اسے خاص طور پر خیال رہتا تھا اور ان کے ساتھ وہ کسی قسم کی زیادتی کو روانہ رکھتا، اس نے ادب کی سرپرستی بڑی فیاضی سے کی اور اسی کے مختصر عہد حکومت میں شعر و شاعری کا مذاق عثمانیوں میں اول اول شروع ہوا۔

محمد نے اکتالیس سال کی عمر میں ۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) میں وفات پائی اور بروصہ میں مسجد خضرا سے متصل جسے اس نے خود تعمیر کرایا تھا، دفن ہوا، یہ مسجد اسلامی طرزِ تعمیر اور سنگ تراشی کا بہترین نمونہ خیال کی جاتی ہے، محمد نے اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر بھی مکمل کرائی جسے مراد اول نے بنوانا شروع کیا تھا لیکن بایزید کی بے توجہی کی وجہ سے نامکمل رہ گئی تھی، اس نے اپنی مسجد کے قریب ہی دو عمارتیں اور بنوائیں، ایک میں مدرسہ قائم کیا اور دوسری میں غریبوں کے لیے طعام خانہ۔

معیارِ عظمت اگرچہ دولت عثمانیہ کے اول دس فرماں رواؤں میں صرف محمد ہی ایسا تھا جس کے عہد میں سلطنت کی توسیع نہیں ہوئی تاہم جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ تباہی کی جس منزل پر پہنچ گئی تھی اور پھر گیارہ سال کی مسلسل خانہ جنگیوں سے جو مزید خطرات پیدا ہو گئے تھے، ان پر نظر رکھتے ہوئے محمد کا یہ کارنامہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں دکھائی دیتا کہ اس نے سلطنت کے کسی صوبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور گو اس کے مختصر عہد حکومت میں ایشیائے کوچک کی ترکی ریاستوں پر پوری طرح قبضہ نہ ہو سکا پھر بھی اس نے ان سب کو زیر کر کے دولت عثمانیہ کے دامن سے وابستہ رکھا، اس کو بجا طور پر سلطنت کے بانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

مراد ثانی

۸۲۴ھ تا ۸۵۵ھ مطابق ۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء

مراد اور مصطفیٰ کی جنگ سلطان محمد اول کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا مراد جو ایشیائے کوچک میں سلطان کا قائم مقام تھا، اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، محمد اول نے اپنے مختصر زمانہ حکومت میں تیموری حملہ کے تمام اثرات مٹا دیے تھے اور سلطنت کو گویا از سرِ نو قائم کر کے مستقل و مستحکم بنا دیا تھا لیکن مراد کی نوعمری سے ان فرماں رواؤں کی ہمتیں بڑھ گئیں جن کو سلطان مرحوم نے اپنی قوت اور حکمت عملی سے سلطنت عثمانیہ کا حلیف و مطیع بنا لیا تھا، سب سے پہلے شہنشاہ قسطنطنیہ نے ان تمام احسانات کو فراموش کر کے جو محمد اول نے اس کے ساتھ کیے تھے، آلِ عثمان کے ساتھ اپنے قدیم بغض و عناد کی بنا پر مراد کی کم سنی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور مصطفیٰ نامی ایک شخص کو جو اپنے کو سلطان بایزید یلدرم کا لڑکا کہتا تھا اور تخت سلطنت کا دعوے دار تھا، مراد کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، یہ وہی مصطفیٰ تھا جو سلطان محمد اول کے مقابلہ میں بھی آیا تھا اور بالآخر شکست کھا کر قسطنطنیہ میں پناہ گزیں ہوا تھا اور جس کی نظر بندی کے معاوضہ میں شہنشاہ قسطنطنیہ سلطان سے ایک کثیر رقم ہر سال پاتا تھا، شہنشاہ نے اس معاہدہ کے ساتھ کہ بہ شرط کامیابی وہ گیلی پولی نیز بحر اسود کے ساحل کے تمام بازنطینی شہر جو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے تھے، شہنشاہ کو واپس کر دے گا، مصطفیٰ کو رہا کر دیا اور اپنی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے روانہ کیا، مراد اس وقت ایشیائے کوچک میں تھا، اس نے مصطفیٰ

کے مقابلہ میں ایک فوج بایزید پاشا کی سرکردگی میں بھیجی لیکن یورپ میں ترکی افواج کا بیشتر حصہ مصطفیٰ کا طرف دار ہو گیا تھا، بایزید پاشا کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا، اس کے بعد مصطفیٰ شہنشاہ قسطنطنیہ کے فراہم کیے ہوئے جہازوں میں دردانیال کو عبور کر کے ایشیائے کوچک میں پہنچا، مراد نے بڑی لیاقت اور شجاعت سے اس کا مقابلہ کیا اور شکست دی، مصطفیٰ بھاگ کر گیلی پولی میں محصور ہو گیا، مراد نے گیلی پولی کو فتح کر کے مصطفیٰ کو گرفتار کر لیا اور اس کو سولی دے دی، اس طرح اس آخری فتنہ کا بھی خاتمہ ہو گیا جس کا سلسلہ بایزید یلدرم کی وفات کے بعد اس کے لڑکوں کی باہمی آویزش اور قوت آزمائی سے شروع ہوا تھا۔

قسطنطنیہ کا محاصرہ مراد نے شہنشاہ کی اس غداری کے جواب میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کے محاصرہ کے لیے بیس ہزار فوج کے ساتھ پہنچ گیا، بازنطینیوں نے نہایت بہادری اور مذہبی جوش کے ساتھ ترکوں کا حملہ روکا مراد نے اس محاصرہ میں جس غیر معمولی فوجی لیاقت کا ثبوت دیا، اس کی مثال اس عہد کی فوجی تاریخ میں شاذ و نادر ملتی ہے[1] قوی امید تھی کہ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہے گا لیکن شہنشاہ نے ایسی تدبیر اختیار کی، جس سے مراد کو مجبوراً محاصرہ اٹھا کر اپنی سلطنت کی حفاظت کے لیے ایشیائے کوچک کا رخ کرنا پڑا، مراد کا ایک چھوٹا بھائی مصطفیٰ نامی تھا، قسطنطنیہ کے محاصرہ کے وقت وہ ایشیائے کوچک میں تھا، شہنشاہ نے کوشش کر کے اس کو مراد کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا، امیر کرمانیہ اور امیر کرمیان نے اس کی مدد کی اور مصطفیٰ نے ان کی مدد سے ایشیائے کوچک میں مراد کی ایک فوج کو شکست دے کر اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، یہ خبر سن کر مراد قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر فوراً ایشیائے کوچک پہنچا، مصطفیٰ کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود گرفتار کر لیا گیا، اس کے گرفتار کرنے والوں نے مراد کے علم و اجازت کے بغیر اسی وقت اس کو سولی پر چڑھا دیا۔

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۹۔

ترکی ریاستوں کی اطاعت اس فتنہ کو فرو کرنے کے بعد مراد ایشیائے کوچک کی ان ترکی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا، جو تیموری حملہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے بالکل آزاد ہو گئی تھیں اور اس کی بیخ کنی کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی تھیں، امیر کرمانیہ ان سب میں پیش پیش تھا، مراد کے خلاف مصطفیٰ کو کھڑا کرنے میں بھی زیادہ تر اسی کا ہاتھ تھا، اس کا یہ طرزِ عمل اس قدیم عناد پر مبنی تھا جو آلِ عثمان اور کرمانیہ کے درمیان ابتدا سے چلا آتا تھا، چنانچہ مراد نے اس کی سرکوبی کے لیے کرمانیہ پر حملہ کیا اور محمد بک کو قتل کر کے اس کے لڑکے ابراہیم کو وہاں کا امیر بنایا، اس نے کرمانیہ کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا، بلکہ صرف اس کے باج گزار ہونے پر قناعت کی، یہی معاملہ اس نے دوسری ریاستوں مثلاً کرمیان، قسطمونی، منتشا، صادو خاں اور حمید وغیرہ کے ساتھ بھی کیا اور ان سب کو سلطنت عثمانیہ کا مطیع اور باج گزار بنا لیا، اس طرح ایشیائے کوچک میں آلِ عثمان کا وہی اقتدار پھر قائم ہو گیا، جو جنگ انگورہ سے پہلے تھا، امیر قسطمونی باج گزار ہونے کے علاوہ اپنی نصف ریاست سے بھی سلطان کے حق میں دست بردار ہو گیا اور اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی، ۸۳۱ھ (۱۴۲۸ء) میں امیر کرمیان لاولد مر گیا، اس کی وصیت کے مطابق ریاست کرمیان سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئی۔

شہنشاہ سے صلح اور چند جدید مقبوضات ایشیائے کوچک میں امن و امان قائم کرنے کے بعد مراد ۸۲۷ھ (۱۴۲۴ء) میں یورپ کو واپس ہوا، اس درمیان میں شہنشاہ مینوئل کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا جان پلیولوگس قسطنطنیہ کا فرماں روا تھا، مراد نے دوبارہ قسطنطنیہ کا محاصرہ نہیں کیا، بلکہ جان سے صلح کر لی، جان نے تیس ہزار ووکات سالانہ خراج دینے کا معاہدہ کیا اور سیمبریا اور درکوس کے سوا زیتون اور تمام دوسرے یونانی شہر جو دریائے اسٹرانیا اور بحر احمر کے ساحل پر باقی رہ گئے تھے، سلطان کے حوالے کر دیے، یوں بازنطینی سلطنت کا خاتمہ چند دنوں کے لیے اور ملتوی ہو گیا۔

سالونیکا کی فتح سالونیکا بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور اور نہایت اہم شہر تھا، گذشتہ

سو سال کے اندر یہ تین بار ترکوں کے قبضہ میں آیا لیکن کچھ دنوں کے بعد ہر بار یونانیوں نے اسے واپس لے لیا، شہنشاہ جان کے دورِ حکومت میں اس کا حاکم شہنشاہ کا بھائی اینڈرونیکس تھا، اینڈرونیکس نے غداری کر کے اس شہر کو وینس کے ہاتھوں فروخت کر دیا، چوں کہ یہ مقدونیا کا ایک اہم شہر تھا اور اس سے قبل تین بار ترکوں کے قبضہ میں رہ چکا تھا، اس لیے مراد نے اس معاملۂ بیع کی مخالفت کی اور ۸۳۳ھ (۱۴۳۰ء) میں سالونیکا کو بہ زور شمشیر فتح کر کے مع اس کے ملحق علاقہ کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

سرویا کی فتح سالونیکا کی فتح کے بعد مراد اپنی سلطنت کی شمالی مغربی سرحد کی جانب متوجہ ہوا، ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) میں اسٹیفن لازاریویچ شاہ سرویا کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ جارج برنیکوویچ تخت نشین ہوا، اسٹیفن اس معاہدہ کے مطابق جو اس نے جنگ کسووا کے بعد بایزید یلدرم سے کیا تھا، ہمیشہ سلطنت عثمانیہ کا ایک وفادار حلیف رہا، اس نے اپنی بہن شہزادی ڈسپینا کو بایزید کے نکاح میں دے کر اس تعلق کو اور زیادہ مضبوط کر دیا تھا لیکن جارج کو مراد کے ساتھ کوئی ذاتی تعلق نہ تھا، اس نے تخت نشینی کے بعد سرویا میں ترکوں کے اقتدار کی مخالفت شروع کر دی، اس نے ترکوں کے خلاف ہنگری سے باہمی امداد کا معاہدہ کیا اور دریائے ڈینوب کے ساحل پر سمندریا میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا، مراد نے جارج کے معاندانہ ارادوں سے واقف ہو کر اس قلعہ کا مطالبہ کیا اور انکار پر جارج کے مقابلہ کے لیے بڑھا، سرویا کو شکست ہوئی اور پورے ملک پر ترکی افواج کا قبضہ ہو گیا، ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں سرویا تمام تر ترکوں کے تسلط میں آ گیا[1]۔

عیسائی حکومتوں میں ایک نئی تحریک ہنگری کو جنگ انگورہ کے بعد سلطنت عثمانیہ سے آزادی کا موقع مل گیا تھا اور وہ رفتہ رفتہ استحکام حاصل کرتا جاتا تھا، مراد کے ابتدائی دورِ حکومت میں وہ اتنی قوت حاصل کر چکا تھا کہ ترکی حملہ کی مدافعت کر سکے، سرویا پر ترکوں کا

---

[1] بلقان از ملر، ص ۲۹۳۔

قبضہ ہو جانے کے بعد ہنگری کے سرحدی علاقوں میں دونوں سلطنتوں کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، اہل بوسنیا بھی ترکوں کی قربت سے خائف تھے، البانیا کو اپنی آزادی کی طرف سے خطرہ تھا اور ولا چیا جو سلطنت عثمانیہ کا باج گزار تھا، اپنی خودمختاری کے لیے بے تاب تھا، تاہم مراد کی تخت نشینی سے تقریباً بیس سال بعد تک ان مختلف عیسائی حکومتوں کے درمیان کوئی اتحاد قائم نہ ہو سکا اور ان میں سے ہر حکومت علاحدہ علاحدہ مراد سے جنگ اور صلح کرتی رہی لیکن جب ۸۴۴ھ (۱۴۴۰ء) میں لارسلاس شاہ پولینڈ ہنگری کے تخت پر بیٹھا تو سلطنت عثمانیہ کے دشمنوں کی قوت بہت کچھ بڑھ گئی اور ایک متحدہ مقابلہ کا حوصلہ ان میں پیدا ہوا، اس حوصلہ کا محرک حقیقتاً ایک فوجی سردار ہونیاڈے نامی تھا، جو حال ہی میں مغربی یورپ سے واپس آیا تھا اور جس کی غیر معمولی شجاعت کا شہرہ تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا، ہونیاڈے نے ہنگری پہنچ کر ترکوں کے مقابلہ کا بیڑا اٹھایا اور بیس سال تک برابر سلطنت عثمانیہ سے جنگ کرتا رہا۔

بلغراد ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) میں مراد کو بلغراد کے حملہ سے ناکام واپس ہونا پڑا، یہ دریائے ڈینوب کے ساحل پر سرویا کا ایک نہایت اہم شہر تھا لیکن ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) سے ہنگری کا مقبوضہ تھا، ہنگری میں داخل ہونے کے لیے اس شہر کی فتح ناگزیر تھی، مراد نے اسی خیال سے اس کا محاصرہ کیا لیکن ہنگری کے عزم و استقلال کے مقابلہ میں آخر کار اسے شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔

ہونیاڈے کی کامیابی اسی زمانہ میں عثمانی جنرل مزید پاشا ٹرانسلوانیا میں ہرمان اسٹاٹ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، ہونیاڈے اس قلعہ کی مدد کے لیے بڑھا اور ایک مختصر فوج کے ساتھ ترکوں کے عظیم الشان لشکر کو شکست دی، اس معرکہ میں بیس ہزار ترک مارے گئے، ہونیاڈے نے مزید پاشا اور اس کے لڑکے کو اپنے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا، اس کی لہو کی پیاس کسی طرح بجھتی ہی نہ تھی، مقتولوں کی چیخ اور تڑپ میں اسے خاص لذت محسوس ہوتی تھی،

چنانچہ اس فتح کے بعد جب وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دستر خوان پر بیٹھا تو اسی وقت ترک قیدیوں کو سامنے بلا کر سب کو نہایت بے دردی سے قتل کرا دیا، ہر فتح کے بعد جو دعوت ہوتی تھی اس میں مہمانوں کو یہ خونیں تماشا بھی ضرور دکھایا جاتا تھا، یہ ہونیاڈے اور ترکوں کا پہلا مقابلہ تھا، مراد نے اس شکست کی خبر سن کر اسّی ہزار کی ایک دوسری فوج شہاب الدین پاشا کی سرکردگی میں روانہ کی، واز اگ سے مقابلہ ہوا اور ہونیاڈے نے عثمانی لشکر کو پھر شکست دی۔

صلیبی اتحاد ہونیاڈے کی شاندار کامیابی اور ترکوں کی پے در پے شکستوں سے یورپ کی تمام حکومتوں میں امید کی ایک لہر دوڑ گئی اور یورپ سے ترکوں کو نکال دینے کے لیے ایک زبردست عیسائی اتحاد قائم کر لیا گیا، شاہ لاڈ سلاس جو اس وقت ہنگری اور پولینڈ دونوں مملکتوں کا فرماں روا تھا، اس تحریک کا روح رواں تھا، اس اتحاد میں ہنگری، پولینڈ، ولاچیا اور بوسنیا کی حکومتیں اپنی پوری قوت کے ساتھ شریک ہوئیں، سرویا بھی جو اسٹیفن کے عہد میں عثمانیوں کا نہایت وفادار حلیف تھا، اب اس کے جانشین جارج برینکوویچ کی سرکردگی میں اتحادیوں کی صف میں شامل ہو گیا، فرانس اور جرمنی نے مبارزین کی ایک کثیر فوج بھیجی، اس کے علاوہ یورپ کے ہر ملک سے ایک بڑی تعداد سپاہیوں کی خود آ کر شریک ہوئی لیکن سب سے زیادہ جوش پوپ نے دکھایا، اس نے اپنے نمائندہ کارڈینل جولین سیزرانی (Julian Cesurini) کو ایک مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا اور یورپ کے ہر حصہ سے اس جنگ کے لیے ایک کثیر رقم فراہم کر کے بھیجی، حقیقتاً یہ ایک صلیبی جنگ تھی، جو عیسائیت کے مذہبی جوش نے اسلام کے خلاف چھیڑی تھی، جمہوریہ وینس اور جمہوریہ جنوا نے بھی اپنے بحری بیڑوں سے مدد کی اور چوں کہ عثمانیوں کے پاس اس وقت تک کوئی بحری فوج نہ تھی، اس لیے خیال تھا کہ مراد کی خاص فوجیں ایشیائے کوچک سے جہاں وہ امیر کرمانیہ سے جنگ میں مصروف تھیں، یورپ میں منتقل نہ کی جا سکیں گی، اتحادی افواج بہ ظاہر شاہ لاڈ سلاس کے زیر کمان تھیں لیکن دراصل ان کا سردار ہونیاڈے تھا، جو اس وقت مسیحی دنیا کا سب سے بڑا جنرل خیال کیا جاتا تھا۔

ترکوں کی شکست مراد اس وقت کرمانیہ کی بغاوت کے سلسلہ میں ایشیائے کوچک میں تھا، اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی لشکر نے ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور نیش کے مقام پر عثمانی فوج کو شکست دی، اس کے بعد ہونیاڈے نے صوفیا پر قبضہ کرلیا اور پھر کوہِ بلقان کو عبور کر کے فلیوپولس پر حملہ کی تیاری شروع کی، کوہِ بلقان کے دامن میں ترکوں نے ایک بار اور مقابلہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی ان کو شکست ہوئی، عیسائیوں کے لیے میدان اب خالی تھا، مسلسل فتوحات سے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں، مراد ایشیائے کوچک میں تھا اور پیہم شکستوں نے ترکی فوج کو بہت کچھ کمزور کر دیا تھا، بااین ہمہ ہونیاڈے نے اس مقصد کے خلاف جسے پیش نظر رکھ کر عیسائی حکومتوں کا یہ اتحاد قائم کیا گیا تھا، واپسی کا عزم کیا اور اپنی کامیابیوں کی داد لینے کے لیے پوری فوج کے ساتھ بوڈا کو واپس چلا گیا۔

صلح نامۂ زیجیڈین مراد نے ہونیاڈے کا تعاقب کرنے کے بجائے اتحادیوں سے صلح کرلینا زیادہ مناسب خیال کیا، کارڈینل جولین صلح کا مخالف تھا لیکن طویل گفت وشنید کے بعد بالآخر ۲۶؍ ربیع الاول ۸۴۸ھ (۱۲؍ جولائی ۱۴۴۴ء) کو زیجیڈین (Szegeddin) کے مقام پر ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے سرویا سلطنت عثمانیہ سے آزاد کر دیا گیا اور ولاچیا ہنگری کو دے دیا گیا، اس کے علاوہ مراد نے ساٹھ ہزار ووکات عثمانی جنرل محمد چلپی کا زرِ فدیہ ادا کیا، جو گذشتہ جنگ میں عیسائیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا، یہ صلح دس سال کے لیے کی گئی، اس پر پابند رہنے کے لیے لاڈسلاس نے انجیل اور مراد نے قرآن کو ہاتھ میں لے کر قسم کھائی۔

مراد کی تخت سے کنارہ کشی ایشیائے کوچک میں امن پہلے ہی قائم ہو چکا تھا، اس صلح نامہ سے یورپ کی جنگ کا بھی بہ ظاہر خاتمہ ہو گیا اور مراد کو ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا، بیس بائیس سال کی مسلسل لڑائیوں نے اس کو اب امورِ سلطنت کی طرف سے دل برداشتہ کر دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بقیہ زندگی سکون کے ساتھ گزار دے، صلح نامۂ زیجیڈین کے تکملہ کے بعد

جب وہ ایشیائے کوچک میں واپس گیا تو اسے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ علاء الدین کی وفات کی خبر معلوم ہوئی، یہ شہزادہ نہایت لائق اور بہادر تھا، مراد کو اس کی وفات کا بے حد رنج ہوا اور اس نے سلطنت سے مستقل طور پر کنارہ کش ہو جانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ اپنے دوسرے لڑکے محمد کو جس کی عمر صرف چودہ سال تھی، تخت پر بٹھا کر وہ ریاست ایدین میں چلا گیا۔

عیسائیوں کی معاہدہ شکنی لیکن جس زندگی کی تلاش میں مراد نے تخت چھوڑ کر ایدین کی سکونت اختیار کی تھی وہ حاصل نہ ہو سکی، جوں ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ مراد سلطنت سے کنارہ کش ہو گیا ہے اور اس کی جگہ نوعمر اور ناتجربہ کار محمد تخت نشین ہے، عیسائیوں کے دلوں میں ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کا حوصلہ ایک بار پھر پیدا ہوا، صلح نامۂ زیجیڈین کی تحریر کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہنگری کی مجلس قومی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کا فیصلہ کر لیا، اس غداری کا اصل محرک کارڈینل جولین تھا جو پوپ کی پوری تائید کے ساتھ معاہدہ شکنی پر زور دے رہا تھا، شہنشاہ قسطنطنیہ بھی اس تحریک میں پیش پیش تھا، حالات تمام تر عیسائیوں کے لیے امید افزا تھے، سلطنت عثمانیہ کی زمام حکومت ایک نوعمر لڑکے کے ہاتھ میں تھی، ایشیائے کوچک میں امیر کرمانیہ نے پھر بغاوت شروع کر دی تھی اور عثمانی فوجیں اس کے فرو کرنے میں مصروف تھیں، درِدانیال پر جنوا، وینس اور برگنڈی کے بحری بیڑوں کا قبضہ تھا، جن کی موجودگی میں ترکی افواج کا ایشیائے کوچک سے یورپ میں آنا محال تھا، پھر بھی لاڈسلاس شاہ ہنگری کو صلح نامہ کی خلاف ورزی کرنے میں تامل تھا لیکن کارڈینل جولین نے اپنے مذہبی اثر سے کام لے کر اس کو مجبور کر دیا اور بادشاہ کے ضمیر کو اس فتویٰ سے مطمئن کر دیا کہ غیر عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی نہیں کرنی چاہیے[1]، ہنگری کی مجلس قومی کے بعض ارکان کی مخالفت بھی اس فتویٰ سے دبا دی گئی اور جولین نے مجلس میں اعلان کیا کہ اس فتویٰ میں خود پوپ کی تائید بھی شامل ہے، اس نے مجلس کو مخاطب کر کے کہا:

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۰۸۔

''کیا تم اس موقع پر ان امیدوں کو توڑ دو گے جو لوگوں نے تمہارے ساتھ قائم کر رکھی ہیں اور اس خوش بختی سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے جو تمہیں نصیب ہوئی ہے، تمہارا عہد و پیان تمہارے خدا اور تمہارے مسیحی بھائیوں کے ساتھ ہے اور وہ سابق معاہدہ اس ناعاقبت اندیشانہ اور مخالف مذہب عہد کو ساقط کر دیتا ہے، جو مسیح کے دشمنوں سے باندھا گیا ہو، دنیا میں اس کا نائب پاپائے رومہ ہے، جس کی اجازت کے بغیر تم نہ کوئی وعدہ کر سکتے ہو اور نہ اسے پورا کر سکتے، اس کی طرف سے میں تم کو دروغ حلفی سے بری الذمہ کرتا ہوں اور تمہاری فوج کو برکت دیتا ہوں، شہرت اور نجات کی راہ پر میرے پیچھے پیچھے چلو اور اگر اب بھی تمہیں کچھ پس و پیش ہے تو میں اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں[1]۔''

ابتدا میں ہونیاڈے نے بھی معاہدۂ زیجیڈین کی خلاف ورزی سے اختلاف کیا لیکن جب یہ وعدہ کیا گیا کہ بلغاریا کو ترکوں سے فتح کرنے کے بعد اسے وہاں کا بادشاہ بنا دیا جائے گا تو وہ راضی ہو گیا، البتہ اس نے یہ شرط کی کہ معاہدہ شکنی کا اعلان یکم ستمبر تک ملتوی کر دیا جائے، یہ شرط اس وجہ سے نہ تھی کہ اسے اب بھی کچھ تامل باقی تھا بلکہ اس خیال سے پیش کی گئی تھی کہ اس وقت تک اتحادی صلح نامہ سے پورا فائدہ اٹھالیں اور ان تمام قلعوں اور علاقوں پر قابض ہو جائیں جنہیں ترک معاہدہ کے مطابق دیانت داری کے ساتھ خالی کر رہے تھے، شاہ سرویا کو اس کی سلطنت میں اضافہ کا لالچ دیا گیا اور وہ بھی معاہدہ شکن اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا۔

لین پول لکھتا ہے کہ جس طریقہ سے یہ غداری عمل میں لائی گئی اس سے زیادہ معیوب بات یورپ کے سورماؤں اور ایک بڑے سپہ سالار کی شہرت کے لیے تصور میں بھی نہیں آسکتی، جس وقت عثمانی دستے مذکورۂ بالا قلعوں اور علاقوں سے نکل آئے اور اتحادیوں نے صلح نامہ سے پوری طرح فائدہ اٹھالیا، شاہ لاڈسلاس، کارڈینل جولین اور ہونیاڈے یکم ستمبر کو بیس ہزار فوج کے ساتھ سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے، ترک اس فریب سے

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۴۶۴۔

بالکل بے خبر تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد قلعے ان کے ہاتھ سے نکل گئے، قلعوں کے ترکی دستے یا قتل کر دیے گئے یا چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر دیے گئے، بحرِ اسود کے ساحل پر پہنچ کر حملہ آوروں نے جنوب کا رخ کیا اور کئی اہم مقامات کو فتح کرتے ہوئے وارنا پہنچے اور اس مشہور شہر کا محاصرہ کر لیا، یہاں بھی ترک اس اچانک حملہ کے لیے بالکل تیار نہ تھے، مجبوراً انہیں ہتھیار ڈال دینے پڑے اور وارنا پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔

جنگ وارنا اس درمیان میں دولت عثمانیہ کے بہی خواہوں نے ان واقعات کی خبر سن کر مراد سے گزارش کی کہ یہ وقت گوشہ عزلت سے نکل کر میدانِ جنگ میں آنے کا ہے، ورنہ شہزادہ محمد کی نوعمری اور نا تجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر دشمن بڑھتے آئیں گے، چنانچہ مراد بہ عجلت تمام چالیس ہزار جنگ آزمودہ سپاہیوں کو لے کر اتحادیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا، درِ دانیال پر عیسائی بیڑوں کا قبضہ تھا لیکن اس نے جنوا کے جہازوں کو فی سپاہی ایک دوکات کی شرح سے محصول ادا کر کے اپنی پوری فوج کو یورپ میں منتقل کر دیا، اتحادیوں کو مراد کی آمد کا گمان بھی نہ تھا کہ اچانک انہیں اس کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملی، مراد نے وارنا سے چار میل کے فاصلہ پر اپنے خیمے نصب کر دیے اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔

ہونیاڈے کو سابق کامیابیوں کی بنا پر اپنی فتح کا پورا یقین تھا، چنانچہ اس نے مجلس حربی کے بعض ارکین کا یہ مشورہ بھی قبول نہ کیا کہ لشکر گاہ کے گرد ناکہ بندی کر کے مراد کے حملہ کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ خود ہی مراد پر حملہ کرنے کے لیے پوری فوج کے ساتھ چل کھڑا ہوا، ۲۶؍رجب ۸۴۸ھ مطابق ۱۰؍نومبر ۱۴۴۴ء کو دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں، عیسائی فوج کے یمین دیسار میں ہنگری اور ولاچیا کے بہترین دستے تھے، ہنگری کے دستوں کے ساتھ کارڈینل جولین کی سرکردگی میں صلیبی مجاہدوں کی ایک خاص جماعت بھی تھی، لاڈسلاس شاہی دستہ اور ہنگری اور پولینڈ کے نوجوان امراء کو لے کر قلب لشکر کو قوت پہنچا رہا تھا، ہونیاڈے پوری فوج کا سپہ سالارِ اعظم تھا، ترکوں کی طرف پہلی

دو صفیں بے ضابطہ سوار اور پیدل فوجوں کی تھیں، داہنے بازو کی کمان رومیلیا کے بیلر بے کے ہاتھ میں اور بائیں بازو کی اناطولیہ کے بیلر بے کے ہاتھ میں تھی، ان صفوں کے پیچھے مرکز میں خود سلطان مراد کے زیر کمان ینی چری اور شاہی سوار دستے تھے، ایک اونچے نیزہ کے سرے پر صلح نامہ زیجیڈین کی نقل فوجی نشان کی طرح ہوا میں لہرا رہی تھی اور بقول کریسی اس منتقم حقیقی کو پکار رہی تھی جو لوگوں کو نقض عہد کی سزا دیتا ہے، لڑائی شروع ہونے کے قریب ہی تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے عیسائیوں کے دلوں میں بدشگونی کا خطرہ پیدا ہو گیا، دفعۃً ہوا کا ایک سخت جھونکا آیا اور ان کے تمام علم سوائے بادشاہ کے علم کے زمین پر گر گئے۔

ابتدا میں عیسائیوں کا حملہ بہت کامیاب رہا، ترکوں کی پہلی دو صفوں کے قدم اکھڑ گئے اور فوج میں اتنا انتشار پیدا ہوا کہ مراد کو اپنی شکست کا یقین ہونے لگا، زندگی میں پہلی اور آخری بار صبر واستقلال کا سررشتہ ایک لمحہ کے لیے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے گھوڑا موڑ کر بھاگنے کا قصد کیا لیکن اناطولیہ کے بیلر بے نے جو قریب ہی تھا، بڑھ کر لگام پکڑ لی اور عرض کی کہ ابھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، مراد کو بھی تنبہ ہوا اور اس نے فوراً گھوڑا روک کر ینی چری کو ہمت دلانا شروع کی، دیکھتے دیکھتے جنگ کا نقشہ بدل گیا، ینی چری نے پے در پے اتنے سخت حملے کیے کہ عیسائی پسپا ہونے لگے، لاڈسلاس نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا لیکن اس کا گھوڑا زخمی ہو کر گرا اور بعض ینی چری سپاہیوں نے اسے گھیر کر گرفتار کر لیا، لاڈسلاس نے خواہش کی کہ اسے قید کر لیا جائے، مگر ترکوں میں عیسائیوں کی معاہدہ شکنی سے اس درجہ برہمی پھیلی ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کی خواہش پر مطلق توجہ نہ کی، ایک پرانے ینی چری خواجہ خیری نے فوراً اس کا سر کاٹ کر ایک نیزے پر رکھا اور نیزے کو بلند کر کے عیسائیوں کی طرف بڑھا، امرائے ہنگری کے دل اس منظر کو دیکھتے ہی بیٹھ گئے اور وہ نہایت بدحواسی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگے، ہونیاڈے نے تھوڑی دیر تک جم کر مقابلہ کیا اور اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ کم سے کم لاڈسلاس کا سر ترکوں سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لے، مگر اسے

کام یابی نہ ہوئی اور آخر کار وہ بھی بقیہ عیسائی دستوں کے ساتھ بمشکل جان لے کر بھاگا لیکن اس سے قبل اتحادی فوجوں کا دوثلث حصہ قتل ہو چکا تھا، شاہ لاڈسلاس کے علاوہ مقتولین میں دو مشہور بشپ اور بعض نہایت ممتاز فوجی افسر بھی تھے لیکن سب سے زیادہ عبرت انگیز نعش کارڈینل جولین کی تھی، جو معاہدۂ زیجیڈین کی شکست کا خاص محرک اور عیسائیوں کی ہلاکت کا اصلی سبب تھا، جس گناہ کو اپنے سر لے کر اس نے ہنگری کی قومی مجلس کو عثمانی مقبوضات پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا، اس کی نعش اس کے وبال کا ایک ایسا مرقع تھی جو مکافاتِ عمل کے خدائی قانون کو فاتح و مفتوح دونوں کے سامنے مجسم شکل میں پیش کر رہا تھا۔

اس جنگ کے نتائج | جنگ وارنا کے بعد ہنگری پر ترکوں کا قبضہ تو فوراً نہ ہو سکا لیکن سرویا اور بوسنیا کی مملکتیں مکمل طور پر فتح کر لی گئیں، یہ دونوں جو یونانی کلیسا سے وابستہ تھیں دولت عثمانیہ کے زیر تسلط آنا بھی چاہتی تھیں کیوں کہ ہونیاڈے کی کام یابی کی صورت میں انہیں بہ جبر لاطینی کلیسا میں داخل کرنے کی دھمکی دی گئی تھی، سرویا کا مؤرخ رانکی (Ranke) نقل کرتا ہے کہ ایک بار جارج برینکوویچ نے ہونیاڈے سے دریافت کیا کہ اسے کام یابی حاصل ہوئی تو مذہب کے متعلق اس کا رویہ کیا رہے گا، ہونیاڈے نے جواب دیا کہ میں سرویا کو رومن کیتھولک مذہب قبول کرنے پر مجبور کروں گا، اس کے بعد برینکوویچ نے یہی سوال مراد سے کیا، اس نے جواب دیا کہ میں ہر مسجد کے پاس ایک گرجا بنوادوں گا اور لوگوں کو پوری آزادی حاصل ہوگی کہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجد میں جا کر عبادت کریں خواہ گرجا میں، اسی طرح کلیسائے رومہ کی مذہبی تعدیوں نے بوسنیا کی تسخیر میں بھی ترکوں کی مدد کی اور آٹھ روز کے اندر بوسنیا کے ستّر قلعوں نے عثمانی فوجوں کے لیے اپنے پھاٹک کھول دیے، بوسنیا کا شاہی خاندان مٹ گیا اور اس کے بہت سے ممتاز امراء اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔[1]

ینی چری کی بغاوت | اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد مراد نے تاج و تخت پھر شہزادہ محمد

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۱۴۔

کے حوالہ کیا اور ایدین کی پر کیف فضا میں علما و مشائخ کی صحبتیں دوبارہ شروع ہوئیں لیکن اب کی بار بھی یہ عزلت پسندی راس نہ آئی، وارنا کی شکست نے عیسائیوں کی قوت کو بالکل توڑ دیا تھا اور سلطنت عثمانیہ کو اب کسی خارجی خطرہ کا خوف نہ تھا لیکن محمد کی کم سنی سے خود ینی چری نے فائدہ اٹھانا چاہا اور تنخواہ کے اضافہ کا مطالبہ پیش کیا، محمد کے انکار پر انہوں نے بغاوت کردی اور اورنہ میں قتل و غارت کا بازار ایسا گرم کیا کہ وزرائے سلطنت نے مجبور ہو کر مراد سے بمنت استدعا کی کہ زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر اس فتنہ کو فرو کرے، چنانچہ مراد کو بادل ناخواستہ ایدین کا سکون پرور ماحول پھر چھوڑنا پڑا، اس کے اورنہ پہنچتے ہی باغیوں نے سر اطاعت خم کر دیا اور شہر میں امن قائم ہو گیا، دوبار کے تجربہ سے مراد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ محمد میں ابھی سلطنت کے سنبھالنے کی کافی قابلیت پیدا نہیں ہوئی، چنانچہ اس نے پھر تخت چھوڑنے کا قصد نہیں کیا، بلکہ بقیہ زندگی امورِ سلطنت کے سرانجام دینے میں گزار دی، بادشاہوں کے تخت سے دست بردار ہو جانے کی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں، ان میں سے بعض کا حالات سے مجبور ہو کر دوبارہ عنانِ سلطنت کو ہاتھ میں لینا بھی ثابت ہے لیکن دوسری بار تخت چھوڑ کر پھر سلطنت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لینا ایک ایسا استثنائی واقعہ ہے جو صرف مراد ثانی کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی کوئی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، گبن کے نزدیک مراد کی زندگی اور سیرت کا سب سے زیادہ مؤثر واقعہ یہی ہے کہ یہ فلسفی سلطان دنیاوی عظمت کی بے حقیقتی سے آگاہ ہو کر چالیس سال کی عمر میں دوبارہ تخت سے علاحدہ ہو گیا۔

موریا لیکن اب تخت پر آنے کے بعد مراد کی زندگی کے بقیہ چھ سال تقریباً تمام تر میدانِ جنگ ہی میں گزرے، سب سے پہلے اسے موریا کی طرف توجہ کرنی پڑی، جہاں شہنشاہ قسطنطنیہ کے دو بھائی قسطنطین اور طامس علاحدہ علاحدہ حصوں پر حکمراں تھے، قسطنطین نے اپنے مقبوضات کے تحفظ کے لیے خاکنائے کورنتھ کی قلعہ بندی کی اور ادھر سے اطمینان کر لینے کے بعد تھیبز (Thebes) کے شہر پر جو اس سرحد سے قریب سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ

تھا، دفعتاً حملہ کر کے قبضہ کرلیا، اس واقعہ کی اطلاع پا کر مراد فوراً موریا کی طرف روانہ ہوا، کورنتھ کا مضبوط قلعہ اس کی راہ میں کسی قدر حائل ہوا، مگر عثمانی توپوں کی گولہ باری کے سامنے وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا، عثمانی فوج میں توپوں کے استعمال کا یہ پہلا موقع تھا،[1] کورنتھ کی فتح کے بعد موریا کا راستہ بالکل صاف ہوگیا اور قسطنطین اور طامس کے لیے اظہارِ اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا، انہوں نے خراج دینا منظور کیا اور موریا بھی دولت عثمانیہ کی باج گزار ریاستوں میں شامل کرلیا گیا۔

کسووا کی دوسری جنگ وارنا کی شکست کے بعد ہونیاڈے ترکوں سے انتقام لینے کی تیاریوں میں مصروف رہا، اس کے دامن شہرت پر وارنا کا داغ بہت ہی بدنما تھا، چنانچہ اس نے چار سال کے اندر اسّی ہزار کی ایک زبردست فوج پھر جمع کرلی اور دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سرویا میں داخل ہوا، یہاں ہنگری، سرویا اور بوسنیا کی فوجیں متحد ہوکر مراد کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئیں، سرویا اور بوسنیا نے جنگ وارنا کے بعد دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کرلی تھی، مگر ہونیاڈے کی کوششوں سے یہ دونوں حکومتیں اپنے معاہدہ سے منحرف ہوگئیں اور مکمل آزادی کی خواہش انہیں مراد کے بالمقابل میدانِ جنگ میں پھر کھینچ لائی، یہ قوت آزمائی کسووا کے اسی میدان میں ہوئی جہاں تقریباً ساٹھ سال پیش تر مراد اول نے سرویا کی طاقت و سلطنت کو شکست دے کر اسے اپنا مطیع بنا لیا تھا، تین روز کی شدید جنگ کے بعد ۱۸؍شعبان ۸۵۲ھ (۱۷؍اکتوبر ۱۴۴۸ء) میں مراد نے ہونیاڈے کی متحدہ افواج کو بری طرح شکست دی، کسووا کی اس دوسری عظیم الشان جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرویا کی آزادی سلب کرلی گئی اور وہ چند سال بعد سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا گیا، مراد نے بوسنیا سے سالانہ خراج قبول کرنے پر اکتفا کیا۔

اسکندر بک اس درمیان میں البانیا میں ایک نیا فتنہ پیدا ہوگیا تھا، مراد کے ابتدائی عہد حکومت میں البانیا کی ایک ریاست کا امیر جان کستریو (John Castriot) دولت علیہ کا مطیع ہو

[1] تاریخ دولت عثمانیہ، از فرید بک، ص ۵۷۔

گیا تھا، بطور ضمانت اس نے اپنے چار لڑکے مراد کی خدمت میں بھیج دیے تھے، ان میں سے تین تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے، چوتھا لڑکا جارج کستریو زندہ رہا اور اس کی ہونہاری اور فراست نے بہت جلد سلطان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، مراد نے اپنی ذاتی نگرانی میں جارج کو اسلامی اور فوجی تعلیم دلوائی اور اس کی لیاقت اور شجاعت سے خوش ہو کر محض اٹھارہ سال کی عمر میں اسے ایک سنجق کا حاکم بنا دیا اور اسکندر بک کے لقب سے سرفراز فرمایا، جان کستریو کا جب انتقال ہوا تو مراد نے اس کی ریاست سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی، یہ بات اسکندر بک کو بہت ناگوار گزری لیکن اس نے ایک عرصہ تک اپنے اندرونی جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا، جب ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں ہونیاڈے کے مقابلہ میں عثمانی فوج کو شکست ہوئی تو اسکندر بک نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے باپ کی ریاست پر قبضہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا، چنانچہ ایک روز وہ رئیس آفندی یعنی سلطان کے چیف سکریٹری کے خیمہ میں تھا دفعتاً داخل ہوا اور اس کے گلے پر خنجر رکھ کر البانیا کے مضبوط شہر آق حصار (جس کا قدیم نام کرویا (Croia) تھا، کے ترک افسر کے نام ایک حکم نامہ لکھوا لیا کہ شہر اور اس کے ملحق علاقے بہ حیثیت گورنر کے اسکندر بک کو دے دیے جائیں، یہ تحریر حاصل کر لینے کے بعد اس نے رئیس آفندی کو فوراً قتل کر دیا اور اسی وقت البانیا کی طرف روانہ ہو گیا، آق حصار پہنچ کر اس فرمان کے ذریعہ سے وہ شہر پر قابض ہو گیا، اس کے بعد اس نے اپنے ارتداد کا اعلان کیا اور دین عیسوی کی حمایت اور البانیا کی آزادی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، البانیا کے مختلف جرگوں کے سردار اس کے علم کے نیچے جمع ہونے لگے، ان کی مدد سے اس نے متعدد قلعوں پر قبضہ کر لیا اور پھر ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے آبائی علاقوں میں داخل ہوا، اس کے بعد تمام قومی امراء نے اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا، تقریباً پچیس سال تک وہ ترکوں کا مقابلہ کرتا رہا، البانیا کے پیچ در پیچ پہاڑی دروں کی وجہ سے عثمانی فوجوں کو کھل کر لڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور متعدد کوششوں کے باوجود البانیا مراد کی حیات میں پوری طرح مسخر نہ ہو سکا۔

مراد کی وفات ۵ محرم ۸۵۵ھ (۹ فروری ۱۴۵۱ء) کو مراد نے اورنہ میں وفات پائی، تجہیز و تکفین قدیم پایہ تخت بروصہ میں ہوئی۔

اخلاق واوصاف مراد کے عدل وانصاف اور شریفانہ اوصاف کا اعتراف اس کے دشمنوں نے بھی کیا ہے، یونانی مؤرخین بھی اس کی فوجی قابلیت کے علاوہ اس کی اخلاقی عظمت کی شہادت دیتے ہیں اور اس بات میں ترک مؤرخین کے ہم نوا ہیں[1]، لارڈ ایورسلے جس کے قلم سے آلِ عثمان کے محاسن کا اعتراف بہت شاذ ہوتا ہے، مراد کے عہدِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''اس کی حکومت پر نظر ڈالنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے توسیع سلطنت کے مقصد سے لڑائیاں لڑیں، تقریباً ہر جنگ کے لیے وہ مجبور کیا گیا، تین بار امیر کرمانیہ نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، ہر بار مراد نے اس کو شکست دی اور کرمانیہ کو صرف ایک باج گزار ریاست بنا لینے پر قناعت کی اور اس کی آزادی کو فنا کرکے اسے سلطنت میں ضم کر لینے پر اصرار نہیں کیا، یہ دکھایا جا چکا ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کا طرزِ عمل کس قدر غدارانہ تھا اور مراد اس کے مقبوضات کے دائرہ کو تنگ سے تنگ کر دینے میں کس درجہ حق بجانب تھا، اسی طرح سالونیکا پر بھی مراد کا حملہ، جب کہ وہ شہر جمہوریۂ وینس کے ہاتھ میں تھا، بالکل حق بجانب تھا کیوں کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کو اسے فروخت کرنے اور یوں اور ایک غیر حکومت کو وہاں قدم جمانے کی جگہ دینے کا کوئی حق نہ تھا، شمالی سرحد پر جو لڑائیاں ہوئیں ان میں مراد کو اہلِ ہنگری اور ان کی حلیف مسیحی طاقتوں کے جارحانہ اقدام سے مجبور ہو کر میدان میں آنا پڑا، اتحادیوں نے تلوار سے فیصلہ چاہا اور فیصلہ ان کے خلاف ہوا[2]۔''

گبن ایک ترک مؤرخ کا بیان نقل کرتا ہے:

> ''سلطان مراد نے انچاس سال کی عمر پائی اور تیس سال چھ مہینے اور آٹھ روز حکومت

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۱۸ [2] ایورسلے، ص ۷۱۔

کی، وہ ایک عادل اور شجاع فرماں روا تھا، نہایت کشادہ دل، مستقل مزاج، عالم، رحم دل، پابند مذہب اور فیاض، وہ اہل علم اور ان تمام لوگوں سے جو کسی علم یا فن میں کمال رکھتے، محبت کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا، وہ ایک نیک شہنشاہ اور ایک جلیل القدر سپہ سالار تھا، کسی شخص نے مراد سے زیادہ اس سے بڑی فتوحات نہیں حاصل کیں، اس کے عہد حکومت میں سپاہی ہمیشہ فتح یاب تھا اور شہری خوش حال اور مامون، جب وہ کسی ملک کو فتح کرتا تو سب سے پہلے وہاں مسجدیں اور کارواں سرائیں، ہسپتال اور مدرسے تعمیر کراتا، ہر سال وہ ایک ہزار طلائی سکے سادات کی نذر کرتا اور ڈھائی ہزار مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے دین دار لوگوں کے لیے بھیجتا۔''

اس کے بعد گبن خود اپنی تحقیق لکھتا ہے:

''مراد کے عدل وانصاف اور بردباری کی تصدیق اس کے طرزِ عمل نیز خود عیسائیوں کی شہادت سے ہوتی ہے، جن کا خیال ہے کہ اس کے عہد کی خوش حالی اور اس کی پر سکون موت اس کے غیر معمولی اوصاف کا صلہ تھی، اپنی عمر اور فوجی قوت کے دورِ شباب میں بھی اس نے شاذ ہی کسی میدانِ جنگ میں قدم رکھا، جب تک پہلے دشمن کی طرف سے اس کو جنگ کے لیے کافی طور پر برانگیختہ نہ کیا گیا، دشمن کے مطیع ہو جانے کے بعد فاتح سلطان اپنے ہتھیار کو کھول کر رکھ دیتا تھا اور صلح ناموں کی پابندی میں اس کا عہد ناقابل شکست اور مستحکم تھا، حملہ کی ابتدا عموماً اہل ہنگری کی طرف سے ہوا کرتی تھی، اسکندر بک کے خلاف اس کو اشتعال خود اسکندر بک کی بغاوت کی وجہ سے پیدا ہوا اور کرمانیہ کے غدار امیر کو سلطان نے دو بار زیر کیا اور دونوں مرتبہ معاف کر دیا، قبل اس کے کہ وہ موریا پر چڑھائی کرے، تھیبیز پر موریا کا فرماں روا اچانک حملہ کر چکا تھا، جہاں تک سالونیکا کی فتح کا تعلق ہے، بایزید کا پوتا اہل وینس کی تازہ خریداری کو زیر بحث لا سکتا تھا اور قسطنطنیہ کے پہلے محاصرہ کے بعد سلطان کو پھر کبھی پلیولوگس کی مصیبت، غیر موجودگی یا اذیتوں کی بنا پر سلطنت بازنطینی کے بجھتے ہوئے چراغ کو گل کر دینے کی ترغیب نہیں ہوئی[1]۔''

[1] گبن، جلد ۴، ص ۴۶۰، ۴۶۱۔

محمد فاتح

۸۵۵ھ تا ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء

شہزادہ محمد ریاست ایدین میں تھا جب اسے مراد کی وفات کی اطلاع ملی، وہ فوراً ایک عربی گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ کہتا ہوا کہ ''جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں، میرے ساتھ آئیں'' دردِ دانیال کی طرف روانہ ہو گیا اور اسے عبور کر کے ادرنہ پہنچا، تخت نشینی کے وقت ینی چری کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اسے انعامات تقسیم کرنے پڑے، جس سے آئندہ کے لیے ایک مثال قائم ہو گئی اور ینی چری میں اپنی اہمیت کا مزید احساس پیدا ہو گیا۔

معصوم بھائی کا قتل زمامِ سلطنت کو ہاتھ میں لینے کے بعد محمد نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے شیر خوار بھائی کو جو سرویا کی شہزادی کے بطن سے تھا، آئندہ فتنہ کے خوف سے حوض میں غرق کرا دیا، معصوم بچہ کا یہ قتل عین اس وقت عمل میں آیا جب غریب و بے کس ماں سلطان کے حکم سے بالکل بے خبر اس کی تخت نشینی پر دربار میں تہنیت پیش کر رہی تھی۔

شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش محمد کی تخت نشینی سے تین سال قبل بازنطینی سلطنت کا آخری فرماں روا قسطنطین یازدہم قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھ چکا تھا، قسطنطین ایک بہادر شہزادہ تھا لیکن محمد کو برافروختہ کرنے میں اس نے اسی شدید غلطی کا اعادہ کیا جس کا خمیازہ اس کے پیش رو مینوئل کو مراد ثانی کے ہاتھوں بھگتنا پڑا تھا، سلطان بایزید یلدرم کا ایک پوتا اورخان نامی جو شہزادہ سلیمان کی اولاد سے تھا، قسطنطنیہ میں نظر بند تھا، اس کے مصارف سلطان کی

طرف سے ادا ہوتے تھے، قسطنطین نے اس رقم میں اضافہ کا مطالبہ کیا اور عدم منظوری کی صورت میں اورخان کو محمد کے مقابل کھڑا کر دینے کی دھمکی دی، اس نے اپنی غلط فہمی سے یہ خیال کیا کہ محمد اب بھی ویسا ہی ناتجربہ کار ہے جیسا کہ چھ سال قبل تھا، اسے معلوم نہ تھا کہ اس قلیل مدت میں نوعمر سلطان کی قوتیں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی پا چکی ہیں اور اکیس ہی سال کی عمر میں وہ ارادہ کی پختگی، فوجی قابلیت اور ملکی تنظیم و تدبیر میں اپنے پیش روؤں کا حریف بن چکا ہے، محمد اس وقت ایشیائے کوچک کی بعض شورشوں کے فرو کرنے میں مصروف تھا، اس نے بازنطینی سفراء کو نرمی سے جواب دے کر ٹال دیا لیکن وزیر اعظم خلیل پاشا نے قسطنطین کو اس احمقانہ مطالبہ کے خطرات سے متنبہ کیا اور سفراء سے کہا کہ ''تمہارا جنون قسطنطنیہ کو سلطان کے ہاتھوں میں دے کر رہے گا، یورپ میں اورخان کے سلطان ہونے کا اعلان کرو، اہل ہنگری کو اپنی مدد کے لیے بلاؤ، جو صوبے تم واپس لے سکتے ہو واپس لے لو لیکن بہت جلد تم کو بازنطینی سلطنت کا خاتمہ بھی نظر آ جائے گا۔''

قسطنطنیہ کی اہمیت اصل یہ ہے کہ ابتدا ہی سے محمد نے قسطنطنیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کا تہیہ کر لیا تھا، سینوپ اور طرابزون کے علاوہ قدیم بازنطینی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقوں پر عثمانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا، یورپ میں بھی صرف قسطنطنیہ اور اس کے مضافات اس سلطنت میں باقی رہ گئے تھے، قیاصرہ کی وہ عظیم الشان سلطنت جو اپنی وسعت اور قوت کے لحاظ سے کبھی دنیا کی تمام سلطنتوں پر فوقیت رکھتی تھی، اب تباہی اور بربادی کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی اور جہاں تک وسعت اور قوت کا تعلق تھا، گویا فنا ہو چکی تھی، تاہم اس حالت میں بھی قسطنطنیہ کا وجود بجائے خود نہایت اہم تھا اور قصر سلطنت کی یہ پہلی اور آخری اینٹ ہنوز اپنی جگہ قائم تھی، ترکوں نے جس وقت یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا، اسی وقت سے اس شہر کو فتح کر لینے کا حوصلہ ان کے دلوں میں راسخ ہوتا گیا، جوں جوں فتوحات کا دائرہ بڑھتا جاتا تھا، ان کے ارادہ میں قوت آتی جاتی تھی اور بالآخر اس کا پہلا عملی اظہار بایزید یلدرم

کے عہد میں ہوا، جب کہ اس نے آبنائے باسفورس کے مشرقی ساحل پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرانے کے بعد قسطنطنیہ کا محاصرہ شروع کیا لیکن محاصرہ کو چند ہی روز گزرے تھے کہ تیموری حملہ نے بایزید کو اسے اٹھا لینے پر مجبور کیا اور جنگ انگورہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے قسطنطنیہ محفوظ و مامون ہو گیا، مراد ثانی اگرچہ شہنشاہ قسطنطنیہ سے آویزش پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن خود شہنشاہ کی غداری نے اسے مجبور کیا کہ سلطنت عثمانیہ کی حفاظت کے خیال سے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے اس فتنہ کا استیصال کر دے، مگر سلطنت بازنطینی کے ایام حیات ابھی کچھ اور باقی تھے اور مراد کو بھی ایشیائے کوچک کی ایک بغاوت کے باعث محاصرہ اٹھا کر شہنشاہ کی اطاعت اور خراج قبول کرنے پر اکتفا کرنا پڑا، تاہم ترکوں کی نظریں اب بھی قسطنطنیہ پر جمی ہوئی تھیں، یہ شہر اپنے موقع کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کا قدرتی پایہ تخت تھا، بحر مامورا کے دونوں ساحلوں پر عثمانیوں کی حکومت تھی لیکن جب تک قسطنطنیہ عیسائیوں کے قبضہ میں رہتا، سلطان کے ایشیائی اور یورپی صوبوں کا درمیانی تعلق کبھی محفوظ نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا علاوہ اس عظمت و شان کے جو اس تباہی اور بربادی کی حالت میں بھی بازنطینی سلطنت کے پایہ تخت سے وابستہ تھی، خود اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے بھی قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا ناگزیر تھا، یہ مصالح بجائے خود محمد ثانی جیسے سلطان کو اس مہم پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھے، قسطنطین کی دھمکی نے اسے اور زیادہ برانگیختہ کر دیا اور اس نے اپنے دورِ حکومت کے سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔

قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں اس غرض سے کہ قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران میں اسے کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہونا پڑے، اس نے پہلے ایشیائے کوچک کی شورشوں کو فرو کیا اور امیر کرمانیہ سے صلح کر کے اس کی لڑکی سے عقد کر لیا، اس کے بعد تین سال کے لیے ہونیاڈے سے بھی صلح کر لی، جس کی وجہ سے شمالی یورپ کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا، پھر اس نے ایک فوج موریا میں بھیج دی تا کہ شہنشاہ کے بھائی جو وہاں حکومت کرتے

تھے، قسطنطنیہ کی مدد کرنے سے روک دیے جائیں، ان تدبیروں سے فارغ ہو کر اس نے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل اور قسطنطنیہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کرانا شروع کیا، یہ قلعہ بایزید یلدرم کے بنوائے ہوئے قلعہ کے جو آبنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر واقع تھا، بالکل مقابل تھا، قسطنطین نے اس قلعہ کی تعمیر کے خلاف احتجاج کیا لیکن بے سود، دورانِ تعمیر میں بعض ترکوں نے چند یونانی کاشت کاروں سے کچھ چھیڑ کی جس نے ایک چھوٹی سی لڑائی کی شکل اختیار کر لی اور اس میں فریقین کے چند سپاہی مارے گئے، قسطنطین سمجھ چکا تھا کہ یہ ساری تیاریاں دراصل قسطنطنیہ پر حملہ کے لیے ہو رہی ہیں، اس نے خوف زدہ ہو کر شہر کا پھاٹک بند کرایا اور ایک وفد کے ذریعہ سے محمد ثانی کی خدمت میں ترک سپاہیوں کے طرزِ عمل کی شکایت کی، محمد نے اس شکایت کا جواب اعلانِ جنگ سے دیا، اب سلطنت بازنطینی کی موت وزیست کا مسئلہ آخری فیصلہ کا منتظر تھا۔

جدید قلعہ ۸۵۶ھ (۱۴۵۲ء) کے موسم سرما سے قبل تیار ہو گیا، آبنائے باسفورس اب تمام ترکوں کے قبضہ میں تھی، کوئی جہاز بغیر ان کی اجازت کے اسے عبور نہیں کر سکتا تھا، اس قلعہ کی تعمیر کے بعد محمد جنگ کی دوسری تیاریوں میں مصروف ہوا، اس نے ادرنہ میں ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کی لیکن قسطنطنیہ کی فتح کے لیے محض سپاہیوں کی تعداد کافی نہ تھی خواہ وہ کتنی ہی زیادہ رہی ہو، یہ شہر مثلث نما تھا جس کے دو حصے پانی سے گھرے ہوئے تھے، شمال میں شاخِ زریں اور جنوب میں بحر مامورا تھا، بری فوجیں صرف تیسرے حصہ سے حملہ کر سکتی تھیں، جو مغرب کی جانب واقع تھا لیکن اس کی حفاظت یکے بعد دیگرے تین زبردست دیواریں کر رہی تھیں، جو توپوں کی ایجاد سے قبل ہر طرح کے حملہ سے محفوظ خیال کی جاتی تھیں، اندر کی دونوں دیواریں بہت موٹی تھیں اور ان پر ایک سو ستر فٹ کے فاصلہ سے مضبوط برج بنے ہوئے تھے، ان دیواروں کے درمیان ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا، باہر کی جانب دوسری اور تیسری دیوار کے بیچ میں ساٹھ فٹ چوڑی ایک خندق تھی، جو سو فٹ گہری تھی، یہ

دیواریں پانچویں صدی عیسوی میں شہنشاہ تھیوڈوسیس ثانی (Theodosius II) نے تعمیر کرائی تھیں اور اب تک اکیس محاصروں میں قسطنطنیہ کو دشمنوں کے قدم سے محفوظ رکھ چکی تھیں، قسطنطنیہ کی فتح کے لیے ضروری تھا کہ ان دیواروں پر کامیابی کے ساتھ گولہ باری کی جائے، کچھ عرصہ سے ترکوں اور عیسائیوں نے جنگ میں توپوں کا استعمال شروع کر دیا تھا لیکن محمد نے مروجہ توپوں کو ناکافی خیال کر کے نہایت عظیم الشان توپیں بنوائیں، جو اپنی جسامت اور طاقت کے لحاظ سے بے نظیر تھیں، اُربان (Urban) نامی ایک عیسائی انجینیر نے، جو ہنگری کا رہنے والا تھا اور بازنطینیوں کی ملازمت سے علاحدہ ہوکر سلطان کی خدمت میں چلا آیا تھا، ایک نہایت زبردست توپ ڈھالی، جس کے سنگی گولوں کا قطر ڈھائی فٹ تھا، اس کے علاوہ اس نے اور بھی توپیں بنائیں جو نسبتاً چھوٹی تھیں لیکن زیادہ تیزی کے ساتھ گولے برسا سکتی تھیں، محمد نے قسطنطنیہ کے محاصرہ کے لیے ایک سو اسّی جہازوں کا ایک بیڑا بھی تیار کرایا، وہ محاصرہ کی تیاریوں میں حد درجہ منہمک تھا اور اس کے لیے تمام سامان اپنی ذاتی نگرانی میں فراہم کر رہا تھا۔

مدافعت کی تیاریاں

ادھر قسطنطین بھی مدافعت کی تیاریوں میں اسی قدر مصروف تھا، اس نے شہر کی دیواروں کی مرمت کرائی اور جو کچھ رسد ممکن تھی، بہم پہنچائی، اس کے بعد اس نے مغربی یورپ کے فرماں رواؤں سے مدد کی درخواست اور پوپ کی پوری اعانت اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کلیسائے رومہ کے تمام مطالبات کو منظور کر کے یونانی کلیسا کو اس سے ملحق کر دیا، سینٹ صوفیا میں پوپ کے نمائندہ کارڈینل اسیڈور (Cardinal Isidore) کے زیرِ صدارت ایک مجلس منعقد ہوئی، جس میں شہنشاہ، اس کے درباری اور قسطنطنیہ کے تمام ملکی اور مذہبی عہدے دار شریک ہوئے اور کلیسائے قسطنطنیہ کو کلیسائے رومہ سے متحد کرنے کی تجویز کثرتِ رائے سے منظور کر لی گئی، اس فیصلہ نے یونانی پادریوں کو بہت برافروختہ کیا اور شہر کی آبادی کے بڑے حصہ نے اس سے اپنی بے زاری کا علانیہ اظہار کیا، دونوں

کلیساؤں کے درمیان جو قدیم عناد چلا آتا تھا، وہ اس نازک موقع پر بھی قائم رہا اور شہنشاہ کے اس فعل نے خود اس کی رعایا کی ایک کثیر تعداد کو اس سے برگشتہ کر دیا، گرانڈ ڈیوک نوٹاراس (Notaras) جو تمام افواجِ قسطنطنیہ کا سپہ سالار اور قسطنطین کے بعد سلطنت کی سب سے بڑی شخصیت تھا، اس قدر برہم تھا کہ اس نے صاف لفظوں میں یہ کہا کہ کارڈینل کی ٹوپی کے مقابلہ میں قسطنطنیہ میں ترکوں کے عمامے دیکھنا مجھے زیادہ گوارا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ خود یونانیوں میں دو جماعتیں ہو گئیں، ایک جو کلیسائے رومہ کی طرف دار اور اس نازک وقت میں اس کی مدد کی خواستگار تھی، دوسری وہ جو اس حالت میں بھی کلیسائے رومہ سے اتحاد کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھی، دوسری جماعت پہلی سے بڑی تھی، چنانچہ اس جماعت کے گرجاؤں نے شہنشاہ کو مالی مدد دینے سے انکار کر دیا اور اس میں سے جو لوگ جنگ میں شریک ہو سکتے تھے، ان کی ایک بہت قلیل تعداد نے شہر کی محافظت کے لیے آمادگی ظاہر کی، قسطنطنیہ کی آبادی باوجود بہت کچھ کم ہونے کے ایک لاکھ کے قریب تھی لیکن ترکو کے مقابلہ میں قسطنطین کی حمایت کے لیے صرف چھ ہزار یونانیوں نے اپنی خدمات پیش کیں[1]۔

مغربی یورپ کی سرد مہری قسطنطین نے مغربی یورپ سے مدد کی جو درخواست کی تھی، وہ بھی بہت ناکافی حد تک پوری ہوئی، پوپ میں آزمودہ کار سپاہیوں کی ایک تعداد اور کچھ مالی مدد کارڈینل اسیڈور کے ساتھ روانہ کی، اٹلی اور اسپین کے بعض شہروں نے جو قسطنطنیہ سے تجارتی کاروبار رکھتے تھے، چند فوجی دستے بھیجے، وینس اور اسپین کے صوبہ کٹالونیا اور اراگن نے کچھ مدد کی لیکن ان سب سے زیادہ قیمتی مدد اہل جنوا کی طرف سے آئی، مشہور جنوی کمانڈر جان جسٹینانی (John Giustinani) دو جنگی جہازوں اور سات سو منتخب بہادروں کے ساتھ محاصرہ شروع ہونے سے تھوڑی ہی مدت آ پہنچا، یہ شخص اپنی شجاعت اور اعلیٰ فوجی قابلیت کے لحاظ سے تنہا ایک فوج کے برابر تھا، دورانِ محاصرہ میں اور خاص کر آخری حملہ کے

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۲۵۔

روز اس نے ایسی جاں بازی کا ثبوت دیا کہ خود محمد ثانی کی زبان سے بے اختیار اس کی تحسین نکل گئی اور اس نے کہا "کاش یہ شخص میرے فوجی سرداروں میں ہوتا" بہرحال مغربی یورپ سے مختلف حکومتوں نے جو فوج بھیجی تھی اس کی مجموعی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی اور ان کو شامل کرنے کے بعد قسطنطین کی تمام فوج صرف نو ہزار تک پہنچی تھی، تعجب یہ ہے کہ قسطنطین کی درخواست کا کوئی اثر فرانس، جرمنی، ہنگری اور پولینڈ پر نہ ہوا اور سلطنتیں جو بار بار ایک عظیم الشان مسیحی اتحاد قائم کر کے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کے لیے مذہبی جوش وخروش کے ساتھ آگے بڑھتی تھیں، قسطنطنیہ کے اس آخری لمحۂ حیات میں جب کہ ان ہی ترکوں کے ہاتھوں سلطنت بازنطینی کا خاتمہ ہو رہا تھا، کامل بے حسی اور بے پروائی کے ساتھ اپنے اپنے مقام سے اس منظر کو دیکھتی رہیں، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ قسطنطین کے معاملہ سے یورپ کو زیادہ دل چسپی نہ تھی، مگر ہمارے نزدیک عیسائی سلطنتوں کے اس طرزِ عمل کا باعث کچھ اور ہی تھا، گذشتہ ۶۵ سال کے اندر ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کی غرض سے انہوں نے چار مرتبہ مذہبی اتحاد کے ذریعہ اپنی تمام قوتوں کو یک جا کیا لیکن ہر بار انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی اور مسیحی اتحاد کا شیرازہ بندھ بندھ کر منتشر ہوتا گیا، کسووا (۱۳۸۹ء)، نائیکوپولس (۱۳۹۶ء) وارنا (۱۴۴۴ء) اور کسووا (۱۴۴۸ء) کی تباہ کن شکستیں اتنی تازہ تھیں کہ یورپ اس قسم کے کسی مزید تجربہ کے لیے تیار نہ تھا اور باوجود اس کے کہ قسطنطین نے اپنا اور اپنی سلطنت کا مذہب تبدیل کر کے کلیسائے رومہ کی اطاعت قبول کر لی اور وہ کر ڈالا جو صدیوں کی کوشش کے بعد بھی مغربی یورپ کی تمام قوتیں انجام نہ دے سکی تھیں، یورپ کے جمود میں کوئی محسوس حرکت پیدا نہ ہوئی اور قسطنطنیہ کی دیواروں کو آخر کار محمد فاتح کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

محاصرہ | ۲۶ ربیع الاول ۸۵۷ھ (۶ اپریل ۱۴۵۳ء) کو محاصرہ شروع ہوا، دورانِ محاصرہ میں یونانیوں نے غیر متوقع شجاعت اور استقلال کا ثبوت دیا، جسٹینانی کی فوجی مہارت خاص طور پر نمایاں تھی اور وہ اپنی قابلیت کے جوہر دکھا کر بار بار سلطان سے خراج

تحسین وصول کر رہا تھا، بری فوج کے حملہ کا ابھی کوئی معمولی اثر بھی ظاہر نہ ہونے پایا تھا کہ وسط اپریل میں ایک مختصر سی بحری جنگ پیش آ گئی، ایک یونانی اور چار جنوی جہاز اہل قسطنطنیہ کے لیے سامانِ رسد لا رہے تھے، بحر مامورا کو عبور کرنے کے بعد جب وہ آبنائے باسفورس میں بمشکل داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ۱۴۰ عثمانی کشتیاں ان کی راہ میں حائل ہیں، جس وقت یہ جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچے ترکی بیڑے نے حملہ کر دیا لیکن جنوی جہاز عثمانی کشتیوں کے مقابلہ میں بہت اونچے اور طاقت ور تھے، انہوں نے عثمانی کشتیوں پر پتھر اور آگ برسانا شروع کر دیا جس سے ان میں انتشار پیدا ہو گیا اور یہ انتشار ان کی کثرت تعداد کی وجہ سے اور بھی بڑھ گیا، سلطان ساحل پر کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے بے اختیار اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا لیکن ترکی بیڑا اس وقت تک اس قدر منتشر ہو چکا تھا کہ عیسائی جہازوں کو نکل جانے کا راستہ مل گیا اور وہ اہل قسطنطنیہ کے نعرہ ہائے مسرت کے ساتھ بہ حفاظت بندرگاہ میں پہنچ گئے۔

جنوی جہازوں کی اس شان دار فتح کا اخلاقی اثر محصورین پر بہت اچھا پڑا، ان میں جرأت و استقلال کی ایک نئی روح پیدا ہو گئی، تاہم صرف اس روح کا پیدا ہو جانا ہی مدافعت کے لیے کافی نہ تھا، جنوی رسد کے بعد پھر کوئی رسد انہیں باہر سے نہ مل سکی، دوسری طرف محمد نے بھی اپنی پہلی بحری شکست کے بعد محاصرہ کی سختی کے لیے ایک زیادہ مؤثر تدبیر سوچی، اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ آبنائے باسفورس کے اس حصہ میں جہاں پانی زیادہ گہرا تھا، ترکی بیڑا عیسائیوں کے طاقت ور جہازوں کے مقابلہ میں مشکل سے کام یاب ہو سکتا تھا، لہٰذا اس نے اپنی کشتیوں کی ایک بڑی تعداد بندرگاہ کے بالائی حصہ میں منتقل کر دینا چاہی، جہاں پانی تنگ اور چھچھلا تھا اور جس میں یونانی اور جنوی جہاز اپنے قد و قامت کی وجہ سے کام یاب نہیں ہو سکتے تھے، سمندر کے راستہ سے بندرگاہ کے اس حصہ تک پہنچنا ممکن نہ تھا، اس لیے محمد نے ایک ایسی صورت اختیار کی جو اس کی ذہانت اور آہنی عزم و استقلال کی ایک غیر فانی مثال ہے، باسفورس اور بندرگاہ

قسطنطنیہ کے درمیان پانچ میل کا فاصلہ ہے، اس نے اس درمیانی پہاڑی زمین پر لکڑی کے تختوں کی ایک سڑک بنوائی اور ان تختوں کو چربی سے خوب چکنا کروا دیا اور ایک رات کے اندر اسّی کشتیاں بیلوں سے کھنچوا کر بندرگاہ کے اس حصہ میں پہنچا دیں، قسطنطنیہ کا یہ حصہ اب تک بالکل محفوظ تھا، ترکی کشتیوں کے پہنچ جانے سے اب یہ بھی حملہ کی زد میں آگیا اور قسطنطین کو مجبوراً سپاہیوں کا ایک دستہ شہر کے دوسرے حصہ سے ہٹا کر اس حصہ میں متعین کرنا پڑا۔

اس درمیان میں شہر کی دوسری سمتوں میں برابر حملے ہو رہے تھے، لیکن ان زبردست دیواروں پر جو ایک ہزار سال سے دشمنوں کا مقابلہ کر رہی تھیں، ہنوز ان حملوں کا کوئی اثر ظاہر نہ تھا، بالآخر سات ہفتوں کی متواتر گولہ باری کے بعد دیواروں میں تین مقامات پر شگاف نمودار ہوئے اور محمد کو آخری حملہ کی کامیابی کا یقین ہو گیا، ۱۵ر جمادی الاول ۸۵۷ھ (۲۴ر مئی ۱۴۵۳ء) کو اس نے قسطنطین کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ شہر کو سپرد کر دے تو رعایا کی جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور موریا کی حکومت اسے دے دی جائے گی لیکن قسطنطین نے اسے منظور نہ کیا، اس کے بعد محمد نے فوج میں اعلان کرا دیا کہ ۲۰ر جمادی الاول (۲۹ر مئی) کو آخری حملہ ہوگا۔

سقوطِ قسطنطنیہ ۲۰ر جمادی الاول ۸۵۷ھ (۲۹ر مئی ۱۴۵۳ء) کی رات ترکوں نے تسبیح و تہلیل میں گزاری اور فریضۂ فجر ادا کرنے کے بعد حملہ شروع ہوا، حملہ مختلف سمتوں میں ہو رہا تھا لیکن سب سے زیادہ زور اس حصہ پر تھا جو دروازہ سینٹ رومانس کے قریب تھا، وہاں کی دیوار ترکی توپوں کی گولہ باری سے بہت کچھ مجروح ہو چکی تھی، عثمانی اور یونانی سپاہیوں کی تعداد میں کوئی مناسبت نہ تھی لیکن دوپہر سے پہلے تک انتہائی کوشش اور فتح کی پوری امید کے باوجود عثمانی فوج کا ایک سپاہی بھی شہر میں داخل نہ ہو سکا، قسطنطین اور اس کے ساتھیوں نے اس روز حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا اور ترکوں کی باڑھ کو بے حد پامردی سے روکتے رہے لیکن محمد بھی عزم و استقلال کا مجسمہ تھا، وہ ابتدائی ناکامیوں سے متاثر نہ ہوا اور اب خود اپنے ینی

چری دستوں کو لے کر آگے بڑھا، یونانی اس وقت تک بالکل خستہ ہو چکے تھے، ان میں اس تازہ حملہ کی تاب نہ تھی، اسی درمیان میں جسٹینانی کو جو گویا مدافعت کی روح تھا، ایک کاری زخم لگا، جس سے وہ کچھ ایسا خائف ہوا کہ جنگ سے بالکل کنارہ کش ہو گیا، ایسے نازک وقت میں جب محمد اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ کر رہا تھا، جسٹینانی کا اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلا جانا گویا شہر کو دشمن کے سپرد کر دینا تھا لیکن قسطنطین کے شدید اصرار کے باوجود وہ کچھ دیر بھی نہ ٹھہرا اور فوراً بندرگاہ میں چلا گیا، اس کے ہٹتے ہی عیسائیوں میں کم زوری کے آثار نمایاں ہونے لگے، قسطنطین نے خود موقع پر پہنچ کر کمان اپنے ہاتھ میں لی مگر ینی چری کا حملہ اتنا سخت تھا کہ شہنشاہ اور اس کے بہادر سپاہیوں کی جاں بازی زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکی، ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس ہم راہیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا اور اگر چہ حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھی فوراً مار کر گرا دیے گئے تاہم باقی کام یاب رہے اور اس کے بعد ہی ترکی دستے بھی یکے بعد دیگرے پہنچتے گئے، یونانیوں کے لیے اب کوئی امید باقی نہ رہی، قسطنطین نے اپنی سرخ عبا جو قیاصرہ کی امتیازی پوشاک تھی، اتار کر پھینک دی اور ترکی فوج کے بڑھتے ہوئے طوفان میں گھس کر ایک جاں باز اور سرفروش سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا۔

فاتح کا داخلہ چند لمحوں کے اندر قسطنطنیہ فاتحوں کے پے در پے دستوں سے بھر گیا، پہلے تو انہوں نے فتح کے ابتدائی جوش میں قتل عام شروع کر دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب یہ جوش کسی قدر ٹھنڈا ہوا اور نیز یہ دیکھ کر کہ شہر والوں کی طرف سے مزاحمت نہیں ہوتی، انہوں نے اپنی تلواریں نیام میں کر لیں اور مالِ غنیمت کے حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے، ظہر کے قریب سلطان محمد فاتح اپنے وزرا اور امرائے سلطنت کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، سینٹ صوفیا کے گرجے کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا اور اس عالی شان معبد میں داخل ہو کر، جس میں گیارہ سو برس سے تین خداؤں کی پرستش ہوتی آئی تھی، خدائے واحد کی تسبیح و تقدیس کے لیے سربسجدہ ہوا اور مؤذن کو حکم دیا کہ اللہ کے بندوں کو اس کی عبادت کے لیے آواز

دے، فتح کے دوسرے روز محمد نے شہر کا جائزہ لیا، جب قیاصرہ کے شاہی محل میں پہنچا اور اس کے ویران اور اجڑے ہوئے ایوانوں پر نظر پڑی تو بے اختیار اس کی زبان پر یہ شعر آ گیا:

پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت   چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

قسطنطنیہ میں داخل ہونے کے بعد ترکوں نے جو کچھ کیا وہ تاریخ کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا، قرونِ وسطیٰ کے دستورِ جنگ میں مفتوحین کی جان و مال تمام تر فاتح کی ملک ہوتی تھی، جس پر اسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہوتا تھا، یورپ کی سلطنتوں نے اس اختیار کے استعمال میں کبھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور ظلم و تعدی کی ایسی ہول ناک مثالیں پیش کیں جو تخیل میں بھی بمشکل آ سکتی ہیں، جب کبھی انہوں نے مسلمانوں پر فتح پائی وہ سب کچھ کر ڈالا جو تاریخ مظالم کے روشن ترین کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے، اس کے مقابلہ میں ترکوں نے قسطنطنیہ میں داخل ہو کر جو کچھ کیا وہ حقیقۃً کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا، بلاشبہ شروع شروع میں جو بھی سامنے آیا اس کو قتل کر دیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور مدافعت کی قوت ان میں باقی نہیں رہی تو فوراً ہی اپنی تلواریں نیام میں کر لیں اور مالِ غنیمت کے جمع کرنے میں مصروف ہو گئے، یہ سلسلہ تین روز تک جاری رہا، چوتھے روز سلطان نے امن عام کا اعلان کیا اور سپاہیوں کے ہاتھ دفعۃً رک گئے، اس موقع پر ایورسلے لکھتا ہے:

> ”اگرچہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کیے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فتح قسطنطنیہ کے موقع پر ویسی نفرت انگیز بدمستیوں کا مظاہرہ ہوا جیسی ۱۲۰۴ء میں دیکھی گئی تھیں جب کہ محاربین صلیبی نے اس پر قبضہ کیا تھا، داخلہ کے ابتدائی چند گھنٹوں کے بعد اس موقع پر کوئی قتل عام نہیں ہوا، آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی، سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا[1]۔“

---

[1] لارڈ ایورسلے، ص ۸۸۔

عیسائیوں کی مذہبی اور ملی آزادی | یکم جون ۱۴۵۳ء کو سلطان نے امن عام کا اعلان کیا اور ان تمام عیسائیوں کو جو قسطنطنیہ سے بھاگ گئے تھے، واپس آنے کی دعوت دی، اس نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا اور انہیں آمادہ کیا کہ آ کر اپنے پیشوں اور کاروبار میں پھر بدستور مشغول ہو جائیں، اس کے بعد اس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو از سرنو اس کے عہدہ پر مامور کیا اور کلیسا کی سرپرستی خود قبول کی، ایک خاص فرمان کے ذریعہ یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی، وہ اور نیز اس کے کلیسا کے دوسرے عہدہ دار تمام ٹیکسوں سے بری کر دیے گئے، اسی فرمان کے ذریعہ یونانیوں کے نصف گرجے انہیں واپس کر دیے گئے اور ان کو اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دے دی گئی، اس فرمان میں سلطان نے انہیں اس امر کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے قومی معاملات اپنی ملّی عدالتوں میں طے کر لیا کریں، ان عدالتوں کا صدر کلیسا کے بطریق جارج گنادیس (George Gennadius) کو مقرر کیا جو خود یونانیوں کا منتخب کردہ تھا، سلطان نے یونانیوں کے قانونِ نکاح اور قانونِ وراثت کو بدستور قائم رکھا اور ان کا نفاذ بطریق اور مذہبی عدالتوں کے سپرد کیا، پروفیسر آرنلڈ اپنی مشہور کتاب ''دعوتِ اسلام'' میں سلطان محمد فاتح کی اس رواداری کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن ہونے کے بعد پہلا انتظام یہ کیا کہ وہ یونانی کلیسا کا حامی اور سرپرست بنا تاکہ عیسائی اس کی اطاعت قبول کریں، عیسائیوں پر سختی ہونے کی ممانعت کر دی اور ایک فرمان جاری کیا جس کے بموجب قسطنطنیہ کے نئے بطریق اور اس کے جانشینوں اور ماتحت اسقفون کو قدیم اختیارات جو حکومت سابقہ میں ان کو حاصل تھے، دیے گئے اور جو ذریعے ان کی آمدنی کے تھے وہ بحال ہوئے اور جن قواعد سے وہ مستثنیٰ تھے ان سے بدستور مستثنیٰ کیے گئے، گنادیوس کو جو ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریق ہوا، سلطان نے اپنے ہاتھ سے وہ عصا عنایت فرمایا جو اس کے منصب کا نشان تھا اور ایک خریطہ میں جس میں ایک ہزار اشرفیاں تھیں اور ایک گھوڑا جس پر بہت تکلف کا سامان تھا،

اس کو دیا اور اجازت دی کہ وہ اپنے قدیم سامانِ جلوس کے ساتھ شہر میں سوار ہو کر دورہ کرے، ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ کلیسا کے سب سے بڑے افسر کی وہی عزت اور وقعت قائم رکھی جو اس کو عیسائی شہنشاہانِ روم کے وقت میں حاصل تھی بلکہ عدالت کے وسیع اختیارات بھی اس کو دیے، بطریق قسطنطنیہ کی ایسے کل مقدمات کا جن میں فریقین مسیحی المذہب ہوں، فیصلہ کرتی تھی، جرمانہ کرنے اور مجرموں کو قید کی سزا دینے کے اختیارات جس کے لیے علاحدہ قید خانے بنے ہوئے تھے اور خاص صورتوں میں سزائے موت کے حکم دینے کا بھی اختیار اس کو حاصل تھا، وزرائے سلطنت اور ترکی حکام کو ہدایت تھی کہ اس عدالت کے فیصلوں کی تعمیل کریں، سابق کی عیسوی سلطنت نے رعایا کے مذہبی امور میں طرح طرح کی دست اندازیاں کی تھی لیکن ترکوں نے ان میں کچھ دخل نہیں دیا، بطریق اور اس کی مذہبی مجلس کو پورے اختیارات مذہب اور مذہبی انتظام کے بارہ میں حاصل ہوئے، بطریق مجاز تھا کہ مذہب مشوروں کی مجلس کو جب چاہے جمع کرے اور اس کے ذریعہ سے عیسوی فقہ اور اصول کے تمام مسائل کو بغیر سلطنت کی مداخلت کے طے کرے اور چوں کہ ایک حیثیت سے وہ سلطانی عہدہ دار بھی تھا، اس لیے اس کے اختیار میں تھا کہ مصیبت زدہ عیسائیوں کی حالت کی اصلاح اس طرح کرے کہ ناانصاف ترکی گورنروں کے کاموں سے سلطان کو اطلاع کر دے، یونانی اسقف جو اضلاع میں تھے، ان کی بھی بہت عزت تھی اور عدالت کے اختیارات ان کو اس قدر دیے گئے تھے کہ موجودہ زمانہ تک انہوں نے اپنے علاقوں میں عیسائیوں پر ترکی حاکموں کی طرح حکومت رکھی[1]۔''

لارڈ ایورسلے کو بھی تسلیم ہے کہ ''محمد کی یہ عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی یورپین حکومت کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی، اہل اسپین نے ان مسلمان مورس کو جنھوں نے اپنے کو گرفتار کرنے والوں (عیسائیوں) کا مذہب اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کے ملک سے نکالتے وقت اس کے نمونہ پر عمل نہیں کیا...... یونانیوں یا قسطنطنیہ کے

[1] دعوتِ اسلام از پروفیسر آرنلڈ (ترجمہ اردو)، ص ۶۵-۱۶۴۔

دوسرے باشندوں کو ترغیب یا جبر سے مسلمان بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی[1]۔''

قسطنطنیہ کی جدید آبادی عیسائیوں کو مذہبی آزادی کا پروانہ عطا کرنے کے بعد محمد قسطنطنیہ کو از سرِ نو آباد کرنے کی طرف متوجہ ہوا، عرصہ سے قسطنطنیہ کی آبادی برابر کم ہوتی جا رہی تھی، سلطان کی ترغیب اور حوصلہ افزائی سے شہر کے اکثر باشندے جو بھاگ گئے تھے، واپس آ گئے، سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں سے بھی بہت سے یونانی اور یہودی اور ترک خاندان کو منتقل کر کے قسطنطنیہ میں آباد کیا گیا، اس کے علاوہ ہر نئی فتح کے بعد محمد نے مفتوحہ ممالک کے ہزاروں باشندوں کو وہاں لا کر بسایا، اس کے عہد حکومت کے خاتمہ پر قسطنطنیہ اپنے آخری یونانی فرماں رواکے زمانہ سے بہت آباد اور خوش حال تھا لیکن اب اس شہر کی خالص یونانی حیثیت فنا ہو چکی تھی اور یونانیوں کے ساتھ ترکی، البانی، بلغاری اور سروی عنصر بھی بکثرت اس کی آبادی میں شامل ہو گیا تھا۔

دار السلطنت قسطنطنیہ کی فتح عثمان کے خواب کی تعبیر تھی، یہی شہر اس انگشتری کا نگینہ تھا، جسے عثمان اپنی انگلی میں پہننا چاہتا تھا لیکن جو ازل سے محمد فاتح کے لیے مقدر ہو چکی تھی، محمد نے قسطنطنیہ کو سلطنت عثمانیہ کا پایۂ تخت بنالیا، کسی نے اس فتح مبین کی تاریخ ''بلدۂ طیبہ'' (۸۵۷ھ) سے نکالی جو قرآن پاک کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔

قسطنطنیہ کے سابق محاصرے قسطنطنیہ کی بنیاد بائزنطیم (Byzantium) کے نام سے ۶۵۸ قبل مسیحی میں پڑی تھی، اس وقت سے لے کر اس کی فتح تک انتیس بار اس شہر کا محاصرہ ہو چکا تھا لیکن صرف آٹھ مرتبہ دشمن کی فوج اس کے اندر داخل ہو سکی، وان ہیمر (Von Hammer) نے اپنی مستند اور ضخیم تاریخ دولت عثمانیہ میں ان تمام محاصروں کا ذکر کیا ہے[2]، مسلمانوں نے بھی اس سے پہلے آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے یقین پر گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تھا، مسند امام حنبل کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''تم ضرور قسطنطنیہ فتح کرلو گے اور

---

[1] ایورسلے، ص ۸۹ [2] کریسی، جلد ا، ص ۱۲۷-۱۲۶، فٹ نوٹ۔

فوج بھی خوب ہے اور اس کا امیر بھی خوب ہے''، نیز بخاری، مسلم اور مسند ابن حنبل میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا ہے'' چنانچہ اس سعادت اور مغفرت کے حصول کے لیے سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۸ھ (۶۶۸ء) میں ایک لشکر قسطنطنیہ کی فتح کے لیے روانہ کیا، اس مہم میں بہت سے صحابہ کرامؓ نے بھی شرکت فرمائی، مثلاً حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بن صامت، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ وغیرہ، بعض روایتوں میں ہے کہ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، بعض کے نزدیک اس کی قیادت یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی، محمد فرید بک نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے ۳۴ھ (۶۵۴ء) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا[1]، وان ہیمر نے بھی تصریح کی ہے کہ عربوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ پہلی مرتبہ ۳۴ھ (۶۵۴ء) میں کیا اور اس فوج کے سپہ سالار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے لیکن اور تاریخوں سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی، بظاہر فرید بک کی روایت وان ہیمر ہی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، وان ہیمر نے مسلمانوں کے دوسرے محاصرہ کی تاریخ ۴۷ھ (۶۶۷ء) درج کی ہے اور یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو سالارِ عسکر لکھا ہے، فرید بک نے بھی یہی نقل کیا ہے لیکن وہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ بتاتے ہیں، حالاں کہ آپ اس محاصرہ سے سات سال قبل ۴۰ھ میں شہید ہو چکے تھے، بہر حال تیسرا محاصرہ وان ہیمر اور فرید بک کی روایت کی رو سے ۵۲ھ (۶۷۲ء) میں ہوا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا، اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مسلمہ نے ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں قسطنطنیہ کا

---

[1] تاریخ دولت علیہ عثمانیہ، ص ۶۰۔

محاصرہ کیا، پھر پانچواں حملہ خلیفہ ہشام کے عہد میں ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) میں ہوا، چھٹا مہدی عباسی کے زمانہ میں ۱۶۴ھ (۷۸۰ء) میں ہارون الرشید کے زیر قیادت ہوا اور ساتواں ہارون الرشید کے سپہ سالار عبدالملک نے ۱۸۲ھ (۷۹۸ء) میں کیا، عربوں کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی اور سلطان بایزید یلدرم نے دوبار محاصرہ کیا اور اگر تیمور اور بایزید کے درمیان تصادم نہ ہو گیا ہوتا تو ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) میں قسطنطنیہ کا ترکوں کے ہاتھ میں آجانا بظاہر یقینی تھا، بایزید کی وفات کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ موسیٰ نے یہ حوصلہ پورا کرنا چاہا لیکن شہزادہ محمد کی مصلحت بینی اور بھائیوں کی باہمی جنگ نے قسطنطنیہ کے لیے سپر کا کام دیا، آخری بار سلطان مراد ثانی نے ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کی فتح کا عزم کیا مگر وہ شہنشاہ کی ندامت اور اظہارِ اطاعت سے متاثر ہو گیا اور محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

غرض سلطان محمد ثانی سے پہلے مجاہدین اسلام گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکے تھے لیکن کامیابی کا سہرا اسی فاتح کا منتظر تھا اور صحابہ کرامؓ کے مقدس خون نے جس چمن زار امید کی آب یاری کی تھی، اس کے پھولوں کا تاج اسی فیروز بخت کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

جامع ایوب رضی اللہ عنہ فتح کے تیسرے روز حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار کا انکشاف ہوا، آپ نے ۴۸ھ کے محاصرہ کے دوران میں وفات پائی تھی اور قسطنطنیہ کی فصیل سے متصل دفن ہوئے تھے، سلطان نے وہاں ایک مسجد تعمیر کرائی، جس کا نام جامع ایوب ہے اور اس وقت سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ تخت نشینی کے موقع پر ہر سلطان اسی مسجد میں جا کر عثمان اول کی تلوار حمائل کرتا تھا اور یہ تقریب رسم تاج پوشی کے قائم مقام سمجھی جاتی تھی۔

دیگر فتوحات اگرچہ قسطنطنیہ کی فتح محمد کا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ ہے اور اسی بنا پر وہ فاتح کے لقب سے مشہور ہوا، تاہم یہ اس کے سلسلۂ فتوحات کی محض پہلی کڑی تھی، اس کا تیس ۳۰ سالہ عہد حکومت تمام تر ملک گیری اور توسیع سلطنت ہی میں گزرا، یہ طویل مدت اس نے تقریباً مسلسل میدانِ جنگ میں صرف کی اور شاذ ہی کوئی مہم ایسی پیش آئی جس کے بعد

اس کے یورپی یا ایشیائی مقبوضات میں کوئی نیا علاقہ شامل نہ ہوا۔

یونان ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں محمد نے یونان کا رخ کیا، وہاں قسطنطین کے دو بھائی دمتریس اور طامس دولت عثمانیہ کے باج گزار کی حیثیت سے علاحدہ علاحدہ حصوں پر حکم راں تھے، انہوں نے سلطان کے پہنچنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ اس کی خدمت میں اپنے سفیر بھیج کر فرماں برداری کا عہد کیا اور بارہ ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا۔

سرویا اس کے بعد ۸۵۸ھ ہی میں محمد سرویا کی طرف متوجہ ہوا اور سب سے پہلے سمندریا پر حملہ کیا جو شاہ سرویا جارج برنیکوویچ کی قیام گاہ تھا، چند ہی دنوں میں عثمانی توپوں کی گولہ باری نے اس شہر کو کھنڈر بنا دیا اور جارج برنیکوویچ کو بھاگنا پڑا، ہونیاڈے یہ خبر سن کر فوراً سرویا کی مدد کے لیے روانہ ہوا اور اس نے ترکوں کے مقدمۃ الجیش کو، جو فیروز بے کی سرکردگی میں تھا، شکست دی لیکن اہل سرویا اپنے ملک میں ہنگری کے اقتدار کو ناپسند کرتے تھے، کلیسا رومہ کی مذہبی تعدیوں نے سرویا کے باشندوں کو اس قدر برگشتہ کر دیا تھا کہ وہ علانیہ مسلمان ترکوں کو کیتھولک عیسائیوں پر ترجیح دیتے تھے اور عثمانی تسلط کو ہنگری کے اقتدار سے بدرجہا بہتر خیال کرتے تھے، چنانچہ اسی وجہ سے برنیکوویچ نے تیس ہزار دوکات سالانہ خراج کے وعدہ پر سلطان سے صلح کر لی۔

محاصرۂ بلغراد دوسرے سال محمد پھر سرویا میں داخل ہوا اور جنوب کی طرف سے بڑھتا ہوا بغیر کسی مزاحمت کے بلغراد تک پہنچ گیا، اس کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر اور تین سو توپیں تھیں، یہ مہم دراصل بلغراد کی فتح کے لیے تھی جو اگرچہ سرویا کی شمالی سرحد پر واقع تھا لیکن اس وقت ہنگری کے قبضہ میں تھا اور گویا ہنگری کا دروازہ تھا، اس کی فتح سے ہنگری کی فتح کا راستہ کھل جاتا اور پھر آسٹریا تک عثمانیوں کو روکنا مشکل ہو جاتا، محمد نے بلغراد پہنچ کر فوراً اس کا محاصرہ کر لیا، بری فوج کے علاوہ شہر کی شمالی سمت میں عثمانی بیڑا دریائے ڈینوب پر قابض تھا، قسطنطنیہ کی فتح نے سارے یورپ کو خوف زدہ کر دیا تھا، جب محمد نے بلغراد کا محاصرہ کیا تو یورپ کے

تمام ملکوں میں ایک ہل چل مچ گئی اور پوپ نے صلیبی جنگ کا اعلان کر کے اپنے نمائندہ جان کاپسٹران (John Capistran) کو ساٹھ ہزار پر جوش مسیحی مجاہدوں کے ساتھ ہنگری کی مدد کے لیے روانہ کیا، ہونیاڈے نے مدافعت میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، آٹھ روز کی گولہ باری کے بعد ۲۱ ؍جولائی ۱۴۵۶ء کو سلطان نے ایک عام حملہ کا حکم دیا اور ترک شہر کے ایک حصہ میں داخل ہو گئے لیکن ابھی وہ پوری طرح قابض نہ ہو سکے تھے کہ عیسائیوں کے ایک زبردست حملہ نے ان کو پیچھے ہٹا دیا اور پھر دوسرے حملہ میں عثمانی دستے بالکل منتشر ہو گئے، یہ حال دیکھ کر محمد خود دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا لیکن اس کی حیرت انگیز شجاعت اس روز ترکوں کے قدم کو نہ روک سکی اور اسے بھی زخمی ہو کر میدانِ جنگ چھوڑنا پڑا، اس معرکہ میں پچیس ہزار ترک کام آئے اور ان کے پورے توپ خانہ پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا، محاصرہ اٹھا لیا گیا اور بلغراد کی فتح جو ہنگری اور ویانا کے حملوں کا مقدمہ تھی، پچاس سال کے لیے ملتوی ہو گئی، ہونیاڈے اس جنگ میں اس قدر زخمی ہو گیا تھا کہ بیس ہی روز کے بعد مر گیا، سلطان کو جب اس کی وفات کی اطلاع ہوئی تو اس نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ یورپ کا سب سے بڑا سپہ سالار جاتا رہا، دو مہینے بعد جان کاپسٹران کا بھی، جس کی عمر ستّر سال ہو چکی تھی، انتقال ہو گیا۔

سرویا پر مکمل قبضہ بلغراد کا محاصرہ اٹھا لینے کے بعد محمد اورنہ کو واپس گیا اور جارج برنیکووچ پھر سرویا پر قابض ہوا لیکن اس کی عمر نوّے سے متجاوز ہو چکی تھی اور تھوڑے ہی دنوں بعد ۸۶۱ھ (۱۴۵۷ء) میں اس کا انتقال ہو گیا، سرویا کی آزادی بھی اس کے بعد ڈیڑھ ہی دو سال قائم رہی، ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں یہ ایک باقاعدہ طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا، ہونیاڈے کی وفات کے بعد صدر اعظم محمود پاشا نے سرویا میں داخل ہو کر دو سال کے اندر پورے ملک کو فتح کر لیا، تاہم یہ ممکن تھا کہ سلطان پھر خراج قبول کر کے سرویا کی خود مختاری بدستور قائم رہنے دیتا لیکن جارج برنیکووچ کے مرنے کے بعد جو خانہ جنگیاں شروع ہوئیں ان سے ملک کی آزادی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا، جارج نے حکومت کا انتظام مشترکہ طور پر اپنی بیوہ اور تین لڑکوں

کے سپرد کیا تھا، ان میں بہت جلد جھگڑے شروع ہو گئے، سب سے چھوٹے لڑکے لازار نے اپنی ماں کو زہر دے دیا اور بھائیوں کو حکومت سے نکال دیا، اب وہ سرویا کا تنہا فرماں روا تھا، اس نے بیس ہزار طلائی سکے سالانہ کے خراج کا وعدہ کر کے سلطان کی سرپرستی بھی حاصل کر لی لیکن دوسرے ہی سال اس کا انتقال ہو گیا، اب محمد نے یہ طے کر لیا کہ سرویا کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنا لے، ہونیاڈے مر چکا تھا، اہل سرویا میں مزاحمت کی ہمت نہ تھی، پچھلے ستّر سال کی لڑائیوں کے بعد وہ ہر دام پر امن و صلح کے لیے تیار تھے، لازار کی بیوہ ہیلینا نے اپنے ملک کی سیاسی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اسے کلیسائے رومہ سے وابستہ کر دینا چاہا لیکن سرویا والوں نے سخت مخالفت کی اور علانیہ کہہ دیا کہ وہ ترکوں کو رومن کیتھولک عیسائیوں پر ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ امرائے سرویا نے صدر اعظم محمود پاشا کے بھائی کو بلا کر اپنا سردار مقرر کیا اور جب ہیلینا نے اسے قید میں ڈال دیا تو انہوں نے سلطان سے مدد کی درخواست کی، سمندریا نے اپنے پھاٹک عثمانی فوجوں کے لیے کھول دیے، جس کی تقلید اور شہروں نے بھی کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں سرویا کا وجود بحیثیت ایک مستقل مملکت کے فنا ہو گیا[1]۔

بوسنیا کی فتح کلیسائے رومہ کے مظالم سے بوسنیا کے باشندے اہل سرویا سے بھی زیادہ عاجز تھے، انہوں نے بھی ترکوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھا، صدیوں سے وہاں لاطینی اور یونانی کلیساؤں کے معرکے گرم تھے، جن سے پریشان ہو کر بہت سے لوگ ان دونوں مسلکوں سے علاحدہ ہو گئے تھے اور اپنی عافیت کے لیے ایک نیا مذہب اختیار کر لیا تھا، جو بدعت بوگومل (Bogumil Heresy) کے نام سے مشہور ہے لیکن اب اس جدید فرقہ کے لوگوں پر دوہرے مظالم ہونے لگے، وہ کبھی یونانی کلیسا کی شدید تعدیوں کا شکار ہوتے اور کبھی لاطینی کلیسا کی، یہ مظالم دیکھ کر اکثر اہل بوسنیا کو اسلام ہی کے دامن رحمت میں پناہ نظر آئی[2]، محمود پاشا کی فوج شاہِ بوسینا کی تنبیہ کے لیے، جس نے خراج دینا روک دیا تھا، فاتحانہ بڑھتی آ رہی

---

[1] بلقان از ملر، ص ۲۹۶ [2] جزیرہ نمائے بلقان اور شرق ادنیٰ، از شینول یلی، مطبوعہ لندن، ۱۹۲۱ء، ص ۴۰۴۔

تھی، بہت سے قلعوں نے ترکوں کا خیر مقدم کیا، بادشاہ میں جب مقابلہ کی طاقت نہ رہی تو اس نے جان بخشی کے وعدہ پر ہتھیار ڈال دیے، مگر محمد نے خلاف معاہدہ اس کو اور اس کے لڑکے کو قتل کرادیا، یوں بوسنیا بھی ۸۶۷ھ (۱۴۶۲ء) میں سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بن گیا، اس نے نوجوانوں میں سے تیس ہزار ینی چری فوج کے لیے چن لیے گئے اور اس کے اکثر امراء مشرف با اسلام ہوئے۔

موریا پر قبضہ موریا میں خاندان پلیولوگس کی حکومت کا بھی بتدریج خاتمہ ہو رہا تھا، طامس اور دمتریس نے خراج کے وعدہ پر اپنی خود مختاری قائم کر رکھی تھی لیکن جب بلغراد کی مہم میں سلطان کو ناکامی ہوئی اور یورپ کے مذہبی جوش نے ترکوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو ایک لمحہ کے لیے روک دیا تو موریا کے فرماں رواؤں کو بھی دولت عثمانیہ کی سیادت کا بار محسوس ہونے لگا، پوپ نے بھی ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا، چنانچہ جب پوپ کا جنگی بیڑا بحر آنجین میں نمودار ہوا تو طامس نے ہمت کر کے خراج کی رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا، اس سے قبل بھی تین سال سے باوجود متعدد تقاضوں کے سلطان کو موریا سے خراج کی کوئی رقم وصول نہیں ہوئی تھی لیکن ابھی تک علانیہ انکار کی نوبت نہیں آئی تھی، اسی لیے محمد نے کسی قسم کی سختی بھی نہیں کی تھی، اب یہ انکار گویا بغاوت کا اعلان تھا، چنانچہ وہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۸ء) میں ایک بڑی فوج لے کر خود موریا آیا اور متعدد قلعوں کو فتح کرتا ہوا پتراس پہنچا جو طامس کا مستقر تھا، تبراس کے باشندے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، قلعہ کے فوجی دستے نے بھی مزاحمت کی جرأت نہ کی، محمد نے پتراس کے باشندوں کے ساتھ بڑی فیاضی اور کشادہ دلی کا برتاؤ کیا، اس کے بعد کورنتھ فتح ہوا، کورنتھ کے باشندوں کے ساتھ بھی اس نے ویسی ہی مراعات کی اور انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا لیکن وہاں کے بہت سے لوگوں کو اس نے قسطنطنیہ اور اس کے مضافات میں لے جا کر آباد کیا، یہ لوگ کاریگر اور کاشت کار تھے، طامس اور دمتریس کو اب صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، محمد نے ان کی درخواست قبول کی اور صلح نامہ کے

تکملہ کے بعد وہ موریا سے چلا گیا لیکن اس کے جاتے ہی ان بھائیوں نے پھر شورش برپا کرنی شروع کی[1]، محمد کو مجبوراً لوٹنا پڑا، اب کی بار اس نے تہیہ کرلیا کہ موریا کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنا کر رہے گا، دمتریس نے اپنے کو مسترا (Mystra) کے قلعہ میں بند کرلیا اور مدافعت کی کوشش کی، مگر بہت جلد اسے ہتھیار ڈال کر قلعہ ترکوں کے سپرد کردینا پڑا، محمد نے اس کے اخراجات کے لیے تھریس کا ایک شہر اور اس کے قریب امبروس (Imbros) لمنوس (Lemnos) اور ساموتھریس (Samothrace) کے جزیرے دے کر اسے اورنہ بھیج دیا، کچھ دنوں کے بعد یہ جاگیریں بھی ضبط کرلی گئیں اور محمد نے ان کے بجائے پچاس ہزار ایسپر (Asper) بطور پنشن کے مقرر کردیے[2] لیکن دمتریس نے آخر میں رہبانیت اختیار کرلی اور ۸۷۵ھ (۱۴۷۰ء) میں اس کا انتقال ہوا، دمتریس کے بعد محمد طامس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے علاقہ کے شہروں کو یکے بعد دیگرے فتح کرنا شروع کیا، طامس نے اپنے مقبوضات کو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی اور اپنے خاندان کے ساتھ جہاز پر سوار ہو کر کارفو چلا گیا لیکن تین ہی مہینہ کے بعد اس نے کارفو کو بھی خیرباد کہا اور رومہ پہنچ کر پوپ کے دامن میں پناہ لی، وہیں ۸۷۰ھ (۱۲ رمئی ۱۴۶۵ء) میں اس کا انتقال ہوگیا، محمد نے موریا کے تمام علاقوں کو فتح کرکے ان پر قبضہ کرلیا، ۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) میں موریا بھی سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ ہوگیا۔

کرمانیہ اسی زمانہ میں ایشیائے کوچک کے بعض حصوں پر بھی جو ابھی تک سلطنت عثمانیہ میں شامل نہ تھے، قبضہ کیا جارہا تھا، کرمانیہ اور دولت عثمانیہ کی عداوت قدیم سے چلی آرہی تھی، محمد کی تخت نشینی کے چند دنوں بعد کرمانیہ کے امیر ابراہیم بیگ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کرکے سلطان سے صلح کرلی تھی اور وہ آخر دم تک اس معاہدہ پر قائم رہا، اس کے انتقال کے بعد اس کے لڑکوں میں ریاست کے لیے جنگ چھڑ گئی، محمد نے ان سب کو برطرف کرکے خود کرمانیہ پر قبضہ کرلیا اور اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ ''موریا''، ص ۵۷۳-۵۷۴ [2] گبن، جلد ۴، ص ۵۰۵-۵۰۴۔

طرابزون اور سینوپ ایشیائے کوچک میں سینوپ اور طرابزون پر اب تک دولت عثمانیہ کا قبضہ نہ ہوا تھا، محمد نے پہلے سینوپ کے مضبوط شہر پر حملہ کیا، اسماعیل بیگ امیر سینوپ کی چار سو توپیں اور دس بارہ ہزار سپاہی کچھ دیر بھی مقابلہ نہ کر سکے اور اس نے شہر سلطان کے حوالہ کر دیا، اس کے بعد محمد طرابزون کی طرف متوجہ ہوا، طرابزون کا شہر اور ملحق علاقے قدیم بازنطینی سلطنت کا جزو تھے، ۶۰۱ھ (۱۲۰۴ء) کے بعد سے جب کہ قسطنطنیہ پر محاربین صلیبی کا قبضہ ہو گیا تھا، طرابزون نے ایک جداگانہ مملکت کی شکل اختیار کر لی تھی، ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں محمد نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اب ایشیائے کوچک کے تمام علاقے سلطنت عثمانیہ کے دائرے میں آ گئے، بحر اسود کے ساحل پر جنوا کے جو مقبوضات تھے وہ بھی فتح کر لیے گئے۔

یونانی مجمع الجزائر محمد نے یونانی مجمع الجزائر کے بہت سے جزیروں پر بھی جو وینس اور جنوا کے زیر حکومت تھے، حملہ کر کے انہیں فتح کر لیا، ان میں سے لسبوس (Lesbos) لمنوس (Lemnos) اور سیفالونیا (Cephalonia) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جزیرہ یوبیا (Uboea) کا بھی یہی حشر ہوا، یہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، جس کے اور مقبوضات بھی جو موریا کے ساحل پر واقع تھے، سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے۔

کریمیا قسطنطنیہ کے بعد محمد کا سب سے اہم کارنامہ کریمیا کی فتح تھی، جس کا سہرا دولت عثمانیہ کے مشہور سپہ سالار صدر اعظم احمد کدک پاشا کے سر ہے، کریمیا پر حملہ کے دو خاص اسباب تھے، ایک سبب تو یہ تھا کہ اس زمانہ میں جنوا سے دولت علیہ کے تعلقات بہت خراب ہو گئے تھے اور کریمیا میں کافہ کا مضبوط شہر جنوا کے قبضہ میں تھا، دوسرا سبب یہ ہوا کہ خود خان کریمیا نے، جسے اس کے باغی بھائیوں نے تخت سے اتار دیا تھا، محمد سے مدد کی درخواست کی لیکن ان اسباب کے علاوہ کریمیا کا محل وقوع بھی قسطنطنیہ کے تخت نشینوں کے لیے حد درجہ اہم تھا اور محمد جیسے بیدار مغز سلطان کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہ تھا کہ عثمانی

مقبوضات کے تحفظ کے لیے کریمیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینا کس حد تک ضروری ہے، چنانچہ ۸۸۰ھ (۱۴۷۵ء) میں احمد کدک نے جنگی بیڑے اور چالیس ہزار فوج کے ساتھ پہلے کافہ پر حملہ کیا، اس شہر نے جو اپنی دولت اور مضبوطی کے لحاظ سے قسطنطنیۂ کوچک کہلاتا تھا، چار روز میں ہتھیار ڈال دیے، بہت زیادہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا، چالیس ہزار باشندے قسطنطنیہ کو منتقل کر دیے گئے اور ڈیڑھ ہزار نوجوان جنوی امراء ینی چری فوج میں داخل کیے گئے، پھر سرعت کے ساتھ پورے ملک پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا اور کریمیا کی آزادی ختم ہو گئی، اس کے بعد تین سو برس تک کریمیا کے خان دولت عثمانیہ کے محکوم رہے۔

ولاچیا اسی زمانہ میں ولاچیا کے مظلوموں کی دردناک چیخیں قسطنطنیہ پہنچیں، جنگ کسووا (۱۳۸۹ء) کے بعد ولاچیا نے دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لی تھی، سلطان محمد ثانی کے وقت میں اس ریاست کا امیر ولاد چہارم (Vlad IV) تھا، اس نے سلطان کے خلاف بغاوت کر دی اور عثمانی تاجروں کو جو ولاچیا میں قیام پذیر تھے، سخت اذیتوں کے ساتھ قتل کرا دیا، اس کا دست عقوبت خود اپنے ملک والوں پر بھی دراز تھا، اس کے مظالم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ ''ڈراکول'' (Drakul) یعنی شیطان کے لقب سے مشہور تھا، اسے لوگوں کو قتل کرنے میں خاص لطف آتا تھا اور قتل کے عجیب وغریب طریقے ایجاد کرتا رہتا تھا لیکن سب سے زیادہ لطف اسے جسم میں میخیں ٹھونک کر قتل کرانے میں آتا تھا، اکثر کئی کئی سو آدمیوں کو ایک ساتھ اس طریقہ سے قتل کراتا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں سے اس کی شیطانی روح کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی تھی، شیویل لکھتا ہے کہ اس کے ہم عصر بھی، جن میں سے کسی کا دامن مظالم کے دھبوں سے پاک نہ تھا، اس کی تعذیب کے انوکھے طریقوں سے ہیبت زدہ تھے اور اس کو ولاد دی امپیلر (Vlad The Impaler) (یعنی میخیں ٹھکوا کر قتل کرنے والا) کہتے تھے، غرض جب اس کے مظالم کی فریاد قسطنطنیہ پہنچی تو سلطان ایک زبردست فوج لے کر اس کی تنبیہ کے لیے روانہ ہوا لیکن قبل اس کے کہ وہ حملہ آور ہو، ولاد نے اس کی خدمت

میں ایک وفد بھیجا اور اس کی سیادت قبول کر کے دس ہزار دوکات سالانہ خراج ادا کرنے کا عہد کیا اور یہ درخواست کی کہ سلطان کی جانب سے اس معاہدہ کی ازسرنو تصدیق کر دی جائے جو ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء) میں بایزید یلدرم اور امیر ولاچیا کے درمیان ہوا تھا، محمد نے اسے منظور کیا اور واپس چلا آیا لیکن یہ معاہدہ ولاد کا محض ایک وقتی حیلہ تھا، وہ اس بہانہ سے سلطان کو ٹال کر ہنگری کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا، چنانچہ عثمانی فوجوں کے واپس ہوتے ہی اس نے ہنگری سے اتحاد کر کے پھر اپنی سابق معاندانہ روش اختیار کر لی، محمد کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے حالات کی تحقیق کے لیے اپنے نمائندے ولاچیا میں بھیجے، ولاد نے ان نمائندوں کو قتل کرا دیا، اس کے بعد اس نے بلغاریا کے علاقوں میں جو دولت علیہ کے ماتحت تھے، لوٹ مار شروع کر دی اور بے حد مظالم کیے، وہ بلغاریا کے پچیس ہزار باشندوں کو بھی پکڑ لایا، یہ سن کر محمد نے پھر اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے حدود سے متجاوز نہ ہو اور ان قیدیوں کو رہا کر دے، ولاد نے اس کے جواب میں سلطانی ایلچیوں کے سروں میں میخیں ٹھنکوا کر انہیں فوراً ہلاک کر دیا، اب محمد کے لیے حملہ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، وہ ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ اس ظالم کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، ولاچیا کے شہر یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے، یہاں تک کہ پایہ تخت بخارسٹ پر بھی عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا لیکن ولاد ہاتھ نہ آیا، اس نے بھاگ کر شاہِ ہنگری کے یہاں پناہ لی، محمد جب بخارسٹ پہنچا تو اس نے وہاں ان قیدیوں کی لاشیں دیکھیں جن کو ولاد بلغاریا سے پکڑ لایا تھا، ان لاشوں کی تعداد بیس ہزار تھی، ان میں بچے اور عورتیں بھی تھیں، بہرحال محمد نے ولاد کو معزول کر کے اس کے بھائی رادول (Radul) کو جو اس کا معتمد علیہ تھا، اور جس کی تربیت بھی سلطان ہی کے زیر نگرانی ہوئی تھی، ولاچیا کا امیر مقرر کیا اور ولاد نے خون کی جو نہر جاری کر رکھی تھی وہ کسی طرح خشک ہوئی، ولاچیا پھر سلطنت عثمانیہ کی ایک اطاعت گزار ریاست ہو گئی، محمد نے اسے مکمل طور پر اپنی سلطنت میں ضم کر لینے پر اصرار نہیں کیا بلکہ صرف اطاعت اور خراج پر قناعت کی۔

البانیا اور ہرزیگووینا البانیا ابھی تک زیر نہ ہو سکا تھا، اسکندر بک محمد فاتح کا مقابلہ بھی اسی طرح کرتا رہا جس طرح اس نے مراد ثانی کا کیا تھا، محمد چاہتا تھا کہ اگر اسکندر بک خراج دینا منظور کر لے تو لڑائی ختم کر دی جائے مگر اس نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا، عثمانی فوجیں البانیا پر مکمل قبضہ نہ پا سکیں اور آخر کار ۸۶۵ھ (۱۴۶۱ء) میں سلطان نے اسکندر بک کو البانیا اور اپائرس کا فرماں روا تسلیم کر لیا، چھ سال کے بعد اسکندر بک کا انتقال ہو گیا، اب البانیا کی فتح میں کوئی دشواری باقی نہ رہ گئی تھی، محمد نے آسانی کے ساتھ اسے مسخر کر لیا اور البانیا اور اپائرس کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا، اس کے بعد ہرزیگووینا کا علاقہ بھی عثمانی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔

وینس البانیا کی فتح کے بعد اٹلی ترکوں کی زد میں آیا، جس طرح ہونیاڈے نے شمال میں عثمانی فوجوں کے بڑھتے ہوئے قدم کو چند دنوں تک روک رکھا تھا، اسی طرح اسکندر بک بھی مغرب میں ان کی راہ روکے ہوئے کھڑا تھا، اس کے مرنے کے بعد ہی اٹلی کا راستہ کھل گیا اور وینس پر حملہ کا مسئلہ زیر غور آ گیا، جمہوریہ وینس نے فتح قسطنطنیہ کے دوسرے ہی سال سلطان سے بمنت صلح کی درخواست کی تھی اور اس صلح نامہ کے ذریعہ محمد نے تقریباً وہ تمام تجارتی مراعات جو وینس کو بازنطینی شہنشاہوں کے عہد میں حاصل تھیں، اسے عطا کر دی تھیں لیکن اسکندر بک کی کامیابیوں نے وینس کے اندر بھی دولت عثمانیہ کے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا اور اس کی نیازمندی جاتی رہی، وینس کو اپنی بحری طاقت کا غرور تھا، دوسری طرف سلطنت عثمانیہ کو بھی بلقانی ریاستوں پر کامل اقتدار رکھنے کے لیے بحر ایڈریاٹک اور بحر ایجین میں اپنے جنگی جہازوں کی تعداد بڑھانی ضروری تھی، البانیا کی تسخیر کے بعد بحر ایڈریاٹک کے تمام ساحلی علاقے اس کے قبضہ میں آ گئے تھے اور اب وینس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ ناگزیر ہو گئی تھی، لڑائی ۸۶۸ھ (۱۴۶۳ء) میں شروع ہوئی اور سولہ سال تک جاری رہی، یکے بعد دیگرے وینس کے ساحلی مقبوضات ترکوں کے قبضہ میں آتے گئے، یہاں تک کہ

جزیرہ یوبیا (نگروپونٹ) بھی جمہوریہ کے ہاتھ سے نکل گیا، ۸۸۲ھ (۱۴۷۷ء) میں ایک زبردست ترکی فوج فریولی (Friuli) کے علاقہ میں داخل ہوئی جو بحر ایڈریاٹک کی شمالی حد پر واقع تھا اور اس پر تسلط قائم کرنے کے بعد وینس کی طرف بڑھی، وینس نے مزاحمت کے لیے فوج روانہ کی لیکن عمر پاشا اسے شکست دیتا ہوا آگے بڑھ گیا اور دریائے پیاوے (Piave) کے ساحل تک کے تمام زرخیز علاقوں پر قابض ہوگیا، جمہوریہ کے لیے اب صلح کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، اگر اب بھی اسے کچھ تامل ہوتا تو اس کے بقیہ مقبوضات بھی نکل جاتے اور خود وینس کے شہر پر عثمانی علم نصب ہوجاتا، ۸۸۴ھ (۱۴۷۹ء) میں صلح نامہ پر دستخط ہوگئے، وینس نے سالانہ خراج ادا کرنے کا معاہدہ کیا اور سلطان نے اسے دوبارہ مشرق میں تجارت کرنے کی اجازت دی۔

روڈس کی ناکام مہم وینس کی بحری قوت ٹوٹ چکی تھی لیکن بحر ایجین میں روڈس کا جزیرہ عثمانی جہازوں کی راہ کا کانٹا تھا، اس جزیرہ پر ڈیڑھ سو برس سے یروشلم کے مبارزین سنیٹ جان کی حکومت تھی جو آسانی کے ساتھ عثمانی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، محمد نے روڈس کی فتح کو ضروری خیال کرکے ۸۸۵ھ (۱۴۸۰ء) میں مسیح پاشا کو اس مہم پر روانہ کیا، مسیح پاشا نے جزیرہ پر اتر کر متعدد مقامات فتح کیے اور پھر خود شہر روڈس کا محاصرہ کرلیا، عیسائی مدافعت کے لیے پوری طرح تیار تھے اور محاصرہ طول کھینچ گیا، بالآخر ۱۸ ربیع الاول ۸۸۵ھ (۲۸ جولائی ۱۴۸۰ء) کو ترکوں نے ایک عام حملہ کیا، یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ عیسائی اپنی انتہائی شجاعت کے باوجود اسے روک نہ سکے اور بعض ترکوں نے دیواروں پر چڑھ کر ہلالی جھنڈا گاڑ دیا لیکن عین اس وقت جب وہ شہر میں داخل ہوا چاہتے تھے، مسیح پاشا کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ تمام مالِ غنیمت سلطان کے حق میں محفوظ سمجھا جائے گا، اس اعلان سے سپاہیوں میں سخت برہمی اور بے زاری پیدا ہوگئی اور جو ابھی تک باہر تھے، انہوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے، جو پہلے پہنچ چکے تھے، اندر جانے سے انکار کردیا، عیسائیوں نے

عثمانی فوج کی یہ حالت دیکھ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ جان توڑ حملہ کیا اور ان ترکوں کو جو شہر میں داخل ہو گئے تھے، شکست دے کر باہر نکال دیا، مسیح پاشا کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب کہ اس کی تلافی ناممکن تھی، اسے محاصرہ اٹھا لینا پڑا اور روڈس کی تسخیر نصف صدی کے لیے ملتوی ہو گئی۔

اوٹرانٹو کی فتح لیکن جس روز مسیح پاشا کو روڈس میں ہزیمت اٹھانی پڑی اسی روز احمد کدک پاشا فاتح کریمیا نے سرزمین اٹلی میں قدم رکھا جہاں اس وقت تک کوئی عثمانی سپاہی نہ پہنچا تھا، اٹلی کی فتح کے لیے اوٹرانٹو پر قبضہ کرنا ضروری تھا کیوں کہ یہ شہر اپنے موقع کے لحاظ سے گویا اٹلی کا دروازہ تھا، احمد پاشا نے فوراً خشکی اور سمندر دونوں جانب سے اس پر حملہ کیا، اہل شہر نے مدافعت میں بڑی سرگرمی دکھائی لیکن وہ صرف چند روز مقابلہ کر سکے اور ۴؍ جمادی الثانی ۸۸۵ھ (۱۱؍ اگست ۱۴۸۰ء) کو عثمانی فوج فاتحانہ اوٹرانٹو میں داخل ہو گئی۔

فاتح کی وفات اوٹرانٹو جیسے مضبوط شہر اور بندرگاہ پر قابض ہونے کے بعد محمد کے لیے اٹلی کی فتح کا راستہ کھل گیا، دوسرے سال وہ کسی جدید مہم کے لیے فوجیں اکٹھا کر رہا تھا اور خیال تھا کہ اوٹرانٹو کے بعد غالباً رومہ پر حملہ ہونے والا ہے لیکن دفعۃً ۴؍ ربیع الاول ۸۸۶ھ مطابق ۲؍ مئی ۱۴۸۱ء کو اکیاون سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا فاتح کی موت سے یورپ کی جان میں جان آئی، تجہیز و تکفین اس مشہور مسجد میں ہوئی جسے اس نے قسطنطنیہ میں تعمیر کرایا تھا، وہ پہلا سلطان تھا جو اس نئے دار السلطنت میں دفن ہوا۔

فوجی قابلیت سلطان محمد ثانی کا عہد حکومت شروع سے آخر تک میدانِ جنگ میں گزرا، کریمیا، روڈس اور اوٹرانٹو کی مہموں علاوہ ہر جنگ میں فوج کی کمان اسی کے ہاتھ میں تھی اور بلغراد کے علاوہ کسی معرکہ میں اسے شکست نہیں ہوئی، فاتح کا لقب اسے قسطنطنیہ کی فتح پر حاصل ہو گیا تھا لیکن اس کی ہر جنگ اس لقب کی تصدیق کرتی ہے، ایک سپہ سالار کی حیثیت سے وہ مراد ثانی پر بھی فوقیت لے گیا تھا، فوجی قابلیت میں اس کا کوئی افسر اس کا ہم

پلہ نہ تھا، حالاں کہ احمد کدک پاشا، محمود پاشا اور بعض دوسرے عثمانی سپہ سالاروں کا شمار اس وقت دنیا کے بہترین جنرلوں میں ہوتا تھا، وہ اپنے ارادوں کو بالکل راز میں رکھتا اور اس کے کسی کمانڈر کو بھی پہلے سے معلوم نہ ہوتا کہ حملہ کس سمت میں ہونے والا ہے، ایک بار جب کسی مہم کے لیے فوجیں جمع ہونے لگیں اور اس کے خاص افسروں میں سے ایک نے محمد سے پوچھا کہ دراصل کون سا شہر یا ملک پیش نظر ہے تو اس نے سختی سے جواب دیا کہ ''اگر میری داڑھی کے ایک بال کو بھی اس کی اطلاع ہو جائے تو میں اسے توڑ کر آگ میں ڈال دوں'' وہ جنگ کی کام یابی کے لیے رازداری اور سرعت عمل کو ضروری شرطیں خیال کرتا تھا اور اس نے ہمیشہ اسی اصول کی پابندی کی، جب وہ کسی حملہ کا عزم کر لیتا تو اسے پوری تیاری اور انتہائی شدت کے ساتھ انجام تک پہنچاتا، اسی وجہ سے عموماً اس کی مہمیں تھوڑے عرصہ میں سر ہو جاتی تھیں، البتہ وینس کے ساتھ لڑائیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ سولہ برس تک قائم رہا، اسی طرح البانیا کی فتح میں بھی کئی برس لگ گئے لیکن یہ استثنائی مثالیں ہیں۔

علوم وفنون کی سرپرستی محمد کی عظمت فتوحات کی وسیع دائرہ میں محدود نہ تھی، اس کی خداداد قابلیت کے جوہر رزم و بزم دونوں جگہ یکساں طور پر نمایاں تھے، بہترین اساتذہ کے زیرنگرانی اس نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ علوم وفنون کی تحصیل کی تھی، اپنی مادری زبان کے علاوہ عربی، فارسی، عبرانی لاطینی اور یونانی زبان پر بھی قدرت رکھتا تھا، دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ سے اسے پوری واقفیت تھی، وہ ایک بلند پایہ شاعر اور شعر وسخن کا بہت بڑا سرپرست بھی تھا، اس کے دربار سے تیس عثمانی شعرا کو وظیفے ملتے تھے اور وہ ہر سال گراں قدر تحائف خواجہ جہاں (ہندوستان) اور مولانا جامی (ایران) کی خدمت میں بھی بھیجا کرتا تھا[1]، اس کی محفلیں علماء اور اہل کمال سے معمور رہا کرتی تھیں، اس نے قسطنطنیہ اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں نہایت کثرت سے مسجدیں، اسپتال، مکاتب اور مدارس قائم کیے اور ان کے

[1] ''ترکی'' از لین پول، ص ۱۰۲۔

اخراجات کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیں، اس کے تعلیمی نظام کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ آگے آتا ہے، اس کی علم دوستی کا اثر اس کے اعلیٰ عہدہ داروں پر بھی پڑا، چنانچہ محمود پاشا نے، جو شاعر بھی تھا، کئی مدرسے قائم کیے، مشرق و مغرب کے نام وروں کے کارنامے اس کے مطالعہ میں رہا کرتے تھے، گبن آخری بازنطینی مؤرخ فرانزا (Phranrza) کے حوالہ سے، جو محمد فاتح کا ہم عصر تھا اور فتح قسطنطنیہ میں گرفتار بھی ہو گیا تھا، لکھتا ہے کہ سلطان سکندر اغسطس، قسطنطین اور تھیوڈوسیس کے سوانح حیات اور کارنامے بڑے انہماک سے پڑھا کرتا تھا، اس کے حکم سے یونانی سوانح نگار پلوٹارک (Plutarch) کی مشہور و معروف تالیف، جو مشاہیر یونان و رومہ کے تذکروں پر مشتمل ہے، ترکی زبان میں ترجمہ کی گئی[1]۔

اخلاق و سیرت لیکن علم و مذہب کا جو اثر تہذیب نفس پر پڑنا چاہیے تھا، وہ کما حقہ ظاہر نہ ہوا اور محمد کی بے باک فطرت بعض اخلاقی پابندیوں سے عموماً آزاد رہی، وہی مغربی مؤرخین جو مراد ثانی کے مکارمِ اخلاق اور شریفانہ اوصاف کے مداح ہیں اور اس کے سی سالہ عہد حکومت کے ایک واقعہ کو بھی قابل الزام نہیں ٹھہراتے، محمد ثانی کی سنگ دلی، بے اعتمادی اور عیاشی کی داستان بے تکلف بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ خفیف سے اشتعال پر وہ قتل کا حکم دے دیتا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے پاشاؤں اور وزیروں کو بھی اپنی جان کی طرف سے کبھی اطمینان نہیں رہتا تھا، چنانچہ اس کے عہد میں دو صدر اعظم بغیر کسی سابق تنبیہ یا اطلاع کے اس کے حکم سے دفعتاً قتل کر دیے گئے، لین پول کا بیان ہے کہ معاہدوں کے توڑنے میں وہ اہل ہنگری کا حریف تھا، شیویل کہتا ہے کہ اپنے عیسائی ہم عصروں کی طرح محمد اس مفید اصول کا قائل تھا کہ جو عہد کفار کے ساتھ باندھا جائے اس کی پابندی ضروری نہیں، دوسرے مغربی مؤرخین نے بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کیے ہیں اور ان کی تائید واقعات سے کی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جن معاصرین سے محمد کا سابقہ تھا، ان کا طرزِ عمل اس

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۲۷۵، فٹ نوٹ۔

باب میں کیا تھا، لارڈ ایور سلے محمد کی سنگ دلی اور نقض عہد کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد آخر میں لکھتا ہے:

> ''محمد کے مظالم اور غداریوں پر ایک بلند معیار کے لحاظ سے رائے قائم کرنا شاید قرینِ انصاف نہیں ہے، اس کے دشمن یعنی ان ملکوں کے فرماں روا جن پر اس نے چڑھائی کی اور جنہیں اس نے فتح کیا، ان باتوں میں اکثر اس سے کم نہ تھے، اسکندر بک جس کو البانیا کی وطن پرستانہ مدافعت کے صلہ میں اپنے ملک کے اندر ایک دلی کی شہرت اور تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل ہوا، جب کبھی اسے موقع ملتا، حد درجہ سفاک اور انتقام جو ثابت ہوتا، وہ جنگ کے قیدیوں کو عادتاً قتل کرا دیتا تھا، اس معاملہ میں موریا کے دونوں حکم راں بھی پیچھے نہ تھے، ولاچیا کا فرماں روا جس کا نام ولاد تھا تاریخ کے شدید ترین ظالم اور خوں خوار بدمعاشوں میں تھا، وہ امپیلر (Impaler) یعنی جسم میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے والا مشہور تھا، اسے ان قیدیوں اور دوسرے مظلوموں کی، جنہیں وہ اس ظالمانہ طریقہ سے قتل کراتا، مرتے وقت کی اذیت اور تڑپ دیکھنے میں خاص لطف آتا تھا، وہ اس غرض سے اس کی ضیافتوں کی رونق کے لیے محفوظ رکھے جاتے تھے، ایک بار جب کسی مہمان نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ وہ ایسی موت سے مرنے والے کے جسم کی بو کیسے برداشت کرتا ہے تو اس نے اس مہمان کو فوراً سولی پر چڑھوا دیا اور حکم دیا کہ سولی کا کھمبا دوسروں سے زیادہ بلند رکھا جائے تاکہ جس بو کی مہمان نے شکایت کی ہے، اس کی تکلیف اسے نہ پہنچے[1]۔''

اشتعال یا انتقام کے موقع پر محمد ثانی نے جو کچھ بھی کیا ہو تاہم اس کی فطرت نرم اور لطیف جذبات سے محروم نہ تھی، قسطنطنیہ کی فتح کے روز اس نے جس رحم دلی اور رقیق القلبی کا ثبوت دیا، اس کی مثال اس کے کسی ہم عصر نے کبھی پیش نہ کی، ڈیوک نوٹاراس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالارِ اعظم تھا، جب گرفتار کرکے اس کے سامنے لایا گیا تو محمد نے اسے نہ

---

[1] ایورسلے، ص ۹۵۔

صرف معاف کر دیا بلکہ اپنی سرپرستی کا بھی یقین دلایا، اس نے ڈیوک کے ساتھ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے لیے گیا، جو علالت اور تازہ مصیبت کے غم سے پریشان تھی اور نہایت نرمی اور احترام کے ساتھ جس طرح کوئی لڑکا اپنی ماں کو سمجھائے، اسے تسلی و تشفی دی، ایسی ہی نرمی کا برتاؤ اس نے حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ بھی کیا اور ان میں سے کئی ایک کا زرِ فدیہ اس نے خود ادا کیا، چند ہی دنوں میں اس کے عفو و کرم کا دامن تمام باشندگانِ شہر تک دراز ہو گیا[1]۔

مگر جلد ہی یہ دامن خون کے دھبوں سے داغ دار نظر آنے لگا، نوٹاراس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ عیسائی مؤرخوں نے محمد کے نقض عہد، سنگ دلی اور نفس پرستی کی ایک بین مثال کے طور پر لکھا ہے اور دل کھول کر اسے برا بھلا کہا ہے لیکن گبن کی تحقیق نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے اور ایک بازنطینی مؤرخ کی حق گوئی سے بہتان کی یہ پوری عمارت جو بغض و عناد کی بنیاد پر قائم تھی، مسمار ہو گئی، عیسائی مؤرخین ڈیوک اور اس کے لڑکوں کو شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور قتل کا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ اس نے اپنے لڑکوں کو سلطان کے خلوت عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا لیکن واقعہ یہ تھا کہ یہ قتل ایک سازش کا نتیجہ تھا جو نوٹاراس قسطنطنیہ کی رہائی کے لیے اٹلی سے کر رہا تھا، گبن لکھتا ہے کہ:

> ''ایسی باغیانہ سازش قابل ستائش ہو سکتی ہے لیکن جو باغی دلیرانہ جرأت کرتا ہے، وہ اس کی پاداش میں اپنی جان کے حق سے بجا طور پر محروم ہو جاتا ہے اور اگر کوئی فاتح اپنے دشمنوں کو قتل کر دے، جن پر آئندہ وہ اعتبار نہیں کر سکتا تو ہمیں اس کو قابل الزام نہ قرار دینا چاہیے[2]۔''

محمد ثانی ایک مطلق العنان فرماں روا کی طرح حکومت کرنا چاہتا تھا اور کسی وزیر کی مداخلت کو گوارا نہ کرتا، عثمان سے لے کر مراد ثانی تک تمام سلاطین اپنے وزیروں اور سپہ سالاروں

---

[1] گبن، جلد ۴، ص ۵۰۱ [2] ایضاً ص ۵۰۲۔

سے مشورہ لیا کرتے تھے اور انہیں شریک دستر خوان بھی کرتے تھے لیکن محمد نے اس دستور کو اٹھا دیا، وہ صرف احکام نافذ کرتا اور کسی کو محرمِ راز نہ بناتا، کھانا بھی وہ تنہا کھایا کرتا۔

آئینِ سلطنت ایک واضع قانون کی حیثیت سے سلطان محمد ثانی اپنے تمام پیش روؤں سے ممتاز نظر آتا ہے، اورخان کے عہد میں دولت عثمانیہ کے پہلے وزیر علاء الدین نے چند فوجی اصلاحات جاری کی تھیں...... جن کی تکمیل مراد اول کے زمانہ میں ہوئی لیکن نظام حکومت کے لیے کوئی دستور اس وقت تک مرتب نہ ہوا تھا، محمد ثانی پہلا سلطان ہے جس نے آئین سلطنت کو باضابطہ طور پر ترتیب دیا، اس کا "قانون نامہ" سلطنت عثمانیہ کا بنیادی دستور ہے۔

ارکانِ حکومت قانون نامہ میں سلطان کو ایک خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے، جو چار ستونوں پر قائم ہے، یعنی (۱) وزرائے سلطنت، (۲) قضاۃ عسکر، (۳) دفتر دار (خازن) اور (۴) نشانجی (معتمد سلطنت)، اس شاہی خیمہ کا بلند دروازہ باب عالی کے نام سے موسوم ہے، جس سے مراد حکومت عثمانیہ ہے۔

وزرا حکومت کے سب سے بڑے عہدہ دار تھے، محمد ثانی کے عہد میں ان کی مقررہ تعداد چار تھی، ان کو صدر وزیر اعظم، سلطنت کے تمام عہدے داروں کا افسر اعلیٰ تھا، اسی کے پاس حکومت کی مہر رہا کرتی تھی، جو بلند ترین منصب کا نشان تھا، تفصیلات پر غور و بحث کرنے کے لیے اسے اپنے مکان پر بھی مجلس وزرا کے منعقد کرنے کا اختیار حاصل تھا، قضاۃ عسکر کا تقرر علماء کی جماعت سے ہوتا تھا، محمد کے زمانہ میں قاضی عسکر دو تھے، ایک یورپ کی تمام عثمانی عدالتوں کا صدر تھا، دوسرا ایشیا کی، علما ہی کی جماعت سے تین بڑے عہدہ دار مقرر کیے جاتے تھے، جن کا مرتبہ اس وقت قضاۃ عسکر کے بعد تھا۔

(۱) خواجہ جو سلطان اور شہزادوں کا اتالیق ہوتا تھا، (۲) مفتی اور (۳) قاضی قسطنطنیہ نشانجی کے سپرد سرکاری دستاویزوں کے تیار کرنے اور ان پر سلطان کا طغرا ثبت

کرنے کی خدمت تھی، یہ منصب بعد کو صرف تعظیمی رہ گیا، اس کے تمام متعلقہ فرائض بتدریج رئیس آفندی (چیف سکریٹری) کی طرف منتقل ہو گئے۔

دیوان حکومت کی مجلس حل وعقد کا نام دیوان تھا، سلطان کی غیر موجودگی میں وزیر اعظم اس کا صدر ہوتا تھا، دوسرے وزراء اور قضاۃ عسکر اس کے داہنے بازو پر بیٹھتے تھے، دفتر دار اور نشانجی کی جگہیں بائیں جانب تھیں، ضرورت کے وقت دیوان کا خاص اجلاس وزیر اعظم کے مکان پر بھی ہوتا تھا۔

آغا ان عمائدین سلطنت کے علاوہ بڑے بڑے آغا بھی تھے، جو سلطنت کے دست و بازو سمجھے جاتے تھے، ان کی دو تقسیمیں تھیں، خارجی آغا اور داخلی آغا، خارجی آغا کی جماعت سے وہ فوجی حکام منتخب ہوتے تھے جن کے سپرد صوبوں کی حکومت ہوتی تھی، داخلی آغا دربار کے عہدوں پر مامور ہوتے تھے، فوجی آغاؤں میں ینی چری کے آغا اور سپاہی اور دوسرے سوار دستوں کے آغا خاص طور پر ممتاز تھے، ینی چری کا آغا قسطنطنیہ کی پولیس کا افسر اعلیٰ بھی ہوتا تھا اور داخلی آغا قصر سلطانی کے اعلیٰ عہدہ دار ہوتے تھے، مثلاً قاپو آغا (گورے خواجہ سراؤں کا افسر)، قیزلر آغا (حبشی خواجہ سراؤں کا افسر)، بوستانجی ماشی (باغبانوں کا افسر)، چاؤش باشی (حکومت کے قاصدوں کا افسر) وغیرہ، محکمۂ دیوانی کے بہت سے عہدوں پر بھی یہ داخلی آغا مقرر کیے جاتے۔

سنجق بے محمد فاتح کے عہد میں صوبوں کی حکومت بے اور بیلر بے کے سپرد ہوتی تھی، بے وہ پاشا کہے جاتے تھے، جن کے نیزوں کے سرے پر ایک گھوڑے کی دم باندھی جاتی تھی، یہ عثمانیوں کا فوجی نشان تھا، بیلر بے وہ پاشا تھے جن کے علم میں دو گھوڑوں کی دمیں ہوتی تھیں، یہ ان جاگیرداروں کے سردار تھے جن کو فوجی خدمات کے صلہ میں زمینیں دی گئی تھیں اور جن کے فرائض میں داخل تھا کہ جنگ کے موقعوں پر مسلح ہو کر حاضر ہو جایا کریں، یہ لوگ ایسے وقتوں میں اپنے اپنے سرداروں کے علم کے نیچے جمع ہو جاتے تھے، علم کو ترکی زبان میں

سنجق کہتے ہیں اور چوں کہ ہر علاقہ کا سنجق الگ تھا، اس لیے ان علاقوں کا نام ہی سنجق پڑ گیا اور ان کے سرداروں کو سنجق بے کہنے لگے، پاشا کا لقب جو عموماً صوبوں کے والیوں کو دیا جاتا تھا، حقیقۃً کسی حاکمانہ اختیار یا فوجی منصب کا نشان نہ تھا، بلکہ محض ایک اعزازی لقب تھا، ابتداءً عثمانیوں میں پاشا کے لقب کا استعمال صرف ان افسروں کے لیے نہیں ہوتا تھا جو فوج کی قیادت کرتے تھے یا جن کے ہاتھ میں صوبوں یا شہروں کی حکومت تھی، جن اول پانچ پاشاؤں کا ذکر عثمانی مصنّفین نے کیا ہے، ان میں سے تین ادیب تھے[1]، رفتہ رفتہ یہ اعزازی لقب ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو گیا جو سلطان کی طرف سے فوج کے کمانڈر اور علاقوں اور اہم شہروں کے حاکم مقرر کیے جاتے تھے، یہاں تک کہ لفظ پاشا لفظ گورنر کے تقریباً مترادف ہو گیا۔

محمد ثانی کے زمانہ میں چھتّیس سنجق سلطنت عثمانیہ کے صرف یورپی علاقوں میں تھے، جن میں سے ہر ایک کے نیچے چار چار سو سوار جمع ہوتے تھے، یورپ اور ایشیا میں سلطنت کے باضابطہ سواروں اور پیادوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، اس میں وہ سوار اور پیادے شامل نہ تھے، جو ہر جنگ کے موقع پر بطور خود اپنی خدمات پیش کرتے تھے اور جن کا معاوضہ صرف مالِ غنیمت تھا، سلطنت کی سالانہ آمدنی بیس لاکھ ڈوکات سے زیادہ تھی، آمدنی کی مدوں میں مال گزاری کے علاوہ محصولِ درآمد، معدنیات، جرمانے اور خراج کی رقمیں بھی شامل تھیں۔

علماء قانون نامہ کا نہایت اہم حصہ وہ ہے جس میں مذہب اور عدالت کے عہدہ داروں کا نظام قائم کیا گیا ہے، چوں کہ قضاۃ عسکر کا تقرر علما کی جماعت سے ہوتا تھا اور وہ خیمہ سلطنت کے چار ستونوں میں سے ایک ستون تھے، اس لیے محمد ثانی نے اس جماعت کی تعلیم و تنظیم پر خاص توجہ کی، کریسی لکھتا ہے:

''محمد ثانی کے پیش رووں خصوصاً اورخان کو اسکولوں اور کالجوں کے قائم کرنے

[1] فان ہیمر بہ حوالہ کریسی، جلد ا، ص ۱۶۰۔

کا بہت شوق تھا لیکن محمد ان سب سے بڑھ گیا تھا، اسی نے ''سلسلہ علما'' کو قائم کیا اور سلطنت کے مفتیوں اور قاضیوں کی تعلیم وترقی کا ضابطہ مرتب کیا، فاتح قسطنطنیہ خوب جانتا تھا کہ ایک بڑی سلطنت کے پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے جواں مردی اور فوجی مہارت کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ضروری ہیں، محمد نے جو خود بھی علوم میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اپنی رعایا میں تعلیم پھیلانے کے لیے بڑی عالی حوصلگی سے کام لیا، وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ عدالت کا نظم ونسق جیسا کہ چاہیے درست رکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ قاضیوں کا احترام قائم کیا جائے اور ان کا احترام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف علم و دیانت سے آراستہ ہوں بلکہ سلطنت کے اونچے اور باعزت عہدوں پر بھی مامور کیے جائیں، نیز افلاس کے وسوسوں اور پریشانیوں سے محفوظ کر دیے جائیں[1]۔''

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر محمد ثانی نے تعلیم کا جو نظام مرتب کیا وہ مذہبی اور علمی حیثیت کے علاوہ سیاسی حیثیت بھی رکھتا تھا، جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے:

''پچھلے عہد میں تمام مدرسے محض مذہبی مدرسے ہوتے تھے، اگرچہ ان میں اور علوم بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن ترکوں کا سررشتہ تعلیم پولیٹکل حیثیت رکھتا تھا، وہ سلطنت کے لیے لائق لائق عہدہ دار پیدا کرتا تھا[2]۔''

علاوہ مکاتب کے جو ہر قصبہ کے ہر محلّہ اور تقریباً تمام بڑے بڑے دیہاتوں میں کھول دیے گئے تھے، محمد نے کثرت سے اونچے درجہ کے مدرسے بھی قائم کیے اور ان پر جائدادیں وقف کیں، یہ مدرسے موجودہ زمانہ کے کالجوں کے برابر تھے، ان میں دس مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی، یعنی صرف، نحو، منطق، مابعد الطبیعیات، لسانیات، بلاغت، طرزِ تحریر، فن خطابت، اقلیدس اور ہیئت، جو طلبہ ان تمام مضامین میں پوری دست گاہ حاصل کر لیتے تھے ان کو دانش مند کی سند ملتی تھی، جو موجودہ یونیورسٹیوں کے ایم، اے کی سند کے

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۷۰-۱۶۹ [2] ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' از مولانا شبلی نعمانی۔

برابر تھی، یہ سند کسی ابتدائی مدرسہ کی اعلیٰ مدرسی کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی لیکن علما کی جماعت کا رکن بننے کے لیے دانش مند کی سند حاصل کرنے کے بعد فقہ اور اصولِ فقہ کا ایک طویل نصاب مکمل کرنا پڑتا تھا اور مختلف امتحانات پاس کرنے پڑتے تھے، اس جماعت میں وہی لوگ داخل کئے جاتے تھے، جو علوم کے بلند ترین مراتب پر فائز ہوتے اور ایسے لوگوں کو حکومت کی طرف سے بڑے بڑے عہدے اور منصب ملتے تھے اور انہیں خاص رعایتیں اور حقوق حاصل تھے، مدرسوں (کالجوں) کے اساتذہ جو مدرس کہے جاتے تھے، علما ہی کی جماعت سے مقرر ہوتے تھے اور اسی جماعت سے تمام حکام عدالت کا انتخاب بھی ہوتا تھا، مثلاً قصبوں اور دیہاتی علاقوں کے قاضی، ملا یعنی بڑے بڑے شہروں کے قاضی، استنبول آفندی یعنی قسطنطنیہ کا قاضی اور ناظر اعلیٰ، قضاۃ عسکر یعنی رومیلیا اور اناطولیہ کے قاضی القضاۃ اور مفتی، یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ علما کی جماعت کوئی مخصوص مذہبی جماعت نہ تھی، بلکہ ایک علمی جماعت تھی جس سے بڑے بڑے ملکی عہدہ دار، حکام فوج داری اور مدرسوں کے اساتذہ مقرر کیے جاتے تھے، خالص مذہبی جماعت جس میں مسجدوں کے امام، خطیب اور مبلغین شامل تھے، طبقہ علما کا محض ایک جز تھی، عام خیال یہ ہے کہ اس مذہبی گروہ کا اثر عثمانی ترکوں پر بہت زیادہ تھا اور اکثر مغربی مؤرخین نے بھی دولت عثمانیہ کے زوال کا ایک بڑا سبب علمائے مذہب ہی کو قرار دیا ہے جن کا جمود ترقی کی ہر راہ کا پتھر تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جماعت کا اثر بہت کم تھا، فان ہیمر لکھتا ہے:

> ''نام نہاد مذہبی گروہ یعنی مسجدوں کے اماموں، مؤذنوں اور خطیبوں کا اثر سلطنت عثمانیہ میں شاید ہر مملکت سے کم ہے، برخلاف اس کے معلمین کی جماعت کا اقتدار اور اہمیت اس قدر ہے کہ اس کی مثال چین کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی[1]۔''

کریسی جس کی تحقیق فان ہیمر کے علاوہ دوسرے قدیم ماخذوں پر بھی مبنی ہے،

---

[1] ''ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ'' جلد ۲۴، ص ۳۲۴۔

اس کی تائید کے ذیل میں لکھتا ہے:

''عثمانیوں کے شرف و افتخار کا یہ واقعہ بھی ضبط تحریر میں لانا چاہیے کہ ان میں مدرسین اور ان تمام اشخاص کا احترام جو خود علمی فضیلت میں ممتاز ہوں، یا اس کے حاصل کرنے میں دوسروں کی رہنمائی کا خاص ملکہ رکھتے ہوں، ہر عیسائی قوم سے زیادہ کیا جاتا ہے[1]۔''

خونیں قانون سلطان محمد ثانی نے حکومت کی ابتدا اپنے شیر خوار بھائی کے قتل سے کی تھی، جب اس نے اس قانون نامہ کو مرتب کرنا شروع کیا تو برادر کشی کو بھی سلطنت کے تخت نشین کے لیے ایک قانون بنادیا اور یہ دفعہ دستور حکومت میں درج کردی:

''میرے فقہا کی اکثریت نے یہ فتویٰ صادر کیا ہے کہ میرے جانشینوں میں سے جو تخت پر بیٹھیں وہ دنیا کے امن وامان کی غرض سے اپنے بھائیوں کو قتل کر سکتے ہیں، ان کا فرض ہوگا کہ اس پر کاربند ہوں[2]۔''

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۱۷۲ [2] فان ہیمر بہ حوالہ کریسی، جلد ۱، ص ۱۸۲۔

بایزید ثانی

۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ مطابق ۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء

سلطان محمد ثانی نے اپنی وفات پر دو لڑکے چھوڑے، بڑا لڑکا شہزادہ بایزید اماسیا کا حاکم تھا اور چھوٹا شہزادہ جم (جمشید) کرمانیہ کا، بایزید کا میلانِ طبع زیادہ تر مذہب اور فلسفہ کی جانب تھا جس کی وجہ سے لوگ اسے صوفی کہتے تھے، وہ نہایت سادہ مزاج، حلیم، نرم خو اور پابند شرع تھا، شاعری سے بھی خاص ذوق رکھتا تھا لیکن ان خصوصیات کے باوجود سپاہیانہ شجاعت میں بھی کم نہ تھا اور میدانِ جنگ میں پہنچ کر یہ صوفی مجاہد بن جاتا تھا، شہزادہ جم میں زیادہ تر سلطان محمد کے اوصاف پائے جاتے تھے، وہ فنونِ حرب کا ماہر اور شجاعت میں اپنے باپ کا مماثل تھا، حکم رانی کا ملکہ اور ملک گیری کی اہلیت اسے خداداد حاصل تھی، اس کے ساتھ شاعری میں بھی اس کا پایہ بلند تھا۔

جس وقت سلطان محمد کے انتقال کی خبر قسطنطنیہ میں مشتہر ہوئی، ینی چری نے تمام شہر میں لوٹ مار شروع کر دی اور وزیر اعظم کو جس نے سلطان کی وفات کو مخفی رکھنے کی کوشش کی تھی، قتل کر دا، چوں کہ وزیر اعظم کے متعلق معلوم تھا کہ وہ شہزادہ جم کا طرف دار ہے، اس لیے شہزادہ بایزید کے حامیوں نے بہ آسانی ینی چری کی حمایت حاصل کر لی، اس کے بعد باقی افواج نے بھی ینی چری کے تتبع میں بایزید کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا، شہزادہ جم کو سلطان کی

وفات کی اطلاع دیر میں ہوئی، اس درمیان میں شہزادہ بایزید نے قسطنطنیہ پہنچ کر تخت پر قبضہ کرلیا، ینی چری نے اس کی حمایت کی لیکن تخت نشینی کے موقع پر اپنی تنخواہوں میں اضافہ اور بخشش کا مطالبہ بھی پیش کیا، اس رسم کی بنا سلطان محمد کی تقریب تاج پوشی میں پڑ چکی تھی، بایزید کو مجبوراً یہ مطالبہ پورا کرنا پڑا، اس کے بعد تین سو برس تک یہ دستور قائم رہا کہ ہر نئے سلطان کی تخت نشینی کے وقت ینی چری کو بڑی بڑی رقمیں بطور انعام کے دی جاتی تھیں، بقول کریسی یہ رسم جس قدر خزانہ شاہی کے لیے بار تھی اسی قدر سلاطین کے لیے باعث شرم تھی۔

شہزادہ جم خاندان عثمانی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کا کوئی شہزادہ تاج و تخت سے کم پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا، اسی لیے کسی سلطان کے مرنے پر اس کے لڑکوں میں تخت سلطنت کے لیے جنگ کا شروع ہو جانا لازمی تھا، چنانچہ اس موقع پر بھی اگرچہ بایزید تخت پر قابض ہو چکا تھا اور تمام فوج اور امرائے دولت نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا، تاہم شہزادہ جم نے علم بغاوت بلند کر دیا اور جنگ چھڑ گئی، وہ جانتا تھا کہ اس کے والد نے جو خونی قانون دستور سلطنت میں داخل کر دیا ہے، اس کی وجہ سے اس کی جان ہر وقت خطرہ میں ہے، لہٰذا اطاعت قبول کرنے کے بعد بھی اسے بایزید کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا، اعلانِ جنگ سے قبل اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم کر دی جائے، یورپ کے صوبے بایزید کی حکومت میں رہیں اور ایشیا کے صوبوں پر جم کی حکومت تسلیم کر لی جائے لیکن بایزید نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، اب لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ۲۰ رجون ۱۴۸۱ء کو احمد کدک پاشا نے جم کو شکست دی اور وہ بھاگ کر سلطان مصر کے دربار میں پناہ گزیں ہوا، دوسرے سال مصر کی فوجی مدد کے ساتھ وہ پھر واپس ہوا اور ایشیائے کوچک کے بعض ترکی سردار اس کی حمایت میں کھڑے ہوئے لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست کھا کر وطن چھوڑنا پڑا، اب کی بار وہ بجائے مصر کے روڈس پہنچا تاکہ وہاں سے مدد لے کر سلطنت عثمانیہ کے یورپین مقبوضات میں داخل ہو اور از سر نو قسمت آزمائی کرے، روڈس مبارزین یروشلم

کے قبضہ میں تھا، ان کا سردار ڈی، آبوسن (De Aubusson) ایک نہایت چالاک اور غدار شخص تھا، اس نے ایک طرف تو شہزادہ جم کو مدد دینے کا وعدہ کیا اور اس سے یہ معاہدہ کرایا کہ بہ صورت کامیابی وہ مبارزین روڈس کو بعض مخصوص اور اہم مراعات عطا کرے گا اور دوسری طرف سلطان بایزید سے یہ طے کیا کہ پینتالیس ہزار ووکات سالانہ کے عوض وہ جم کو نظر بند رکھے گا، چنانچہ سات برس تک یہ بدنصیب شہزادہ روڈس اور پھر فرانس کے مختلف مقامات میں جو مبارزین روڈس کے قبضہ میں تھے، ظاہری احترام کے باوجود دراصل ایک قیدی کی طرح زندگی بسر کرتا رہا، تمام یورپ کو جم کے معاملہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور متعدد بادشاہوں نے شہزادہ کو حاصل کرنے کے لیے ڈی آبوسن سے مراسلت شروع کردی تھی، وہ چاہتے تھے کہ اسے بایزید کے مقابلہ میں کھڑا کر کے سلطنت عثمانیہ کو نقصان پہنچائیں لیکن ڈی آبوسن پینتالیس ہزار ووکات سالانہ کی رقم سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھا، وہ معاملہ کو عمداً طول دیتا رہا، اس درمیان میں اس نے شہزادہ جم کی ماں اور بیوی سے بھی جو اس وقت قاہرہ میں مقیم تھیں، خط و کتابت شروع کردی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر بیس ہزار ووکات ادا کر دیے جائیں تو شہزادہ فوراً قاہرہ پہنچا دیا جائے گا، ڈی آبوسن کے وعدہ پر اعتماد کر کے ان خواتین نے یہ رقم اس کے پاس بھیج دی تھی، مگر مبارزین یروشلم کا یہ مقدس پیشوا ایفائے عہد کی پابندی سے بالاتر تھا، عیسائی مؤرخین بھی اس شرمناک فریب پر اظہارِ نفرت کرتے ہیں، بالآخر شاہِ فرانس چارلس ہشتم نے جم کو ڈی آبوسن کے پنجہ سے رہا کر کے پوپ اینوسنٹ ہشتم (Pope Innocent VII) کے پاس رومہ بھیج دیا، یہاں بھی اس کی حیثیت حقیقۃً ایک قیدی ہی کی تھی، اگرچہ اینوسنٹ نے اس کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کو اپنے محل میں عزت و احترام کے ساتھ رکھا، اب پوپ نے چالیس ہزار ووکات سالانہ کی رقم شہزادہ کی نگرانی کے صلہ میں بایزید سے وصول کرنا شروع کی، چند سال کے بعد اینوسنٹ مرگیا اور اس کا جانشین پوپ اسکندر بورجیا

ہوا جو اپنے ہلاکت پاش جرائم کی وجہ سے عالم گیر شہرت کا (Pope Alexander Borgia) مالک ہے، اسکندر بورجیا نے اپنا ایک سفیر سلطان بایزید کی خدمت میں بھیج کر شہزادہ جم کی نظر بندی سے متعلق سابق معاہدہ کی تجدید کی اور اس میں ایک اہم دفعہ کا اضافہ یہ کیا کہ اگر وہ سلطان کو شہزادہ کی طرف سے ہمیشہ کے لیے مطمئن کر دے تو بجائے چالیس ہزار دوکات سالانہ وصول کرنے کے تین لاکھ دوکات یک مشت کا مستحق ہوگا لیکن ابھی سلطان اور سفیر پوپ کے درمیان اس معاملہ پر گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ چارلس ہشتم نے اٹلی پر حملہ کر دیا اور ۳۱ر دسمبر ۱۴۹۵ء کو رومہ میں فاتحانہ داخل ہوا، چند روز کے بعد شاہ چارلس اور پوپ اسکندر کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی، جس کی ایک اہم شرط تھی کہ شہزادہ جم چارلس کے ساتھ فرانس جائے گا، اسکندر کو صلح کی خاطر یہ شرط منظور کرنی پڑی اور شہزادہ فرانسیسی فوج کے سپہ سالار کے ساتھ رومہ سے روانہ ہوگیا، اسکندر بورجیا کو اگرچہ چالیس ہزار دوکات سالانہ سے محروم ہو جانا پڑا تاہم شہزادہ کے قتل سے تین لاکھ دوکات کی خطیر رقم کا حاصل کرنا اب بھی ممکن تھا اور وہ اس خونیں تدبیر میں کام یاب ہوا، قتل کے طریقہ میں ترک اور اطالوی مؤرخین کے بیانات باہم مختلف ہیں، اطالوی مؤرخین کی روایت ہے کہ اسکندر بورجیا نے شہزادہ کے ایک خدمت گار سے سازش کر کے ایک خاص قسم کا سفید زہر شکر میں ملا کر کھلا دیا، ترک مؤرخین کا بیان ہے کہ مصطفیٰ نامی ایک نائی نے بورجیا کی تحریک سے شہزادہ کا خط بناتے وقت زہر کے بجھے ہوئے استرہ سے ایک خفیف سا زخم لگا دیا، بہر حال تمام مؤرخین کو اس امر پر اتفاق ہے کہ شہزادہ جم کا قتل پوپ اسکندر بورجیا ہی کی تحریک سے عمل میں آیا[1]، زہر کا اثر فوراً ہی ظاہر نہ ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ نمایاں ہوا، یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد فاتح قسطنطنیہ کا وہ جواں سال و جواں ہمت فرزند جس نے اپنی عمر کے ۳۶ سال بھی ہنوز پورے نہ کیے تھے اور جو تیرہ سال تک اسیری کی صعوبتیں برداشت کر چکا تھا، بیک وقت قید فرنگ و قید حیات دونوں سے آزاد

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۱۹۴۔

ہو گیا، آخر وقت تک اسے بیوی اور بچوں کے دیکھنے کی حسرت تھی، اس کی آخری دعا یہ تھی:

> ''اے میرے رب! اگر دینِ حق کے دشمن یہ چاہتے ہیں کہ میری ذات کو آلہ کار بنا کر ان تجویزوں کو تقویت پہنچائیں جو انہوں نے مسلمانوں کی بربادی کے لیے سوچ رکھی ہیں تو آج کے بعد مجھے زندہ نہ رکھ، بلکہ فوراً میری روح کو اپنی طرف اٹھا لے۔''

سلطان بایزید نے اس کی نعش یورپ سے منگوالی اور اسے شاہی تزک و احتشام کے ساتھ بروصہ میں سپرد خاک کر دیا۔

شہزادہ جم کے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے:

> ''اس تمام غم ناک سرگذشت سے یہ حیرت انگیز نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیائے مسیحیت میں ایک بھی ایمان دار بادشاہ نہ تھا، جو قیدی پر ترس کھاتا اور نہ کوئی ایسا تھا جو گرینڈ ماسٹر (ڈی آبوسن) پوپ اور چارلس ہشتم کی غیر شریفانہ اور ضمیر فروشانہ سازشوں پر نفریں کرتا، ان میں سے ہر ایک غداری اور فضیحت کے انعام کے لیے دوسرے سے مسابقت کی کوشش کر رہا تھا، اپنے بھائی کو محفوظ نگرانی میں رکھنے کی خواہش کرنا بایزید کے لیے قابل معافی ہوسکتا ہے لیکن مسیحی کلیسا کے پیشوائے اعظم اور رہبانی نائٹوں کی جماعت کے سرداری کی مدافعت میں کیا کہا جا سکتا ہے جنھوں نے کافری اشرفیوں کے لیے ایک بے کس و مجبور پناہ لینے والے کو دغا دی[1]۔''

اوٹرانٹو بایزید ثانی کا عہد حکومت فتوحات اور توسیع سلطنت کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، تخت نشینی کے بعد اس نے احمد کدک پاشا کو شہزادہ جم کی بغاوت فرو کرنے کے لیے اوٹرانٹو سے واپس بلا لیا اور اس کی جگہ خیر الدین پاشا کو مقرر کیا، خیر الدین پاشا کو حسب ضرورت مدد نہ پہنچ سکی، وہ بہت دنوں تک نہایت بہادری کے ساتھ دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرتا رہا، مگر بالآخر شہر ڈیوک آف کلبریا (Calabria) کو سپرد کر دینا پڑا، اوٹرانٹو کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد پھر کبھی ترکوں کا قدم اٹلی کے کسی حصہ میں نہ جم سکا۔

---

[1] ''ترکی'' از لین پول، ص ۱۵۰۔

ہرزیگووینا ہرزیگووینا اب تک ایک باج گزار حکومت تھی، بایزید نے اسے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا۔

ہنگری ہنگری سے کئی سال تک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس سے کوئی خاص نتیجہ حاصل نہ ہوا اور آخر میں دونوں سلطنتوں میں صلح ہوگئی۔

بحری فتوحات البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ۹۰۴ھ (۱۴۹۸ء) میں چھڑی وہ بہ اعتبار اپنے نتیجہ کے بہت زیادہ اہم تھی، ترکوں نے موریا میں وینس کے تین باقی ماندہ قلعوں یعنی مورانس (Mavarins) موڈن (Moden) اور کورن (Coran) کو بھی فتح کرلیا اور اس طرح یونان میں وینس کے اثر کا خاتمہ ہوگیا، ترکی بیڑا محمد فاتح کے عہد ہی میں بحر روم کی تمام بحری طاقتوں پر فوقیت حاصل کرچکا تھا، بایزید ثانی نے اس کو اور زیادہ فروغ دیا، چنانچہ ۹۰۵ھ (۱۴۹۹ء) میں مشہور ترکی امیر البحر کمال رئیس نے وینس کے بیڑے کو زبردست شکست دے کر لیپانٹو (Lepanto) کے بندرگاہ پر قبضہ کرلیا، دوسرے سال وینس، آسٹریا، اسپین اور پوپ کے بیڑوں نے متحدہ طور پر ترکی بیڑے پر حملہ کیا، باوجود اس کے کہ عثمانی جہازوں کی مجموعی تعداد اتحادی بیڑوں سے بہت کم تھی، کمال رئیس نے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور پھر آگے بڑھ کر مسلمانانِ غرناطہ کی درخواست پر، جو عیسائیوں کے ظلم وستم سے عاجز آچکے تھے، سواحل اسپین پر حملے کیے لیکن مظلومین غرناطہ کو ان حملوں سے کوئی فائدہ نہ پہنچا اور ان کو آخر کار اپنا وطن چھوڑ کر اسپین سے نکل جانا پڑا۔

مصر سے صلح ایشیا میں اب تک سلاطین عثمانی کو جن مخالفین سے سابقہ پڑا تھا وہ صرف ایشیائے کوچک کے امراء تھے، جنہوں نے دولت سلجوقیہ کی تباہی کے بعد خودمختار ریاستیں قائم کر لی تھیں، یہ تمام ریاستیں محمد فاتح کے عہد تک مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلی گئی تھیں اور سلطان کو اپنے ایشیائی مقبوضات کی طرف سے اطمینان حاصل ہو چکا تھا لیکن بایزید ثانی کے تخت پر آتے ہی عثمانیوں کو ایک نئے دشمن سے معاملہ کرنا پڑا، حکومت مصر یہ اب تک سلطنت

عثمانیہ کے معاملات سے بالکل بے تعلق تھی، شہزادہ جم نے پہلی بار اس کو عثمانی مقبوضات میں قدم رکھنے کی دعوت دی، اگرچہ اس مہم میں مصری فوج کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا تاہم سلطنت عثمانیہ سے قوت آزمائی کی جرأت پیدا ہوگئی اور مصریوں نے ایشیائے کوچک کے جنوبی مشرقی علاقوں پر دست درازیاں شروع کر دیں، دولت عثمانیہ اور مصر کے مملوک سلطانوں کے درمیان پہلی جنگ ۸۹۰ھ (۱۴۸۵ء) میں شروع ہوئی، جس میں ترکوں کو سخت شکست ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرمانیہ نے بغاوت کر دی، عثمانی فوجیں اس بغاوت کے فرو کرنے میں تو کامیاب ہوئیں لیکن مصریوں کے مقابلہ میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا، بالآخر پانچ سال کے بعد اس جنگ کا سلسلہ ختم ہوا اور بایزید ثانی نے اپنے تین قلعے سلطانِ مصر و شام کی نذر کر کے صلح کر لی۔

سلیم کی بغاوت اور تخت نشینی

بایزید کا عہد حکومت جس طرح خانہ جنگی سے شروع ہوا تھا، اسی طرح خانہ جنگی پر ختم بھی ہوا، اس کے تینوں لڑکے کرکود، احمد اور سلیم ایشیائے کوچک کے مختلف صوبوں کے حکمراں تھے، کرکود بڑا لڑکا تھا لیکن اس کا ذوق تمام تر علمی تھا، اس لیے بایزید احمد کو جسے وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن سلیم باوجود سب سے چھوٹا ہونے کے اپنی شجاعت اور فوجی قابلیت کی وجہ سے تمام فوج خصوصاً ینی چری میں نہایت محبوب تھا، یہ دیکھ کر بایزید اپنی عمر اور خرابی صحت کے باعث امورِ سلطنت پر کافی توجہ مبذول کرنے سے معذور ہے، سلیم کو خطرہ لاحق ہوا کہ ممکن ہے احمد بایزید کی حیات ہی میں تخت پر قابض ہو جائے، لہٰذا اس نے سلطان کی اجازت کے بغیر طرابزون سے قسطنطنیہ کی طرف کوچ کر دیا اور ایک منتخب فوج کے ساتھ اورنہ پہنچ گیا، بایزید نے اس کو طرابزون واپس جانے کا حکم دیا لیکن سلیم جنگ پر آمادہ ہو گیا اور بایزید کو مجبوراً اس سے مقابلہ کرنا پڑا، اس جنگ میں سلیم کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر کریمیا پہنچا، کریمیا کا فرماں روا سلیم کا خسر تھا، اس نے سلیم کی مدد کی، کچھ دنوں کے بعد وہ پھر قسطنطنیہ لوٹا اور اب کی بار تمام فوج نے اس کا ساتھ دیا، بایزید نے ینی چری کے ایک وفد کو باریاب کیا اور ان سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، انہوں نے

جواب دیا کہ ہمارا بادشاہ ضعیف العمر اور کم زور ہے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ سلیم تخت نشین ہو، یہ دیکھ کر کہ فوج قابو سے باہر ہو چکی ہے، بایزید نے اعلان کیا کہ میں اپنے لڑکے سلیم کے حق میں تختِ سلطنت سے دست بردار ہوتا ہوں، خدا اس کو ایک خوش حال عہد حکومت عطا فرمائے، اس کے بعد وہ تخت سے اتر آیا، وہ چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام ایشیائے کوچک کے شہر ڈیموٹیکا میں گزار دے جو اس کی جائے پیدائش تھا لیکن موت نے اس کی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا اور قسطنطنیہ سے روانہ ہونے کے تین ہی روز بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

پہلا روسی سفیر سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان اب تک سفارتی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے، ۹۰۰ھ (۱۴۹۵ء) میں پہلا روسی سفیر مائیکل پلے شیف (Micheal Plestshiev) قسطنطنیہ آیا اور روسی تاجروں کے لیے تجارتی مراعات کا خواست گار ہوا، زار ایوان سوم (Ivan III) نے اسے سختی کے ساتھ ہدایت کر دی تھی کہ وہ نہ تو سلطان کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو، نہ سلطان کے علاوہ کسی وزیر سے سفارتی معاملات پر کوئی گفتگو کرے اور نہ یورپ یا ایشیا کی کسی مملکت کے سفیر کو اپنے آگے جگہ دے، اے ڈی لا مارٹین (A. De Lamartine) تاریخ ترکی میں لکھتا ہے کہ پلے شیف کی گستاخی اور بدتمیزی اس کے دربار کے تکبر سے بھی بڑھ گئی، جو قوم اس کی مہمان نوازی اور تواضع کر رہی تھی، اسی کے رسم و رواج کی اس نے تحقیر کی، وزیر اعظم نے اس کے استقبال کے لیے جو دعوت کی تھی، اس میں شریک ہونے سے اس نے انکار کر دیا اور دیوان کی طرف سے جو خلعت اور دوسرے تحائف اسے پیش کیے گئے تھے، انہیں واپس کر دیا، عثمانی رسم و رواج کی اس توہین پر مغربی حکومتوں کے سفیروں کو بھی غصہ آیا[1]، اگر یہ روسی سفیر محمد ثانی یا سلیم اول کے عہد میں آیا ہوتا تو اسے اپنی گستاخیوں کا نتیجہ معلوم ہو جاتا، بایزید نے اپنے غیر معمولی تحمل اور بردباری کی وجہ سے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ پلے شیف کو رخصت کر دیا اور اپنا کوئی سفیر دربارِ روس میں نہیں بھیجا۔

---

[1] ڈی لا مارٹین، بہ حوالہ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۲۴، ص ۳۳۷۔

سلیم اوّل

۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ مطابق ۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء

جس وقت سلیم نے بایزید کو تخت سے اتار کر زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی وہ سینتالیس سال کی پختہ عمر کو پہنچ چکا تھا اور اس کی فوجی اور انتظامی قابلیت پوری طرح مسلم ہو چکی تھی، اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی لیکن اس قلیل مدت میں سلطنت عثمانیہ کی وسعت کو دو چند کر دیا، اس نے یورپین مقبوضات میں کوئی اضافہ نہیں کیا مگر ایشیا میں دیار بکر، کردستان، شام، مصر اور عرب کا ایک بڑا حصہ جس میں حرمین شریفین بھی داخل تھے، فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اس کی فتوحات کی وسعت، اعلیٰ فوجی قابلیت اور انتظام سلطنت کی غیر معمولی اہلیت نے اس کو سلاطین آلِ عثمان کی صف اول میں ایک ممتاز جگہ دی ہے، ان خصوصیات کے علاوہ علم و فضل میں بھی اس کا پایہ نہایت بلند تھا، وہ رات کو بہت کم سوتا اور زیادہ تر وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتا، اس کو تاریخ اور فارسی شاعری سے خاص دل چسپی تھی، فارسی زبان میں اس نے کچھ نظمیں خود بھی لکھیں، محمد فاتح کی طرح وہ بھی سیزر اور سکندر کے کارنامے نہایت شوق سے پڑھا کرتا تھا، اس کو حرم کی زندگی سے بہت کم دل چسپی تھی، دن میں سلطنت کے کاموں سے جو وقت بچتا، اس کا بیشتر حصہ وہ علما کی صحبت میں گزارتا، وہ اہل علم کو بڑے بڑے عہدوں پر بھی مامور کرتا، مثلاً جب کردستان کا

صوبہ فتح ہوا تو اس نے مؤرخ ادریس کو وہاں کا والی مقرر کیا لیکن علم کا شوق اور علما کی ہم نشینی اس کے مزاج میں نرمی پیدا نہ کر سکی، اس کی طبیعت حد درجہ اشتعال پذیر تھی، وہ کسی امر میں خفیف سی مخالفت بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور جو لوگ اس کی رائے سے ذرا بھی اختلاف کرنے کی جرأت کرتے، ان کو فوراً قتل کرا دیتا تھا، اس کے مختصر عہد حکومت میں سات وزیراعظم اس کے حکم سے قتل ہوئے، ان کے علاوہ متعدد فوجی اور ملکی عہدہ داروں کو بھی اس کی ناخوشی کی پاداش میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا، جو لوگ وزیراعظم کے عہدہ پر مقرر کیے جاتے تھے، ان کو اپنے انجام کا اتنا یقین ہوتا تھا کہ وہ اس ہلاکت آفریں ذمہ داری کو قبول کرنے سے پہلے ایک وصیت نامہ لکھ کر چھوڑ جاتے تھے اور اکثر ان کی پیش بینی صحیح ثابت ہوتی تھی، چنانچہ ایک روز وزیراعظم پیری پاشا نے سلیم سے عرض کیا کہ اے میرے بادشاہ! میں جانتا ہوں کہ جلد یا بدیر تجھے اس وفادار غلام کو قتل کرنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ مل جائے گا، لہٰذا التجا ہے کہ قتل سے پہلے مجھے تھوڑی مہلت عطا فرما تا کہ میں اس دنیا سے متعلق اپنے کاروبار کا انتظام کرلوں اور تیرے حکم سے دوسری دنیا میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤں، سلیم اس درخواست پر ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میں کچھ دنوں سے تیرے قتل کی نسبت غور کر رہا ہوں لیکن فی الحال تیرا کوئی جانشین مجھے نظر نہیں آتا، ورنہ تیری یہ درخواست میں بہ خوشی منظور کر لیتا، لیکن سلیم کی یہ سختی جو عموماً ظلم سے تعبیر کی جاتی ہے، ایک خاص اصول کے ماتحت تھی، وہ جو کچھ کرتا تھا، سلطنت کے لیے کرتا تھا، وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے باپ کے حلم ولنیت نے حکومت کے تمام شعبوں میں بدنظمی پیدا کر دی تھی، فوج میں خودسری آگئی تھی، وزراء اپنے فرائض کو بھولے ہوئے تھے، قاضیوں کے فیصلوں میں جانب داری کی جھلک نمایاں تھی، اس حالت کو سدھارنے کے لیے سختی ناگزیر تھی اور گو بعض اوقات سزا کی شدت جرم کی شدت سے بڑھ جاتی تھی، تاہم اس سخت گیری کا عام اثر نہایت مفید ثابت ہوا اور وہ تمام خرابیاں دور ہو گئیں جو حکومت کی بنیاد کو متزلزل کر دینے کے لیے کافی ہیں، مؤرخین

نے سلیم کو ظالم لکھا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان مظالم کے باوجود وہ رعایا میں نہایت مقبول تھا، جو طرزِ عمل افراد کے لیے ظلم کا حکم رکھتا تھا، وہی رعایا کے حق میں رحمت بن گیا تھا۔

بھائیوں کی بغاوت سلیم نے جس وقت بایزید کو تخت سے اتار کر سلطنت پر قبضہ کیا تھا، اس کے دونوں بڑے بھائی کرکود اور احمد ایشیائے کوچک کے دو صوبوں کے حاکم تھے، ابتدا میں ان دونوں نے اطاعت کا اظہار کیا، سلیم ان کی طرف سے مطمئن نہ ہوا، اس کو تخت پر بیٹھے چند ہی روز گزرے تھے کہ شہزادہ احمد نے، جو اماسیا کا حاکم تھا، علم بغاوت بلند کر کے بروصہ پر قبضہ کر لیا، سلیم فوراً ایشیائے کوچک پہنچا، احمد بروصہ چھوڑ کر بھاگا اور اپنے دولڑکوں کو شاہ اسماعیل کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے ایران روانہ کیا، سلیم نے گو بروصہ پر قبضہ کر لیا لیکن اس کی فوج کے بعض افسر شہزادہ احمد سے جا ملے اور لڑائی پھر چھڑ گئی، ابتدا میں احمد کو چند معمولی فتوحات حاصل ہوئیں لیکن بالآخر اسے اپنی جان لے کر بھاگنا پڑا، سلیم نے وزیر اعظم مصطفیٰ پاشا کو، جو احمد سے مل گیا تھا، پھانسی دے دی اور اس کے بعد اپنے پانچ بھتیجوں کو، جو بروصہ کے بعض امراء کے گھروں میں چھپے ہوئے تھے، گرفتار کر کے مروا ڈالا، یہ شہزادے اس کے مرحوم بھائیوں شہنشاہ شاہ عالم اور محمود (جو بایزید کی حیات ہی میں وفات پا چکے تھے) کی اولاد تھے۔

شہزادہ کرکود اس وقت تک اپنے علاقہ صاروخان میں خاموش بیٹھا تھا لیکن ان شہزادوں کے قتل کی خبر سن کر اس نے سمجھ لیا کہ اس کی باری بھی اب آیا چاہتی ہے، اس لیے وہ بھی اب اپنی جان کی حفاظت کا سامان کرنے لگا اور ینی چری کو اپنا طرف دار بنانے کی کوشش شروع کی، سلیم کو اس کی تیاریوں کی اطلاع ہوگئی، وہ نہایت خاموشی سے شکار کا بہانہ کر کے دس ہزار سواروں کے ساتھ کرکود کی حکومت میں داخل ہوا اور اسے گرفتار کر لینا چاہا، کرکود بھاگا لیکن جلد پکڑ لیا گیا، سلیم نے سنان نامی ایک افسر کو اس کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ مرنے کے لیے فوراً تیار ہو جاؤ، رات کا وقت تھا اور کرکود سو رہا تھا، سنان نے اس کو

بیدار کر کے سلیم کا حکم سنایا، کرکود نے صرف ایک گھنٹہ کی مہلت مانگی، اس فرصت میں اس نے اپنی بے کسی کی موت پر ایک منظوم خط سلیم کے نام لکھا، جس میں اس کی بے دردی کی شکایت کی، اس کے بعد اس نے اپنی گردن جلاد کے حوالے کر دی، سلیم یہ خط پڑھ کر، جو حقیقۃً ایک نہایت دردناک مرثیہ تھا، بہت رویا، اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ تین روز تک خود بھی ماتم کرتا رہا اور تمام سلطنت میں بھی ماتم کا حکم دیا، جن ترکمانوں نے کرکود کے چھپنے کی جگہ کا پتہ بتایا تھا اور اب انعام کے لیے حاضر ہوئے تھے، سلیم نے ان سب کو قتل کرا دیا، اس درمیان میں احمد نے پھر ایک فوج اکٹھا کر کے سلیم کا مقابلہ کیا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوا لیکن ۱۷ر صفر ۹۱۹ھ (۲۴ر اپریل ۱۵۱۳ء) کی جنگ میں اسے شکست ہوئی اور وہ قید کر لیا گیا، اسے بھی گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔

ایران سے جنگ سلیم اب تخت سلطنت کی طرف سے مطمئن ہو گیا، وہ ایشیائے کوچک سے یورپ کو واپس ہوا اور یورپ کی مختلف حکومتوں سے صلح ناموں کی تجدید کر کے اپنی سلطنت کے مغربی حصہ کو ہر طرح کے بیرونی خطرات سے محفوظ کر لیا اور پھر مشرق کی جانب متوجہ ہوا، ایران کے تخت پر اس وقت شاہ اسماعیل صفوی متمکن تھا، جس نے چند سال قبل عراق، عرب، خراسان اور دیار بکر پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کا ایک فوجی افسر بغداد میں بھی داخل ہو گیا تھا، ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں فارستان اور آذربائیجان بھی سلطنت ایران میں شامل کر لیے گئے تھے، جو خلیج فارس سے بحر کاسپین اور فرات سے دریائے آمو تک پھیلی ہوئی تھی، اس طرح ایران کی سرحد سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے مل گئی تھی، اتفاق یہ کہ دونوں سلطنتوں کے فرماں روا بھی شجاعت، عظمت اور ملک گیری کی ہوس میں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے، ایسی صورت میں دونوں کا تصادم ناگزیر تھا، تصادم کے متعدد اسباب موجود تھے، سب سے بڑا سبب مذہب کا اختلاف تھا، شاہ اسماعیل ایک غالی شیعہ اور سلیم ایک متشدد سنی تھا، سلطنت عثمانیہ کے ایشیائی مقبوضات میں شیعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، شاہ اسماعیل کے گماشتے اناطولیہ میں شیعیت

کی تلقین کرتے پھرتے تھے اور اندر اندر لوگوں کو سلیم کے خلاف ابھارتے رہتے تھے، سلیم شیعیت کا سخت دشمن تھا اور اسے سلطنت کے لیے ایک بڑا فتنہ خیال کیا کرتا تھا، وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کی تخت نشینی سے ایک ہی سال قبل اسماعیل کے اعوان میں سے شاہ قلی نامی ایک شخص نے کس طرح تشیع کی تبلیغ کر کے اناطولیہ کے باشندوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا اور اس فتنہ کے فرو کرنے میں کس قدر دشواری پیش آئی تھی، چنانچہ جب اسے اس قسم کا خطرہ پھر محسوس ہوا تو اس نے اپنی سلطنت سے شیعیت کا استیصال کر دینا چاہا اور جاسوسوں کے ذریعہ سے سلطنت کے تمام شیعوں کو شمار کرایا، ان کی تعداد ستّر ہزار نکلی، پھر ایک روز دفعۃً ان میں سے چالیس ہزار کو قتل کرا دیا اور باقی تیس ہزار کو جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے، قید میں ڈال دیا، اس واقعہ سے تمام ایران میں ایک آگ سی لگ گئی لیکن سلیم کی قوت وسطوت کے مقابلہ میں اس وقت شاہ اسماعیل کو اقدام کی جرأت نہ ہوئی، بہر حال ایران اور دولت عثمانیہ کی جنگ کا یہی ایک سبب نہ تھا، اس قتل عام سے قبل بھی دونوں سلطنتوں کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے، مثلاً شاہ یزید ثانی کے عہد میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں پیش آچکی تھیں جن میں شاہ اسماعیل نے بعض ترک سرداروں کو جو ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقوں کے حاکم تھے، شکست دی تھی، علاوہ بریں اس نے دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں سلطان مصر سے اتحاد کر لیا تھا، وہ سلطنت عثمانیہ کی رفتار ترقی کو روکنا چاہتا تھا، ان میں سے ہر سبب سلیم جیسے تند مزاج سلطان کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن جس چیز نے اس کو سب سے زیادہ برانگیختہ کیا وہ یہ تھی کہ شاہ اسماعیل نے مرحوم شہزادہ احمد کے لڑکے شہزادہ مراد کو پناہ دی اور اعلانیہ اس کی حمایت کر رہا تھا، نہ صرف یہ بلکہ سلیم کو تخت سے اتار کر مراد کو اس کی جگہ بیٹھانے کے لیے وہ اب فوجیں بھی جمع کر رہا تھا، سلیم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ایران پر حملہ کا تہیہ کر لیا اور شاہ اسماعیل کو میدان جنگ میں مقابلہ کی دعوت دی۔

عثمانی فوجیں ینی شہر کے میدان میں جمع ہوئیں اور سلیم ۲۳ رصفر ۹۲۰ھ (۲۰ راپریل

۱۵۱۴ء) کو ایک لاکھ چالیس ہزار فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ایران کے پایہ تخت تبریز کی طرف روانہ ہوگیا، ینی شہر سے تبریز کا فاصلہ ایک ہزار میل سے زیادہ تھا، راستہ بھی پہاڑی تھا اور درمیان میں کوئی سڑک نہ تھی، سب سے بڑی دشواری سامان رسد کی فراہمی کی تھی، جب سلیم ایران کی سرحد پر پہنچا تو شاہ اسماعیل نے بجائے مقابلہ کرنے کے تمام علاقے ویران کرادیے اور خود پایہ تخت کی طرف لوٹ گیا، اس سے سلیم کی مشکلات اور بڑھ گئیں، رسد کے ملنے میں سخت دشواری پیش آنے لگی، فوج میں جو اپنے طویل سفر سے بالکل خستہ ہوگئی تھی، بے دلی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور اس نے آگے بڑھنے میں تامل کیا لیکن سلیم کی مستقل مزاجی بدستور قائم رہی اور باوجود اس کے کہ رسد کی فراہمی روز بروز زیادہ دشوار ہوتی جاتی تھی، اس کے قدم نہ رکے، بالآخر فوج نے علانیہ طور پر آگے بڑھنے سے انکار کردیا، سلیم کے لیے یہ موقع نہایت نازک تھا، مگر اس کی غیر معمولی شجاعت نے فوج کو قابو سے باہر نہ ہونے دیا، وہ دلیری کے ساتھ ان کے سامنے گیا اور یوں کہنے لگا ”کیا اسی طرح تم اپنے سلطان کی خدمت کرتے ہو؟ کیا تمہارا ادعائے وفا محض زبانی تھا؟ جو لوگ واپس جانا چاہتے ہیں وہ فوج سے علاحدہ ہو جائیں اور چلے جائیں لیکن میں نے تو اتنی دور کا سفر اس لیے نہیں کیا ہے کہ یہاں سے لوٹ جاؤں، تم میں سے جو بزدل ہیں وہ فوراً ان بہادروں سے علاحدہ ہو جائیں، جنہوں نے تیغ و تفنگ اور جسم و روح کے ساتھ ہماری مہم کے لیے اپنی جانیں وقف کردی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے دستہ قائم کرکے فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور کسی ایک سپاہی کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ اپنا دستہ چھوڑ کر علاحدہ ہو جائے۔

ایرانیوں کی شکست عثمانی فوج جب تبریز کے قریب پہنچی تو شاہ اسماعیل کو مجبوراً مقابلہ کے لیے نکلنا پڑا، دونوں فوجیں ۲/رجب ۹۲۰ھ (۲۴/اگست ۱۵۱۴ء) کو وادی چالدیران میں صف آراء ہوئیں، ترکی لشکر کی تعداد جس نے بارہ سو میل کی سخت دشوار گزار راہ صرف ایک سو چھبیس روز کی قلیل مدت میں طے کی تھی، اب ایک لاکھ چالیس ہزار سے گھٹ کر ایک

لاکھ بیس ہزار رہ گئی تھی، جس میں اسّی ہزار سوار تھے، ایرانی فوج کی مجموعی تعداد اسّی ہزار تھی، یہ سب سوار تھے اور اپنی شجاعت اور سپہ گری کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھے، عثمانی بالکل خستہ ہو رہے تھے، برخلاف اس کے ایرانی سوار تازہ دم تھے، جنگ کی ابتدا ایرانیوں کے موافق ہوئی، ایرانی سواروں کا جو دستہ شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں تھا، اس نے اپنے مقابل ترکی دستہ کو پسپا کر دیا لیکن ترک فوراً ہی سنبھل گئے اور انہوں نے پلٹ کر نہایت دلیری سے مقابلہ کیا، اس درمیان میں عثمانی توپوں نے گولے برسانا شروع کر دیے، ایرانیوں کے پاس توپ خانے نہ تھے، وہ اس حملہ کی تاب نہ لا سکے اور پچیس ہزار لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگے، شاہ اسماعیل بھی زخمی ہو گیا تھا اور بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ سکا۔

۱۴؍رجب ۹۲۰ھ (۴؍ستمبر ۱۵۱۴ء) کو سلیم تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا، وہاں سے اس نے علاوہ شاہی خزانے کے ایک ہزار بہترین صناع اور کاریگر قسطنطنیہ روانہ کیے، قسطنطنیہ میں ان لوگوں کو رہنے کے لیے مکانات اور اپنے پیشوں کے جاری رکھنے کے لیے تمام ضروری سامان دیے گئے، تبریز میں آٹھ روز قیام کے بعد وہ شمال میں قرہ باغ کی طرف بڑھا، اس کا ارادہ تھا کہ موسم سرما آذربائیجان کے میدانوں میں گزارنے کے بعد بہار شروع ہونے پر پھر فتوحات کا سلسلہ شروع کرے لیکن فوج اب بالکل خستہ ہو چکی تھی اور آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی، سلیم کو اندیشہ ہوا کہ سختی کرنے سے ممکن ہے بغاوت برپا ہو جائے، اس لیے مجبوراً وہ قسطنطنیہ کی طرف واپس ہوا، شاہ اسماعیل سے کوئی صلح نامہ نہ ہوا اور دونوں سلطنتوں کی جنگ کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک سلیم کی حیات تک قائم رہا لیکن چالدیران کی جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیار بکر اور کردستان کے صوبے مکمل طور پر فتح کر لیے گئے اور ایران سے نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے، سلیم نے ان صوبوں کا حاکم مشہور مورخ ادریس کو مقرر کیا، سلیم کے لیے پورے ایران کو عثمانی مقبوضات میں داخل کر لینا دشوار نہ تھا لیکن کسی مصلحت سے اس نے ایسا کرنا مناسب نہ خیال کیا، جیسا کہ ایور سلے کا خیال ہے، شیعیت سے اسے اس درجہ نفرت تھی کہ

ممکن ہے اس نے ایران کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بجائے علاحدہ رکھنا ہی بہتر سمجھا ہو، اسی تشدد کے تحت اس نے ایک فرمان نافذ کرکے ایران سے تجارت کرنا ممنوع قرار دیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ چند تاجروں نے اس فرمان کی حکم عدولی کی ہے تو اس نے ان سب کے قتل کا حکم دے دیا، مفتی جمالی نے بمشکل اس سے یہ حکم منسوخ کرایا۔

شام و مصر ایران کے بعد سلیم شام اور مصر کی طرف متوجہ ہوا، یہ ممالک ڈھائی سو برس سے سلاطین مملوک کے زیر حکومت تھے، سلیم کے زمانہ میں ان کا حکم راں قانصوہ غوری تھا، سلطان مصر کو حجاز کی فرماں روائی بھی حاصل تھی، دولت عثمانیہ اور سلطنت مصر کے تعلقات بایزید ثانی ہی کے وقت سے غیر خوش گوار تھے، جو لڑائیاں ان کے درمیان ہوئی تھیں ان میں عثمانیوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی تھی لیکن سلیم کی تخت نشینی کے بعد قانصوہ غوری کو معلوم ہوگیا کہ اب سلطنت عثمانیہ کی عنان حکومت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں ہے، جو بایزید ثانی سے بالکل مختلف ہے، یہی وجہ تھی کہ اس نے شاہ اسماعیل کی دعوت پر دولت عثمانیہ کے خلاف ایران سے اتحاد کرلیا تھا، کردستان اور دیار بکر کی فتح کے بعد عثمانی اور شامی مقبوضات ایک دوسرے سے بالکل قریب ہوگئے تھے، قانصوہ غوری نے ۹۲۲ھ (۱۵۱۶ء) میں ایک زبردست فوج شام کے علاقہ میں متعین کردی تھی تاکہ افواجِ عثمانی کی نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہے، سنان پاشا نے جو ایشیائے کوچک کے جنوب مشرق میں ترکی لشکر کا سپہ سالار تھا، اس واقعہ کی اطلاع سلیم کو دی اور لکھ بھیجا کہ ایسی صورت میں سلطان کے حسب ہدایت وادی فرات کی طرف کوچ کرنا خطرہ سے خالی نہ ہوگا، سلیم نے قسطنطنیہ میں دیوان منعقد کرکے اس مسئلہ کو غور و بحث کے لیے پیش کیا۔

دنیائے اسلام کا انتشار یہ مسئلہ محض سلطنت مملوکیہ اور دولت عثمانیہ کی قوت آزمائی کا نہ تھا بلکہ حقیقۃً اس کا تعلق دنیائے اسلام کے عام انتشار اور پراگندگی سے تھا، خلافت عباسیہ کے مصر میں منتقل ہونے کے بعد اسلام کی متحدہ سیاسی قوت پارہ پارہ ہوگئی تھی اور خلیفہ کا

اقتدار صرف مذہبی اور رسمی رہ گیا تھا، سلطان سلیم کے ابتدائے عہد میں دنیائے اسلام کے ضعف و انتشار کی جو حالت تھی، اس کا اندازہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے محققانہ رسالہ ''خلافت عثمانیہ'' کے حسب ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے:

''نویں صدی کے اواخر میں دنیائے اسلام کے نقشہ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس عظیم الشان جمہوریت کا قالب بے جان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، اس کے دل و دماغ (خلافت مصر) کی کمزوری اور ضعف کا یہ حال پہنچا ہے کہ وہ دور کے اجزائے بدن کی تو کیا آس پاس کے اعضا کی قوت کا سہارا بھی نہیں رہے ہیں، بڑی بڑی سلطنتیں اور حکومتیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں، امارتوں اور ٹکڑیوں میں بٹ گئی ہیں، ہندوستان سے لے کر اسپین تک تم کو یہی کیفیت اور یہی نقشہ نظر آئے گا، ہندوستان کی طاقت سندھ، گجرات، مالوہ، احمد نگر، بیجاپور، برہان پور، بیدر، کشمیر، جون پور، بنگال، دہلی وغیرہ صوبہ دار حکومتوں میں منقسم ہو گئی ہے، ترکستان میں بخارا، بلخ، خوارزم، مرو اور کاشغر میں بیسیوں خان چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حکم راں ہیں، روس کا علاقہ کریمیا، قازان، استراخان میں بٹ گیا ہے، علاقہ قفقاز میں آذربائیجان، داغستان، گرجستان، سب بکھرے ہوئے اجزا ہیں، افغانستان و خراسان میں مختلف تیموری شہزادے اور ترکمانی امراء ادھر ادھر قسمت آزمائی کر رہے ہیں، عراق ایک مستقل حکومت ہے، مصر و شام میں مملوک سلطانوں کی سلطنت ہے، عرب چھوٹے چھوٹے شیوخ میں بٹا ہوا ہے، یہاں تک کہ یمن میں تو ایک ایک شہر کا الگ الگ امیر ہے، حجاز شرفا کے ایک خاندان کے ماتحت تھا، جو کبھی مصر کے زیر اثر بن جاتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا تھا امام یمن سے ساز باز کر لیتے تھے، امام یمن اور سلطان مصر میں ایک سلسلہ جنگ برپا تھا، مصر کے پار سوڈان، طرابلس، تیونس، الجزائر، فاس کتنی ہی ریاستیں تھیں، اسپین کی ایک سلطنت کے غرناطہ، قرطبہ، طلیطلہ، شاطبہ، حمس، بطلیوس کتنے ہی ٹکڑے ہو گئے تھے، جن میں سے اب صرف ایک یا دو باقی تھے، غرض خانوادۂ اسلام کا ایک ایک گھر اجڑ گیا تھا اور جامۂ خلافت کا تار تار الگ ہو گیا تھا۔''

یہ تو دنیائے اسلام کے انتشار کا نقشہ تھا، اس انتشار سے جو نتائج پیدا ہوئے ان کی تصویر بھی مولانائے موصوف کے قلم نے کھینچ دی ہے:

''یورپ کے مسیحی سپاہیوں نے ایک ہی دفعہ اس پر چار گوشوں سے حملہ کیا، ۸۹۳ھ سے روس نے ایشیائے وسطٰی کے صحرا سے اسلام پر اپنا حملہ شروع کیا، یہ قازان کی اسلامی ریاست تھی اور ایک طویل سلسلہ جنگ کے بعد ۹۹۳ھ میں اس کا خاتمہ ہوگیا، اس کے بعد استرخان اور کریمیا وغیرہ کی باری آئی، یہاں تک کہ اس کے ڈانڈے بحر اسود اور سرحد ایران سے آکر مل گئے، اسپین اور پرتگال ملک اندلس میں اسلام کا ۸۹۷ھ میں خاتمہ کر کے آگے کو بڑھے، اسپین نے دوستی کے پردہ میں تیونس اور الجزائر پر قبضہ کیا، پرتگال نے پورے افریقہ کو ناپ کر بحر عرب اور بحر ہند میں آکر اپنے ڈیرے ڈالے اور عرب اور ہندوستان کے اسلامی سواحل پر قتل وغارت گری کا آغاز کیا، دوسری طرف مراکش کے سواحل پر آکر وطاسی خاندان پر حملہ آور ہوئے، جو مغرب میں ایک نئی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال رہا تھا اور آسفی، ازمور اور معمورہ پر قبضہ کرلیا، صلیبی سپاہیوں کی چوتھی کمین گاہ بحر روم کے جزائر تھے، قبرص (سائپرس) روڈس، مالٹا اور وینس کے صلیبی دستے مصر و شام کی ناکہ بندی میں مصروف تھے، خصوصاً قبرص، روڈس اور مالٹا تو سینٹ جان کے صلیبی مجاہدین کے بڑے بڑے مستحکم قلعے تھے، جو دن رات صرف مسلمانوں کے خون کے پیاسے رہتے تھے، اور یہی ان کی زندگی کا مذہبی فرض تھا، یہ درحقیقت گذشتہ صلیبی سپاہیوں کی یادگار اور فلسطین کی مسیحی نوے سالہ حکومت کی شکست خوردہ فوج کی نسل تھے، یہ بحر روم کے دربان تھے، جن کے سامنے سے کوئی اسلامی جہاز مسلمان ملکوں کو روانہ نہیں ہوسکتا تھا، قپچاق، کریمیا اور روم کے مسلمان حج نہیں کرسکتے تھے، وینس کا بازار مسلمان عورتوں کی ناموس اور مسلمان مردوں کی آزادی کی خرید و فروخت کی بڑی منڈی بن گئی تھی، جو قیدی کسی حال میں اسلام سے پھرنا گوارا نہیں کرتے تھے، اگر مرد ہوتے وہ مصر لاکر بیچ ڈالے جاتے تھے، جہاں وہ مملوک سپاہیوں میں بھرتی کر لیے جاتے تھے اور اگر

لڑکیاں ہوتیں تو وہ اٹلی کے امراء اور دولت مندوں کے عیش خانوں میں بھیج دی جاتی تھیں اور جب کبھی موقع ملتا وہ اسکندریہ تک دھاوا کرتے چلے آتے۔

اس سے زیادہ بدقسمتی یہ کہ اسی زمانہ میں ۹۰۵ھ میں ایران وخراسان میں صفوی خاندان کا ظہور ہوا، جس نے تنگ نظری سے اسلام کے بجائے شیعیت کو اپنے سیاسی کارناموں کا مرکز قرار دیا، اہل سنت یا تو اس ملک جلاوطن ہونے پر مجبور ہوئے یا ہنگاموں میں قتل ہوئے یا وہ شیعہ بنا ڈالے گئے، اس سے بڑھ کر یہ کہ صفویوں نے سلطنت عثمانیہ کے باغی شہزادوں کو اپنے یہاں پناہ دی اور سلطان مصر سے خط وکتابت کر کے سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک متحدہ حملہ کا سامان کیا، اس کا نتیجہ باہمی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں اور مجموعی حیثیت سے اسلام کی تباہی۔''

دیوان کا فیصلہ | دنیائے اسلام کی یہ حالت سلیم سے پوشیدہ نہ تھی، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس ضعف وانتشار کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خلافت اور سلطنت دو علاحدہ علاحدہ شخصیتوں میں تقسیم کر دی گئی ہے، اسلام کے گذشتہ اقتدار کو از سر نو قائم کرنے کے لیے اس کے نزدیک ان دونوں شخصیتوں کو ایک ہی ہستی میں مدغم کر دینا نہایت ضروری تھا اور چوں کہ دولت عثمانیہ سے زیادہ طاقت ور اس وقت کوئی دوسری اسلامی سلطنت نہ تھی اور دفاع وجہاد کا فرض جو منصب خلافت کا پہلا مقصد ہے، ڈیڑھ سو برس سے وہی ادا کر رہی تھی، اس لیے دنیائے اسلام کی امامت کا حق دار بھی اس سے زیادہ کوئی دوسرا نہ تھا لیکن حجاز ومصر وشام پر، جو اسلامی دنیا کے اصلی عناصر تھے، مصر کے مملوک سلاطین کی حکومت تھی اور ان اجزا کو شامل کیے بغیر خلافت کا دائرۂ اقتدار مکمل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ جب سلیم نے سنان پاشا کی تحریر دیوان کے سامنے پیش کی تو نہ صرف قانصوہ غوری کے معاندانہ روش پر غور کیا گیا جو اسماعیل سے ملا ہوا تھا اور جس نے ایران کی جنگ کے موقع پر سامان رسد کے قافلہ کو عثمانی لشکر میں جانے سے روک دیا تھا[1] بلکہ خلافت وامامت کے مسئلہ پر بھی مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں بہت دیر

---

[1] فتوحات اسلامیہ از مفتی دحلان مکی، جلد ۲، ص ۱۲۲، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۰ھ۔

تک بحث ہوتی رہی، بالآخر یہ طے پایا کہ حرمین شریفین کی خدمت کا حق سلطان عثمانی سے زیادہ کسی دوسرے مسلمان حکمراں کو نہیں پہنچتا اور اس کے لیے جنگ ناگزیر ہے، رئیس آفندی محمد پاشا نے اس رائے کی موافقت میں ایک نہایت پرزور تقریر کی اور کہا کہ وہ دولت علمیہ کا فرض ہے کہ اس حق کو بہ ذریعہ فتح حاصل کرے، سلیم محمد پاشا کی تقریر سے اس قدر خوش ہوا کہ اسی وقت اس کو وزیر اعظم مقرر کر دیا، غرض دیوان نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے قانصوہ غوری سے اطاعت کا مطالبہ کرنا چاہیے اور اگر وہ انکار کرے تو لڑائی شروع کر دی جائے۔

شام کی فتح قانصوہ غوری اس وقت حلب میں مقیم تھا، سلیم کے ایلچی جب یہ پیغام لے کر اس کے پاس پہنچے تو اس نے برافروختہ ہو کر ان کو قید میں ڈال دیا لیکن سلیم لڑائی کا عزم پہلے ہی کر چکا تھا، ایلچیوں کے روانہ کرنے کے فوراً ہی بعد وہ خود بھی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے شام کی طرف روانہ ہو گیا تھا، جب عثمانی لشکر شام کی سرحد میں داخل ہوا تو قانصوہ غوری کو اپنی غلطی کی اہمیت معلوم ہوئی، اس نے سلیم کے ایلچیوں کو فوراً رہا کر دیا اور صلح کی گفتگو شروع کی، مگر سلیم صلح کے لیے قسطنطنیہ سے نہیں روانہ ہوا تھا، ۲۵ رجب ۹۲۲ھ (۲۴ اگست ۱۵۱۶ء) کو حلب سے قریب مرج وابق کے میدان میں پہلا معرکہ پیش آیا، جس نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، مملوک نہایت بہادری سے لڑے لیکن آپس کے اختلافات سے ان کی قوت پہلے ہی کمزور ہو گئی تھی، علاوہ بریں قانصوہ غوری کے دو فوجی سرداروں یعنی خیر بے اور غزالی نے لڑائی شروع ہونے سے قبل سلیم سے ساز باز کر لیا تھا، خیر بے حلب کا گورنر تھا اور غزالی فوج کا ایک بڑا افسر تھا، ان دونوں نے عین موقع پر غداری کی، جلبانوں کے دستوں کو لے کر جو چرکسی مملوکوں سے نیچے درجہ کے مملوک تھے اور چرکسوں سے حریفانہ رقابت رکھتے تھے، میدان جنگ سے بھاگ گئے، قانصوہ غوری کے پاس توپیں نہ تھیں، عثمانی توپوں کی گولہ باری نے مصری فوج کو جس کی قوت خیر بے اور غزالی کی غداری سے ٹوٹ چکی تھی، زیادہ دیر تک میدان جنگ میں ٹھہرنے نہ دیا، صرف ایک گھنٹہ کے اندر لڑائی ختم ہو گئی، بوڑھا سلطان قانصوہ غوری بھی یہ دیکھ

کر کہ اب مقابلہ بے سود ہے، بھاگا لیکن شاید اپنے ہی سپاہیوں کی بھیڑ میں دب کر مارا گیا۔

حلب کا خیر مقدم سلیم فاتح کی حیثیت سے حلب میں داخل ہوا، خیر بے نے شہر کی کنجیاں پیش کیں، باشندگان شہر نے حاضر ہو کر وفاداری کا حلف لیا، مفتی وحلان مکی لکھتے ہیں کہ حلب کے باشندے اپنے علما اور صلحا کے ساتھ سروں پر قرآن رکھے ہوئے سلطان کے استقبال کو آئے، فتح کی تہنیت پیش کی اور رحم و درگزر کے خواستگار ہوئے، سلیم ان سب سے مہربانی کے ساتھ پیش آیا، پھر جب وہ جامع مسجد میں گیا تو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، پہلے سلاطین مصر کے القاب میں ''خادم الحرمین الشریفین'' کا لقب شامل کیا جاتا تھا لیکن حلب کی فتح کے بعد جامع مسجد کا خطیب جب خطبہ دینے کھڑا ہوا تو سلطان سلیم خان کے نام کے ساتھ اس لقب کا اضافہ کیا، سلیم نے اسے آئندہ کامیابی کی بشارت خیال کیا اور اس قدر خوش ہوا کہ جو حلہ پہنے ہوئے تھا، اتار کر اسی وقت خطیب کو دے دیا[1]۔

دیگر فتوحات حلب میں چند دنوں قیام کرنے کے بعد سلیم شام کے دوسرے شہروں کی فتح کے لیے روانہ ہوا، ہر شہر نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے دروازے کھول دیے اور وہاں کے لوگوں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا، سلیم نے ان کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کیا، اور اپنے الطاف و اکرام سے انہیں بالکل مطمئن کر دیا، چنانچہ دمشق، بیت المقدس، حمص اور متعدد دوسرے شہر نہایت آسانی سے فتح ہو گئے اور ہر جگہ سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، دمشق میں اس نے شیخ محی الدین بن عربیؒ کے مزار پر ایک مقبرہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور وہاں کے فقرا کے لیے ایک مطبخ بھی قائم کیا اور اس کے اخراجات کے لیے کافی جائیداد وقف کر دی[2]۔

طومان بے شام کے اس آسانی سے فتح ہو جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ قانصوہ غوری کی وفات پر اس کے جانشین کے انتخاب کے لیے مملوکوں کے تمام بڑے بڑے فوجی سردار فوراً

---

[1] فتوحات اسلامیہ، جلد ۲، ص ۱۲۳ [2] الاعلام باعلام بیت اللہ والحرام بر حاشیہ خلاصۃ الکلام، ص ۱۸۸، مطبوعہ مصر، ۱۳۰۵ھ

قاہرہ روانہ ہو گئے اور میدان عثمانیوں کے لیے خالی ہو گیا، مملوکوں میں دستور یہ تھا کہ سلطان کا انتخاب چوبیس بلند پایہ امراء کیا کرتے تھے، جو فوج و حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور ہوتے تھے، چنانچہ اس موقع پر بھی یہ امرا قاہرہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے طومان بے کو جو اپنی حیرت انگیز شجاعت، فوجی قابلیت اور شریفانہ اوصاف و خصائل کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز تھا، سلطان منتخب کیا، طومان بے کے انتخاب سے مملوکوں میں ایک تازہ روح پیدا ہو گئی۔

معرکہ روانیہ | شام کی فتح کے بعد سلیم نے مصر کی طرف کوچ کی تیاری کی، ادھر طومان بے بھی مدافعت کا سامان کر رہا تھا، سب سے پہلے اس نے ایک فوج غزہ روانہ کی تا کہ عثمانی لشکر کو مصر کی طرف بڑھنے سے روکے اور خود قاہرہ کے قریب مصری افواج کے بڑے حصہ کو جمع کرنا شروع کیا، غزہ میں مملوکوں اور عثمانیوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا لیکن صدر اعظم سنان پاشا کی سپہ سالاری اور ترکی توپوں کی گولہ باری نے مملوکوں کے قدم اکھاڑ دیے، اس کے بعد مصر کی سرحد تک پھر کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور سلیم کی فوج نے دس روز کے اندر ریگستان کو عبور کر لیا، سلیم نے اس مہم کے لیے کئی ہزار اونٹ خرید لیے تھے، ان پر فوج کے لیے پانی کے مشکیزے لدے ہوئے تھے، مصری فوجیں قاہرہ سے تھوڑے فاصلہ پر روانیہ میں خیمہ زن تھیں، وہیں ۲۹ ذی الحجہ ۹۲۲ھ (۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء) کو مقابلہ ہوا، اس معرکہ میں بھی اگرچہ پہلی جنگوں کی طرح توپ خانوں کی وجہ سے میدان ترکوں کے ہی ہاتھ رہا تاہم مملوکوں نے جیسی غیر معمولی شجاعت اور جاں بازی کا ثبوت دیا، اس کی مثال تاریخ کے صفحات میں کم ملتی ہے، لڑائی کے شروع میں ہی سواروں کا ایک دستہ جو سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق تھا، عثمانی فوج کے قلب پر جہاں سلطانی علم لہرا رہا تھا، حملہ آور ہوا، اس دستہ کی قیادت خود طومان بے اور اس کے دو بہترین افسر الان بے اور قرط بے کر رہے تھے، ان لوگوں نے قسم کھائی تھی کہ یا تو سلیم کو زندہ گرفتار کریں گے یا اسے قتل کر کے چھوڑیں گے، یہ قسم پوری ہو کر رہتی مگر حسن اتفاق سے اس وقت بجائے سلیم کے صدر اعظم سنان پاشا وہاں

چند خاص خاص فوجی افسروں کے حلقہ میں کھڑا ہوا تھا، طومان بے اسی کو سلیم سمجھ کر ایک نیزہ ایسا مارا کہ سینہ کے پار ہو گیا، الان بے اور قرط بے نے بھی ایک ایک پاشا کو قتل کیا اور پھر گھوڑے موڑ کر یہ تینوں بہ حفاظت اپنی فوج میں واپس آ گئے، البتہ الان بے کو بندوق کی گولی سے ایک زخم لگ گیا تھا، یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے ہو گیا، طومان بے سمجھتا تھا کہ سلیم کے قتل کے بعد ترکوں کی ہمت چھوٹ جائے گی، دوسرے مملوکوں نے بھی اپنے سرداروں کی طرح سپہ گری اور جاں بازی کا حق ادا کر دیا لیکن ان کی بے مثل شجاعت اور سرفروشی ترکی توپوں کے مقابلہ میں بے سود ثابت ہوئی، پچیس ہزار مملوک سواروں کی لاشیں تحفظ وطن کی قیمت نہ ادا کر سکیں اور طومان بے کو بالآخر اپنے بقیہ سواروں کے ساتھ میدان چھوڑنا پڑا۔

قاہرہ میں قتل عام | جنگ روانیہ کے ایک ہفتہ بعد عثمانی فوج کا ایک دستہ بلا مزاحمت قاہرہ میں داخل ہوا لیکن طومان بے نے آ کر دفعتہً اس پر چھاپا مارا اور پورے دستہ کو تہ تیغ کر دیا، اب سلیم نے اپنی بہترین فوجیں قاہرہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیں، شہر کے گرد باقاعدہ استحکامات نہ تھے لیکن مملوکوں نے گویا ہر سڑک کو میدان جنگ اور ہر مکان کو قلعہ بنا دیا تھا، عثمانیوں کو ہر ہر قدم پر مزاحمت کا سامنا تھا، تین دن تک نہایت سخت لڑائی ہوتی رہی، آخر کا خیر بے کے مشورے سے سلیم نے یہ اعلان کرا دیا کہ جو مملوک ہتھیار ڈال دیں گے، ان کی جانیں بخش دی جائیں گی، اس اعلان پر اعتبار کر کے مملوکوں نے لڑائی موقوف کر دی اور ان میں سے آٹھ سو ممتاز آدمیوں نے اپنے کو سلیم کے حوالہ کر دیا، سلیم نے خلاف عہد ان سب کو قتل کرا دیا، اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ شہر کے تمام باشندے تہ تیغ کر دیے جائیں، کریسی کا بیان ہے کہ پچاس ہزار آدمی اس قتل عام میں مارے گئے۔

قرط بے | قرط بے کچھ دنوں تک قاہرہ میں چھپا رہا لیکن پھر سلیم کے وعدوں پر اعتماد کر کے اس نے بھی اپنے کو پیش کر دیا، اس موقع پر سلیم اور قرط بے کے درمیان جو گفتگو ہوئی اسے ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں، کریسی نے ان دونوں کی ملاقات کا حال اور ان کی گفتگو فان ہیمر کے

حوالہ سے نقل کی ہے اور فان ہیمر من جملہ اور اسناد کے ایک ایسے شخص کی سند بھی پیش کی ہے جو طومان بے کے دربار کا ایک عہدہ دار تھا۔[1] قرط بے جب سلیم کے سامنے آیا تو وہ فوج کے تمام بڑے بڑے افسروں کے حلقہ میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا لیکن فاتح سلطان کی یہ شان اس بہادر مملوک کو مطلق متاثر نہ کر سکی، سلیم نے اس کے بے خوف چہرے پر نظر ڈالی اور پوچھا "تو ایک نامور شہ سوار تھا، تیری شجاعت اب کہاں ہے؟" قرط بے نے جواب دیا کہ "وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہے" سلیم نے کہا "کیا تجھے معلوم ہے کہ تو نے میری فوج کے ساتھ کیا کیا ہے؟" "مجھے خوب معلوم ہے" یہ جواب بھی پہلے جواب کا سا مختصر اور مسکت تھا، اس کے بعد سلیم نے اس دلیرانہ حملہ پر اظہار تعجب کیا جو قرط بے نے روانیہ کے میدان میں طومان بے اور الان بے کے ساتھ اس پر کرنا چاہا تھا اور جو سنان پاشا کے لیے اس قدر مہلک ثابت ہوا قرط بے اپنی خوش بیانی کے لیے بھی اسی قدر مشہور تھا جس قدر اپنی بہادری کے لیے، اس نے اس کو جواب میں مملوکوں کی شجاعت پر ایک پرزور تقریر کی، جس میں توپ اور بندوق کا ذکر نفرت اور حقارت کے ساتھ کیا کیوں کہ ان کا وار بہادرانہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بزدلانہ طریقہ پر مارتی ہیں، اس نے سلیم کو بتایا کہ بندوقیں مصر میں سب سے پہلے اشرف قانصوہ کے عہد میں لائی گئی تھیں، جب کہ ماریشش کے ایک شخص نے مملوکوں کو بندوق سے مسلح کر دینے کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی لیکن سلطان اور اس کے فوجی افسروں نے جنگ میں اس بدعت کے جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ ایک تو یہ حقیقی شجاعت کے شایان شان نہیں، دوسرے آنحضرت ﷺ کے طریقہ کے بھی خلاف ہے، قرط بے نے کہا کہ جب اس شخص سے انکار کیا گیا تو وہ چلا اٹھا اور کہنے لگا کہ تم میں سے کچھ لوگ اس وقت تک زندہ رہیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ سلطنت ان ہی گولیوں سے ختم ہو کر رہے گی، یہ بیان کر کے قرط بے نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا کہ افسوس وہ پیشین گوئی پوری ہوئی لیکن تمام قدرت اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھوں میں ہے، سلیم نے پوچھا کہ "اگر تم

---

[1] کریسی، ج ۱، ص ۲۴۳، فٹ نوٹ۔

خدا پر بھروسہ رکھتے ہو تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں شکست دی اور تمہارے قلعوں سے تم کو مار بھگایا اور خود تو اس وقت میرے سامنے ایک قیدی کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہے'' قرط بے نے جواب دیا کہ ''خدا کی قسم ہمیں شکست اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ تم لڑائی میں ہم سے زیادہ بہادر یا ہم سے بہتر شہ سوار تھے، بلکہ ہم اس لیے ہارے کہ یہی ہماری تقدیر میں تھا کیوں کہ ہر وہ شے جو ابتدا رکھتی ہے، ایک روز ختم ہو کر رہے گی اور سلطنت کی مدت بھی محدود ہے، خلفا یعنی اسلام کے وہ زبردست حامی آج کہاں ہیں؟ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت ور سلطنتیں کہاں ہیں؟ اے آلِ عثمان! تمہارا وقت بھی آنے والا ہے اور تمہاری حکومت بھی اپنے وقت پر ختم ہو کر رہے گی، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے اے سلطان سلیم! میں تیرا قیدی نہیں ہوں بلکہ تیرے وعدوں اور عہد و پیمان کی بنا پر یہاں آزاد اور بے خطر کھڑا ہوں'' اس کے بعد قرط بے خیر بے کی طرف متوجہ ہوا جو سلیم کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اور اس پر نہایت سخت لعن وطعن کرنے کے بعد سلیم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ ''اس غدار کا سر اڑا دے ورنہ کہیں تجھے بھی اپنے ساتھ یہ جہنم میں گھسیٹ نہ لے جائے'' اس پر سلیم نے غضب ناک ہو کر کہا ''میں نے سوچا تھا کہ تجھے آزاد کر دوں گا، بلکہ اپنے اعلیٰ فوجی عہدہ داروں میں بھی شامل کر لوں گا لیکن تو نے بے ادبی کے ساتھ گفتگو کی ہے اور میری موجودگی کا احترام ملحوظ نہیں رکھا ہے، جو شخص پادشاہوں کے حضور میں خلافِ ادب طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ فضیحت کے ساتھ نکالا جاتا ہے'' قرط بے نے دلیری کے ساتھ جواب دیا ''خدا مجھے تیرا عہدہ دار ہونے سے بچائے''، یہ سن کر سلیم کا غصہ ناقابل برداشت ہو گیا اور اس نے جلادوں کو طلب کیا، قرط بے نے سلیم سے کہا ''تنہا میرے قتل سے تجھے کیا فائدہ پہنچے گا، جب کہ بہت سے بہادر خود تیرے سر کی فکر میں ہیں اور طومان بے اب بھی اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھتا ہے'' سلیم نے جلادوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا، جلاد نے جوں ہی تلوار اٹھائی قرط بے نے ایک بار پھر خیر بے کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''اے غدار! میرے خون آلود سر کو لے جا اور اپنی بیوی کی گود میں ڈال دے، خدا غدار کو اس کے فعل کا

ویسا ہی بدلہ دے''، یہ آخری الفاظ تھے جو اس بہادر مملوک کی زبان سے ادا ہوئے۔

طومان بے کا قتل قاہرہ کے مفتوح ہو جانے کے بعد بھی طومان بے مایوس نہیں ہوا تھا، چوں کہ مملوکوں کی بہت بڑی تعداد قتل ہو چکی تھی، اس لیے اس نے مملوک سلاطین کی سابق روایات کے برخلاف عربوں کو اپنی فوج میں داخل کیا اور چند دنوں تک کامیابی کے ساتھ عثمانی دستوں کا مقابلہ کرتا رہا، سلیم نے اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر دولت عثمانیہ کی سیادت قبول کر لو تو مصر کا تخت تمہارے لیے چھوڑ دیا جائے لیکن قاہرہ کے غدارانہ قتل عام اور قرط بے کے قتل سے نہ صرف سلیم کے وعدوں کا اعتبار اٹھ گیا تھا بلکہ مملوکوں کی آتش غضب بھڑک اٹھی تھی، چنانچہ جب سلیم کا ایلچی یہ پیغام لے کر طومان بے کے دربار میں پہنچا تو اس نے اسے اور اس کے تمام ہم راہیوں کو قتل کرا دیا، سلیم نے اس کے جواب میں تین ہزار مملوک قیدیوں کو تہ تیغ کرا دیا، ان واقعات سے یہ صاف ظاہر تھا کہ صلح کی کوئی امید نہیں، کچھ عرصہ تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، مگر بدقسمتی سے اسی زمانہ میں جب عثمانی فوج حملہ کر رہی تھی، خود عربوں اور مملوکوں میں باہم جھگڑے شروع ہو گئے، جس سے طومان بے کی قوت کو سخت نقصان پہنچا، آخر میں اس کی تمام فوج منتشر ہو گئی اور اسے بھاگ کر روپوش ہونا پڑا لیکن بعض ساتھیوں نے اس کے ساتھ دغا کی اور اسے عثمانیوں کے حوالہ کر دیا، سلیم کو جب کی اس کی گرفتاری کی اطلاع ہوئی تو وہ جوش مسرت میں چلا اٹھا کہ ''الحمدللہ! مصر اب فتح ہوا''، بہر حال اس نے شروع میں طومان بے کے ساتھ مناسب عزت و احترام کا سلوک کیا لیکن چند دنوں کے بعد غزالی اور خیر بے نے طومان بے کے خلاف اس کے کان بھرنا شروع کیے اور اسے یقین دلایا کہ طومان بے کو آزاد کرانے کے لیے ایک زبردست سازش کی جا رہی ہے، سلیم نے ان غداروں کے فریب میں آ کر طومان بے کو قتل کرا دیا، سلاطین مصر کے مملوکی سلسلہ کی یہ آخری کڑی تھی جو ۱۷ اپریل ۱۵۱۷ء کو ٹوٹ گئی۔

مصر کا نظام حکومت مصر فتح ہو گیا لیکن اس کے نظم و نسق کا مسئلہ بہت مشکل تھا، باوجود

اس کے کہ مملوکوں کی قوت ٹوٹ چکی تھی، سلیم کو ان کی طرف سے اطمینان نہ تھا اور چوں کہ مصر قسطنطنیہ سے بہت زیادہ فاصلہ پر واقع تھا، اس لیے مملوکوں کی بغاوت کا اندیشہ اور بھی زیادہ قوی تھا، اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے سلیم نے مصر کا دستور حکومت مرتب کرتے وقت جو چیز خاص طور پر پیش نظر رکھی وہ یہ تھی کہ حکومت ملک کے مختلف طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دی جائے کہ دولت عثمانیہ کے خلاف ان کے باہم متحد ہونے کا امکان کم سے کم رہ جائے، چنانچہ اسی غرض سے اس نے نہ تو مملوکوں کا بالکل قلع قمع کیا اور نہ ان کے سرداروں کو سرکیشیا سے نئے غلام بھرتی کرنے سے روکا، مملوک سلاطین کے عہد میں مصر و شام کی حکومت چوبیس اضلاع میں تقسیم تھی اور ہر ضلع پر ایک مملوک امیر حاکم تھا، سلیم نے اس نظام کو برقرار رکھا اور دونوں کو بارہ بارہ سنجقوں میں تقسیم کر کے ہر سنجق پر ایک مملوک سردار کو مقرر کیا، مرکزی حکومت کے لیے اس نے ایک مجلس مقرر کی جو دیوان کبیر کے نام سے موسوم تھی، اس کا صدر پورے ملک کا والی بنایا گیا، سلیم نے اس عہدہ پر خیر بے کو مقرر کیا لیکن چوں کہ وہ اپنے سابق آقا قانصوہ غوری کے ساتھ غداری کر چکا تھا، اس لیے سلیم نے اس کے بیویوں اور بچوں کو ضمانت کے طور پر یورپ بھیج دیا، اسی طرح غزالی شام کا والی مقرر ہوا، دیوان کبیر کے ارکان کو یہ اختیار دیا گیا کہ معقول اسباب کی بنا پر والی کے احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو اسے معزول کر کے دوسرا والی منتخب کر سکتے ہیں لیکن اس انتخاب کے لیے باب عالی کی منظوری لازمی قرار دی گئی، ان اختیارات کے عطا کرنے سے سلیم کا مقصد یہ تھا کہ کوئی والی اتنی قوت حاصل نہ کر سکے کہ آگے چل کر اس کے اندر خود مختاری کا حوصلہ پیدا ہو، والی کو قابو میں رکھنے کے لیے سلیم نے پانچ ہزار سواروں اور پانچ سو ینی چری سپاہیوں کی ایک مستقل فوج بھی قاہرہ میں متعین کر دی اور آغا خیر الدین کو اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا، اسے خاص طور پر یہ حکم تھا کہ کسی حالت میں بھی قلعہ کے باہر نہ جائے، تقسیم اقتدار کے اسی اصول کے ماتحت سلیم نے اکثر عدالتی اور مذہبی عہدوں پر عرب شیوخ کو مامور کیا، جن

کا اثر مصر کی عربی النسل آبادی پر بہت زیادہ تھا، یہ لوگ مملوکوں سے زیادہ عثمانیوں کی جانب مائل تھے، محاصل کی تحصیل وصول کا کام عموماً قبطیوں اور یہودیوں کے سپرد کیا گیا۔

خادم الحرمین الشریفین مصر کی فتح کے بعد حجاز پر بھی جو اس وقت تک مملوک سلاطین کے زیر حکومت تھا، دولت عثمانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا لیکن شروع میں سلیم کو امید نہ تھی کہ حرمین شریفین کی خدمت کا شرف بغیر جنگ کے حاصل ہو سکے گا کیوں کہ حجاز کی حکومت سابق سلطان مصر کے عمال کے ہاتھوں میں تھی، چنانچہ ان عمال کو برطرف کرنے کے لیے اس نے ایک فوج حجاز میں بھیجنا چاہی لیکن قاضی صلاح الدین کے مشورہ سے جو ایک مشہور عالم تھے، اور جنہیں سلیم نے سلطان غوری کی قید سے رہا کیا تھا، اصل مقصد بغیر کسی جنگ کے حاصل ہو گیا، مفتی وحلان لکھتے ہیں کہ قاضی موصوف نے سلطان سلیم کے وزیر کو یہ مشورہ دیا کہ حجاز میں فوج بھیجنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ شریف برکات بن حسن بن عجلان (جو اس وقت مکہ معظمہ کے امیر تھے) سلطان کی اطاعت کے لیے آمادہ ہیں اور ان کے اثر سے اہل حرمین اور باشندگان حجاز بھی سلطان کی بیعت کے لیے تیار ہو جائیں گے، اس لیے بجائے فوج کے شریف کے نام صرف ایک فرمان بھیج دینا کافی ہوگا، سلیم نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور امیر مصلح بیگ کی معرفت فرمان ہمایونی مع دو بیش قیمت خلعتوں کے ایک خود شریف برکات کے لیے اور دوسرا ان کے بیٹے ابونمی کے لیے جو مکہ کی امارت میں اپنے باپ کا شریک تھا، بھیجا اور دونوں کو بدستور ان کے عہدوں پر قائم رکھا، حج کا زمانہ قریب تھا، اس لیے سلیم نے مصلح بیگ کے ساتھ محمل شریف کو بھی روانہ کیا، چنانچہ جب مصلح بیگ مکہ کے قریب پہنچا تو شریف برکات اپنے بیٹے اور دیگر معززین کو لے کر اس کے استقبال کے لیے نکلے، باپ بیٹوں نے خلعت سلطانی کو پہنا اور مکہ معظمہ واپس آ کر لوگوں سے سلطان کی بیعت لی اور سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا،[۱] ”خادم الحرمین الشریفین“ کا لقب جو ایک مسلمان فرماں روا کے لیے سب

[۱] فتوحات اسلامیہ، جلد ۲، ص ۱۲۵۔

سے زیادہ معزز لقب ہے، سلطان سلیم کے نام کے ساتھ شامل کیا گیا اور اس کا اعلان اس مقدس سرزمین میں ایسے وقت ہوا، جب تمام دنیا کے مسلمان حج کے لیے اکٹھا ہوئے تھے، حرمین شریفین کی خدمت کا شرف سلیم کے بعد اس کے جانشینوں کو چار سو برس تک حاصل رہا، اس طویل مدت میں انہوں نے باشندگان حجاز اور خصوصاً اہل حرمین کی خدمت کا حق جس طرح ادا کیا اس کی تفصیلات سے تاریخ کے صفحات پر ہیں اور اس کی یاد اب ان عربوں کو خون کے آنسو رلا رہی ہے جنہوں نے جنگ عمومی میں اپنی آزادی کی پیاس ترکوں کے خون سے بجھانی چاہی مگر طلسم فرنگ کے پیدا کردہ سراب سے حقیقی حریت کی موجیں آج تک نہ اٹھ سکیں۔

سلیم کو اہل حرمین کی خدمت کا موقع صرف تین سال کے لیے حاصل ہوا، اس قلیل مدت میں اس نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہوسکتا ہے، جو مفتی وحلان کی مستند تالیف ''فتوحات اسلامیہ'' سے ماخوذ ہیں:

''سلاطین مملوک کی طرف سے شریف مکہ کو جو وظیفہ ملتا تھا، سلیم نے اس میں پانچ سو دینار کا اضافہ کر دیا، اس نے ایک دفتر قائم کیا جس میں حرم محترم کے مجاوروں کے نام لکھے گئے، ان میں سے ہر ایک کا وظیفہ سو دینار مقرر کیا گیا، جو مصر کے خزانہ سے ادا کیا جاتا تھا، اس نے تیں آدمیوں کی ایک جماعت بھی مقرر کی جو روزانہ قرآن پاک کا ایک ختم پڑھتی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بارہ دینار مقرر کی، سلاطین مصر ہر سال بدوؤں، فقرائے مکہ کے لیے غلہ بھیجا کرتے تھے، سلیم نے اس دستور کو جاری رکھا اور حکم دیا کہ ہر سال سات ہزار اردب (کم وبیش من) غلہ اہل حرمین کے لیے بھیجا جائے، اس میں سے پانچ ہزار اردب مکہ معظمہ کے لیے اور دو ہزار اردب مدینہ منورہ کے لیے مقرر رہا، مفتی وحلان لکھتے ہیں کہ سلیم کے بعد دوسرے سلاطین عثمانی غلہ کی مقدار میں اضافہ کرتے گئے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کے لیے بارہ ہزار اردب اور مدینہ منورہ کے لیے سات ہزار اردب غلہ آنے لگا، سلیم نے مکہ معظمہ میں مقام حنفی کو از سر نو تعمیر کرایا اور مدینہ منورہ میں امیر مصلح بیگ کو بھیج کر بہت سے رفاہی کام

انجام دیے، اس کی داد و دہش اور امورِ خیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں حرمین شریفین میں فارغ البالی پھیل گئی، شیخ قطبی جو مکہ کے ایک مشہور عالم اور سلیم کے معاصر تھے، بیان کرتے تھے کہ میں اپنے بچپن میں مطاف کو اکثر خالی پاتا تھا اور تنہا طواف کرتا تھا، بازار سعی کو بھی چاشت کے وقت تک سنسان دیکھتا تھا اور اکثر دیکھتا تھا کہ غلہ فروشوں کے قافلے آئے ہوئے ہیں، مگر خریدنے والے بہت کم ہیں لیکن اب دولت عثمانیہ کے عہد میں لوگوں کی کثرت ہے، رزق وسیع ہے، خوش الحالی اور فارغ البالی ہے اور لوگ اس سلطنت کے زیر سایہ امن و اطمینان میں ہیں اور اس کے انعام و اکرام کے دریا میں غوطے لگا رہے ہیں[1]۔''

خلافت | غرض حرمین شریفین کی خدمت کا شرف جب سلیم کو حاصل ہو گیا تو آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے جو قاہرہ میں سلاطین مملوک کے زیر سایہ ظاہری شان و شوکت کے ساتھ مگر حقیقۃً بغیر کسی اختیار و اقتدار کے زندگی بسر کر رہا تھا، خلافت کے تمام حقوق و امتیازات بھی اسے تفویض کر دیے اور مقامات مقدسہ و حرمین شریفین کی کنجیاں، نیز بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرت ﷺ کی تلوار، علم اور چادر بطور سند خلافت اس کے حوالہ کر دیے، اس تاریخ سے سلاطین عثمانی خلیفہ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے اور خطبوں میں ان کا ذکر بحیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا، اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت دنیائے اسلام کی خلافت کا حق بھی انہی کو پہنچتا تھا، کوئی دوسری اسلامی سلطنت طاقت اور وسعت میں دولت عثمانیہ کے برابر نہ تھی، یہی سلطنت تمام دوسری سلطنتوں سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی تھی اور قریباً ڈیڑھ صدی سے جہاد کا فرض ادا کرتی آ رہی تھی، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب سلطان سلیم کی خلافت کا اعلان کیا گیا تو دنیائے اسلام کے کسی گوشہ سے اس کی مخالفت نہیں ہوئی، اس منصب کے لیے سلاطین عثمانی کا حق اس قدر مسلم سمجھا گیا کہ سلیم کے عہد سے لے کر گذشتہ جنگ عمومی تک پوری چار صدیوں میں ایک مدعی خلافت بھی ان کے مقابلہ میں نہیں

---

[1] فتوحات اسلامیہ، جلد ۲، ص ۱۳۰-۱۲۶۔

اٹھا، بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں خلافت کے بہت سے دعوے دار نظر آتے ہیں لیکن خلفائے عثمانیہ کی پوری تاریخ میں کسی ایک حریف کو بھی سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

منصب خلافت پر فائز ہو جانے سے سلطان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا، حکومت کے علاوہ اب اسے اپنی مسلمان رعایا کی مذہبی پیشوائی بھی حاصل ہوگئی اور اس دینی اقتدار کا دائرہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مسلمان باشندوں تک محدود نہ رہا بلکہ اس کے اندر تمام دنیائے اسلام کے باشندے آگئے، خواہ وہ کسی قوم یا ملک کے ہوں، علاوہ ایرانیوں اور بعض دوسری شیعی جماعتوں کے جو بمقابلہ اہل سنت والجماعۃ کے تعداد میں بہت کم ہیں۔

واپسی مصر اور حجاز کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر شعبان ۹۲۳ھ (ستمبر ۱۵۱۷ء) میں سلیم شام کی طرف واپس ہوا، ہزار اونٹ سونے اور چاندی سے لدے ہوئے ساتھ تھے، مال غنیمت کا زیادہ قیمتی حصہ جہازوں کے ذریعہ اس سے پہلے قسطنطنیہ بھیجا جا چکا تھا، انہی جہازوں پر قاہرہ کے بہترین صناع اور کاریگر بھی روانہ کیے گئے تھے، جو قسطنطنیہ لے جا کر آباد کیے گئے، ۲۰ر رمضان ۹۲۳ھ کو سلیم دمشق پہنچا اور وہاں ۲۲ر صفر ۹۲۴ھ تک قیام کیا، دمشق سے حلب گیا اور وہاں بھی دو مہینہ قیام کیا، اس مدت میں اس نے شام کی حکومت کے انتظامات کیے، ۱۷ر رجب ۹۲۴ھ (۲۵ر جولائی ۱۵۱۸ء) کو وہ قسطنطنیہ پہنچا، اس کو وہاں سے روانہ ہوئے صرف دو سال گزرے تھے، اس تھوڑی مدت میں اس نے شام، مصر اور حجاز کو فتح کر کے سلطنت مملوکیہ کا خاتمہ کر دیا اور سلطنت عثمانیہ کے رقبہ کو تقریباً دو چند کر دیا۔

اسپین سے معاہدہ سلیم جب قسطنطنیہ واپس آیا تو اسپین کا سفیر عیسائیوں کے لیے بیت المقدس کی زیارت کی اجازت حاصل کرنے کی غرض سے اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے معاوضہ میں وہ رقم جو پہلے سلاطین مصر کی دی جاتی تھی، دولت عثمانیہ کو ادا کرتے رہنے کا وعدہ کیا، سلیم نے اس درخواست کو منظور کر لیا مگر یہ تصریح کر دی کہ باضابطہ طور پر اس معاہدہ کا تکملہ ہونا چاہیے۔

روڈس پر حملہ کی تیاریاں اس کے بعد سلیم دولت عثمانیہ کی بحری طاقت کو ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوا، اس نے مختلف سائز کے ڈیڑھ سو نئے جہاز تعمیر کرائے، ان کے علاوہ سو جہاز اور بھی بنوائے اور حکم دیا کہ وہ کسی مہم پر روانہ ہونے کے لیے ہر وقت پوری طرح مسلح اور تیار رکھے جائیں، ساٹھ ہزار فوج بھی مع ایک بڑے توپ خانہ کے ایشیائے کوچک میں اکٹھا کی گئی، بعض لوگ خیال کرتے تھے کہ یہ تیاریاں ایران پر حملہ کی غرض سے کی جارہی ہیں لیکن عام رائے یہ تھی کہ حملہ روڈس پر ہونے والا ہے، جہازوں، بندرگاہوں اور سلاح خانوں کی تعمیر نے اسی رائے کی تائید ہوتی تھی، سلیم نہایت انہماک کے ساتھ ان تیاریوں میں مصروف تھا اور اس مہم کو اس وقت تک ملتوی رکھنا چاہتا تھا، جب تک روڈس جیسے مضبوط قلعہ پر کامیابی کے ساتھ حملہ کرنے کے لیے کافی سامان فراہم نہ ہو جائے، چنانچہ ایک روز اس نے اپنے وزیروں کو بلا کر کہا کہ ”تم روڈس کی فتح کے لیے مجھ سے عجلت کرانا چاہتے ہو، مگر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایسی مہم کے لیے کتنے سامان کی ضرورت ہے، تم بتا سکتے ہو کہ اس وقت کس قدر بارود تمہارے پاس موجود ہے؟“ وزراء اس سوال کے جواب کے لیے تیار نہ تھے لیکن دوسرے روز انہوں نے آ کر سلیم سے کہا کہ ”ہمارے پاس چار مہینہ کے محاصرہ کے لیے کافی سامان موجود ہے“، سلیم یہ سن کر برافروختہ ہوا اور کہنے لگا کہ ”چار ماہ کے سامان جنگ سے کیا ہوتا ہے جب کہ اس کی دوچند مقدار بھی کافی نہ ہوگی، کیا تم چاہتے ہو کہ سلطان محمد ثانی کی سی رسوائی مجھے بھی نصیب ہو، میں اس وقت تک لڑائی نہیں شروع کروں گا اور نہ ایسی ناکافی تیاریوں کے ساتھ روڈس کا سفر کروں گا، علاوہ بریں میرا خیال ہے کہ اب مجھے صرف ایک ہی سفر اختیار کرنا ہے یعنی سفر آخرت۔“

وفات اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا، وہ ادرنہ کے لیے قسطنطنیہ سے روانہ ہوا، مزاج پہلے ہی سے ناساز تھا، مگر اطبا کی ممانعت کے باوجود اس نے گھوڑے کی سواری نہ چھوڑی، راستہ میں مرض کی شدت اتنی بڑھی کہ اسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اتر جانا پڑا اور وہیں ۹ رشوال ۹۲۶ھ (۲۲ ستمبر ۱۵۲۰ء) کو اپنی حکومت کے نویں اور عمر کے چونویں سال میں اس کا انتقال ہوگیا۔

سلیمان اعظم قانونی

۹۲۶ھ تا ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء

سلیمان اعظم کا عہد حکومت نہ صرف تاریخ عثمانیہ بلکہ تاریخ عالم کا ایک نہایت اہم دور ہے، مغربی یورپ کی سلطنتیں قرون وسطی کے خلفشار سے نکل کر عہد جدید کی معرکہ آرائیوں کے لیے تیار ہو رہی تھیں، سلطنت عثمانیہ اور ان کے درمیان چالیس سال سے کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی تھی، یورپ میں بایزید ثانی کی لڑائیاں چھوٹی چھوٹی مسیحی حکومتوں کے ساتھ محدود ہیں، سلیم کی توجہ تمام تر اسلامی سلطنتوں کی جانب مبذول رہی، اس مدت میں یورپ کی سلطنتوں نے بہت نمایاں طور پر ترقی کر لی تھی، اسپین سے مورس کا اخراج ہو چکا تھا اور وہاں کی مختلف مسیحی ریاستیں متحد ہو کر ایک فرماں روا کے زیر حکومت آ چکی تھیں، فرانس اپنی خانہ جنگیوں کو ختم کر کے دوسرے ملکوں کی فتوحات کے لیے نکل چکا تھا، انگلستان اور سلطنت اسٹریا میں بھی قوت و استحکام کی علامتیں ظاہر تھیں، من جملہ دیگر فنون کے فن حرب میں خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ ترقی ہو گئی تھی، باقاعدہ تنخواہ دار پیدل فوجیں بڑی تعداد میں رکھ لی گئی تھیں، آتشیں اسلحوں کا استعمال کثرت سے کیا جا رہا تھا، عیسائی سلطنتوں میں اپنی قوت کی ترقی کا احساس اور مسلمانوں سے تازہ مقابلہ کا حوصلہ شدت سے پیدا تھا، یورپ مذہبی جوش سے لبریز تھا اور باہمی عداوتوں کے باوجود تمام مسیحی سلطنتیں دولت عثمانیہ کے مقابلہ کے لیے آمادہ و مستعد تھیں، شہنشاہ چارلس پنجم جس کی وسیع سلطنت یورپ کے نصف سے زیادہ حصہ پر پھیلی

ہوئی تھی، خاص طور پر اس مسیحی اتحاد میں پیش پیش تھا، دولت عثمانیہ کے لیے چارلس اور اس کے معاونین سے قوت آزمائی کرنا آسان نہ تھا، خصوصاً ایسی حالت میں کہ ایران کی وسیع سلطنت دشمنی پر آمادہ تھی اور شام و مصر میں ہر وقت بغاوت کا خطرہ تھا، تاہم وہ نہ صرف ان بیرونی اور اندرونی خطرات سے محفوظ رہی بلکہ سولہویں صدی کی پوری مدت میں اس کی قوت وسطوت میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور عیسائی سلطنتوں کے بہتیرے صوبے اس کے مقبوضات میں شامل ہو گئے، اس میں شبہہ نہیں کہ سولہویں صدی میں ترکوں کی عظیم الشان کام یابی کا سبب ان کی زبردست فوجی قوت اور اپنی قومی عظمت کا احساس تھا لیکن اس کام یابی کا اصلی سبب یہ تھا کہ عنان سلطنت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں تھی جو دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا تاج دار اور اس وقت تمام دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ تھا۔

ذاتی اوصاف واخلاق سلطان سلیمان چھبیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، بایزید ثانی کے زمانہ میں جب اس کی عمر بہت کم تھی وہ مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا، پھر جب سلیم نے ایران پر حملہ کیا تو سلیمان کو نائب سلطنت کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں چھوڑ گیا، اس کے بعد جنگ مصر کے دوران میں وہ اورنہ کا حاکم تھا اور پھر سلیم کے عہد کے آخری دو سالوں میں ولایت صادر خان کا انتظام اسی کے سپرد تھا، چنانچہ جب سلیم کی وفات کے بعد وہ تخت پر آیا تو ایک کام یاب مدبر اور لائق فرماں روا کی شہرت حاصل کر چکا تھا، ذاتی عظمت میں وہ اپنے تمام پیش رووں سے بڑھا ہوا تھا اور فتوحات اور وسعت سلطنت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت لے گیا، اس عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی انتہائی حد کمال تک پہنچ گئی، اس کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی، وہ اپنے رحم و کرم کے لیے خاص طور پر مشہور تھا، انصاف اس کا مخصوص شیوہ تھا اور اس کی عدالت میں نسل، رنگ اور مذہب کی کوئی تفریق نہ تھی، رعایا کی فلاح و بہبود اس کا مطمح نظر تھا، چنانچہ جب وہ تخت نشین ہوا تو تمام رعایا نے اس نوجوان سلطان کا، جو اپنے اخلاق، شجاعت، انصاف، رحم دلی اور دانش مندی کی بنا پر حد درجہ ہر دل عزیز تھا، نہایت مسرت کے

ساتھ استقبال کیا، اپنی حکومت کے پہلے ہی سال میں اس نے انصاف اور رحم دلی کی ایسی مثالیں پیش کیں جس سے اس کے آئندہ طرز عمل سے متعلق نہایت خوش آئند توقعات قائم کی جانے لگیں، سلطان سلیم نے چھ سو مصریوں کو بہ جبر مصر سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا تھا، سلیمان نے ان سب کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی، سلیم نے بعض تاجروں کا سامان تجارت ایران سے تجارت کرنے کی پاداش میں ضبط کر لیا تھا، سلیمان نے نقد روپیہ دے کر ان کے نقصان کی تلافی کر دی، اس کے حکم سے سلطنت کے بعض اعلیٰ حکام بد دیانتی اور ظلم کے جرم میں گرفتار کیے گئے اور ان کو سخت سزائیں دی گئیں، ان واقعات کی خبریں تمام سلطنت میں پہنچیں اور رعایا کو اپنی جان و مال کی طرف سے اطمینان ہو گیا، سلیمان نے تمام صوبہ داروں کے پاس احکام بھیجے کہ رعایا کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی روا نہ رکھی جائے اور امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کیا جائے، ان احکام کے نفاذ سے ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا، البتہ غزالی نے جسے سلطان سلیم نے مصری حکومت سے غداری کے صلہ میں شام کا حاکم بنایا تھا، سرکشی کا اظہار کیا اور خود مختار ہو جانا چاہا، سلیمان نے فوراً اس کی سرکوبی کے لیے ایک فوج روانہ کی، غزالی کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا، اس کے قتل سے نہ صرف شام کا فتنہ فرو ہو گیا بلکہ شاہ اسماعیل کے معاندانہ ارادوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، جس نے غزالی کی بغاوت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے شام کی سرحد پر اپنی فوجیں تیار کر رکھی تھیں۔

بلغراد کی فتح سلیم کے آخری دور حکومت میں سلطنت عثمانیہ اور سلطنت ہنگری کے درمیان آویزش پیدا ہو گئی تھی اور سرحدی علاقہ میں برابر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، اس خلش کو دور کرنے کے لیے سلیمان کو بلغراد اور زباکز (Szabacez) کے سرحدی قلعوں کو فتح کر لینا ضروری ہو گیا، ان قلعوں کی فتح سرحد کے استحکام کے لیے بھی ضروری تھی اور یورپ میں مزید فتوحات حاصل کرنے کے لیے بھی، چنانچہ سلیمان نے ہنگری کے بادشاہ لوئی ثانی کے پاس اپنے سفیر بھیجے اور اس سے خراج کا مطالبہ کیا، لوئی نے اس مطالبہ

کے جواب میں عثمانی سفراء کو قتل کرا دیا[1]، سلیمان کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ فوراً ہنگری کی فتح کے لیے روانہ ہو گیا، اس کے فوجی سرداروں نے زابا کر اور دوسرے قلعوں کا محاصرہ کر کے قبضہ کر لیا، اس کے بعد سلیمان خود بلغراد کی طرف بڑھا اور اس شہر کے گرد جس نے محمد فاتح جیسے سلطان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا، اپنے خیمے نصب کر دیے، سات روز کی گولہ باری کے بعد ۲۵ رمضان ۹۲۷ھ (۲۹ اگست ۱۵۲۱ء) کو بلغراد فتح ہو گیا، فتح کے بعد نہ قلعہ کے فوجی دستہ کا قتل عام ہوا اور نہ شہر کے باشندے قتل کیے گئے[2]، سلیمان نے وہاں کے سب سے بڑے گرجا میں نماز ادا کی اور تثلیث کے اس عظیم الشان معبد کو خدائے واحد کی پرستش کے لیے مخصوص کر دیا، اس کے بعد اس نے بلغراد میں ایک ترکی دستہ متعین کیا، اور قلعہ کو از سر نو مضبوط اور مستحکم کر کے قسطنطنیہ واپس ہوا، بلغراد کے علاوہ سرحد کے دوسرے قلعوں پر بھی عثمانیوں نے قبضہ کر لیا اور ہنگری میں داخل ہونے کے تمام دروازے ان کے لیے کھل گئے، سلیمان اب ہنگری کے دارالسلطنت بودا کی طرف بڑھ سکتا تھا لیکن روڈس کی فتح اس کے نزدیک زیادہ ضروری تھی اور بلغراد کے بعد اس نے اسی جانب رخ کیا۔

جمہوریہ وینس کا باج گزار ہونا بلغراد کی فتح کا ایک اثر یہ ہوا کہ جمہوریہ وینس نے از سر نو اپنے کو سلطنت عثمانیہ کا باج گزار تسلیم کر لیا اور جزائر قبرص (سائپرس) وزانطہ کا خراج دوچند کر دیا۔

روڈس کی فتح روڈس کی فتح مختلف وجوہ سے ضروری تھی، بلغراد اور روڈس یہی دو معرکے تھے، جن میں سلطان محمد فاتح نے شکست کھائی تھی، بلغراد کی فتح نے سلطنت عثمانیہ کے دامن سے ایک شکست کا داغ تو دھو دیا، سلیمان کی عالی حوصلگی دوسرے دھبہ کے دھونے کے لیے بھی بے قرار تھی، علاوہ بریں روڈس کے جہاز بحر روم کے مشرقی حصہ میں اور مجمع الجزائر اور اناطولیہ کے ساحلوں پر لوٹ مار مچائے رہتے تھے[3]، روڈس کی فتح اس وجہ سے بھی ضروری تھی

[1] کیمبرج ماڈرن ہسٹری، جلد ۵، ص ۹۳ [2] ایورسلے، ص ۱۷ [3] کیمبرج ماڈرن ہسٹری، ج ۱، ص ۵۳۔

کہ قسطنطنیہ اور شام و مصر کے درمیان جو تعلقات اب قائم ہو گئے تھے ان میں مبارزین روڈس اپنے جہازوں کے ذریعہ رخنہ انداز ہوتے رہتے تھے، ان اسباب کی بنا پر سلیمان نے اس جزیرہ پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا اور تین سو جہازوں کا عثمانی بیڑا قسطنطنیہ سے روڈس کی جانب روانہ کیا، ساتھ ہی وہ خود بھی ایک لاکھ فوج لے کر ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کی طرف بڑھا، بحری اور بری فوجوں کے جمع ہونے کی جگہ خلیج مارمریس قرار پائی، جو روڈس کے محاذ میں واقع ہے، ۲۸؍ جولائی ۱۵۲۲ء کو سلیمان روڈس کے ساحل پر اترا اور یکم اگست ۱۵۲۲ء کو محاصرہ شروع ہوا، جو تقریباً پانچ مہینہ تک جاری رہا، روڈس کے راہب مبارزوں نے نہایت شجاعت کے ساتھ مدافعت کی لیکن محاصرین کی قوت سے مجبور ہو کر بالآخر انہیں ۶؍ صفر ۹۲۹ھ (۲۵؍ دسمبر ۱۵۲۲ء) کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، سلیمان نے ان کے ساتھ جو مراعات برتیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی شجاعت کا کس درجہ قدردان تھا، اس نے مبارزین کو اجازت دے دی کہ بارہ روز کے اندر اپنے تمام اسلحوں اور سامانوں کو لے کر اپنے ہی جہازوں پر روڈس سے چلے جائیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو عثمانی جہازوں کو بھی کام میں لائیں، روڈس کے باشندوں کو سلطان کی رعایا بننے کے بعد پوری مذہبی آزادی دے دی گئی، سلطان نے صراحت کے ساتھ وعدہ کیا کہ ان کے کلیساؤں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، ان کے بچے والدین سے چھینے نہ جائیں گے اور پانچ سال تک ان سے کسی قسم کے ٹیکس یا محصول کا مطالبہ نہ ہوگا[1]، سلیمان نے اپنی فوجیں قلعہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہٹا لیں تاکہ مبارزین امن و سکون کے ساتھ قلعہ سے نکل جائیں لیکن ینی چری باوجود سخت روک تھام کے بے قابو ہو گئے اور شہر میں داخل ہو کر تھوڑی دیر تک لوٹ مار کرتے رہے، تاہم اور تمام شرائط سلیمان کی طرف سے نہایت دیانت داری کے ساتھ پورے کیے گئے، مبارزین روڈس نے وہاں سے نکلنے کے بعد آٹھ سال تک جزیرہ کریٹ میں قیام کیا اور پھر مستقل طور پر جزیرہ مالٹا میں جا کر آباد ہو گئے۔

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۲۶۲۔

مصر اور ینی چری کی بغاوت بلغراد اور روڈس کی فتح کے بعد ہنگری، سسلی اور اٹلی کے راستے سلیمان کے لیے کھل گئے لیکن مصر کی بغاوت اور ایشیائے کوچک کی شورش کے باعث اسے پہلے مشرق کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور یورپین سلطنتوں کو دو سال کی مہلت مل گئی، احمد پاشا نے جو خیر بے کے انتقال کے بعد ۹۲۸ھ (۱۵۲۲ء) میں مصر کا حاکم مقرر ہوا تھا علم بغاوت بلند کیا، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلیمان نے ایک فوج مصر روانہ کی، احمد پاشا کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا، اس کے بعد سلیمان نے صدر اعظم ابراہیم پاشا کو حکومت مصر کے انتظام و استحکام کے لیے مامور کیا اور خود سلطنت کے داخلی انتظامات کی طرف متوجہ ہوا، ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) کے اوائل سرما میں وہ شکار کی غرض سے قسطنطنیہ سے اورنہ چلا گیا، روڈس کی فتح کو ڈیڑھ سال کی مدت گزر چکی تھی، اس درمیان میں کوئی دوسری جنگ پیش نہیں آئی تھی، ینی چری کو امن کا یہ زمانہ نہایت گراں گزر رہا تھا، چنانچہ سلیمان کی عدم موجودگی میں انہوں نے قسطنطنیہ میں بغاوت برپا کر دی اور وزرا اور دوسرے بڑے بڑے عہدہ داروں کے مکانات لوٹ لیے، یہ خبر سن کر سلیمان اورنہ سے قسطنطنیہ کو لوٹا اور اس شورش کو فرو کرنے کی کوشش کی، اس نے باغیوں کے بعض سرداروں کو قتل کرا دیا، دو کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور پھر عام سپاہیوں کو انعام و اکرام دے کر بغاوت کا خاتمہ کیا۔

ہنگری کی فتح وزیر اعظم ابراہیم پاشا اس وقت مصر میں تھا، سلیمان نے اسے واپس بلا لیا اور ہنگری کی مہم کی تیاری شروع کر دی، ینی چری کی بغاوت سے اس کو تجربہ ہو گیا تھا کہ سلطنت کے امن کے لیے اس فوج کو جنگ میں مصروف رکھنا ضروری ہے، بلغراد کی فتح کے بعد سے اگر چہ کوئی بڑی جنگ ہنگری کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی، تاہم چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ قائم تھا، علاوہ بریں فرانس اول شاہ فرانس نے جسے شہنشاہ چارلس پنجم نے پیویا کی جنگ ۱۵۲۵ء میں شکست دے کر قید کر لیا تھا، سلیمان سے ہنگری پر حملہ کرنے کی بہ منت استدعا کی، تا کہ چارلس کو اپنی توجہ فرانس سے ہٹا کر ہنگری کی جانب مبذول کرنی پڑے،

جس کی سرحد سلطنت آسٹریا سے ملی ہوئی تھی، پھر اسی زمانہ میں شاہ ایران نے شہنشاہ چارلس اور شاہ ہنگری کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی، ان وجوہ سے سلیمان نے ہنگری پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا، ایک لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ روانہ ہوا، قسطنطنیہ سے روانہ ہونے کے پانچ ماہ بعد ۲۰/ذی قعدہ ۹۳۲ھ (۲۸/اگست ۱۵۲۶ء) کو موہاکز کے میدان میں ہنگری کی فوج سے مقابلہ ہوا، عثمانی لشکر کو اپنی کثرت تعداد اور توپ خانوں کی بنا پر بہت کچھ فوقیت حاصل تھی، دو گھنٹہ سے کم ہی میں جنگ اور ساتھ ہی ہنگری کی قسمت کا بھی فیصلہ ہوگیا، شاہ لوئی، اس کے آٹھ اسقف، اعیان ہنگری کی ایک بڑی تعداد اور چوبیس ہزار سپاہی مارے گئے، لوئی بھاگتا ہوا دریا میں ڈوب کر مرا، ۳۰/ذی الحجہ ۹۳۲ھ (۱۰/ستمبر ۱۵۲۶ء) کو سلیمان ہنگری کے پایہ تخت بودا میں پہنچا، باشندگان شہر نے ہتھیار ڈال کر دروازے کھول دیے، ہنگری کے جو امرا موہاکز کی تباہی سے بچ گئے تھے، انہوں نے سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوکر اطاعت کا حلف لیا، چوں کہ شاہ لوئی لاولد مرگیا تھا، اس لیے سلیمان کی تحریک سے ان امرائے ہنگری کے تخت کے لیے کانٹ زاپولیا (Count Zapolya) کا انتخاب کیا، جو ٹرانسلوینیا کا امیر اور ہنگری کے اکابر میں تھا، اس کے چند دنوں کے بعد سلیمان کو اطلاع ملی کہ ایشیائے کوچک میں کچھ بغاوت کی صورتیں رونما ہورہی ہیں، چنانچہ وہ فوراً بودا سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوگیا، ہنگری کے بعض سرحدی قلعوں میں ترکی دستے متعین کردیے گئے۔

ہنگری میں خانہ جنگی ہنگری کے تخت کے لیے زاپولیا کا انتخاب خانہ جنگی کا باعث ثابت ہوا، آرک ڈیوک فرڈیننڈ جو شہنشاہ چارلس پنجم کا بھائی تھا اور جسے چارلس نے آسٹریا کی آرچ ڈچی منتقل کردی تھی، ایک صلح نامہ کے رو سے جو چارلس اور سابق شاہ لوئی کے درمیان ہوچکا تھا، ہنگری کے تخت کا دعوے دار ہوا، دوسری طرف زاپولیا اور اس کے حامیوں نے اپنی موافقت میں ہنگری کا ایک قدیم قانون پیش کیا، جس کی رو سے ہنگری کے باشندے

کے علاوہ کوئی دوسرا شخص وہاں کا بادشاہ منتخب نہیں ہوسکتا تھا لیکن باوجود اس قانون کے مغربی ہنگری کے امرا نے فرڈینینڈ کو منتخب کرلیا، اس کے بعد جنگ ناگزیر ہوگئی، فرڈینینڈ کے ساتھ آسٹریا کی مدد شامل تھی، اس نے زاپولیا کو شکست دے کر ملک کے باہر بھگا دیا، زاپولیا نے پولینڈ میں پناہ لی اور وہاں سے سلطان کی خدمت میں مدد کی درخواست بھیجی، یہ سن کر فرڈینینڈ نے بھی اپنا ایک سفیر سلیمان کے دربار میں بھیجا اور نہ صرف ہنگری کے تخت کے لیے حمایت کی استدعا کی بلکہ بلغراد اور ہنگری کے دوسرے شہروں کی واپسی کا بھی جو سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو چکے تھے، مطالبہ کیا، سلیمان نے فرڈینینڈ کے مطالبہ سے برافروختہ ہوکر اس کے سفیر کو رخصت کر دیا اور زاپولیا کے سفیر کو اطمینان دلایا کہ وہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔

فرڈینینڈ کی شکست ۱۰ رمئی ۱۵۲۹ء کو سلیمان قسطنطنیہ سے روانہ ہوا اور ڈھائی لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ہنگری میں داخل ہوکر ۳ رستمبر کو پایہ تخت بودا پہنچا اور اس کا محاصرہ کرلیا، چھ روز میں بودا فتح ہوگیا اور زاپولیا دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا، اس کے بعد سلیمان آسٹریا کے مشہور دارالسلطنت ویانا کی طرف بڑھا۔

ویانا کا محاصرہ آسٹریا کا شہنشاہ چارلس پنجم اس وقت یورپ کا سب سے بڑا فرماں روا تھا، وہ اسپین، نیدرلینڈ، سسلی اور جرمنی کی مملکتوں کا تنہا مالک تھا، محاصرہ ویانا کے وقت وہ اٹلی میں فرانسس اول، شاہ فرانس سے جنگ میں مصروف تھا، اس لیے ترکوں کے مقابلہ کے لیے کوئی فوج نہ بھیج سکا اور آسٹریا کو صرف اپنی ذاتی قوت پر بھروسہ کرنا پڑا، چنانچہ محاصرہ سے قبل ہر دس آدمیوں میں سے ایک آدمی فوج میں بھرتی کیا گیا، ہم سایہ ریاستوں نے فوجی دستوں سے مدد کی، پھر بھی یہ فوج ترکوں کے مقابلہ کے لیے بالکل ناکافی تھی، فرڈینینڈ نے مجلس سلطنت سے مدد کی درخواست کی، جس نے صرف بارہ ہزار پیدل اور چار ہزار سوار فوج بھیجنا منظور کیا، مجلس کو بہ مشکل یقین دلایا جاسکا کہ سلیمان ویانا کی طرف بڑھتا آرہا ہے، بہرحال جلد ہی یہ معلوم ہوگیا کہ آسٹریا اتنی فوجیں جمع کرنے سے قاصر ہے، جو ترکوں

کو آگے بڑھنے سے روک سکیں، اس لیے عیسائیوں نے اب صرف دار السلطنت کی حفاظت کی تیاریاں شروع کیں، فرڈیننڈ خود تو سلیمان کے خوف سے ویانا سے بھاگ گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے چند جاں باز افسر اور اسپین اور جرمنی کے آزمودہ کار دستے محاصرہ کے مکمل ہونے سے قبل شہر میں پہنچ گئے تھے اور ان کی مدد حد درجہ اہم ثابت ہوئی، ویانا کے فوجی دستوں کا سپہ سالار کاؤنٹ ڈی سام (Count De Salm) تھا اور مدافعت کی اصلی نگرانی اسی کے ہاتھ میں تھی، ترکوں کے ویانا پہنچنے سے پہلے ہی تمام امکانی تیاریاں کر لی گئی تھیں، شہر کے استحکامات زیادہ تر بوسیدہ حالت میں تھے، فصیل بھی ایک ہی تھی جو بہ مشکل چھ فٹ موٹی تھی، چنانچہ وہ تمام مکانات جو فصیل سے بہت قریب واقع تھے، گرا کر زمین کے برابر کر دیے گئے، شہر کے اندر مٹی کی ایک نئی دھس تیار کی گئی، دریا کے ساحل پر خندق کھود کر لکڑی کے بڑے بڑے مضبوط لٹھوں سے باڑھ لگا دی گئی، آتش زدگی کے خیال سے چوبی کھپریلیں جن سے عام طور پر مکانات چھائے ہوئے تھے، شہر کے ہر مکان سے نکال لی گئیں، سڑک کی سنگی پٹریاں بھی اکھاڑ لی گئیں تاکہ دشمن کے گولوں اثر زائل ہو جائے، سامان رسد اور گھوڑوں کے لیے چارہ فراہم کرنے کی غرض سے متعدد ٹولیاں گرد و نواح میں بھیجی گئیں، پھر اس خطرہ سے کہ محاصرہ زیادہ دنوں تک قائم رہ جائے، ایسے تمام لوگوں کو جو مدافعت کے کام کے نہ تھے، بلکہ جن کی ذات پر فوجی نقطۂ نظر سے بیکار صرف ہو رہا تھا، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے اور پادری لوگوں کو شہر چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کیا گیا[1] اور جب ترک ویانا کے قریب پہنچ گئے تو نواح شہر کو بھی مسمار کر دیا گیا تاکہ محاصرین اس سے روک اور پناہ کا کام نہ لے سکیں، وہاں کے باشندوں کو ایسے وقت میں بے خانماں ہونا پڑا جب انہیں بھاگ جانے کا بھی موقع نہ تھا، ان میں اکثر ترکوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے۔

---

[1] ترک اور ویانا کے دو محاصرے از شمر بحوالہ لین پول، ص ۱۸۴ Two Sieges Of Vienna By The Turks By Schimmer

۲۷ رستمبر کو سلیمان ویانا پہنچا اور محاصرہ شروع ہوا، کثرت بارش کی وجہ سے سڑکیں اس قدر خراب ہوگئی تھیں کہ ترکوں کو اپنی بڑی بڑی توپیں ہنگری میں چھوڑ دینی پڑی تھیں اور اب انہیں زیادہ تر سرنگیں کھود کر دیواروں کو گرانے کی کوشش کرنی پڑی لیکن محصورین بھی ہر مقام پر نگاہ رکھتے تھے اور ۹ راکتوبر تک ترکوں کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں، بالآخر ۱۰ راکتوبر سرنگ کے ذریعہ سے شہر پناہ میں ایک چوڑا رخنہ پیدا ہوگیا، جس کے بعد ترکوں نے فوراً پے در پے حملے کیے، مگر ہر بار انہیں پسپا ہونا پڑا اور وہ رخنہ پر کردیا گیا، اسی طرح ۱۱ر اور ۱۲ راکتوبر کو بھی ترکوں نے ان مقامات پر جہاں سرنگوں نے بڑے بڑے رخنے کردیے تھے، سخت حملے کیے لیکن عیسائی ایسی جاں بازی سے لڑے کہ ترک شہر کے اندر داخل نہ ہو سکے، سلیمان یہ حالت دیکھ دیکھ کر بہت پیچ وتاب کھا رہا تھا، ترک بھی موسم کی شدت، سامان رسد کی قلت اور سب سے بڑھ کر ان مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے روز بروز زیادہ دل شکستہ ہو رہے تھے، آخر کار یہ طے پایا کہ ۱۴ راکتوبر (۲۰ رصفر ۹۳۶ھ) کو ایک آخری حملہ کیا جائے، سلیمان نے سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لیے بہت فیاضی سے روپیہ تقسیم کیا اور وعدہ کیا کہ جو شخص سب سے پہلے دیوار پر چڑھ جائے گا اسے دولت سے مالا مال کردیا جائے گا اور ایک بہت بڑا منصب عطا کیا جائے گا، چنانچہ ۹ ربجے صبح کو ینی چری اور عثمانی فوج کے بہترین دستے حملہ کے لیے بڑھے، صدر اعظم ابراہیم پاشا اور فوج کے تمام بڑے بڑے افسر بھی ساتھ تھے لیکن عیسائیوں کی سرفروشی نے ترکوں کے قدم شہر کے اندر نہ آنے دیے، حالاں کہ سہ پہر میں عثمانی انجینیر وں نے سرنگوں کے ذریعہ سے شہر پناہ کا ایک بڑا حصہ گرادیا تھا، مغربی مؤرخین کا بیان ہے کہ ترکوں کی ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں، یہاں تک کہ ینی چری نے بھی دل برداشتہ ہوکر حملہ کرنے سے انکار کردیا، برخلاف اس کے عیسائیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، آخر کار مایوس ہوکر سلیمان کو محاصرہ اٹھالینا پڑا اور اس نے فوج کو واپسی کا حکم دیا، ویانا کو اس کے مدافعین کی سرفروشی نے بچالیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے محاصرہ کی

ناکامی میں موسم کی شدت، جس کے ایشائی ترک عادی نہ تھے اور ینی چری کی سرکشی کو بھی بہت زیادہ دخل تھا، وسط یورپ میں عثمانی فتوحات کی موج ویانا کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔

آسٹریا کی فتح تین سال کے بعد سلیمان پھر ایک زبردست فوج کے ساتھ ہنگری پر حملہ آور ہوا اور وہاں سے ویانا کا رخ کیا، اب کی بار شہنشاہ چارلس نے آسٹریا کی فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لی لیکن قلعہ گنس (Guns) کی فتح میں جو راستہ میں واقع تھا، تین ہفتہ کی مدت صرف ہوگئی اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد سلیمان نے ویانا کی طرف بڑھنے کا ارادہ فسخ کیا، بجائے اس کے وہ آسٹریا کی طرف متوجہ ہوا اور اسے فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ کو لوٹ گیا، چارلس نے بھی سلیمان سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور ویانا کے قریب اپنی فوجیں لیے ہوئے پڑا رہا۔

ہنگری میں ترکی حکومت سلیمان کے قسطنطنیہ لوٹ جانے کے بعد بھی چند سالوں تک زاپولیا اور فرڈیننڈ میں لڑائی کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا، بالآخر ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں ان دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ ہوگیا، جس کے رو سے ہنگری کے دو حصے کر دیے گئے، مشرقی حصہ کا بادشاہ زاپولیا تسلیم کیا گیا اور مغربی حصہ فرڈینڈ کی فرماں روائی میں دے دیا گیا، مگر دوسرے ہی سال زاپولیا کا انتقال ہوگیا اور اس کی بیوہ اور فرڈینڈ کے درمیان جنگ پھر چھڑ گئی، فرڈینڈ پورے ہنگری کا دعوے دار ہوا اور زاپولیا کی بیوہ نے اپنے بچہ کے لیے سلیمان سے مدد کی درخواست کی، چنانچہ ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) میں سلیمان پھر ہنگری میں داخل ہوا اور فرڈینڈ کو شکست دے کر بودا اور دوسرے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا اور ان میں ترکی دستے متعین کر دیے، اگرچہ ساتھ ہی اس نے اس امر کا بھی اعلان کر دیا کہ زاپولیا کے بچہ کے بالغ ہونے کے بعد وہ اسے ٹرانسلوانیا اور ہنگری کے تخت پر بٹھا دے گا، بہرحال اس وقت سلیمان نے ہنگری کو سنجقوں میں تقسیم کر دیا اور ان میں ترکی گورنر مقرر کر دیے، اس

جنگ میں گو عثمانیوں کو کہیں کہیں شکستیں بھی ہوئیں لیکن مجموعی طور پر سلیمان کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ ۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں شہنشاہ چارلس اور فرڈیننڈ نے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور ۹۵۳ھ (۱۵۴۷ء) میں پانچ سال کے لیے صلح کر لی گئی اور صلح نامہ کی رو سے تقریباً تمام ہنگری اور ٹرانسلوانیا پر سلیمان کا قبضہ بدستور قائم رہا اور فرڈیننڈ نے باب عالی کو تیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا۔

سلیمان ''صاحب قراں'' یہ صلح نامہ جس میں شہنشاہ چارلس پنجم، پوپ، جمہوریہ وینس اور شہنشاہ فرانس شریک تھے، اس بات کا ثبوت ہے کہ مسیحی یورپ نے سلیمان کا ''صاحب قراں'' ہونا تسلیم کر لیا تھا، آسٹریا کو سلطنت عثمانیہ کے سامنے اس حد تک جھکنا پڑا کہ اس سے قبل صلح کے متعلق جو مراسلت ہوئی تھی اس میں فرڈیننڈ نے اپنے کو صدر اعظم ابراہیم پاشا کا بھائی لکھنا منظور کیا اور اس طرح اپنا مرتبہ ایک ترکی وزیر کے مرتبہ کے برابر قرار دیا، فرانسس اول نے بھی کئی بار نہایت ادب اور عاجزی کے ساتھ سلیمان سے مدد کی درخواست کی تھی اور سلیمان نے اس کی درخواست پر ہنگری اور جرمنی پر حملہ کر کے چارلس کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی فوجیں فرانس سے ہٹا لے، نیز فرانس کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لیے اس نے ایک جنگی بیڑہ بحرہ روم میں بھی روانہ کیا تھا[1]، یورپ کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دوران میں سلیمان کو ایران کی جانب بھی متوجہ ہونا پڑا اور دولت عثمانیہ کی عسکری قوت دو محاذوں میں تقسیم ہو گئی، فرڈیننڈ کا سفیر بوس بکیس (Busbequius) جو سلیمان کے دربار میں مامور تھا، لکھتا ہے:

> ''ہمارے اور تباہی و بربادی کے درمیان اہل ایران ہی صرف ایک روک ہیں، ترک ہمیں ضرور آدباتے مگر ایرانی انہیں روکے ہوئے ہیں، ایرانیوں کے ساتھ ترکوں کی اس جنگ سے ہمیں صرف مہلت مل گئی ہے، مخلصی اور نجات نہیں حاصل ہوئی ہے[2]۔''

ایران کی مہم ۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) میں سلیمان ایران کی مہم پر روانہ ہوا، چند ماہ قبل اس نے

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۲۷۸ [2] ایضاً ص ۲۷۶، فٹ نوٹ۔

ابراہیم پاشا کو ایک بڑی فوج کے ساتھ بھیج دیا تھا، ابراہیم سیدھا تبریز پہنچا اور اس پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا، تبریز ہی میں سلیمان بھی اس سے آکر مل گیا اور وہ دونوں وہاں سے موصل اور بغداد کی طرف روانہ ہوئے، راستہ اور موسم کی خرابی کی وجہ سے ترکی فوج کو بہت کچھ نقصان برداشت کرنا پڑا، بالآخر سلیمان بغداد پہنچا اور ۲۴ / جمادی الآخر ۹۴۱ھ (۳۱ / دسمبر ۱۵۳۴ء) کو وہاں کے حاکم نے شہر اس کے حوالے کر دیا کیوں کہ شاہ طہماسپ نے ترکوں سے مقابلہ کرنے کی زحمت ہی نہیں گوارا کی، اس طرح موصل اور بغداد کے دو بڑے صوبے آسانی کے ساتھ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے، پھر ۹۵۵ھ (۱۵۴۸ء) ۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) اور ۹۶۱ھ (۱۵۵۴ء) میں بھی سلیمان نے ایران پر حملے کیے اور ایڈان وان کے مضبوط شہروں کے علاوہ آرمینیا، میسوپوٹامیا کے بعض بڑے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے، ایرانیوں نے متفرق طور پر ترکی فوج کا مقابلہ کیا اور ترکوں کو موسم کی سختی اور سامانِ رسد کی عدم فراہمی کے باعث کافی نقصان پہنچایا لیکن خود شاہ ایران کی طرف سے کوئی مدافعت نہیں ہوئی اور ترک اپنے مفتوحات پر بدستور قائم رہے، ان علاقوں کے علاوہ سلیمان نے اپنی بحری قوت کے زور سے عدن پر بھی مستقل قبضہ کر لیا اور سواحل عرب اور ایران نیز شمالی مغربی ہند پر اس کا اثر قائم ہوا۔

بحری طاقت | بری قوت کے لحاظ سے ایشیا یا یورپ کی کوئی سلطنت دولت عثمانیہ کی ہم سر نہ تھی، بحری طاقت کے اعتبار سے بھی اس کی فوقیت تمام دوسری سلطنتوں پر مسلم تھی، اس وقت اسپین اور وینس کے بحری بیڑے سارے یورپ پر حاوی تھے لیکن ترکی بیڑے نے متعدد معرکوں میں ان کو شکست دی، بحری قوت کے اعتبار سے اسپین اور سلطنت عثمانیہ میں زیادہ فرق نہ تھا لیکن اسپین کے ساتھ وینس اور پوپ کے بیڑوں کے شامل ہونے کے بعد اتحادیوں کے بیڑے جہازوں کی کثرت تعداد اور سائز کے لحاظ سے ترکی بیڑے سے بہت زیادہ بڑھ جاتے تھے، تاہم دو بڑے معرکوں میں جب کہ یہ زبردست اتحاد ان کے خلاف تھا، ترک کامیاب رہے اور سلیمان کے عہد حکومت میں برابر ترکی بیڑے کا اقتدار بحر روم

میں قائم رہا، جس کی وجہ سے سلیمان نے الجزائر، اردن اور طرابلس کے صوبے اور بحر اسپین کے متعدد جزیرے جو وینس کے قبضہ میں تھے، فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔

بحری قزاق سلیمان کے ابتدائی عہد میں شمالی افریقہ کے مسلمان فرماں روا اس قدر کم زور تھے کہ وہ ساحلی علاقوں کے علاوہ اپنی مملکت کے جنوبی حصوں پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتے تھے اور خود ساحل کے شہر بھی بحری قزاقوں کی آماج گاہ تھے، جن میں سے بعض ان فرماں رواؤں کی اطاعت برائے نام تسلیم کرتے تھے لیکن اکثر بطور خود بحر روم میں لوٹ مار مچاتے رہتے تھے، یہ بحری قزاق دس دس اور بیس بیس بحری جہازوں کے بیڑے بنا کر اپنے جری اور نہایت تجربہ کار سرداروں کی قیادت میں مال غنیمت کے لیے بحر روم میں پھرا کرتے تھے اور اسپین، اٹلی اور فرانس اور کبھی کبھی انگلینڈ اور آئر لینڈ کے ساحلوں پر بھی حملے کیا کرتے تھے۔

سلطان سلیم نے بحری قوت پر خاص توجہ کی تھی اور جہازوں کی تعداد اور سائز میں بہت کچھ اضافہ کیا تھا، سلیمان نے بھی اس کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھا اور بحری قوت کو پہلے سے بہت زیادہ ترقی دی لیکن اس کے بحری سردار بے خوفی اور مہارت فن میں بحری قزاقوں کے ہم پلہ نہ تھے، یہ دیکھ کر اس نے ان قزاقوں کو جو اپنی قابلیت اور تجربہ میں دوسروں سے ممتاز تھے، سلطنت عثمانیہ کی خدمت کے لیے مدعو کیا اور انہیں ان کے جہازوں اور آدمیوں کے ساتھ بلا کر ترکی بیڑے کے اعلیٰ منصب پر مقرر کیا۔

خیر الدین پاشا بحری ان میں سب سے پہلا اور اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور بحری سردار خیر الدین باربروسہ (سرخ داڑھی والا) تھا، یہ شخص پہلے چند جہازوں کو ساتھ لے کر بحر روم کے تجارتی جہازوں پر چھاپا مارا کرتا تھا اور پھر ساحلی علاقوں پر حملہ آور ہونے لگا، چنانچہ اس نے بطور خود الجزائر پر حملہ کیا، شہر اور گردونواح کے علاقوں پر قبضہ کر لیا لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی خود مختار حکومت قائم نہ رکھ سکے گا، اس نے سلطان سلیم کی فرماں روائی قبول کر لی، یہ وہ زمانہ تھا جب اندلس کے مسلمانوں پر اسپین کی

عیسائی حکومت انتہائی مظالم کر رہی تھی، خیر الدین نے ان مظلوموں میں سے ستر ہزار کو اپنے جہازوں کے ذریعہ اندلس سے الجزائر پہنچا دیا، پھر جب سلیمان تخت پر آیا تو اس نے خیر الدین کو عثمانی بحریہ کا امیر اعظم مقرر کیا، چنانچہ ۱۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) میں اس نے شہنشاہ چارلس کے زبردست بیڑے پر حملہ کیا اور کورن، پٹراس اور دوسرے ساحلی شہروں کو جن پر چارلس کے مشہور امیر البحر اینڈریا ڈوریا (Andrea Doria) نے قبضہ کر لیا تھا، واپس لے کر سواحل اٹلی پر حملہ آور ہوا، اس کے بعد سلیمان کی تحریک سے اس نے تونس پر قبضہ کر کے اسے الجزائر کی ریاست میں شامل کر لیا، تونس کے حفصی سلطان حسن نے شہنشاہ چارلس سے فریاد کی، چارلس خود پانچ سو جہازوں کا بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر تونس پر حملہ آور ہوا، خیر الدین کو شکست ہوئی اور اسے تونس چھوڑنا پڑا، چارلس فاتحانہ طور پر شہر میں داخل ہوا اور گو وہاں کے باشندوں نے اسپینی حملہ کے خلاف خیر الدین کو کسی طرح کی مدد نہ دی تھی، تاہم چارلس نے اپنے سپاہیوں کو شہر لوٹ لینے کی اجازت دے دی، اس واقعہ پر ایور سلے کا بیان ہے کہ مظالم اور غارت گری کا جو منظر پیش آیا وہ ناقابل یقین ہے، شہر کے تیس ہزار بے قصور باشندے قتل کر دیے گئے اور دس ہزار غلاموں کے طور پر فروخت کیے گئے، مسجدیں اور تمام خاص خاص عمارتیں جلا کر برباد کر دی گئیں[1]، مسجدیں گرجوں کی شکل میں تبدیل کر دی گئیں، کتب خانے برباد کر دیے گئے، اتنی کتابیں راستہ میں پڑی ہوئی تھیں کہ ان کے ڈھیروں کو روندے بغیر کوئی جامع مسجد تک پہنچ نہیں سکتا تھا، لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، مسلمانوں کی جائدادیں اور مکانات چھین چھین کر عیسائیوں کو دیے جانے لگے[2]، بہر حال اس تمام قتل و غارت گری کا نتیجہ یہ ہوا کہ تونس سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل کر پھر سلطان حسن کے زیر حکومت آ گیا لیکن حسن کو سلطنت اسپین کی اطاعت قبول کرنی پڑی اور اس کی خود مختاری کا

---

[1] ''ترکی سلطنت'' از لارڈ ایور سلے، ص ۱۲۵ [2] المونس فی اخبار افریقہ وتونس لابن ابی دینار بحوالہ خلافت عثمانیہ از مولانا سید سلیمان ندویؒ۔

خاتمہ ہوگیا، اس کے بعد تونس پر ترکوں کا مستقل قبضہ ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) تک نہ ہوسکا۔

فرانس کے ساتھ مخصوص مراعات | ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں شہنشاہ چارلس اور فرانسس اول میں پھر جنگ چھڑ گئی اور فرانسس نے سلیمان سے مدد کی درخواست کی، اس درخواست کی بنا پر سلیمان اور فرانسس کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی سطوت و اقتدار یورپ میں کس حد تک تسلیم کرلیا گیا تھا، فرانسیسی مصنف البین (Albin) اس معاہدہ کو ''رعایت'' سلطانی سے تعبیر کرتا ہے، سلیمان نے اہل فرانس کے لیے سلطنت عثمانیہ کے ہر حصہ میں وہ حقوق عام کردیے جو ۱۵۲۸ء میں انہیں مصر میں عطا ہوئے تھے، فرانسیسیوں کو پانچ فیصدی محصول کے معاوضہ میں تمام ترکی بندرگاہوں سے تجارت کرنے کی اجازت دی گئی، کوئی غیر ملکی جہاز جس پر فرانس کا نشان نہ ہو سلطنت عثمانیہ کے زیر اثر سمندروں میں داخل ہونے کا مجاز نہ تھا، فرانسیسی تاجروں کے مقدمات دیوانی اور فوج داری دونوں صیغوں کے، خود ان ہی کے فیصلوں کے سپرد کردیے گئے اور ترکی عہدہ داروں کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ وہ ان قونصلوں کے فیصلوں کی تعمیل کراتے رہیں گے، سلطنت عثمانیہ کے فرانسیسی باشندوں کو انتقال جائیداد کے متعلق وصیت کرنے کے مخصوص حقوق عطا کیے گئے، انہیں نہ صرف اپنے لیے کامل مذہبی آزادی بخشی گئی بلکہ مقامات مقدسہ کی نگہبانی بھی تفویض ہوئی اور اس طرح گویا سلطان کی تمام عیسائی رعایا کی حمایت کا حق انہیں حاصل ہوگیا، یورپ کے تمام فرماں رواؤں میں صرف فرانس کے بادشاہ کو سلطان نے بجائے بے کے بادشاہ کے لقب سے سرفراز کیا اور اس معاہدہ کے بعد اس کے ساتھ ہم سری کا برتاؤ روا رکھا[1]۔

جزائر الجین پر قبضہ | چنانچہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں فرانس اور چارلس کے درمیان جو جنگ چھڑی اس میں معاہدہ مذکور کی بنا پر سلیمان نے فرانس کا ساتھ دیا، بحر روم میں خیر الدین پاشا کا اقتدار بدستور قائم تھا، اس نے جزیرہ مائنر کا پر حملہ کرکے وہاں سے بہت

[1] ''مسئلہ شرقیہ'' از جے، آر، میریٹ، ص ۹۴-۹۳ (The Easternouistion By J. R. Marriot)

کچھ مال غنیمت حاصل کیا اور کورن پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) میں سلیمان نے فرانس کی درخواست پر جمہوریہ وینس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جو چارلس کی مستقل حلیف تھی، خیر الدین پاشا نے سلیمان کی معیت میں جزیرہ کارفو پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا لیکن اہل وینس نے جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی اور سلیمان کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا، تاہم خیر الدین نے موقع پا کر بحر الجین کے تقریباً تمام جزائر پر جو وینس کے زیر حکومت تھے، قبضہ کر لیا اور یہ سب سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے، ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں یورپ اور فرڈیننڈ شاہ ہنگری نے چارلس اور جمہوریہ وینس سے مل کر ترکوں کے خلاف ایک ''اتحاد مقدس'' قائم کیا اور ستمبر ۱۵۳۸ء میں اتحادیوں کا زبردست بیڑا جو اپنے جہازوں کی تعداد اور قوت کے لحاظ سے ترکی بیڑے سے کہیں بڑھا ہوا تھا، شہنشاہ چارلس کے مشہور امیر البحر انڈریا ڈوریا کی سرکردگی میں پریویسا (Prevesa) کے سامنے عثمانی بیڑے سے مقابل ہوا، ڈوریا کی شہرت اور اتحادی بیڑے کی مجموعی طاقت عیسائیوں کی فتح کی کافی ضمانت سمجھی جاتی تھی، مگر خیر الدین پاشا نے اتحادیوں کو زبردست شکست دے کر ان کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا، اسی دوران میں فرانس نے وینس کے مقام پر چارلس سے ایک عارضی صلح کر لی، پھر ۹۴۶ھ (۱۵۳۹ء) میں جمہوریہ وینس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور تین ماہ کے لیے ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا لیکن دوسرے ہی سال مستقل طور پر صلح ہوگئی، جمہوریہ وینس نے تین لاکھ دوکات تاوان جنگ دینا منظور کیا اور وہ ساحل ڈلماشیا کے متعدد مقامات سلطان کے حوالہ کر کے بحر الجین کے ان جزائر سے دست بردار ہوگئی جن پر خیر الدین نے قبضہ کر لیا تھا۔

چارلس سے جنگ کا سلسلہ لیکن اس صلح کا کوئی اثر سلیمان اور چارلس کی جنگ پر نہ پڑا، الجزائر پر خیر الدین پاشا کا قبضہ چارلس کے اسپینی اور اطالوی مقبوضات کے لیے ایک مستقل خطرہ کا باعث تھا، لہٰذا ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) میں چارلس نے الجزائر کو فتح کرنے کے لیے ایک بیڑا روانہ کیا، مگر یہ بیڑا اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا، دوسرے سال فرانس نے

صلح نامہ وینس کا (۱۵۳۸ء) کا خاتمہ کر کے چارلس سے پھر جنگ شروع کر دی اور ترکی بیڑے کی مدد سے شہر وینس پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا، فرانس نے اپنے حلیف کی مدد کا اعتراف کیا اور اس کے معاوضہ میں ٹولوں کی بندرگاہ ترکوں کے حوالہ کر دی، ا۹۵۱ھ (۱۵۴۴ء) میں فرانس اور چارلس کے درمیان پھر صلح ہوگئی (صلح نامۂ کرپسی) لیکن سلیمان اور چارلس کی جنگ بحر روم اور ہنگری میں بدستور جاری رہی، فرانس اگرچہ دولت عثمانیہ کا حلیف تھا اور ۱۵۳۵ء کے معاہدہ کے بعد ہر جنگ میں سلیمان نے پوری وفاداری کے ساتھ فرانس کا ساتھ دیا تھا مگر فرانس کو جب بھی اپنا فائدہ نظر آیا اس نے سلیمان کی اجازت کے بغیر چارلس سے صلح کر لی، چنانچہ صلح نامہ وینس (۱۵۳۸ء) اور صلح نامہ کرپسی (۱۵۴۴ء) کا تکملہ عین اس حالت میں ہوا جب سلیمان فرانس کے حلیف کی حیثیت سے چارلس سے جنگ میں مصروف تھا، فرانس کے اس طرز عمل کو میریٹ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں مناسب طریقہ پر واضح کر دیا ہے، وہ لکھتا ہے:

> ''فرانس اور خاندان ہیپس برگ (The Habsburgs) یعنی فرماں روایان آسٹریا و ہنگری کے درمیان جنگ کا سلسلہ بہت قلیل وقفہ کے ساتھ ۱۵۳۵ء سے ۱۵۵۹ء تک قائم رہا اور مکمل طور پر صلح تو ۱۵۹۸ء تک نہ ہو سکی، اس پوری مدت میں اور اس کے بعد بھی فرانس ترکوں کے وفادارانہ تعاون پر اعتماد کر سکتا تھا، اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ترکوں نے فرانسیسیوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مستقل اور مسلسل طور پر اس اتحاد کے ساتھ وفاداری برتی، برخلاف اس کے موخر الذکر کے مقاصد کے لیے یہ اتحاد جب اور جتنے دنوں تک مفید ثابت ہوا، انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا لیکن جب ان کے ذاتی اغراض کا تقاضا یہ ہوا کہ ترکوں کے دشمنوں سے صلح کر لی جائے تو انہوں نے اس میں کوئی تامل نہیں کیا۔[1]''

خیر الدین پاشا کی وفات | ۹۵۳ھ (۱۵۴۶ء) میں خیر الدین پاشا کا انتقال ہو گیا،

---

[1] میریٹ، ص ۹۴۔

اس نے اپنی حیرت انگیز شجاعت اور قابلیت سے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات میں بہت کچھ اضافہ کیا بلکہ بحر روم، بحر احمر اور بحر ہند میں اس کی بحری قوت کو درجہ کمال تک پہنچا دیا، یہاں تک کہ یورپ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ طاقت ور شہنشاہ چارلس پنجم بھی تنہا ان کے مقابلہ کی جرأت نہیں کرسکتا تھا، گو وہ محض ایک سپاہی تھا تاہم علوم وفنون کی سرپرستی کا شوق اسے اتنا زیادہ تھا کہ اس نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ ایک کالج قائم کرنے میں صرف کردیا۔

طورغوت خیر الدین پاشا کے علاوہ سلیمان کو اسی قسم کے دو اور بحری کپتانوں کی خدمات بھی حاصل ہوگئی تھیں، جن کی غیر معمولی شجاعت اور قابلیت کا سلسلہ بحر روم اور اس کے ساحلی علاقوں پر بیٹھا ہوا تھا، ان میں سے ایک طورغوت اور دوسرا پیالے تھا، طورغوت بھی ابتدا میں ایک بحری قزاق رہ چکا تھا، چنانچہ ایک بار اس نے تیس جہازوں کا بیڑا تیار کر کے جزیرہ کارسیکا پر حملہ کردیا لیکن ڈوریا نے اسے شکست دے کر گرفتار کرلیا اور زنجیروں میں ڈال دیا، آخر کار مہینوں کے بعد خیر الدین باربروسہ کی دھمکی سے کہ اگر طورغوت رہا نہ کیا گیا تو جنوا (ڈوریا کا وطن) برباد کردیا جائے گا، ڈوریا نے اسے آزاد کیا، طورغوت اپنی مہارت فن اور شجاعت میں خیر الدین سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا، اٹلی اور اسپین کے ساحلی علاقے اس کے نام سے کانپتے تھے، عثمانی رعایا ہونے کے باوجود اس کو سلطان کے حلیفوں کے جہاز گرفتار کرلینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا، چنانچہ ایک بار اس نے وینس کے چند تجارتی جہاز گرفتار کرلیے اور جب سلیمان نے باز پرس کرنے کے لیے اس کو قسطنطنیہ میں طلب کیا تو اس نے وہاں جانے سے انکار کردیا اور اپنے بیڑے کو لے کر مراکش چلا گیا اور وہاں کے سلطان کی ملازمت اختیار کرلی، پھر خیر الدین پاشا کی وفات کے بعد سلیمان نے معافی اور اعلیٰ منصب کا وعدہ کر کے اسے بلالیا اور چند دنوں کے بعد طرابلس کی فتح کے لیے روانہ کیا، طرابلس اس وقت مبارزین مالٹا کا مقبوضہ تھا، طورغوت نے حملہ کر کے اسے فتح کرلیا اور سلطنت عثمانیہ میں شامل

کردیا، اس کے بعد وہ طرابلس کا حاکم مقرر رہا، ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں جب ترکوں نے مالٹا پر حملہ کیا تو وہ بھی اپنا بیڑا لے کر دولت عثمانیہ کی مدد کو آیا لیکن اسی معرکہ میں وہ مارا گیا۔

پیالے | پیالے بھی ایک مدت تک بحری قزاق رہ چکا تھا، پھر اس نے سلیمان کی ملازمت اختیار کرلی اور رفتہ رفتہ عثمانی بیڑے کا امیر البحر مقرر ہوگیا، ۹۶۷ھ (۱۵۶۰ء) میں دوسو جہازوں کا ایک عظیم الشان عیسائی بیڑا طرابلس کو ترکوں سے واپس لینے کے لیے ڈوریا کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا تھا پیالے اس کے مقابلہ کے لیے دردانیال سے نکلا اور عثمانی جزیرہ جربہ کے قریب جس پر عیسائیوں نے اپنی فوجیں اتاردی تھیں اور ایک قلعہ بھی تعمیر کرلیا تھا، ۱۴ر مئی ۱۵۶۰ء کو ڈوریا کے بیڑے پر حملہ آور ہوکر اسے نہایت سخت شکست دی، عیسائیوں کے تقریباً پچاس جہاز برباد ہوگئے اور سات گرفتار کرلیے گئے، جزیرہ پر جو عیسائی فوجیں پہنچ چکی تھیں انہیں بھی قلعہ کا محاصرہ کرکے پیالے نے گرفتار کرلیا اور جربہ پر عثمانی علم پھر لہرانے لگا، اس کے بعد اس نے اردن کے صوبہ پر جو الجزائر کے مغرب میں واقع ہے، حملہ کرکے اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کرلیا، ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں جب مالٹا پر حملہ ہوا تو وہی عثمانی بیڑے کا امیر البحر تھا۔

پرتگال سے بحری جنگ | پندرہویں اور سولہویں صدی میں اسپین کے بعد جس ملک سے مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا وہ پرتگال تھا، اندلس میں جب اسلامی حکومت قائم تھی تو پرتگال بھی اسی کے زیر سایہ تھا لیکن جب اس سرزمین میں مسلمانوں کا آفتاب اقبال غروب ہوا اور اسپین کی عیسائی حکومت نے اسلام کشی کا عمل شروع کیا تو پرتگال نے بھی اخوت دینی کا حق پوری طرح ادا کیا، تفصیل آگے آتی ہے، ہندوستان، چین، سیام، جاوا، سماترا، جزائر ہند، سیلون، ملیبار، ممباسہ، زنجبار، حبش، مصر وعرب وغیرہ مشرقی ممالک کی بحری تجارتیں عرب تاجروں کے ہاتھوں میں تھیں، ان کے جہاز بحر ہند، بحر عرب، خلیج فارس اور بحر احمر کے تجارتی راستوں پر قابض تھے، یہ لوگ چین، ہندوستان اور ایران وغیرہ سے مال لے جاکر مصر

پہنچاتے تھے اور وہاں سے وینس اور جنوا کے سوداگر اسے یورپ لے جاتے تھے، پھر اسی طریقہ سے یورپ کا مال عربوں کے جہازوں پر ہندوستان، ایران اور چین وغیرہ مشرقی ملکوں میں پہنچتا تھا، اس تجارت سے مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کو بہت فائدہ تھا لیکن جب واسکوڈی گاما نے راس امید کی راہ سے ہندوستان تک پہنچنے کا راستہ دریافت کیا تو پرتگال نے اس بات کی کوشش شروع کی کہ جس طرح ممکن ہو یہ تجارت عربوں کے ہاتھوں سے چھین لی جائے اور مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کے لیے بجائے قدیم راستہ کے وہ جدید راستہ اختیار کیا جائے جس کو واسکوڈی گاما نے دریافت کیا تھا، اس مقصد کے حصول کے لیے پرتگیزوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس کی نوعیت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مستند رسالہ ''خلافت عثمانیہ'' سے واضح ہوتی ہے، مولانا فرماتے ہیں:

''اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عرب جہازوں پر تاخت شروع کی، عرب، حبش، ہندوستان اور فارس کے ساحلی مقامات پر حملے کیے اور نامسلموں کو مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں اور عربوں کے ہاتھ اپنا اسباب تجارت فروخت نہ کریں، ملیبار کے موپلہ تاجروں پر بڑی زیادتیاں کیں، یمن اور حجاز کے ساحلی شہروں پر قبضہ جمایا اور ہندوستان میں سندھ سے لے کر مدراس و گجرات و بمبئی تک بندرگاہوں پر دھاوے کیے، ساحلوں اور جزیروں میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، مسجدیں توڑ کر کلیسا بنائی جارہی تھیں، کالی کٹ کے راجہ کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کو عرب آنے جانے سے روک دے، کوچین ساحل ہند پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو قتل کیا اور مسجد کو کلیسا بنالیا اور پھر رفتہ رفتہ عرب کے سواحل پر عدن، ہرمز، پریم وغیرہ کو اور ہندوستان کے سواحل میں سے گوا، جیول، وابل، دیپ، دمن، مہائم وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا، ۹۱۵ھ میں کالی کٹ پر حملہ کر کے شہر کو لوٹ لیا اور وہاں کی جامع مسجد کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، یہی حال انہوں نے عرب کے ساحلی مقامات کا کر دیا، حج کے بحری مسافران قزاقوں کے ہاتھوں سے بہ مشکل جاں بر ہو سکتے تھے، گوا کا مشہور بندرگاہ سلطنت بیجاپور سے

چھین لیا اور سلطان گجرات کے تمام بندرگاہوں پر غارت گری شروع کر دی، جدہ اور عدن پر کئی حملے کیے، کبھی کام یابی ہوئی اور کبھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا، انتہا یہ ہے کہ پرتگالی یہ خواب دیکھنے لگے کہ جدہ پر قبضہ کر کے حجاز پر حملہ کیا جائے اور خاکم بدہن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو ویران اور حرمین محترمین کو منہدم کر کے اسلام کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے[1]۔''

یہ حالات تھے جن کے دفعیہ کی ذمہ داری سلطان نے تخت پر آنے کے بعد بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے محسوس کی اور پھر اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہو آنے کی حتی الامکان پوری کوشش کی، چنانچہ ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) میں اس نے ایک بیڑا رئیس سلیمان کی ماتحتی میں عدن کے محاصرہ کے لیے روانہ کیا، جس پر اس وقت پرتگیزوں کا قبضہ تھا، مگر اس مہم میں ترکوں کو شکست ہوئی، پھر بھی وہ دل شکستہ نہیں ہوئے اور بحر ہند میں برابر پرتگال کے جہازوں پر حملہ کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ گجرات کے ساحل تک پہنچ گئے، جہاں ان میں اور پرتگیزوں میں متعدد معرکے پیش آئے، اس کے بعد ۹۴۵ھ (۱۵۳۸ء) میں ایک عظیم الشان ترکی بیڑا سلیمان پاشا والی مصر کی سرکردگی میں سوئز اور عدن پر قبضہ کرتا ہوا گجرات کی طرف روانہ ہوا، دیپ پہنچنے کے بعد گجراتیوں سے مل کر اس نے پرتگیزوں پر حملے شروع کیے، سلیمان پاشا نے دیپ کا محاصرہ کر لیا اور اگر وہ استقلال کے ساتھ محاصرہ کو جاری رکھتا تو یہ بندرگاہ پرتگال کے قبضہ سے ضرور نکل جاتی لیکن غالباً سلیمان پاشا کی خودرائی اور استبداد نے امرائے گجرات کو آزردہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے سامان رسد کا بھیجنا بند کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز دفعتہً ترکی بیڑے نے لنگر اٹھا کر کوچ کر دیا اور دیپ پر پرتگیزوں کا قبضہ بدستور قائم رہا، سلیمان کو جب یہ خبر پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا، اس نے سلیمان پاشا کو اپنے دربار میں طلب کیا اور غضب ناک ہو کر کہنے لگا کہ ''میں نے تم کو دیپ سے فرنگیوں کو نکالنے کے لیے اور وہاں کے بادشاہ کی مدد کے لیے بھیجا تھا، ہندوستان کے مسلمانوں پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا تھا[2]۔''

---

[1] ان واقعات کی تفصیل واسناد کے لیے رسالہ مذکور ہے صفحات ۳۶ تا ۵۷ ملاحظہ فرمائیں۔ [2] خلافت عثمانیہ، ص ۶۱۔

پیری رئیس ترکوں کی اس ناکامی سے پرتگیزوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ انہوں نے عدن پر دوبارہ قبضہ کرلیا، اس لیے ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں سلیمان نے مشہور ترکی امیر البحر پیری رئیس کے زیر قیادت ایک مضبوط بیڑا بحر ہند میں روانہ کیا، اس بیڑے نے پہلے عدن کو پرتگیزوں کے قبضہ سے چھڑایا، پھر وہ عرب کے ساحلی مقامات سے گزرتا ہوا مسقط پہنچا جہاں اس نے پرتگالی بیڑے کو غافل پاکر گرفتار کرلیا لیکن جب خلیج فارس کے ساحل پر پرتگیزوں کو شکست دے کر یہ ہرمز پہنچا تو وہاں ایک سخت معرکہ پیش آیا، جس میں دشمنوں کو فتح ہوئی اور پیری رئیس صرف دو جہازوں کو لے کر نکل سکا، بقیہ گرفتار ہوگئے، پیری رئیس ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے بھی اسی قدر مشہور ہے جس قدر ایک امیر البحر کی حیثیت سے، اس نے بحر الجین اور بحر روم پر دو کتابیں لکھی ہیں، جن میں ذاتی معلومات کی بنا پر ان سمندروں کے دھاروں، گرد و پیش کے علاقوں، بندرگاہوں اور ساحل پر اترنے کی مناسب جگہوں کے حالات بیان کیے ہیں۔

سیدی علی پیری رئیس کی شکست کی خبر سن کر سلیمان نے ایک دوسرے امیر البحر مراد بے کو روانہ کیا تاکہ عثمانی بیڑے کو آزاد کرائے، ہرمز کے سامنے پرتگالی بیڑے سے مقابلہ ہوا، جس میں ترکوں کو پھر شکست ہوئی اور ان کے جہازوں کا بڑا حصہ ڈوب گیا، اس کے بعد سلیمان نے اپنے مشہور امیر البحر سیدی علی کو اس مہم پر روانہ کیا، یکم شوال ۹۶۱ھ (۱۵۵۴ء) کو وہ بصرہ سے روانہ ہوا اور خلیج فارس کے کنارہ کنارہ ہوتا ہوا جب راس موسندام کے قریب پہنچا تو پرتگالی بیڑا سامنے نظر آیا، ایک سخت معرکہ کے بعد پرتگیزوں کو شکست ہوئی اور سیدی علی کے لیے آگے کا راستہ صاف ہوگیا، چنانچہ وہ کھلے سمندر میں داخل ہو کر مسقط کے سامنے نمودار ہوا، یہاں پرتگیزوں نے پھر مقابلہ کیا اور اس جنگ میں طرفین کو شدید نقصان پہنچا، رات کے وقت جب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو دفعۃً ہوا اس قدر تیز ہوئی کہ سیدی علی کے جہاز بے قابو ہوگئے اور وہ بہہ کر بلوچستان کے ساحل پر نکل آیا، چند دنوں کے بعد اس نے پھر بحر احمر کا رخ کیا لیکن ایک ناگہانی طوفان اسے دوبارہ بحر ہند میں بہا لے گیا، سیدی علی نے سورت

کی بندرگاہ میں آکر جہازوں کو چھوڑ دیا اور خشکی کا راستہ اختیار کیا، وہ افغانستان، ایران اور عراق ہوتا ہوا قسطنطنیہ واپس آیا اور یہ مہم ناتمام ہی رہی، اس کے بعد سلیمان کے عہد میں پرتگیزوں سے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں مگر کوئی بڑا مقابلہ پیش نہیں آیا۔

پیری رئیس نے گجرات سے قسطنطنیہ تک سیاحت کے حالات ایک سفرنامہ میں قلم بند کیے ہیں، وہ شاعر بھی تھا، اس نے ریاضیات اور فن جہاز رانی پر بھی چند رسالے لکھے ہیں جو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، خصوصاً اس کی تصنیف ''محیط'' جو بحر ہند کی جہاز رانی پر ہے، نہایت مستند خیال کی جاتی ہے، جرمن مؤرخ فان ہیمر کا بیان ہے کہ بحر الجین اور بحر روم کے حالات پر جو کتابیں پیری رئیس نے لکھی ہیں، ان کے نسخے برلن اور ڈرسڈن کے شاہی کتب خانوں، نیز رومہ میں پوپ کے کتب خانہ اور بولونا میں سیدی علی کی ''محیط'' کا واحد معلوم نسخہ نیپلز میں ہے[1]۔

مالٹا مالٹا مبارزین سینٹ جان کا مقبوضہ تھا، جہاں روڈس سے نکلنے کے بعد انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، یہ اور اس کے قریب کا چھوٹا سا جزیرہ غوزا شہنشاہ چارلس نے انہیں دے دیا تھا، مالٹا میں آنے کے بعد انہوں نے اس کو نہایت مستحکم کر لیا تھا، مبارزین کے جہاز اسپین اور دوسری مخالف طاقتوں کے بیڑوں کے ساتھ مل کر عثمانی بیڑوں پر حملہ آور ہوتے تھے اور ترکوں سے ان کی جنگ برابر جاری رہتی تھی، یہ لوگ سلطنت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں پر بھی حملہ آور ہوتے رہتے تھے اور بحر روم میں لوٹ مار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، مجبوراً سلیمان کو مالٹا پر حملہ کرنے کا تہیہ کرنا پڑا، حملہ کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مالٹا میں ایک کثیر تعداد مسلمان غلاموں کی موجود تھی، جو وہاں کے عیسائیوں کے مظالم سے تنگ آ گئے تھے، علاوہ بریں بحر روم میں یہ جزیرہ اپنے موقع کے لحاظ سے نہایت اہم تھا، چنانچہ یکم اپریل ۱۵۶۵ء کو سلیمان نے ۱۸۱ رجہازوں کا ایک زبردست بیڑا تیس ہزار فوج کے ساتھ مصطفیٰ پاشا کی سرکردگی میں قسطنطنیہ سے روانہ کیا، ۱۹ رمئی کو یہ بیڑا مالٹا پہنچا اور دوسرے ہی روز حملہ شروع

---

[1] کریسی، ج۱، ص ۲۸۸، فٹ نوٹ۔

ہو گیا، ۲۳ / جون ۱۵۶۵ء کو قلعہ سینٹ ایلمو (St. Elmo) فتح ہو گیا لیکن ترکوں کی انتہائی کوشش اور شدید نقصان کے باوجود سینٹ اینجیلو (St. Angelo) اور سینٹ مائیکل (St. Micheal) کے قلعوں پر قبضہ نہ ہو سکا اور بالآخر چار ماہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۱/ ستمبر ۱۵۶۵ء کو مصطفیٰ پاشا نے محاصرہ اٹھا لیا، اس محاصرہ میں پچیس ہزار ترک اور پانچ ہزار عیسائی مارے گئے۔

ہنگری کی مہم اور سلیمان کی وفات جس وقت محاصرہ اٹھا لینے کی خبر قسطنطنیہ پہنچی، سلیمان آسٹریا سے ایک نئی جنگ کی تیاری کر رہا تھا، وجہ یہ تھی کہ ہنگری کی حلیف جماعتوں میں پھر نزاع شروع ہو گئی تھی اور میکسی میلن ثانی (Maximilian-II) نے جو فرڈیننڈ کے انتقال کے بعد اس کا جانشین تھا، کانٹ زاپولیا کے لڑکے کو تخت سے محروم کر دینے کا عزم کر لیا تھا، چنانچہ اسی سلسلہ میں اس نے بعض اہم قلعوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا، یہ معلوم کر کے سلیمان نے بذات خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا اور باوجود اس کے کہ اس کا سن ۷۶ / سال کا ہو چکا تھا اور ضعف عمر اور علالت کے باعث وہ گھوڑے پر بیٹھ نہیں سکتا تھا، پالکی میں سوار ہو کر یکم مئی ۱۵۶۶ء کو فوج کے ساتھ قسطنطنیہ سے ہنگری کی طرف روانہ ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ آسٹریا کی جنگ نے اس سال مبارزین مالٹا کو دوسرے حملہ سے محفوظ کر دیا جو یقیناً ان کے لیے مہلک ثابت ہوتا، ۲۷ / جون ۱۵۶۶ء کو سلیمان سلین کے مقام پر پہنچا اور وہاں نوجوان سجسمنڈ زاپولیا (Sigismund Zapolya) نے جو سلطنت عثمانیہ کے زیر سرپرستی ہنگری اور ٹرانسلوینیا کا بادشاہ تھا، اس کے سامنے نذر اطاعت پیش کی، آگے بڑھنے سے پہلے سلیمان اربرو (Erbru) اور زیجیتھ (Szigeth) کے قلعوں کو فتح کر لینا چاہا تھا، چنانچہ ۵ / اگست ۱۵۶۶ء کو عثمانی فوجوں نے زیجیتھ شہر کے گرد اپنے خیمے نصب کر دیے، پانچ روز میں شہر فتح ہو گیا لیکن وہاں کے حاکم زرینی (Zriny) اور اس کے باقی ماندہ ۳۲۰۰ / آدمیوں نے قلعہ میں پناہ لی اور وہاں سیاہ علم نصب کر کے اس بات کی قسم کھائی کہ جب تک ایک سپاہی بھی زندہ رہے گا ہتھیار نہ ڈالیں گے، اگست اور ستمبر میں ترکوں نے اس قلعہ پر تین حملے کیے لیکن ہر بار انہیں پسپا ہونا پڑا،

بالآخر انہوں نے قلعہ کے سب سے بڑے برج کے نیچے سرنگ کھود کر بارود بچھا دیا اور ۵/ستمبر ۱۵۶۶ء کو علی الصباح بارود میں آگ لگادی، پھر بھی چار روز کی مسلسل گولہ باری کے بعد ۸/ستمبر کو یہ قلعہ فتح ہوا لیکن ۵/ستمبر کی رات ہی کو سلیمان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی، صدر اعظم صوقوللی نے سلطان کی وفات کی خبر بالکل مخفی رکھی اور اسی کے نام سے تمام احکام جاری کرتا رہا، اس سے پوشیدہ طور پر شہزادہ سلیم کے پاس اس حادثہ کی اطلاع بھیج دی، اس درمیان میں عثمانی فوجیں جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی متعدد مقامات فتح کرتی رہیں، صوقوللی نے سلیمان کی لاش پر مصالحہ لگا کر اسے خراب ہونے سے محفوظ کر دیا تھا اور کوچ کے وقت لاش کو پالکی میں رکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتا تھا، اس نے لشکر میں یہ خبر مشہور کرادی تھی کہ سلطان علالت کی وجہ سے باہر نکلنے سے معذور ہے، اس تدبیر سے اس نے سات ہفتہ تک اس کی وفات کو پوشیدہ رکھا اور بالآخر یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ قسطنطنیہ میں شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھ چکا، اس نے ۲۴/اکتوبر ۱۵۶۶ء کو تمام فوج کو جمع کر کے سلیمان کی وفات کا اعلان کر دیا۔

سلطنت عثمانیہ کی وسعت سلیمان کے عہد میں سلطنت عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور خوش حالی کے لحاظ سے حد کمال تک پہنچ گئی تھی، اس کے بعد جزائر سائپرس اور کریٹ کے علاوہ اس میں بہت کم اہم اور مستقل اضافے ہوئے، اس وسیع وعریض سلطنت کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل سے زیادہ تھا، یہ بودا سے بصرہ تک اور بحر کاسپین سے بحر روم کے مغربی حصہ تک پھیلی ہوئی تھی اور یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک اس میں شامل تھے، شمال میں ازف کی دیواریں، روس کے مقابل سلطنت عثمانیہ کی سرحد کی حفاظت کرتی تھیں، جنوب میں عدن کی پہاڑی نے سلاطین کی حکومت عرب کے جنوبی ساحل پر مستحکم کر دی تھی، انہیں بحر ہند میں بااثر بنا دیا تھا اور بحر احمر پر کامل اختیار دے رکھا تھا، سلطان کا یہ فخر کوئی بے جا فخر نہ تھا کہ وہ بہت سی مملکتوں کا فرماں روا، تین براعظموں کا شہنشاہ اور دو بحروں کا مالک ہے[1]۔

---

[1] فنلے (Finlay) بحوالہ میریٹ، ص ۹۹۔

سلطنت کی انتظامی تقسیم سلیمان نے اس عظیم الشان سلطنت کو اکیس ولایتوں اور پھر ان ولایتوں کو ۲۵۰ سنجقوں میں تقسیم کر دیا تھا، ولایتیں حسب ذیل تھیں:

۱- رومیلیا، اس میں یورپ کے وہ تمام عثمانی مقبوضات شامل تھے، جو دریائے ڈینوٹ کے جنوب میں واقع تھے اور جن میں یونان، مقدونیا، تھریس، پائرس، ایلیریا، دلماشیا اور میسیا کے صوبے بھی داخل تھے۔

۲- مجمع الجزائر، بحر روم، یہ ولایت قبودان پاشا (امیر البحر اعظم) کے سپرد تھی۔

۳- الجزائر اور اس کے علاقے۔

۴- طرابلس۔

۵- ادفن جس میں مغربی ہنگری کے مفتوحہ علاقے شامل تھے۔

۶- تمیسوار بہ شمول بنات، ٹرانسلوانیا و مشرقی ہنگری۔

۷- اناطولیہ، عموماً اس سے تمام ایشیائے کوچک مراد لیتے ہیں لیکن یہاں اس سے ایشیائے کوچک کا صرف شمالی مغربی حصہ مراد ہے۔

۸- کرمانیہ، ۹- روم جیسے ولایت سیواس اور بعض اوقات حکومت اماسیا بھی کہتے ہیں۔

۱۰- سوالقدر، اس میں ملاٹیا، سموسٹا اور البوستان کے شہر اور ملحق علاقے اور کوہ طور کے مشرقی درے شامل تھے۔

۱۱- طرابزون۔

۱۲- دیار بکر، ۱۳- دان، ان دو ولایتوں میں آرمینیا اور کردستان کے بیش تر حصے شامل تھے۔

۱۴- حلب، ۱۵- دمشق، ان دونوں میں شام اور فلسطین کی ولایتیں شامل تھیں۔

۱۶- مصر۔

۱۷- مکہ، مدینہ اور حجاز کے علاقے۔

۱۸- یمن و عدن، یہ ولایت جنوبی عرب، خلیج فارس کے ساحلی علاقے اور شمالی مغربی ہند تک پھیلی ہوئی تھیں۔

۱۹- بغداد، ۲۰- موصل، ۲۱- بصرہ، یہ تینوں ولایتیں ان فتوحات پر مشتمل تھیں جو سلیم اور سلیمان نے مسوپوٹامیا اور اس سے ملحق جنوبی علاقوں میں ایرانیوں سے حاصل کی تھیں۔

ان ولایتوں کے علاوہ ولاچیا، مولڈیویا، رگوسا اور کریمیا کی مملکتیں بھی سلیمان کی باج گذار تھیں، ولاچیا اور مولڈیویا سے خراج زیادہ مقدار میں آتا تھا اور کریمیا عثمانی افواج کے لیے بہادر تاتاریوں کے دستے مہیا کرتا تھا۔

آبادی سلیمان اعظم کی وسیع سلطنت میں بیس مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے، ان میں سے عثمانی ترکوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ تھی، ان کا بیش تر حصہ ($\frac{4}{5}$) ایشیا اور خصوصاً ایشیائے کوچک میں آباد تھا، تیس لاکھ یونانی یورپین ترکی کے جنوبی حصہ میں آباد تھے اور دس لاکھ ایشیائے کوچک میں، آرمینی نسل کے لوگ جن کی تعداد بیس اور تیس لاکھ کے درمیان تھی، زیادہ تر ایشیا میں تھے، سب سے زیادہ تعداد سیلانی نسل کے باشندوں کی تھی، بلغاریا، سرویا، بوسینیا، مونٹی نیگرو اور ہرزیگووینیا میں کثرت تعداد ان ہی لوگوں کی تھی، مولڈیویا اور ولاچیا میں بھی ان کی تعداد زیادہ تھی اور ان میں سے کئی ہزار ٹرانسلوینیا اور البانیا میں بھی آباد تھے، ان کی مجموعی تعداد تخمیناً ۶۵ /لاکھ تھی، رومی نسل کے لوگ زیادہ تر ولیچیا اور مولڈیویا میں پائے جاتے تھے، ان کی تعداد چالیس لاکھ تھی، اہل البانیا جنہیں ترک ارناؤط (Skipetars) کہتے ہیں تقریباً پندرہ لاکھ تھے، تاتاریوں کی تعداد بھی تخمیناً پندرہ لاکھ تھی، عربی نسل کثرت سے شام، عرب، مصر اور شمالی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی اور سلیمان کے عہد میں اس کا شمار تقریباً ساٹھ لاکھ تھا، مارونی، کالڈی اور دروزی نسل کے لوگ بھی مجموعی طور پر دس لاکھ کے اندر تھے، کردوں کی تعداد بھی غالباً اسی قدر تھی، دیار بکر اور ملحق علاقوں کے ترکمانوں کا شمار

ایک لاکھ تھا، ان کے علاوہ ترکی، ہنگری کے مگیار اور ٹرانسلوینیا کے جرمن نسل والے الجیریا اور دوسرے افریقی صوبوں کے برابر مصر کے قبطی، یہود، سگانی (Tsigenes) مملوک اور وہ ہندوستانی جوتر کی گورنر عدن کے زیرِ حکومت تھے، یہ سب سلطان سلیمان اعظم کی عظیم الشان سلطنت میں آباد تھے، سلطنت کی مجموعی آبادی کا تخمینہ ساڑھے چار کروڑ سے پانچ کروڑ تک کیا جاتا ہے[1]۔

فوج سلیمان کی سلطنت کی وسعت کا ایک بڑا سبب اس کی فوجی قوت تھی، چھیالیس سال کی حکومت میں اس نے عثمانی فوجوں کی تعداد دو چند کر دی تھی، ینی چری کی تعداد اس نے بیس ہزار تک پہنچا دی، مستقل اور تنخواہ دار فوج کا شمار جس میں شاہی سوار اور دوسرے دستے شامل تھے، اڑتالیس ہزار تھا، سلیمان کی توجہ سب سے زیادہ ینی چری پر رہتی تھی کیوں کہ یہی فوج اکثر معرکوں میں فتوحات کی ضامن ہوتی، اس نے اس فوج کا ایک علاحدہ دستہ قائم کیا تھا، جس میں وہی سپاہی داخل کیے جاتے تھے، جو ایک طویل مدت کی خدمات کے بعد ضعیف ہو جاتے یا زخموں کے باعث کسی جنگ میں شریک ہونے کے قابل نہ رہ جاتے، سلیمان کی نظر میں ینی چری کی جو اہمیت اور قدر تھی اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اعزازی طور پر وہ خود اس فوج میں داخل ہو گیا تھا اور جس روز تنخواہ تقسیم کی جاتی تھی، ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے خود بھی تنخواہ لینے کے لیے حاضر ہوتا تھا، یہ طریقہ اس کے جانشینوں نے بھی جاری رکھا، جو فوجیں سلطنت کے جاگیردار جمع کرتے تھے یا جو بے ضابطہ طور پر جنگ کے موقعوں پر خود جمع ہوتی تھیں، ان کا شمار دو لاکھ سے زیادہ تھا، ان کے علاوہ تین سو توپیں اور تین سو جہاز تھے۔

سولہویں صدی کی ابتدا سے یورپ کی مسیحی سلطنتوں کی فوجوں میں بہت کچھ اصلاح و ترقی ہونے لگی تھی لیکن عثمانی فوجیں اپنی تنظیم اور ساز و سامان میں مسیحی فوجوں سے

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۳۴۰-۲۲۰۔

بہت آگے تھیں، توپ خانوں کی تعداد اور قوت کے علاوہ قلعہ بندی اور قلعہ سازی اور فوجی انجینیرنگ کی تمام شاخوں میں ترک یورپ کی سلطنتوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے تھے، کریسی لکھتا ہے کہ سلیمان اپنی فوجوں کے جسمانی آرام اور اخلاقی نگرانی پر جس قدر توجہ رکھتا تھا اس کو اس بے پروائی سے کوئی مناسبت نہ تھی جو اس کے حریفوں کے لشکر میں بدنصیب سپاہیوں کے ساتھ برتی جاتی تھی[1]۔

محاصل سلطنت محاصل سلطنت کے لحاظ سے سلیمان کو اپنے تمام ہمعصر فرماں رواؤں پر فوقیت حاصل تھی، اس کے عہد میں خالصہ کی آمدنی پچاس لاکھ دوکات تھی، عشر، جزیہ، محصول درآمد برآمد اور دوسرے مستقل محصولوں کی آمدنی ملا کر یہ رقم ستر اور اسّی لاکھ دوکات تک پہنچ جاتی تھی، رعایا پر محصول کا بار ہلکا تھا اور صرف دو موقعوں پر ایک بار جب وہ بلغراد اور روڈس کے محاصرہ کی تیاری کر رہا تھا اور دوسری مرتبہ جب اسے جنگ موہاکز کے لیے سامان فراہم کرنا تھا، سلیمان کو ایک زائد محصول لگانا پڑا، جس میں اس کی تمام رعایا بلا امتیاز مذہب وحیثیت شریک کی گئی لیکن دونوں مرتبہ محصول کی رقم قلیل تھی اور ان موقعوں کے علاوہ پھر کبھی کسی زائد محصول کی ضرورت پیش نہیں آئی، جنگوں کے اخراجات مال غنیمت سے پورے ہوتے رہتے تھے، ان اخراجات کے علاوہ ہر فتح سے کافی رقم سلطان کو بھی ملتی تھی، ہنگری، ٹرانسلوینیا، گوسا، مولڈیویا اور ولاچیا سے خراج آتا تھا، آمدنی کا ایک ذریعہ ان اعلیٰ حکام سلطنت کا ضبط کردہ سامان اور جائیدادیں بھی تھیں جو کسی جرم میں سلطان کے حکم سے قتل کر دیے جاتے تھے۔

نظام جاگیری سلیمان نے ترکی نظام جاگیری کی تنظیم خاص توجہ کے ساتھ کی اور ان بدعنوانیوں کو دور کیا جو اس نظام میں پھیلنا شروع ہوگئی تھیں، اس نے قانون بنا دیا کہ کوئی تیمار (چھوٹی جاگیر) ایک خاص حد سے نیچے قائم نہ رکھی جائے، متعدد چھوٹی جاگیروں کو ملا کر

---

[1] کریسی، ج ۱، ص ۳۲۴۔

ایک زعامت (بڑی جاگیر) بنا لینے کی اجازت تھی لیکن کوئی زعامت تقسیم کر کے تیمار نہیں بنائی جا سکتی تھی، علاوہ اس صورت کے کہ کسی زعامت کا جاگیردار جنگ میں قتل ہو گیا ہو اور اس نے ایک سے زیادہ لڑکے چھوڑے ہوں، سلطان کی اجازت سے متعدد اشخاص مل کر کسی جاگیر کو اپنی مشترکہ کاشت میں رکھ سکتے تھے لیکن جاگیر اس وقت بھی ایک جاگیر شمار کی جاتی تھی، جاگیر کی کوئی تقسیم جس کے لیے باب عالی سے خاص طور پر اجازت حاصل نہ کر لی گئی ہو سخت سزا کی مستوجب ہوتی، ان قوانین سے ان برائیوں کا انسداد ہو گیا جو جاگیروں کے ٹکڑے کر دینے سے مسیحی یورپ کے نظام جاگیری میں پھیلی ہوئی تھی جاگیردار کو وصیت نامہ یا کسی دوسرے ذریعہ سے جاگیر کے انتقال کا اختیار نہ تھا، اگر کوئی دوسرا جاگیردار اولادِ نرینہ چھوڑے بغیر مر جاتا تو اس کی جاگیر سلطان کے قبضہ میں چلی جاتی، سلیمان سے پہلے وزرا اور صوبے کے حاکموں کو اجازت تھی کہ وہ اس قسم کی جاگیریں دوسرے اشخاص کو دے دیں لیکن سلیمان نے اس اختیار کو صرف چھوٹی جاگیروں تک محدود کر دیا، سلطان کے علاوہ کوئی دوسرا کسی ایسی رعایت کو دینے کا اختیار نہ رکھتا تھا، جو سابق جاگیردار کی وفات پر سلطان کے قبضہ میں آ چکی ہو، اگر کوئی شخص کسی چھوٹی جاگیر (تیمار) کو سلطان کے علاوہ کسی اور سے بھی پاتا تب بھی اس کے جاگیری فرائض تمام تر سلطان ہی سے متعلق ہوتے اور جاگیر کے عطا کرنے والے کو اس شخص پر کسی قسم کا جاگیری حق حاصل نہ ہوتا، ”سپاہی“ اس نظام جاگیری میں صرف اپنے سلطان کا تابع تھا۔

سلیمان کے عہد میں بڑی جاگیروں (زعامت) کی تعداد ۳۱۹۲ر اور چھوٹی جاگیروں (تیمار) کی ۵۰۱۶۰ر تھی، سپاہی (یعنی فوجی جاگیردار) کا فرض صرف یہ نہ تھا وہ جنگ کے موقع پر فوجی خدمت کے لیے خود حاضر ہو بلکہ اگر اس کی جاگیر کی قیمت ایک متعین رقم سے زیادہ ہوتی تو اس زیادتی کی مناسبت سے ایک ایک سے زیادہ مسلح سواروں کو بھی اپنے ساتھ حاضر کرنا پڑتا، سلیمان کے عہد میں فوجی جاگیرداروں کی مجموعی تعداد ڈیڑھ لاکھ سوار تھی، یہ سوار

بیلر بے اور سنجق بے کی طلب پر متعین مقامات پر جمع ہو کر عثمانی فوجوں میں شامل ہو جاتے اور بغیر کسی تنخواہ کے جنگ میں شریک رہتے، مستقل تنخواہ دار فوج کا شمار اڑتالیس ہزار تھا،، ان کے علاوہ تاتاری سواروں کے متعدد دستے تھے جنہیں خان کریمیا ایک نائب حاکم کی حیثیت سے ہر جنگ کے موقع پر بھیجتا، نیز بے ضابطہ سواروں اور پیادوں کا انبوہ کثیر تھا، جو بطور خود آ کر ترکی لشکر میں شامل ہو جاتا اور جسے مال غنیمت کے سوا اور کچھ نہ ملتا[1]۔

''قانون رعایا'' سلیمان نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لیے جو قوانین وضع کیے تھے، وہ اس کی رواداری، روشن خیالی اور تدبر کی ایک نمایاں مثال ہیں، اس نے لگان اور دیگر خدمات کو جو رعایا پر جاگیردار کی طرف سے عائد ہوتی تھیں تصریح کے ساتھ ''قانون رعایا'' میں درج کرا دیا تاکہ جاگیردار اپنے حق سے زیادہ مطالبہ نہ کر سکے، ''قانون رعایا'' کی رو سے مزروعہ زمین کی ملکیت کاشت کار کو حاصل ہوتی تھی اور اس کے معاوضہ میں اسے لگان اور بعض محصول ادا کرنے ہوتے تھے اور اپنے جاگیردار کے لیے چند متعین خدمات انجام دینی ہوتی تھیں، سلطنت عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا اور مسیحی یورپ کے زرعی غلاموں (Serfs) کی حالتوں کے فرق کا اندازہ اس امر سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور و تعدی پر ترکوں کی نرم حکومت کو ترجیح دیتے تھے، کریسی سلیمان کے ایک ہم عصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے:

> ''میں گروہ در گروہ ہنگری دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنے بیوی بچوں، مویشی اور سامان کاشت کو لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے، جہاں وہ جانتے تھے کہ عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار عائد نہ کیا جائے گا۔''

عام قوانین قانون فوج داری، قانون پولیس اور دیگر عام قوانین پر بھی سلیمان نے خاص توجہ کی اور ان سب میں مناسب ترمیم و اصلاح کی، اس کے زیر نگرانی ملا ابراہیم حلبی

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۳۲۸-۳۲۶۔

نے جو مجموعہ قوانین تیار کیا تھا، اس میں سلطنت عثمانیہ کے متعلق تمام ضروری قوانین درج ہیں، پہلے بہت سے جرائم کے لیے نہایت سخت سزائیں مقرر تھیں مثلاً قتل کر دینا اور اعضا کا کاٹ ڈالنا، سلیمان نے ان سزاؤں کی سختی میں تخفیف کر دی، اس نے مختلف اشیا کی قیمتیں اور اجرت کی شرحیں بھی مقرر کر دیں، اتہام رکھنے والوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ اپنے شر کی تلافی کریں، جھوٹی شہادت دینے والوں، جعل بنانے والوں اور کھوٹے سکے چلانے والوں کی سزا یہ مقرر ہوئی کہ ان کا داہنا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے، گیارہ فیصدی سے زیادہ سود لینا خلاف قانون ٹھہرایا گیا، مسلسل تین وقتوں کی نماز یا ایک روزہ قضا کرنے والے کے لیے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی، بار برداری کے جانوروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے کی تاکید کی گئی[1]۔

تجارتی مراعات سلیمان کا عہد حکومت غیر ملکی تاجروں سے حسن سلوک کے لیے خاص طور پر ممتاز تھا، موجودہ جمہوریہ ترکی کے قیام تک سلطنت عثمانیہ میں وہ تجارتی معاہدے جاری تھے جو سلاطین نے غیر ملکی تاجروں کے ساتھ کر رکھے تھے اور جن کی رو سے حکومت عثمانیہ نہ صرف ان تاجروں کے جان و مال اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ذمہ دار ہو جاتی تھی بلکہ ان کے مقدمات کے لیے ان ہی کے ہم قوم افراد کی عدالتیں بھی قائم کر دیتی، ان تجارتی معاہدہ (Capitulations) میں سب سے پہلا معاہدہ سلیمان ہی نے ۱۵۳۵ء میں فرانس کے ساتھ کیا تھا، کریسی لکھتا ہے کہ غیر ملکی سامان تجارت پر ایک حد درجہ ہلکا محصول درآمد و برآمد لگایا گیا تھا، محصول تامین (Profictuir Duties) کا گراں بار اور تکلیف دہ رواج عثمانیوں میں بالکل مفقود رہا ہے[2]۔

علم کی سرپرستی علم کی اشاعت اور علما کی قدردانی سلاطین آل عثمان کا ایک مخصوص امتیاز تھا، سلیمان اس وصف میں بھی بہت نمایاں تھا، اس نے بہت سے مدرسے اور دارالعلوم

---

[1] کریسی، جلد ا، ص ۳۳۲-۳۳۱ [2] ایضاً ص ۳۳۳۔

بنوائے اور علما کی تعلیمی تنظیم اور ان کے منصب میں بہت سی اصلاحیں کیں، وہ علما کی قدر و منزلت میں اپنے تمام پیش رووں سے آگے بڑھ گیا اور ان کے لیے سلطنت کے قانون میں بعض ایسی مخصوص رعایتیں کر دیں جو کسی اور جماعت کے لیے نہیں کی گئیں، مثلاً اس نے علما کی پوری جماعت کو ہر طرح کے محصول سے بری کر دیا اور ان کی جائیداد کے لیے یہ قانون بنا دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی ضبط نہ کی جائے گی۔

سلیمان نے مکہ معظّمہ میں چاروں مذہب کے لیے چار مدرسے قائم کیے، ان کی بنیاد ۹۷۲ھ (۱۵۶۴ء) میں رکھی گئی، عمارت کی تکمیل سلیم خان ثانی کے عہد میں ہوئی، اس نے مدرسین اور طلبہ کے لیے شام کے اوقاف سے وظائف مقرر کیے۔

صدقات سلیمان نے صدقہ رومیہ کی مقدار جو اس کے آباو اجداد کے زمانہ سے حرمین شریفین کے لیے آتا تھا، بہت بڑھا دی اور اپنے خاص خزانہ سے بہت سی رقمیں اضافہ کیں، غلہ کا صدقہ سلیم اول کے وقت سے جاری ہوا تھا، سلیمان نے علاوہ مخصوص اوقاف کے انبار خاص سے بھی غلہ بھیجنا شروع کیا، اس نے مصر کے چند گاؤں بیت المال سے خرید کر ان کے غلہ کو اہل حرمین کے لیے وقف کر دیا، شروع میں مدینہ منورہ کے لیے ڈیڑھ ہزار اردب غلہ بھیجا جاتا تھا مگر کچھ دنوں کے بعد سلیمان نے دو ہزار اردب مدینہ منورہ کے لیے اور تین ہزار مکہ معظّمہ کے لیے مقرر کر دیا، اس کے علاوہ مصر میں اہل ذمہ سے جو رقم لی جاتی تھی، سلیمان نے اسے خزانہ اور عامرہ سے نکال کر حرمین شریفین اور مصر کے علما و مشائخ کو دینا شروع کی، خزانہ شاہی اور سلطان کے جیب خاص سے جو رقمیں ان صدقات کے لیے نکالی جاتی تھیں وہ علاحدہ تھیں[1]۔

تعمیرات کا ذوق سلیمان کو تعمیرات کا بھی خاص ذوق تھا، اس نے قسطنطنیہ، بغداد، قونیہ، دمشق اور دوسرے شہروں میں نہایت خوب صورت اور عالی شان عمارتیں بنوائیں،

[1] الاعلام علام بیت اللہ الحرام، ص ۳۲۶-۳۲۴۔

متعدد مسجدیں خود تعمیر کرائیں اور بہتیری مسجدوں کو از سر نو درست کرایا، ان کے علاوہ قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑی نہر بنوائی اور مکہ معظّمہ کی پرانی نہروں کی مرمت کرائی، سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اسپتال اور پل تعمیر کرائے۔

علمی اور شاعرانہ مذاق سلیمان علم و فضل کا نہایت قدر دان تھا اور خود بھی علمی اور شاعرانہ مذاق رکھتا تھا، اس کی تصانیف ترکی لٹریچر میں بلند پایہ خیال کی جاتی ہیں، یہی حیثیت اس کے شاعرانہ کلام کی بھی ہے، دوران جنگ میں وہ روزمرہ کے واقعات قلم بند کرتا جاتا تھا اور اس کے یہ روزنامچے اپنے اندر نہایت قیمتی تاریخی مواد رکھتے ہیں، ان روزنامچوں سے اس کے احساس فرض اور اس کی جفاکشی کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سلطنت کے تمام ملکی اور فوجی معاملات پر کس درجہ توجہ رکھتا تھا۔

عدل و انصاف سلیمان کی عظمت، اس کے بری اور بحری فتوحات اور توسیع سلطنت ہی میں نمایاں نہ تھی بلکہ سلطنت کے ہر شعبہ میں اس کی غیر معمولی شخصیت کا اثر پایا جاتا تھا، اس کے عدالت میں ہر طبقہ اور ہر جماعت کے لوگ برابر تھے اور سب کے ساتھ یکساں انصاف کیا جاتا تھا، صوبوں کے گورنر یا دوسرے اعلیٰ حکام جو بے انصافی یا ظلم کا ارتکاب کرتے، فوراً برطرف کر دیے جاتے اور اکثر انہیں اپنے جرائم کے پاداش میں قتل کی سزا ملتی، سلیمان کو عدل و انصاف کا اس قدر خیال تھا کہ تخت سلطنت پر آتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بعض حکام کو جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں بدعنوانیاں کرتے تھے، برخاست کر دیا، اس امر میں وہ کسی شخص کی رعایت نہ کرتا، خواہ وہ شخص اس سے کیسا ہی قریبی تعلق رکھتا ہو، چنانچہ فرہاد پاشا کو جو اس کا داماد تھا، سلیمان نے ظلم اور رشوت ستانی کے جرم میں ایک صوبہ کی حکومت سے معزول کر دیا، فرہاد پاشا کی بیوی اور سلیمان کی ماں نے بڑی التجاؤں کے بعد اس کو دوبارہ مقرر کرایا لیکن جب اس نے اپنی سابق بدعنوانیاں پھر شروع کر دیں تو سلیمان نے اسے دوبارہ معزول کیا اور اب کی بار اس کو قتل کرا دیا۔

خون کے چند دھبے | سلیمان کی خانگی زندگی بالکل بے داغ تھی، وہ اپنی طبعی شرافت اور رحم دلی کے لیے مشہور تھا لیکن خون کے چند بدنما دھبوں نے اس کے دامن کو بھی داغ دار بنا دیا، اس کا سب سے بڑا لڑکا مصطفیٰ ایک نہایت لائق اور ہونہار شہزادہ تھا، سلیمان نے اس کو ایک صوبہ کا حاکم بنا دیا تھا، جہاں اس کی غیر معمولی قابلیت کے جوہر نمایاں ہو چکے تھے، اس میں سلیمان کے تمام اعلیٰ اوصاف پائے جاتے تھے، وہ فوج کا محبوب اور اپنے ملک کا مایہ امید تھا لیکن یہی ہر دل عزیزی اس کی ہلاکت کا باعث ثابت ہوئی، سلطانہ خرم جو ایک روسی خاتون تھی، سلیمان کی سب سے زیادہ محبوب حرم تھی اور اس کے مزاج میں حد درجہ دخیل ہوگئی تھی، وہ اپنے لڑکے سلیم کے لیے تخت کو محفوظ کر لینا چاہتی تھی لیکن سلیم علاوہ اس کے کہ شہزادہ مصطفیٰ سے عمر میں چھوٹا تھا، نہایت نالائق اور عیش پسند بھی تھا اور مصطفیٰ کے مقابلہ میں اسے تخت پر بٹھانے کا خیال بھی کسی کو نہیں آ سکتا تھا، خرم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی، اس لیے اس نے سلیم کے لیے راستہ صاف کرنے کی کوشش کی اور مصطفیٰ کے خلاف سلیمان کے کان بھرنا شروع کیے، اس نے سلیمان کو یقین دلایا کہ مصطفیٰ اس کی حیات میں تخت پر قبضہ کرنے کی در پردہ کوشش کر رہا ہے اور چوں کہ تمام فوج اس پر جان دیتی ہے، اس لیے بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہو جائے، جس طرح سلطان سلیم اول نے سلطان بایزید ثانی کو معزول کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا تھا، سلیمان خرم کے بیانات سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے مصطفیٰ کو اپنی صفائی میں ایک حرف بھی کہنے کا موقع نہ دیا اور ۱۵۵۳ء میں جب ایران کی دوسری لڑائی کے لیے وہ لشکر کے ساتھ کوچ میں تھا، مصطفیٰ کو اپنے خیمہ میں طلب کر کے فوراً گلا گھونٹ کر مروا ڈالا، دوسرا لڑکا بایزید بھی خرم کے محبوب فرزند سلیم ہی کی خاطر قتل کیا گیا لیکن اس کے قتل کا سبب ایک حد تک معقول تھا، مصطفیٰ کے قتل کے بعد اس کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی جان بھی زیادہ دنوں تک سلامت نہ رہ سکے گی، اس کے بعض مشیروں نے سازش کر کے اسے قسمت آزمائی کے

لیے آمادہ کیا اور ۱۵۶۱ء میں اس نے سلیم کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا لیکن سلیم کے ساتھ سلیمان کی قوت بھی شامل تھی اور بایزید کو شکست کھا کر ایران میں پناہ لینی پڑی، شاہ طہماسپ نے نہایت احترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور بالتصریح وعدہ کیا کہ اسے اس کے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے گا لیکن سلیمان نے جنگ کی دھمکی دے کر اور چار لاکھ اشرفیوں کا وعدہ کر کے طہماسپ کو مجبور کیا کہ وہ بایزید اور اس کے چاروں بیٹوں کو سلیم کے سفیروں کے حوالے کر دے، اس سفیر نے بایزید اور اس کے سب بیٹوں کو فوراً قتل کرا دیا، بایزید کے قتل کے بعد اب تنہا سلیم ہی تخت کا وارث رہ گیا۔

ابراہیم پاشا خون کے جن چھینٹوں سے سلیمان کا دامن داغ دار نظر آتا ہے، ان میں سے ایک اس کے وزیر ابراہیم کا خون بھی ہے، ابراہیم نسلاً یونانی تھا، لڑکپن میں گرفتار ہو کر وہ فروخت ہو گیا تھا، مغنیسیا کی ایک مسلمان دولت مند بیوہ نے اسے خریدا اور اس کی ذہانت کا اندازہ کر کے اعلیٰ تعلیم دلوائی، ایک بار سلیمان اس صوبہ میں گیا اور وہاں اس کی نظر ابراہیم پر پڑی، ابراہیم فن موسیقی کا ماہر تھا، اس کے اس کمال کا اثر سلیمان پر خاص طور سے پڑا اور وہ اسے اپنے ساتھ قسطنطنیہ لیتا آیا، وہاں پہنچ کر وہ اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے روز بہ روز سلیمان کی نظر میں زیادہ محبوب ہوتا گیا، یہاں تک کہ سلیمان نے اپنی بہن کا عقد اس سے کر دیا اور ۱۵۲۳ء میں اسے سلطنت عثمانیہ کا وزیر اعظم مقرر کیا، سلیمان ابراہیم پر حد درجہ اعتماد رکھتا اور اس سے بے حد محبت کرتا، دونوں ساتھ ہی کھانا کھاتے، تمام امور سلطنت دونوں کے باہمی مشورہ سے طے پاتے، جن معرکوں میں سلیمان کسی معذوری کی وجہ سے خود شرکت نہ کر سکتا، ان میں ابراہیم کو سر عسکر بنا کر بھیجتا، تیرہ سال تک سلیمان کے اعتماد کی یہی کیفیت رہی لیکن پھر اس کے دل میں ابراہیم کی طرف سے شکوک پیدا ہونے لگے جو ابراہیم کی بے احتیاطی سے بڑھتے گئے، چوں کہ سلیمان نے اس کو سلطنت کے تمام اختیارات دے رکھے تھے، اس لیے ابراہیم اپنے کو سلطان کا ہم پلہ خیال کرنے لگا اور یہی خیال اس کے لیے مہلک ثابت ہوا، اس کی خود

اعتمادی یہاں تک ترقی کر گئی کہ آخر میں اس نے اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لقب بھی شامل کرلیا، یہ دیکھ کر سلیمان کے وہ شکوک جو خرم نے ابراہیم کے خلاف اس کے دل میں پیدا کر دیے تھے، یقین کی حد تک پہنچ گئے، خرم وزیر اعظم کے عہدہ پر اپنے داماد رستم پاشا کو مقرر کرانا چاہتی تھی، خرم کی تدبیر کارگر ہوگئی اور ۱۵۳۵ء میں ایک روز جب ابراہیم حسب دستور کھانا کھانے کے لیے محل شاہی میں داخل ہوا تو پھر اس میں سے زندہ نہیں نکلا اور دوسرے روز محل میں اس کی لاش پائی گئی، ابراہیم کی تمام جائیداد اور دولت ضبط کر لی گئی۔

زوال سلطنت کی ابتدا سلیمان نے اپنے طویل عہد حکومت میں سلطنت عثمانیہ کی عظمت کو حد کمال تک پہنچا دیا تھا، اس کے بعد ہی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا، گو چند سالوں تک زوال کے آثار نمایاں نہ ہوئے، ایک ترک مؤرخ قوچی بے نے ۱۶۲۳ء میں سلطنت عثمانیہ کے زوال پر ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ زوال کی بنیاد سلیمان کے عہد ہی میں پڑ چکی تھی، وہ زوال سلطنت کو حسب ذیل اسباب کا نتیجہ قرار دیتا ہے:

۱- پہلے دستور یہ تھا کہ دیوان کی ہر مجلس میں سلطان خود موجود رہتا تھا اور وزرائے سلطنت سے خود مشورے کرتا تھا، سلیمان نے اس دستور کو موقوف کر دیا، وہ بجائے دیوان میں بیٹھنے کے اس سے متصل ایک علاحدہ کمرے میں بیٹھنے لگا اور وہیں سے مجلس کی تمام کارروائیوں کو سنا کرتا تھا، اس کے جانشینوں نے دوسرے کمرے میں بیٹھنا بھی موقوف کر دیا، اس طرح سلاطین کی مطلق العنانی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا اور وزرا کے مشوروں کا اثر کم ہونے لگا، جب تک سلیمان جیسا مدبر اور عالی دماغ سلطان تخت پر تھا، اس تبدیلی کی خرابی ظاہر نہ ہوئی لیکن اس کے بعد اس کے مضر اثرات نمایاں ہونے لگے، وزرائے سلطنت کے بجائے خواتین حرم یا دوسرے غیر ذمہ دار اور خود غرض اشخاص امور سلطنت میں مشورے دینے لگے، سلطان کے فیصلے اکثر ان ہی مشوروں سے متاثر ہوتے تھے۔

۲- سلیمان نے ایک جدت یہ بھی کی کہ بعض ایسے اشخاص کو جنھوں نے بتدریج ضروری مدارج طے نہیں کیے تھے، محض اپنی مردم شماری کی بنا پر اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر دیا، اس کی سب سے پہلی اور سب سے نمایاں مثال ابراہیم کا واقعہ ہے، سلیمان ابراہیم کی لیاقت سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے چند سال کے اندر ہی اسے سلطنت عثمانیہ کی وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر مقرر کر دیا، ابراہیم کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ اسی طرح اونچی اونچی جگہوں پر مقرر کیے گئے، اس میں شبہ نہیں کہ سلیمان کو مردم شناسی کا خاص ملکہ حاصل تھا اور اس نے اپنے انتخاب میں شاید ہی کبھی غلطی کی لیکن اس کے جانشینوں نے جن کو یہ خداداد ملکہ حاصل نہ تھا، اس جدت پر عمل کر کے بیش تر ایسے اشخاص کا انتخاب کیا جو کسی طرح ان عہدوں کے اہل نہ تھے اور جن کا تقرر محض سلطان کے حسن ظن یا حرم کے اثر سے ہوا تھا۔

۳- زوال سلطنت کا تیسرا سبب رشوت ستانی تھی، جس کی بنیاد رستم پاشا نے ڈالی، یہ شخص سلیمان کا داماد تھا اور پندرہ سال تک وزیر اعظم رہا، وہ شاہی خزانہ کے لیے روپیہ حاصل کرنا خوب جانتا تھا، سلطنت کے انتظامی عہدوں پر جو لوگ مقرر کیے جاتے رستم پاشا ان کے تقرر کے موقع پر ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا، سلیمان کے عہد میں یہ رقمیں ہر عہدہ کی تنخواہ کی مناسبت سے ایک متعین مقدار میں مقرر تھیں لیکن یہ جدت صرف انتظامی عہدوں تک محدود تھی اور بحری اور فوجی ملازمتوں میں داخل نہیں کی گئی تھی، سلیمان کے بعد رقم کی متعین مقدار بھی اٹھا دی گئی اور انتظامی عہدوں کی قید بھی باقی نہ رہی، بڑی بڑی رقمیں وصول کی جانے لگیں اور فوجی اور بحری عہدوں پر وہی اشخاص مقرر کیے جانے لگے جو اپنے تقرر کے وقت کثیر رقمیں پیش کرتے، گویا تمام ملازمتیں نیلام ہونے لگیں، ان کثیر رقموں کی ادائیگی کے لیے صوبہ کے حاکم سے لے کر ادنیٰ عہدہ دار تک سب ہر طرح کے جا و بے جا طریقے استعمال کرتے تھے۔

۴- سلیمان کی عادت یہ تھی کہ جن وزرا سے خوش ہوتا ان پر بے انتہا انعام واکرام

کرتا اور خواہ وہ کسی قدر زر و مال جمع کر لیں ان سے تعرض نہ کرتا، چنانچہ ابراہیم جو تیرہ سال تک اور رستم پاشا جو پندرہ سال تک سلطنت کے وزیر اعظم رہے، ان دونوں نے بے انتہا دولت جمع کی، انہوں نے ایک ایسی شاہ خرچ اور شاہانہ زندگی کا نمونہ قائم کر دیا جس کی اتباع دوسرے وزرا اور اعلیٰ عہدہ دار بھی کرنے لگے، رستم پاشا نے اپنی وفات پر جو جائیداد چھوڑی اس کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے، اناطولیہ اور رومیلیا میں ۸۱۵/ مزروعہ زمینیں، ۴۷۶/ پن چکیاں، ۱۷۰۰/ غلام، ۲۹۰۰/ زرہ بکتر، ۸۰۰۰/ امامے، ۷۶۰/ تیغے، ۶۰۰/ جلدیں قرآن پاک کی، ۵۰۰۰/ دوسری کتابیں اور بیس لاکھ دوکات۔

ان اسباب کے علاوہ زوال سلطنت کا ایک اور قوی سبب بھی سلیمان کے عہد میں پیدا ہو چلا تھا یعنی امور سلطنت میں خواتین حرم کی مداخلت، یہ مداخلت سلیمان کے جانشینوں کے زمانہ حکومت میں روز بہ روز بڑھتی گئی، سلیمان کے عہد میں ابراہیم کا زوال و قتل، شہزادہ مصطفیٰ کا قتل اور شہزادہ بایزید کی بغاوت اور قتل، یہ سب حرم ہی کی سازشوں کا نتیجہ تھے۔

سلیم ثانی

۹۷۴ھ تا ۹۸۲ھ مطابق ۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء

سلیمان اعظم کے بعد عنان سلطنت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں آئی جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا، سلیمان نے سلطنت عثمانیہ کو ہر حیثیت سے پایہ کمال تک پہنچا دیا تھا، جس سلطنت کی بنیاد تیرہویں صدی عیسوی میں عثمان خان نے رکھی تھی، اس کا تکمیلی پتھر سولہویں صدی میں سلیمان کے ہاتھ سے رکھا گیا، تین سو برس کی مدت میں یہ سلطنت جو ابتداءً اناطولیہ کی چند جاگیروں پر مشتمل تھی، مکہ معظّمہ سے بودا تک اور بغداد سے الجزائر تک پھیل گئی لیکن سلیمان کی وفات کے بعد زوال شروع ہو گیا اور یہ عظیم الشان سلطنت اپنی قوت میں روز بہ روز گھٹتی گئی، اس زوال کے اسباب خارجی اور داخلی دونوں تھے، پندرہویں صدی سے یورپ کی مسیحی سلطنتوں میں نمایاں ترقی ظاہر ہونے لگی تھی، روس کی سلطنت جو پہلے اپنے دور وحشت کی منزلیں طے کر رہی تھی، سولہویں صدی سے مہذب اور طاقت ور سلطنتوں میں شمار کی جانے لگی، دولت عثمانیہ کی ہم سایہ سلطنت ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا تصادم ناگزیر تھا اور سولہویں صدی کے بعد یورپ کی جن حکومتوں نے سلطنت عثمانیہ پر حملے شروع کر دیے ان میں روس سب سے آگے تھا لیکن مسیحی سلطنتوں کا کوئی اتحاد سلطنت عثمانیہ کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا، اگر خود نظام سلطنت میں اندرونی طور پر فساد پیدا نہ ہو گیا ہوتا اور زوال کے اسباب خود سلطان اور امرائے دولت کے ہاتھوں فراہم نہ ہو گئے ہوتے، انحطاط کی بنیاد سلیمان ہی کے عہد میں پڑ

چکی تھی لیکن اس کی غیر معمولی اور عظیم الشان شخصیت نے ان خرابیوں کو ظاہر نہ ہونے دیا، جو اس کے جانشینوں کے عہد میں سرعت کے ساتھ بڑھتی گئیں، سلیمان کے بعد جتنے سلطان تخت نشین ہوئے ان میں سے بہ استثنائے چند کوئی بھی اتنی وسیع سلطنت کی جو تین براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس میں تقریباً دو درجن مختلف نسلیں اور قومیں آباد تھیں، فرماں روائی کا اہل نہ تھا، نااہلوں کی اس طویل فہرست میں سب سے پہلا نام سلیم ثانی کا نظر آتا ہے، جس نے اپنے مختصر دور حکومت کو بادہ پرستی اور عیش کوشی کی نظر کر دیا اور امور سلطنت سے منھ موڑ کر اپنا تمام وقت عیش و عشرت میں ضائع کر دیا، یہ پہلا عثمانی تاج دار تھا جو میدان جنگ میں جانے سے گریز کرتا تھا اور جس میں انتظام سلطنت کی مطلق اہلیت نہ تھی۔

لیکن سلیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی سلطنت کا زوال نمایاں نہیں ہونے لگا، جو سلطنت تین سو برس کی تدریجی ترقی کے بعد سلیمان اعظم کے زمانہ میں اپنے کمال عروج تک پہنچی تھی، اس میں دفعۃً انحطاط کا نمودار ہو جانا ممکن نہ تھا، سلیمان کی وفات کے بعد بھی تمام ملکی اور فوجی انتظامات چند سالوں تک استحکام کے ساتھ بدستور قائم رہے اور متعدد وزرا و عہدہ داران سلطنت جو سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ تھے، بدستور سلطنت کی خدمت کرتے رہے، جب تک یہ وزرا اور ملکی و فوجی حکام زندہ رہے، سلطنت کا زوال ظاہر نہ ہو سکا، بلکہ تقریباً بارہ سال تک حدود سلطنت میں اضافہ ہی ہوتا گیا، عہد آخر کے ان وزرا میں محمد صوقوللی ہی سلطنت کا حقیقی فرماں روا تھا۔

محمد صوقوللی کی دو اہم تجویزیں

محمد صوقوللی کے پیش نظر دو اہم تجویزیں تھیں، وہ خاکنائے سوئز میں ایک نہر کھود کر بحر احمر اور بحر ہند کو ملا دینا چاہتا تھا، تاکہ ترکی بیڑا ان دونوں سمندروں میں آسانی کے ساتھ داخل ہو سکے، دوسری تجویز دریائے ڈان اور دریائے والگا کو ایک نہر کے ذریعہ سے ملا دینے کی تھی، یہ دونوں دریا روس سے نکل کر دور تک متوازی خطوط میں بہتے آتے ہیں اور ایک مقام پر ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہو جاتے ہیں

کہ درمیانی فاصلہ صرف تیس میل رہ جاتا ہے، وہاں پہنچ کر پھر وہ علاحدہ ہو جاتے ہیں اور ایک بحر ازف میں جا کر شامل ہو جاتا ہے اور دوسرا بحر کاسپین میں، ان دریاؤں کو ایک نہر کے ذریعہ سے اس مقام پر ملا دینے سے جہاں درمیانی فاصلہ صرف تیس میل رہ جاتا ہے، ترکی جہازوں کے لیے دریائے ڈان اور دریائے والگا سے گزر کر بحر کاسپین میں پہنچ جانا اور وہاں سے صوبہ تبریز پر حملہ آور ہونا جو سلطنت ایران کا مقبوضہ تھا، بہت آسان ہو جاتا، علاوہ بریں اس تجویز کی کامیابی سے تجارتی فائدے بھی بہت کچھ حاصل ہو سکتے تھے لیکن اس مقصد کا پورا ہونا اسی وقت ممکن تھا جب استراخان پر قبضہ کر لیا جاتا، یہ شہر مملکت روس کے قبضہ میں تھا جس کی وسعت وقوت چند سالوں سے برابر ترقی کر رہی تھی۔

۹۷۶ھ (۱۵۶۸ء) میں صوقوللی نے پچیس ہزار ینی چری اور سپاہیوں کو ازف روانہ کیا، وہاں کریمیا کے تیس ہزار تاتاری بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور یہ متحدہ فوج استراخان پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھی، جو دریائے والگا کے دہانہ پر واقع تھا، یہاں پہلی بار روسیوں اور ترکوں کا مقابلہ ہوا، ترکی فوج استراخان پر قبضہ نہ کر سکی اور تاتاریوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی، عثمانی فوجیں مجبوراً ازف کی طرف واپس ہوئیں لیکن قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے ان کا بیش تر حصہ بحر اسود میں ایک طوفان سے ضائع ہو گیا اور صرف سات ہزار سپاہی بہ خیریت واپس پہنچ سکے، اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈان اور والگا کو ملا دینے کی تجویز منسوخ کر دی گئی، روس میں ابھی اتنی قوت نہ تھی کہ وہ خود سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہوتا، زار آئیوان (Czar Ivan) نے ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں اپنا ایک سفیر باب عالی میں بھیجا اور استراخان کے حملہ کی شکایت کی، نیز دونوں سلطنتوں کے درمیان امن واتحاد قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ ایک صلح نامہ مرتب کیا گیا اور تقریباً ایک صدی تک روس اور سلطنت عثمانیہ میں پھر کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

خاکنائے سوئز کی تجویز بھی ایک نامعلوم مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی، کیوں کہ

یمن میں بغاوت چھڑ گئی تھی اور سنان پاشا کی سرکردگی میں ایک فوج وہاں روانہ کرنی پڑی، سنان پاشا اس بغاوت کے فرو کرنے میں کامیاب ہوا اور یمن اور عرب کے دوسرے حصے مستقل طور پر سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیے گئے۔

تونس یمن کی دوبارہ فتح کے بعد صوقوللی نے تونس کو اسپینیوں کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں اولوج پاشا کو الجزائر کا حاکم بنا کر اس کی سرکردگی میں ایک ترکی بیڑا روانہ کیا، اولوج پاشا نے اسپینیوں کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا لیکن اسپینی فوج قلعہ میں محصور ہو گئی اور ۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) تک اس پر قابض رہی۔

قبرص کی فتح ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں سلیم نے قبرص پر حملہ کرنے کا قصد کیا، یہ جزیرہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، جو سلطنت عثمانیہ کی حلیف تھی، صوقوللی نے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن قرہ مصطفیٰ پاشا کے اصرار اور خود سلیم کی خواہش نے اس کی مخالفت کو بے اثر رکھا اور ایک حلیف کے مقبوضہ پر حملہ کرنے کے لیے مفتی اعظم نے علت جواز پیش کی کہ قبرص اس سے قبل ایک اسلامی حکومت (مصر) کے زیر نگیں رہ چکا تھا، چنانچہ ۱۵۷۰ء میں مصطفیٰ پاشا نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ قبرص پر چڑھائی کی، سات ہفتہ کے محاصرہ کے بعد اس کا پایہ تخت نائکوسیا (Nicosia) فتح ہو گیا، پھر مصطفیٰ پاشا نے اس جزیرہ کے سب سے مضبوط قلعہ فاماگوستا (Famagosta) کا بھی محاصرہ کیا اور ایک طویل مدت کے بعد اگست ۱۵۷۱ء میں محصورین نے ہتھیار ڈال دیے، قلعہ کی سپردگی کے وقت مصطفیٰ پاشا نے قبرص کے سپہ سالار براگاڈینو (Bragadino) کے سامنے نہایت نرم شرائط پیش کیے، اس نے عیسائی فوج اور وہاں کے عیسائی باشندوں کی جان و مال اور مذہب کی حفاظت کا ذمہ لیا اور وعدہ کیا کہ یہ فوج ترکی جہازوں پر جزیرہ کریٹ پہنچا دی جائے گی اور وہاں آزاد کر دی جائے گی لیکن عین اس وقت کہ یہ جہاز روانگی کی تیاری کر رہے تھے، مصطفیٰ پاشا اور براگاڈینو میں بعض گذشتہ واقعات کے متعلق تکرار ہو گئی اور یہ بات یہاں تک بڑھی کہ مصطفیٰ پاشا نے غصہ میں آ کر

تمام عیسائی فوج کے قتل کا حکم دے دیا اور اس کے ایک ہفتہ کے بعد براگاڈینو کی زندہ کھال نکلوالی، فارما گوستا پر قبضہ پا جانے کے بعد ترکوں نے پورے جزیرہ کو فتح کر لیا لیکن اس فتح میں ان کے تقریباً پچاس ہزار آدمی کام آئے، تین سو برس تک قبرص سلطنت عثمانیہ کے زیر تسلط رہا، ۱۸۷۸ء میں باب عالی نے اسے گورنمنٹ برطانیہ کے حوالہ کر دیا۔

مسیحی اتحاد قبرص کے حملہ سے یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں نہایت تشویش پیدا ہوئی اور یورپ نے ترکوں کی بحری طاقت کا سد باب کرنے کے لیے بحر روم کی عیسائی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کیا، جس کے خاص ارکان اسپین، وینس اور مبارزین مالٹا تھے اور اس متحدہ بحری بیڑے کا سالار اعظم ڈان جان (Don John) کو مقرر کیا جو شہنشاہ چارلس پنجم کا ناجائز لڑکا اور باوجود اپنی نوعمری کے اس عہد کا نہایت ممتاز کمانڈر تھا، اتحادی بیڑا ستمبر ۱۵۷۱ء کو مسینا (Messina) میں جمع ہوا لیکن قبرص اس وقت تک فتح ہو چکا تھا، ترکی بیڑا جو اپنے جہازوں کی کثرت تعداد میں عیسائی بیڑے سے بڑھا ہوا تھا، خلیج لیپانٹو (Lepanto) میں لنگر انداز ہوا، امیر البحر علی پاشا ایک نوعمر سردار تھا، اس کو بحری جنگ کا زیادہ تجربہ نہ تھا، اولوج پاشا جس کی عمر کے ۴۳ سال بحری جنگوں میں صرف ہو چکے تھے، اس بیڑے کا نائب امیر تھا، اس نے اتحادیوں پر فوراً حملہ کرنے سے اس بنا پر اختلاف کیا کہ تیاری جیسی چاہیے ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی لیکن علی پاشا کو بلا توقف حملہ کر دینے پر اصرار تھا، اولوج پاشا کو خاموش ہو جانا پڑا۔

جنگ لیپانٹو ۷/ اکتوبر ۱۵۷۱ء کو خلیج لیپانٹو کے دہانہ کے قریب دونوں بیڑوں کا مقابلہ ہوا، جنگ صرف چند گھنٹوں تک قائم رہی، مگر فریقین کو شدید نقصانات برداشت کرنے پڑے، دونوں بیڑے ایک دوسرے سے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ تلوار کی لڑائی ہونے لگی جس میں امیر البحر علی پاشا مارا گیا، عیسائیوں نے اس کا سر کاٹ کر جہاز کے مستول پر لٹکا دیا، یہ دیکھ کر ترکوں کے قدم اکھڑ گئے اور اولوج پاشا کی کوشش کے باوجود انہیں بری طرح شکست ہوئی، اولوج پاشا بہ مشکل چالیس جہازوں کو لے کر سلامتی کے ساتھ وہاں سے نکل

سکا، باقی پورا ترکی بیڑا جس کے جہازوں کی تعداد ۲۶۶ تھی، عیسائیوں کے قبضہ میں آ گیا، ان میں سے کچھ غرق بھی کر دیے گئے، اس جنگ میں تیس ہزار ترک کام آئے اور پندرہ ہزار عیسائی غلام آزاد ہوئے۔

خیال تھا کہ اتحادی اپنی عظیم الشان کامیابی سے فائدہ اٹھا کر آگے قدم بڑھائیں گے لیکن اس فتح سے وہ کچھ ایسا مطمئن ہوئے کہ فوراً اپنے اپنے ملک کو روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر خوشیاں منانے لگے۔

برخلاف اس کے ترکوں نے فوراً اس نقصان کی تلافی شروع کر دی، سلیم نے بھی جو عموماً عیش و عشرت میں سرشار رہتا تھا، اپنی جیب خاص سے ایک کثیر رقم عطا کی اور اپنے محل کے باغ کا ایک حصہ نئے جہازوں کی تعمیر کے لیے دے دیا، چنانچہ ۱۶۸ر جہازوں کی تعمیر فوراً شروع کر دی گئی اور چند مہینوں میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ یہ نیا بیڑا تیار ہو گیا، ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں اتحادی بیڑا پھر بحر روم کے مشرقی حصہ میں جمع ہوا، اولوج پاشا اپنے نئے بیڑے کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لیے نکلا لیکن چوں کہ اس کے جہاز رانوں کو ہنوز کافی تجربہ نہ تھا، اس لیے اس نے خود حملہ کرنا مناسب نہیں خیال کیا اور اتحادیوں کی پیش قدمی کا انتظار کرتا رہا، اتحادی ترکوں کی اس خلاف توقع تیاری سے بظاہر اس قدر مرعوب ہوئے کہ ان کی طرف سے بھی کوئی حملہ نہ ہوا اور اولوج پاشا اپنے پورے بیڑے کے ساتھ واپس آ گیا۔

وینس سے صلح ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں وینس نے باب عالی سے صلح کی گفتگو شروع کی اور حسب ذیل معاہدہ مرتب ہوا، وینس نے نہ صرف قبرص کی فتح اور اس پر سلطنت عثمانیہ کا قبضہ تسلیم کر لیا بلکہ اس کے حاصل کرنے میں جو اخراجات دولت علیہ کو برداشت کرنے پڑے تھے اور جن کا تخمینہ تین لاکھ ڈوکات تھا، ان کی ادائیگی بھی منظور کی، جزیرہ زانطہ کے لیے جمہوریہ وینس اب تک پانچ سو ڈوکات خراج ادا کرتی تھی، اس معاہدہ کی رو سے خراج کی مقدار ڈیڑھ ہزار ڈوکات مقرر ہوگئی، البتہ قبرص کا خراج جو آٹھ ہزار ڈوکات سالانہ آیا

کرتا تھا وہ اب موقوف کر دیا گیا، ڈلماشیا اور البانیا میں فریقین کے جو مقبوضات جنگ لیپانٹو سے قبل تھے وہی برقرار رکھے گئے۔

تونس کا الحاق وینس اور سلطنت عثمانیہ کی صلح کے بعد ڈان جان ایک اسپینی بیڑے کے ساتھ تونس پر حملہ آور ہوا اور چوں کہ قلعہ پر اسپین کا قبضہ جاری تھا، اس لیے آسانی کے ساتھ شہر کو فتح کر لیا، اس نے تونس میں ایک جدید قلعہ تعمیر کرایا اور اسپینی سپاہیوں کا ایک طاقت ور دستہ وہاں چھوڑ کر خود واپس چلا گیا، اس واقعہ کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو صدر اعظم صوقو للی نے اولوج پاشا کو ایک زبردست بیڑے کے ساتھ روانہ کیا، اولوج پاشا نے اسپینیوں کا قلع قمع کر کے شہر، قلعہ اور تونس کے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا اور اسے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر دیا۔

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) میں سلیم کا انتقال ہو گیا۔

مراد ثالث

۹۸۲ھ تا ۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۷۴ء تا ۱۵۹۵ء

سلیم کے انتقال کی خبر سن کر اس کا بڑا لڑکا مراد جو حکومت مغنیسیا پر مامور تھا، ۲۱ر دسمبر ۱۵۷۴ء کو قسطنطنیہ پہنچا اور ۲۸ رسال کی عمر میں تخت نشین ہوا، محمد فاتح کے قائم کردہ دستور کے مطابق اس نے زمام سلطنت کو ہاتھ میں لیتے ہی اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کرادیا اور اس کے بعد سب سے پہلا فرمان شراب کی ممانعت میں صادر کیا، جس کا رواج سابق سلطان کے عہد میں بہت زیادہ ہو گیا تھا۔

امورِ مملکت میں حرم کا دخل مراد ثالث کے عہد کے ابتدائی چار برس صوقوللی پاشا کی صدارت کے تھے، پھر بھی سلطان پر حرم کا اثر روز بہ روز زیادہ ہوتا جارہا تھا، حرم کی چار خاتونوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ اس پر بہت زیادہ تھا اور امورِ سلطنت کا انصرام حقیقۃً ان ہی خواتین کی منشا کے مطابق ہوتا تھا، ان میں سے ایک سلطانہ والدہ نور بانو تھی، دوسری مراد کی محبوب سلطانہ صفیہ تھی، جو وینس کے مشہور اور سر برآوردہ خاندان بفو (Baffo) کی رئیس زادی تھی اور اپنے حسن صورت اور ذکاوت طبع کے باعث مراد پر حد درجہ حاوی تھی، صفیہ کی سلطنت کی جنگ و صلح میں خاص دخل تھا، چنانچہ باوجود اس کے کہ وینس نے ایک سے زائد بار سلطان کو برانگیختہ کیا، محض صفیہ کی کوششوں سے جنگ کی نوبت نہ آئی، تیسری ایک ہنگروی خاتون تھی، جس نے کچھ دنوں کے لیے صفیہ کی محبوبیت کو زائل کر دیا تھا اور مراد کی توجہ کا مرکز

بنی رہی، چوتھی خاتون جان فدا حرم سلطانی کی خاص مہتمم تھی اور وہ بھی اپنی لیاقت اور سلیقہ شعاری کی وجہ سے مراد کے مزاج میں بہت کچھ دخیل تھی، یہی چار خواتین سلطان کی خاص مشیر کار اور انتظام حکومت کی حقیقی نگراں تھیں۔

جنگ ایران تاہم سلیمان اعظم کے تربیت یافتہ فوجی اور بحری افسروں میں سے اب بھی کچھ باقی رہ گئے تھے اور مراد ثالث کے عہد میں جو لڑائیاں پیش آئیں ان میں عثمانی فوجوں کو اہم اور نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں اور دولت علیہ کے مقبوضات میں قیمتی اضافے ہوئے، اس عہد کی سب سے بڑی جنگ ایران کی جنگ تھی، جس کا سلسلہ ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) سے ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) تک قائم رہا، ۱۵۷۶ء میں شاہ طہماسپ کا انتقال ہو گیا اور اس کی وفات پر تخت سلطنت کے لیے ایران میں جو اندرونی خلفشار برپا ہوا اس سے دولت عثمانیہ نے فائدہ اٹھانا چاہا اور لالہ مصطفیٰ پاشا عثمانی فوجوں کے ساتھ جارجیا پر حملہ آور ہوا جو ایران کی حلیف مملکت تھی اور اس کے پایہ تخت تفلس کو فتح کر کے پورے جارجیا پر قبضہ کر لیا، جارجیا کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ پر ایک ترکی افسر مقرر کر دیا گیا، عثمان پاشا شروان کا حاکم تھا، چار ایرانی فوجوں نے بیک وقت جارجیا پر حملہ کیا اور اسے ترکوں کے قبضہ سے چھڑا لینا چاہا، عثمان پاشا نے شہزادہ حمزہ کی فوج کو شکست دی لیکن جب سلطنت ایران کی سب سے بڑی فوج نے حملہ کیا تو اسے شروان چھوڑ کر پسپا ہونا پڑا اور وہ دربند چلا گیا، سائمن لورسب (Simon Luarseb) سابق امیر جارجیا نے اپنے قدیم پایہ تخت تفلس کا محاصرہ کر لیا مگر ترک محصورین نے نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، یہاں تک کہ حسن پاشا جو محمد صوقوللی پاشا کا لڑکا کمک لے کر پہنچ گیا اور سائمن کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا، اس کے بعد ۱۵۸۳ء میں عثمان پاشا نے داغستان پر حملہ کیا اور اس پر پوری طرح قبضہ کر کے اس نے عین موسم سرما میں کوہ قاف کو عبور کیا اور کافہ پہنچ گیا، وہ محمد کرائی خان کریمیا کو تخت سے معزول کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ خان نے عثمانی افواج کو مدد دینے سے انکار کر دیا تھا، محمد کرائی

نے یہ اطلاع پا کر علم بغاوت بلند کیا اور چالیس ہزار سواروں کو لے کر کافہ میں عثمان پاشا کا محاصرہ کر لیا، سلطان نے محمد کرائی کے بھائی اسلام کرائی کو کریمیا کے تخت پر بٹھا دینے کا وعدہ کیا اور اس کے معاوضہ میں فوجی مدد چاہی، چنانچہ اسلام کرائی اپنے بھائی خان کریمیا کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور محمد کرائی ۱۵۸۴ء میں قتل کر دیا گیا، عثمان پاشا اس باغی کا سر لے کر قسطنطنیہ پہنچا جہاں اس کا نہایت شان دار استقبال ہوا اور سلطان نے اپنی خاص تلوار اور اپنے عمامہ کے بیش بہا جواہرات اسے عطا کیے، اس کے بعد عثمان پاشا ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ تبریز کی طرف بڑھا، شہزادہ حمزہ مرزا نے عثمانی مقدمۃ الجیش کو شکست دی لیکن ایرانی ترکوں کی کثرت تعداد کا مقابلہ نہ کر سکے اور بالآخر شکست کھا کر انہیں تبریز خالی کر دینا پڑا، عثمان پاشا صحت کی خرابی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اس کے بعد چھ سال تک مسلسل ایرانی اور عثمانی فوجوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں، اسی درمیان میں عثمان پاشا کا انتقال ہو گیا، ۱۵۹۰ء میں دولت عثمانیہ اور سلطنت ایران کے درمیان صلح ہو گئی، جس کے رو سے جارجیا، شروان، اورستان، شہر تبریز اور آذربیجان کا ایک حصہ مراد ثالث کی سلطنت میں شامل ہو گیا، صلح نامہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ آئندہ اہل ایران خلفائے ثلاثہ کے خلاف تبرا کرنے سے باز رہیں گے۔

یورپین حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات | مراد کے عہد حکومت میں دولت علیہ اور یورپ کی سلطنتوں کے درمیان صلح کے تعلقات عموماً قائم رہے، علاوہ متفرق چھیڑ چھاڑ کے جو ہنگری کی سرحد پر ترکی پاشاؤں اور عیسائی قلعہ داروں میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی، دوسری یورپین حکومتوں سے سلطنت عثمانیہ کے تعلقات دوستانہ رہے، البتہ مراد کی وفات سے دو سال قبل آسٹریا سے جنگ کی نوبت آ گئی، مراد کے عہد میں خصوصاً صدر اعظم صوقوللی پاشا کے مشورہ سے مغربی یورپ کی بیشتر حکومتوں سے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم ہوئے، انگلستان نے جو اب تک سلطنت عثمانیہ کے لیے ایک ناآشنا حکومت تھی، اول

اول ۱۵۷۹ء میں اپنے تین تاجروں ولیم ہیر بون (William Harebone) ایڈورڈ ایلس (Edward Ellis) اور رچرڈ اسٹیپل (Richard Stapel) کو قسطنطنیہ بھیجا، انہوں نے باب عالی سے انگلستان کے لیے وہی تجارتی مراعات حاصل کیے جو یورپ کی دوسری قوموں کو حاصل تھے، ۱۵۸۳ء میں ملکہ الزبیتھ نے ولیم ہیر بون کو اپنا سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا اور سلطان سے یہ درخواست کی کہ وہ انگلستان سے متحد ہو کر اسپین کے عیسائی فرماں روا فلپ ثانی پر حملہ آور ہو جو سلطنت عثمانیہ اور حکومت انگلستان دونوں کا یکساں دشمن تھا۔

محمد صوقوللی کا قتل اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مراد کے عہد حکومت کے ابتدائی چار سالوں میں عنان سلطنت صدر اعظم محمد صوقوللی پاشا کے ہاتھوں میں تھی لیکن مراد کے بعض دوسرے درباریوں مثلاً شمسی پاشا، اویس، خواجہ سعد الدین مؤرخ اور خواجہ سرا غضنفر آغا کا اثر شروع ہی سے بڑھتا گیا، یہ سب محمد صوقوللی کے مخالف تھے، بدقسمتی سے مراد پر حرم کا اثر بھی بہت زیادہ تھا، چنانچہ شمسی پاشا وغیرہ اور حرم کی سازش سے صدر اعظم کا اقتدار روز بہ روز کم ہوتا گیا، پہلے اس کے معتمد عہدہ داروں کو پایہ تخت سے علاحدہ کیا گیا اور پھر سازش کی تکمیل کے بعد خود محمد پاشا کو ۱۱ اکتوبر ۱۵۷۸ء کو قتل کر دیا گیا۔

سلطنت کا انتہائی عروج لارڈ ایورسلے کی رائے ہے کہ سلطنت عثمانیہ اپنے کمال عروج کو سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے آخری سال میں نہیں بلکہ صدر اعظم محمد پاشا صوقوللی کے عہد وزارت کے آخری سال میں پہنچی کیوں کہ سلیمان کے بعد بھی اس بارہ سال کی مدت میں جب صوقوللی عملاً سلطنت کا فرماں روا تھا، دولت علیہ نے اہم فتوحات حاصل کیں، جن میں جزیرہ قبرص، صوبہ تونس، مملکت جارجیا اور سلطنت ایران کے زرخیر صوبے اور یمن شامل تھے، یہی فتوحات سلطنت عثمانیہ کی آخری فتوحات تھیں، ان کے بعد صرف کریٹ ۱۰۸۹ھ (۱۶۶۸ء) میں فتح ہوا، ورنہ اور ہر طرف زوال کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے اور عثمانی مقبوضات پر رفتہ رفتہ ہمسایہ حکومتوں کا حملہ اور قبضہ ہونے لگا۔

صوقوللی پاشا کے قتل کے وقت سلطنت عثمانیہ شمال میں وسط ہنگری سے لے کر جنوب میں خلیج فارس اور سوڈان تک اور پھر مشرق میں بحر کاسپین اور سرحد ایران سے لے کر مغرب میں افریقہ کے صوبہ ادرن تک پھیلی ہوئی تھی، اس میں مراکش کے سوا بحر روم کا تقریباً تمام جنوبی ساحل اور بحر اسود اور بحر احمر کے تمام ساحل شامل تھے، بحر ایجین کے تمام جزیرے علاوہ کریٹ کے ان کے زیر نگیں تھے، ان ممالک میں بیس مختلف نسل کے لوگ آباد تھے، جن کی تعداد کا تخمینہ تین کروڑ سے زیادہ ہے[1]۔

سلطنت کا زوال صوقوللی کے قتل کے بعد ہی سلطنت میں بدنظمی کا دور شروع ہوگیا، یکے بعد دیگرے دس وزرا صدر اعظم کے عہدہ پر مقرر کیے گئے، سنان پاشا تین بار اس عہدہ پر مامور ہوا، عثمان پاشا داغستان سے واپس ہونے پر ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں صدر اعظم مقرر ہوا لیکن آٹھ ہی مہینے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا، صدر اعظم کی ان تبدیلیوں میں حرم کو بہت کچھ دخل تھا اور وہی وزرا اس عہدہ کا حوصلہ کرسکتے تھے جنہیں حرم کی سرپرستی حاصل تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہوگیا اور صرف وہ امیدوار مقرر کیے جانے لگے جو بڑی بڑی رقمیں پیش کرتے تھے، رشوت ستانی کی اس مہلک وبا سے حکومت کا کوئی شعبہ محفوظ نہ رہ سکا، یہاں تک کہ فوجی، عدالتی اور انتظامی عہدوں میں بھی امیدوار کی ذاتی قابلیت کے بجائے اس کی پیش کردہ رقم کی سفارش قبول کی جانے لگی، خود سلطان کو بھی اپنے ذاتی مصارف کے لیے روپیہ کی زیادہ ضرورت رہا کرتی تھی اور آخر میں اس نے بھی ایسی رقموں میں اپنا حصہ لگانا شروع کیا، یہیں سے سلطنت میں وہ اندرونی اختلال نمایاں ہونے لگا جس نے اس کی بنیادوں کو بالکل ہلا دیا۔

فوج کی بغاوت اور عام بدنظمی ان خرابی کے اثرات فوج میں بھی ظاہر ہونے شروع ہوئے، جس کا سبب صرف یہی نہ تھا کہ نااہل اشخاص بڑے بڑے فوجی عہدوں پر مقرر کیے

[1] ترکی سلطنت، لارڈ ایورسلے، ص ۱۴۶۔

جانے لگے بلکہ فوج کے نظام جاگیری میں بھی سخت بے عنوانیاں ہونے لگیں اور جو جاگیریں محض فوجی خدمات کے معاوضہ میں دی جاتی تھیں ان کی خرید وفروخت شروع ہوگئی، ان حالات کے ساتھ ساتھ فوج بھی بے قابو ہونے لگی اور آخر کار ۱۵۸۹ء میں ینی چری نے علانیہ علم بغاوت بلند کر دیا اور قصر سلطانی کے سامنے جمع ہو کر محمد پاشا، بیلر بے، رومیلیا کے سر کا مطالبہ کیا، ان کو محمد پاشا سے یہ شکایت تھی کہ اس کی تحریک سے فوج کی تنخواہ میں ایسے سکے تقسیم کیے گئے تھے جن میں چاندی بہت کم تھی، مراد کو ان کی دھمکی سے دبنا پڑا اور اس نے حکم دے دیا کہ محمد پاشا کا سر کاٹ کر ینی چری کے حوالہ کر دیا جائے، مراد کے اس طرح دب جانے سے ینی چری کو اپنی قوت کا اندازہ ہو گیا اور چار ہی سال کے اندر انہوں نے دو بار اور بغاوت کی اور سلطان کو مجبور کیا کہ وہ موجودہ صدر اعظم کو معزول کر کے دوسرا صدر اعظم مقرر کر دے، ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں انہوں نے پھر مراد کو مجبور کر کے مولڈیویا کی باج گزار مملکت کے تخت پر اس امیدوار کو بٹھایا جس نے رشوت کے ذریعہ سے ان کی حمایت حاصل کر لی تھی، خود قسطنطنیہ میں ینی چری اور سپاہی فوجوں میں باہمی جنگ ہوگئی، صوبوں کی حالت مرکزی حکومت کی بدنظمی کی وجہ سے حد درجہ خراب تھی، رشوت کا بازار اپنے لازمی نتائج کے ساتھ وہاں بھی گرم تھا اور جو حکام رشوت کے ذریعہ سے مقرر ہوئے تھے وہ اپنی رقم کی تلافی اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے رعایا پر مظالم کر رہے تھے، ۱۵۸۹ء سے ۱۵۹۲ء تک ہر قسم کی بدنظمی اور بدامنی سلطنت میں برپا رہی، مصر کی ردیف (ملیشیا) اپنے صوبہ دار سے باغی ہوگئی، تبریز کی فوج نے بغاوت کر دی اور قسطنطنیہ کا تبدیل شدہ سکہ لینے سے انکار کر دیا، بودا کے فوجی دستہ نے جس کی تنخواہ چھ مہینے سے باقی تھی، اپنے پاشا کو قتل کر دیا، ایران میں ایک شخص شاہ طہماسپ کا لڑکا بن کر تخت کا دعوے دار ہوا لیکن ارض روم کے والی نے اسے گرفتار کر لیا، لبنان (شام) کا دروزی فرقہ وہاں کے حکام کی سخت گیریوں سے عاجز آ کر باغی ہو گیا، اس فتنہ کے فرو کرنے کے لیے مراد نے ابراہیم پاشا کو شام بھیجا جس نے دروزیوں کو شکست دے کر ان کو قابو میں کیا۔

ہنگری اور آسٹریا سے جنگ سب سے زیادہ انتشار ینی چری کی خود سری سے پیدا ہو رہا تھا، اتفاق سے اسی زمانہ میں ہنگری اور آسٹریا سے جنگ چھڑ گئی اور ینی چری کو سلطنت کے باہر بھیجنے کا موقع ہاتھ آ گیا، ابتدا میں عثمانیوں کو کامیابی ہوئی مگر سیسک کے محاصرہ میں حسن پاشا والی بوسینیا کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا اور وہ دریا عبور کرتے ہوئے ڈوب کر ہلاک ہو گیا، یہ خبر سن کر سنان پاشا فوراً ادھر روانہ ہوا، اسی درمیان میں بودا کے پاشا کو آسٹریا کی فوجوں سے شکست ہوئی اور چند عثمانی قلعوں پر آسٹریا کا قبضہ ہو گیا، تاہم فریقین کی فتوحات کے پلے اب تک تقریباً برابر تھے لیکن ۱۵۹۴ء میں مولڈیویا، ولاچیا اور ٹرانسلوینیا نے بغاوت کر کے آسٹریا سے اتحاد کر لیا اور اپنی مملکتوں کے تمام مسلمان باشندوں کو قتل کر ڈالا، ابھی آسٹریا کی جنگ جاری ہی تھی کہ ایران سے بھی پھر لڑائی چھڑ گئی جس میں ابتداءً عثمانی فوجوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

مراد کا انتقال اسی اثنا میں ۱۶ر جنوری ۱۵۹۵ء کو مراد کا انتقال ہو گیا، وہ فطرتاً بہت نیک اور صلح جو تھا، اس کی تخت نشینی کے وقت سلطنت عثمانیہ جس پایہ کمال کو پہنچ چکی تھی مراد میں اگرچہ اسے برقرار رکھنے کی صلاحیت نہ تھی اور حرم کی دخل اندازی سے نظام سلطنت میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں تاہم ان خرابیوں کی ذمہ دار تنہا اس کی ذات قرار نہیں دی جا سکتی، سلطنت کا انحطاط خود سلیمان کے وقت سے شروع ہو گیا تھا اور گو صوقوللی پاشا کے تدبر و اقتدار نے اسے سلیم کے عہد میں نمایاں نہ ہونے دیا تاہم دبی ہوئی چنگاریاں اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی تھیں اور مراد کے عہد میں ان کا بھڑک اٹھنا گزیر تھا۔

مراد ایک صوفی مشرب سلطان تھا، اس کو تصوف سے خاص شغف تھا، اکثر سلاطین عثمانیہ کی طرح وہ بھی شاعر تھا اور مراد ہی تخلص کرتا تھا، تصوف میں اس کی ایک مشہور تصنیف ''فتوحات الصیام'' ہے[1]۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ص ۳۱ے۔

محمد ثالث

۱۰۰۴ھ تا ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۵۹۵ء تا ۱۶۰۳ء

سلطان مراد کی وفات کے وقت اس کا سب سے بڑا لڑکا محمد ایشیائے کوچک میں صوبہ مغنیسیا کا حاکم تھا، اس کی ماں سلطانہ صفیہ نے مراد کی وفات کو مخفی رکھا، یہاں تک کہ محمد قسطنطنیہ پہنچ گیا، ایسا کرنا اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ مراد کے دوسرے لڑکے تخت سلطنت کے دعوے دار نہ بن سکیں لیکن اس تحفظ کی ضرورت آئندہ پھر کبھی پیش نہ آئی، کیوں کہ سلاطین آل عثمان میں محمد ثالث آخری سلطان تھا، جسے شہزادگی کے زمانہ میں کسی صوبہ کی حکومت سپرد کی گئی تھی، اس کے بعد تمام شہزادے محل کے ایک خاص حصہ میں نظر بند رکھے جانے لگے اور سلطنت کا کوئی عہدہ انہیں سپرد نہ کیا جاتا، انہیں صرف اسی وقت آزادی نصیب ہوتی جب تخت نشینی کے لیے اعیان سلطنت ان کو محل سے باہر لاتے، اس جدید نظام کا سبب یہ خطرہ تھا کہ مبادا شہزادے سلطان وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں لیکن اس کا جو اثر فرماں روایان سلطنت کی سیرت اور اہلیت پر پڑتا تھا وہ ملکہ حکم رانی کے لیے نہایت درجہ مضر تھا۔

فوج کی شورش محمد ثالث نے تخت نشین ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائیوں کو فوراً قتل کرا دیا، اس طرف سے مطمئن ہو کر تخت نشینی کے آٹھویں روز وہ جامع صوفیہ میں جلوس کے ساتھ نماز ادا کرنے گیا اور فوج کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اتنی کثیر مقدار میں انعامات اور بخششیں تقسیم کیں کہ اس سے پہلے کسی سلطان نے نہ کی تھیں، پھر وہ ہنگری

میں کمک بھیجنے کی تیاری کرنے لگا لیکن اس تیاری کے دوران ہی میں فوج کے دو دستوں نے جو سلطانی بخشش سے مطمئن نہ تھے اور مزید انعامات کے خواہش مند تھے، صدر اعظم فرہاد پاشا کو گھیر کر اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے سخت لہجہ میں اصرار کرنا شروع کیا، فرہاد پاشا نے انہیں سرحد پر جانے کا حکم دیا اور وعدہ کیا کہ ان کے مطالبات وہیں پورے کیے جائیں گے، اس پر انہوں نے اور زیادہ برہمی ظاہر کی اور فرہاد پاشا کو دھمکانے لگے، فرہاد پاشا نے ان کی یہ خودسری دیکھ کر کہا ''کیا تم نہیں جانتے کہ جو لوگ اپنے سرداروں کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں وہ کافر ہیں اور ان کی بیویاں عقیمہ ہیں'' اس طنز پر وہ نہایت برافروختہ ہوئے اور مفتی اعظم کے پاس پہنچ کر فرہاد پاشا کے خلاف ایک فتویٰ چاہا، مفتی اعظم نے انہیں یہ سمجھا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی کہ فرہاد پاشا کے کہنے سے نہ وہ کافر ہو سکتے اور نہ ان کی بیویاں عقیمہ لیکن ان کو مفتی اعظم کے جواب سے تشفی نہ ہوئی اور انہوں نے علانیہ بغاوت کر دی، سپاہیوں (قسطنطنیہ کے سوار دستوں) نے بھی ان کی حمایت کی اور سب نے مل کر فرہاد پاشا کے قتل کے لیے غل مچانا شروع کیا، اس شورش میں حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار جنہوں نے باغیوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی، زخمی ہوئے، بالآخر ینی چری دستوں کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے آمادہ کیا گیا اور یہ بغاوت کسی طرح فرو ہوئی۔

سلسلۂ جنگ اس درمیان میں سرحد کی جنگ برابر جاری تھی اور ہنگری اور ولاچیا میں عثمانی فوجوں کو متعدد شکستیں بھی ہوئیں، یہ حالت دیکھ کر مدبرین سلطنت نے محمد کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ خود دشمنوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو، کیوں کہ عیسائی جس تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے، اسے روکنے کی اس سے زیادہ امید افزا کوئی دوسری صورت نہ تھی، محمد کو قسطنطنیہ چھوڑنا منظور نہ تھا اور سلطانہ صفیہ نے بھی جو اب سلطانہ والدہ تھی اس کو میدان جنگ سے باز رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، محمد ثالث ایک کم زور دل و دماغ کا آدمی تھا، سلطنت کے تمام امور میں سلطانہ صفیہ ہی کو زیادہ دخل تھا اور محمد پر اس کا حد سے

زیادہ اثر تھا وہ خوب سمجھتی تھی کہ قسطنطنیہ سے باہر ہونے کے بعد محمد اس کے قابو سے نکل جائے گا، اس لیے اس نے ہر ممکن کوشش سے اس کو روکنا چاہا لیکن جنگ کی حالت روز بہ روز زیادہ انتشار انگیز ہوتی جاتی تھی، ۱۵۹۳ء میں ولاچیا اور ٹرانسلوانیا کی حمایت میں آسٹریا اور ہنگری نے بھی باب عالی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا، ان کی فوجیں شہنشاہ میکسی میلین اور ہنگری کے مشہور جنرل کاؤنٹ فلفی (Count Filfy) کے زیر کمان تیزی سے عثمانی سرحد کی جانب بڑھ رہی تھیں، انہوں نے دریائے ڈینوب تک پہنچنے سے پہلے گران، پست، بخارسٹ اور دوسرے متعدد قلعوں کو جن پر ترکوں کا قبضہ تھا، فتح کر لیا، اس کے بعد انہوں نے ڈینوب کو عبور کر کے وارنا، سیلسٹریا، رسچک اور اکرمان پر قبضہ کر لیا، عثمانی فوجوں کو ان شکستوں کی خبر جس وقت قسطنطنیہ پہنچی تمام شہر میں تہلکہ پڑ گیا اور ہر شخص نے اسی پر اصرار کرنا شروع کیا کہ سلطان کو فوج لے کر خود سرحد کی طرف روانہ ہونا چاہیے تاکہ جو شکستیں ترکوں کو ہو چکی تھیں ان کی تلافی ہو جائے اور جن مقامات پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ واپس لے لیے جائیں، مشہور مؤرخ خواجہ سعد الدین جو محمد کا استاد تھا اور جس کا محمد نہایت احترام کرتا تھا، اس نے بھی بے حد اصرار کے ساتھ اسی پر زور دیا، آخر میں ینی چری نے بھی یہ دھمکی دی کہ جب تک سلطان خود ان کی قیادت نہ کرے گا وہ دشمن کے مقابلہ کے لیے نہ بڑھیں گے، محمد نے مفتی اعظم کو بلا کر مشورہ طلب کیا، مفتی اعظم نے اس کے جواب میں اس عہد کے مشہور شاعر علی چلپی کی ایک نظم اس کے ہاتھ میں رکھ دی، اس نظم میں سلطنت کی زبوں حالی اور موجودہ جنگ کی تباہ کاری نہایت واضح اور موثر الفاظ میں بیان کی گئی تھی، ان تمام باتوں کا اثر بالآخر محمد پر بھی پڑا اور اس نے سلطانہ صفیہ کی شدید مخالفت کے باوجود سرحد پر جانے کا عزم کر لیا۔

جون ۱۵۹۶ء میں سلطان محمد نہایت تزک و احتشام کے ساتھ سرحد کی طرف روانہ ہوا، اس مہم میں علم نبوی ﷺ پہلی بار نکالا گیا تھا، جس کی وجہ سے فوج میں بے انتہا جوش تھا،

مؤرخ سعد الدین سلطان کے ہم رکاب تھا، فوج کی کمان صدر اعظم ابراہیم پاشا، حسن صوقوللی پاشا اور سیکالا پاشا کے ہاتھ میں تھی، جوں ہی ترکی فوج سرحد پر پہنچی، آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں بلا مقابلہ پسپا ہوگئیں اور بلغاریا کے تمام مفتوحہ علاقوں کو خالی کر دیا، سلطان نے ایرلا کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا، اس کے بعد آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں ٹرانسلوانیا سے کمک حاصل کر کے پھر آگے بڑھیں لیکن ایرلا اس وقت تک فتح ہو چکا تھا، ۲۴/اکتوبر ۱۵۹۶ء کو فریقین کی فوجی سیرسٹیز (Cerestes) کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں اور پھر تین دن تک اس ہنگامہ خیز جنگ کا سلسلہ قائم رہا، جس میں ابتداءً ترکوں کو شکست ہوئی لیکن آخر میں جنگ کے خاتمہ کے قریب انہوں نے عیسائیوں کی طاقت کو پاش پاش کر دیا۔

پہلے روز ترکی فوج کا ایک دستہ جو جعفر پاشا کی کمان میں تھا، نہایت جاں بازی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا لیکن غنیم کی کثرت تعداد سے مغلوب ہو کر ایک ہزار ینی چری اور ایک سو سپاہی اور تینتالیس توپوں کے نقصان کے ساتھ اسے پسپا ہونا پڑا، اس ابتدائی شکست کے بعد سلطان نے فوجی افسروں کو جمع کر کے مشورہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ جنگ فی الحال موقوف کر دی جائے اور فوج کو واپسی کا حکم دے دیا جائے، مؤرخ سعد الدین نے اس رائے کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ ''یہ بات نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی گئی کہ عثمانیوں کے کسی بادشاہ نے انتہائی اور ناگزیر مجبوری کے بغیر دشمن کو پیٹھ دکھائی ہو'' بعض سرداروں نے یہ مشورہ دیا کہ سلطان کی حفاظت کے خیال سے فوج کی کمان حسن صوقوللی پاشا کے ہاتھ میں دے دی جائے، سعد الدین نے اس کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ ''یہ معاملہ پاشاؤں کا نہیں ہے، یہاں خود سلطان کی ذاتی موجودگی قطعی طور پر ضروری ہے'' چنانچہ محض سعد الدین کے عزم و استقلال کی وجہ سے آخر میں یہ طے پایا کہ جنگ جاری رکھی جائے اور سلطان ہی اس کی قیادت کا فرض انجام دے۔

فتح مبین دوسرے روز بھی ترکوں کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی، لیکن تیسرے روز ۲۶/اکتوبر ۱۵۹۶ء کو دونوں فریق نے پوری تیاری کے ساتھ حملہ کیا اور یہی حملہ فیصلہ کن ثابت ہوا، شروع میں عیسائیوں نے مکمل طور پر غلبہ پایا، انہوں نے ترکوں اور تاتاریوں کو میدان سے بھگا کر ان کی تمام توپوں پر قبضہ کرلیا، سلطان نے یہ دیکھ کر کہ اب کوئی امید باقی نہیں رہی، بھاگنے کا قصد کیا لیکن سعد الدین نے اس موقع پر بھی ثابت قدمی دکھائی اور قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کر کے سلطان کو سمجھایا کہ صبری سے فتح حاصل ہوتی ہے اور رنج کے بعد خوشی کا آنا ضروری ہے، عین اس وقت جب کہ عیسائی دستے فاتحانہ جوش و خروش میں لوٹ مار میں مصروف تھے، سیکالا پاشا جواب تک بالکل خاموش کھڑا ہوا تھا، دفعۃً اپنے سواروں کے انبوہ کے ساتھ بجلی کی طرف غنیم پر ٹوٹ پڑا اور اس بے جگری سے انہیں قتل کرنا شروع کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی میدان میں ٹھہر نہ سکے اور انتہائی سراسیمگی کی حالت میں جان بچانے کے لیے بھاگے لیکن باوجود اس کوشش کے ان کے پچاس ہزار سپاہی دلدل میں پھنس کر اور ترکوں کی تلواروں سے ہلاک ہو گئے، ان کی پنچانوے توپیں اور آرچ ڈیوک میکسی میلین (Maximilion) کا جو عیسائی فوجوں کا سپہ سالار اعظم تھا، تمام زر و جواہر اور فوجی سامان ترکوں کے قبضہ میں آ گیا، ترکوں کی یہ فتح اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار سے تاریخ آل عثمان کی نمایاں ترین فتوحات میں تھی۔

اس غیر متوقع فتح کے بعد جس کا سہرا حقیقۃً سعد الدین پاشا اور سیکالا پاشا کے سر تھا، سلطان محمد بڑے فخر و مسرت کے ساتھ قسطنطنیہ کو واپس ہوا اور پھر اپنی عیش و عشرت کی زندگی میں مصروف ہو گیا، ہنگری کے ساتھ جنگ کا سلسلہ کم و بیش برابر جاری رہا، یہاں تک کہ اس کے جانشین سلطان احمد اول کے عہد میں صلح نامہ ستواتوروک (Sitvatoroh) کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہوا۔

فراری قسطنطنیہ پہنچ کر سلطان محمد نے فوراً ہی سیکالا پاشا کو اس کی شجاعت اور کامیابی

کے صلہ میں صدر اعظم مقرر کیا لیکن یہ انتخاب نتائج کے اعتبار سے نہایت افسوس ناک ثابت ہوا اور چند ہی دنوں کے بعد سیکالا پاشا اس عہدے سے برطرف کر دیا گیا، ایک فوجی افسر کی حیثیت سے اس کی بے مثل شجاعت اور جاں بازی مسلم تھی تاہم انتظام سلطنت کے لیے جس تدبر اور مصلحت بینی کی ضرورت تھی، اس سے وہ بڑی حد تک محروم تھا، جنگ سیر سیز کے موقع پر جب عیسائیوں نے غلبہ پایا تو عثمانی فوج کے بیش تر دستوں کے قدم اکھڑ گئے تھے، سیکالا پاشا کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان بھاگنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی، جن میں زیادہ تر ایشیا کے جاگیری دستے تھے، اس نے ان سب کو ''فراری'' کے لقب سے موسوم کر کے ان کی تنخواہیں روک دیں اور ان کی جاگیریں ضبط کر لیں، بہتیروں کو اس نے علانیہ قتل کرا دیا، ایک بڑی تعداد ایشیائے کوچک کو واپس چلی گئی اور سیکالا پاشا اور سلطنت کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کرنے لگی، چنانچہ ایشیائے کوچک میں تھوڑے ہی دنوں کے بعد جو بغاوت برپا ہوئی اور جس کا سلسلہ کئی سال تک قائم رہا، اس میں نمایاں حصہ ان ہی ''فراریوں'' کا تھا۔

قرہ بازیچی سلطان محمد کے بقیہ عہد حکومت میں فوج کی خودسری اور صوبہ داروں کی تعدی اور سخت گیری روز بہ روز زیادہ ہوتی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے خلاف ایک عام بے زاری پھیل گئی اور ہر طرف بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے، چنانچہ ۱۵۹۹ء میں ایشیائے کوچک کے فوجی جاگیرداروں کا ایک سردار عبدالحمید جو ''قرہ بازیچی'' کے لقب سے مشہور تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور سلطان کے خلاف عام بغاوت برپا کر کے خود ایک خود مختار فرماں روا بن جانا چاہا، اس نے کردوں، ترکمانوں اور جنگ سیر سٹیز کے ''فراریوں'' کی ایک فوج تیار کی اور اپنے بھائی ولی حسن بغداد کی مدد سے عثمانی لشکر کو متعدد شکستیں دیں، اس کے بعد حسن صوقوللی پاشا باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، اس نے عبدالحمید کو شکست دے کر بھگا دیا، عبدالحمید کو لڑائی میں ایک کاری زخم لگا

تھا، جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکا لیکن مرنے سے پہلے اس نے اپنے بھائی ولی حسن کو اپنی موت کا بدلہ لینے پر مامور کر دیا تھا، چنانچہ ولی حسن نے جنگ جاری رکھی اور بالآخر حسن پاشا کو قتل کر دیا، اس کی طاقت روز بہ روز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ سلطان کو ۱۶۰۳ء میں مجبوراً اس سے صلح کرنی پڑی، سلطان نے اسے بوسینا کا حاکم مقرر کر دیا، جس کے معاوضہ میں ولی حسن نے آئندہ مطیع اور وفادار رہنے کا عہد کیا۔

ایران سے جنگ اس بغاوت کے دوران ہی میں شاہ عباس نے اپنے قدیم دشمن کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۱۶۰۱ء میں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا اور گذشتہ عہد میں جو صوبے سلطنت ایران سے نکل کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہو گئے تھے، انہیں واپس لے لیا۔

وفات جون ۱۶۰۳ء میں سلطان محمد نے اپنے سب سے بڑے لڑکے محمود کو جس کی شجاعت اور لیاقت کے جوہر ابتدا ہی سے نمایاں تھے اور جس نے باغیوں کو سر کرنے کے لیے ایشیائے کوچک کی سپہ سالاری کی درخواست سلطان سے کی تھی محض اس شبہ کی بناء پر قتل کرا دیا کہ وہ اس بہانہ سے خود تخت سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، اس شبہ کو کسی درویش کی پیشین گوئی سے کہ جلد ایک نیا سلطان تخت پر بیٹھے گا اور بھی تقویت پہنچی، سلطان نے اس پیشین گوئی کے خوف سے محمود کو تو قتل کرا دیا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۲۷/ اکتوبر ۱۶۰۳ء کو وہ خود بھی ختم ہو گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک درویش نے اس سے کہا تھا کہ پچپن روز کے اندر اس پر کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے، اس پیشین گوئی کا اثر یہ ہوا کہ وہ روز بہ روز مغموم اور ضعیف ہوتا گیا، یہاں تک کہ ٹھیک پچپنویں روز اس کا انتقال ہو گیا۔

احمد اوّل

۱۰۱۲ھ تا ۱۰۲۶ھ مطابق ۱۶۰۳ء تا ۱۶۱۷ء

سلطان محمد ثالث کے بعد اس کا بڑا لڑکا احمد اول چودہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، ابتداءً اس نے انتظام سلطنت میں جس قوت اور استقلال کا ثبوت دیا، اس سے توقع کی جاتی تھی کہ اس کا عہد حکومت کے پچھلے عہد کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب اور شاندار ثابت ہوگا، مثلاً جب صدر اعظم نے جوہنگری کی جدید مہم پر مامور کیا گیا تھا، ایک کثیر رقم کا مطالبہ کیا اور اس کے پورا نہ ہونے تک آگے قدم بڑھانے سے انکار کر دیا تو احمد نے اس کے مطالبہ کے جواب میں صرف یہ پیغام بھیجا کہ "اگر تم کو اپنا سر عزیز ہے تو فوراً روانہ ہو جاؤ" صدر اعظم کو اس حکم کی تعمیل بے چون و چرا کرنی پڑی، سلطان سلیم ثانی کے زمانہ سے حرم کو امور سلطنت میں بہت کچھ دخل حاصل تھا اور مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں عنان حکومت زیادہ تر خواتین حرم ہی کے ہاتھ میں تھی، جن میں سب سے زیادہ اثر سلطانہ صفیہ کا تھا، جو مراد ثالث کی محبوب سلطانہ اور محمد ثالث کی والدہ تھی، سلطان احمد نے باوجود نوعمری کے سلطانہ صفیہ اور اس کے معتمد اشخاص کو سلطنت کے معاملات میں دخل دینے سے یک قلم روک دیا، یہ اقدام بالکل خلاف توقع اور بہت کچھ امید افزا تھا، اس کے بعد اس نے سیکالا پاشا کو ایران کی طرف روانہ کیا لیکن شاہ عباس کے مقابلہ میں اس کو شکست ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۶۰۵ء میں سیکالا پاشا کا انتقال ہو گیا، صدر اعظم لالہ مصطفیٰ نے جوہنگری

کی مہم پر روانہ کیا گیا تھا، بودا کو عیسائیوں کے ہاتھ سے چھڑا لیا، مگر موسم کی خرابی اور ینی چری کے آغا کی کم ہمتی کے باعث اسے مجبوراً پست اور گران کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا، بہر حال چند ہی روز کے بعد اس نے گران کو فتح کر لیا۔

صلح نامۂ سیتوا توروک ۱۱/ نومبر ۱۶۰۶ء کو صلح نامۂ سیتوا توروک پر دستخط ہوئے، اس کے رو سے فریقین کے مقبوضات میں کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہوئی، گران، ایرلا اور گراڈسکا (Gradiscka) کے قلعے عثمانیوں کے قبضہ میں رہے اور رآب اور کومورن پر آسٹریا کا قبضہ قائم رہا، ٹرانسلوینیا بھی اس صلح نامہ میں بطور ایک فریق کے شریک کیا گیا اور یہ صوبہ ایک حد تک سلطنت عثمانیہ کی محکومی سے آزاد ہو گیا، تیس ہزار ووکات سالانہ کی رقم جو آسٹریا بطور خراج دولت عثمانیہ کو ادا کرتا تھا، موقوف کر دی گئی اور اس کے معاوضہ میں باب عالی نے دو لاکھ ووکات یک مشت قبول کر لیے لیکن اس صلح نامہ کی اصلی اہمیت وہ تبدیلی ہے، جو اس کے بعد دولت عثمانیہ اور یورپ کی عیسائی حکومتوں کے سفارتی تعلقات میں واقع ہوئی، اب تک عیسائی حکومتوں سے جو صلح نامے ہوتے تھے، ان کی عبارت سے ظاہر ہوتا تھا کہ صلح سلطان کی طرف سے عطا کی جارہی ہے لیکن سیتوا توروک کے صلح نامہ میں باب عالی نے بین الاقوامی قانون کے اصول و آداب کا لحاظ رکھا، نیز شاہ آسٹریا حکمراں ''ویانا'' کے بجائے ''شہنشاہ'' لکھنا منظور کیا، اب تک سلطان کی طرف سے جو سفراء ویانا بھیجے جاتے تھے، وہ باب عالی کے ادنیٰ ملازمین میں سے منتخب کیے جاتے تھے، اس صلح نامہ کے بعد یہ طے پایا کہ سفراء کم از کم سنجق بے کے مرتبہ کے ہوں گے۔

ضعف سلطنت اس صلح نامہ نے واضح کر دیا کہ دولت عثمانیہ کے عروج کا دور ختم ہو چکا اور اب وہ زوال و انحطاط کی جانب مائل ہو گئی ہے، سترہویں صدی کا ابتدائی زمانہ اس کے لیے نہایت خطرناک تھا، سلاطین عموماً کم زور تھے اور غنیم (سلطنت آسٹریا) روز بہ روز زیادہ طاقت حاصل کرتا جاتا تھا لیکن ۱۶۱۸ء میں جرمنی میں وہ عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑ گئی جس

کا سلسلہ تین سال تک قائم رہا اور جس نے سلطنت آسٹریا کو ترکوں کی کم زوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے بوہیمیا، سیکسنی، ڈنمارک، سویڈن اور فرانس سے معرکہ آرائی میں مصروف رکھا، سلطنت اسپین بھی دولت عثمانیہ کی ایک بہت بڑی دشمن تھی لیکن فلپ ثانی کی وفات (۱۵۹۸ء) کے بعد یہ سلطنت نہایت تیزی کے ساتھ گرنے لگی اور سترہویں صدی کی ابتدا میں اس قابل نہ تھی کہ اپنے سابق حریف کے ساتھ قوت آزمائی کر سکے، فرانس اور انگلستان دولت عثمانیہ سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، علاوہ بریں وہ سترہویں صدی کے نصف اول اپنے خانگی جھگڑوں میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں دوسری جانب توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، روس خانہ جنگیوں اور بغاوتوں سے پریشان تھا اور اس زمانہ میں جب سلطنت عثمانیہ کی کم زوری بہت نمایاں تھی، خود ان بغاوتوں کے فرو کرنے اور اہل سویڈن و پولینڈ سے اپنے بعض صوبے واپس لینے کی کوششوں میں مشغول و منہمک تھا، غرض سترہویں صدی کے ابتدائی تیس سالوں میں جو سلطنت عثمانیہ کے لیے نہایت نازک اور تشویش ناک دور تھا، یورپ کی کوئی بڑی حکومت اس قابل نہ تھی کہ ترکوں کی کم زوری سے فائدہ اٹھا سکے، اس زمانہ میں ترکوں کے خاص دشمن پولینڈ اور وینس تھے، پولینڈ اپنے خانگی انتشار کے باعث کوئی نمایاں فتح حاصل نہ کر سکا اور وینس کبھی اس قابل نہ تھی کہ تنہا سلطنت عثمانیہ کا مقابلہ کر سکے، علاوہ بریں تمام ظاہری نمائش کے باوجود اس کی قوت خود روز بہ روز کم زور ہوتی جا رہی تھی، سترہویں صدی کے نصف اول میں ایران سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا دشمن تھا، تاہم اس سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ اس کی فوجیں مغرب کی جانب اس حد تک بڑھ آئیں گی کہ سلطنت کے اصلی مقبوضات خطرہ میں پڑ جائیں۔

صلح نامۂ سیتوا توروک کے بعد سلطان احمد اول نے گیارہ سال حکومت کی، اس مدت میں صدر اعظم مراد پاشا نے ایشیائے کوچک کی بغاوت فرو کرنے میں ایک حد تک کام یابی حاصل کی لیکن ایران سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا، جس میں زیادہ تر ترکوں

کا ہی نقصان ہوا، ۱۶۱۳ء میں قزاقوں نے سینوپ پر جو ایشیائے کوچک کا ایک نہایت دولت مند شہر اور بحر اسود کا بہت مضبوط بندرگاہ تھا، حملہ کر کے اسے تاخت وتاراج کر ڈالا، ترکی بیڑا موقع سے دور تھا اور شہر کی بربادی کے بعد بھی حملہ آوروں سے انتقام نہ لے سکا۔

وفات ۲۳/ذیقعدہ ۱۰۲۶ھ (۲۲/نومبر ۱۶۱۷ء) کو سلطان احمد اول نے اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

مصطفیٰ اوّل و عثمان ثانی

۱۰۲۶ھ تا ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۱۷ء تا ۱۶۲۳ء

سلطان احمد اول نے اپنی وفات کے وقت سات لڑکے چھوڑے جن میں سے تین تخت نشین ہوئے لیکن اس کا پہلا جانشین اس کا بھائی مصطفیٰ تھا، اب تک چودہ پشتوں سے سلطنت عثمانیہ کی وراثت باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی، یہ پہلا اتفاق تھا کہ بیٹے کے بجائے سلطان سابق کا بھائی تخت نشین ہوا، فان ہمیر کی روایت کے مطابق[1] خاندان کے سب سے بڑے فرد کو تخت نشین کرنے کا دستور دولت عثمانیہ نے آل چنگیز سے لیا تھا لیکن جب سے سلاطین نے محمد فاتح کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کرنا شروع کیا اور تاج و تخت کی حفاظت کے لیے بھائیوں کا قتل ضروری خیال کیا جانے لگا، اس وقت سے سلطنت کا وارث بھائی کے بجائے بڑا لڑکا ہوتا تھا، احمد اول نے چوں کہ اپنے بھائی مصطفیٰ کو قتل نہیں کرایا تھا اور صرف اس کی قید ہی پر اکتفا کیا تھا، اس لیے قانون آل عثمان کی رو سے مصطفیٰ تخت سلطنت پر بٹھایا گیا لیکن مصطفیٰ کی سادہ لوحی اور نااہلیت تین ہی مہینے میں اس درجہ واضح اور نمایاں ہوگئی کہ اراکین سلطنت نے ۱۶ر فروری ۱۶۱۸ء کو اسے معزول کر کے سلطان احمد کے چہاردہ سالہ فرزند شہزادہ عثمان کو تخت پر بٹھا دیا، فوج سے خطرہ تھا مگر اس نے بھی اپنے مالی فائدہ کو پیش نظر رکھ کر اس تجویز سے بہ خندہ پیشانی اتفاق کیا اور نئے سلطان کی تخت

---

[1] کریسی، جلد ۱، ص ۳۸۷۔

نشینی کے موقع پر حسب دستور قدیم جدید انعامات کا مطالبہ کیا، جس کی وجہ سے صرف تین ماہ کے اندر خزانہ کو ساٹھ لاکھ دوکات کا بار پھر برداشت کرنا پڑا۔

عثمان ثانی سلطان عثمان ثانی کا مختصر عہد حکومت خود اس کے اور سلطنت کے لیے نہایت نامبارک ثابت ہوا، ترکوں کو مسلسل شکستوں سے مجبور ہو کر ایران سے صلح کرنی پڑی (۱۶۱۸ء) اور وہ تمام فتوحات جو مراد ثالث اور محمد ثالث کے عہد میں حاصل ہوئی تھیں، ایرانیوں کو واپس کردی گئیں، سلطنت عثمانیہ کی مشرقی سرحد پھر اسی خط پر پہنچ گئی جس پر سلطان سلیم ثانی کے زمانہ میں تھی، ادھر سے فارغ ہو کر عثمان سلطنت کے اندرونی دشمنوں یعنی ینی چری وسپاہی دستوں کی جانب متوجہ ہوا، جن کی خودسری اور سرکشی سلطنت کے لیے ایک مستقل خطرہ تھی، خصوصاً ینی چری کا تمرد سلطان اور رعایا دونوں کے لیے یکساں طور پر تشویش ناک تھا، ۱۶۲۱ء میں عثمان نے پولینڈ سے جنگ چھیڑ دی جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس کی فوج کی قوت بھی کچھ کم زور ہو جائے، یہ مقصد ایک حد تک پورا تو ہوا اور سلطانی فوجوں کو جزوی کام یابی کے بعد کافی نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا لیکن اس جنگ کے نتیجہ سے عثمان کے خلاف ایک عام برگشتگی پیدا ہوگئی، بجائے اس کے کہ وہ رعایا کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرتا، اس نے قوانین وضوابط میں نامناسب تبدیلیاں اور سختیاں نافذ کرکے اور زعمائے سلطنت کو اپنے برتاؤ سے ناخوش کر کے ہر طبقہ کے لوگوں کو بے زار کردیا، ۱۶۲۲ء میں اس نے سفر حج کا ارادہ ظاہر کیا لیکن یہ پوشیدہ نہ تھا کہ اس کا اصلی مقصد دمشق پہنچ کر کردوں اور دوسرے سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کرنا ہے جسے جدید طرز پر منظم کر کے وہ ینی چری اور سپاہی کی بیخ کنی کے لیے قسطنطنیہ لانا چاہتا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہوتا تو سلطنت کی بہتیری خرابیاں دور ہو جاتیں لیکن اس قسم کی مہم کے لیے جیسی راز داری اور قوت عمل کی ضرورت تھی، عثمان اس سے خالی تھا، ینی چری کو اس کے اصلی مقصد کا علم ہوگیا اور انہوں نے برافروختہ ہو کر سلطان کو اس سفر سے روک دیا اور پھر موجودہ وزیروں کے قتل کا مطالبہ کیا،

عثمان کے پاس نہ کوئی ایسی فوج تھی جو ینی چری کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرتی اور نہ رعایا میں کوئی طبقہ اس کا ہمدرد تھا، جس سے وہ مدد طلب کر سکتا، خود سابق سلطان مصطفیٰ کی والدہ بھی باغیوں کی طرف دار تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اگر یہ بغاوت فرو ہو گئی تو عثمان اپنی ذات کو محفوظ کرنے کی غرض سے اپنے تمام اعزہ کو جس میں مصطفیٰ سب سے پہلے تھا، قتل کرا دے گا، فوج کے مطالبات بڑھتے ہی گئے اور باغیوں نے وزرا سے گزر کر خود سلطان کی ذات پر حملہ شروع کیا، چنانچہ انہوں نے عثمان کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور مصطفیٰ کو رہا کر کے دوبارہ تخت سلطنت پر بیٹھایا، داؤد پاشا جس کو اس بغاوت میں بہت زیادہ دخل تھا، صدر اعظم کے عہدہ پر متمکن ہوا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ مبادا کوئی انقلاب پھر پیش آئے، لہٰذا اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے رفع کرنے کی غرض سے وہ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر عثمان کے قید خانہ میں داخل ہوا اور نہایت بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ اسے پھانسی دے کر ختم کر دیا۔

عثمان کا خون تھوڑے ہی دنوں کے بعد رنگ لایا اور خود ینی چری میں قاتلوں کے خلاف برہمی پیدا ہوئی، مصطفیٰ نے بھی اس حادثہ پر رنج و غم کا اظہار کیا اور قاتلوں کی سزا کا حکم نافذ کیا، تاہم حکومت میں جو انتشار پیدا ہو چکا تھا وہ بدستور قائم رہا اور مصطفیٰ کی نااہلی میں ذرا بھی فرق ظاہر نہ ہوا، اس کی ماں سلطانہ والدہ اصلی فرماں روا تھی، سلطنت کے اعلیٰ عہدوں کے لیے ہر امیدوار رشوت کے ذریعہ سے ینی چری اور ''سپاہی'' فوجوں کی مدد حاصل کرنا چاہتا تھا، قسطنطنیہ میں بدامنی اور شورش یہاں تک بڑھی کہ خود فوج پر بھی اس کا اثر پڑا اور اس نے عاجز آ کر وزرائے سلطنت کی یہ خواہش منظور کر لی کہ مصطفیٰ کی معزولی کے بعد نئے سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر وہ اپنے دستوری انعامات کا مطالبہ نہ کرے گی، چنانچہ اگست ۱۶۲۳ء میں مصطفیٰ دوسری مرتبہ معزول کیا گیا اور سلطان عثمان کا بھائی شہزادہ مراد جس کی عمر صرف بارہ سال تھی، تخت پر بیٹھایا گیا۔

مصطفیٰ کے دوسرے دور حکومت کا قیام ایک سال سے کچھ ہی زائد رہا لیکن یہ قلیل

مدت میں بھی سلطنت کے لیے نہایت مضرت رساں ثابت ہوئی، اسی دوران میں ایران سے جنگ پھر چھڑ گئی تھی اور بغداد و بصرہ دونوں سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گئے، باظا پاشا والی ارض روم مقتول سلطان کے خون کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور تمام ایشیائے کوچک میں بغاوت برپا کردی، وہ ینی چری کا خاص طور پر دشمن تھا اور اس نے اس خود سر فوج کو بھی عاجز کردیا، اس عام خلفشار اور بدنظمی میں سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا، رعایا کا حال حد درجہ خراب تھا، وہ ہر طرح کی سختیوں اور تباہیوں کی شکار تھی، مرکزی حکومت بالکل کم زور ہوگئی تھی اور رشوت ستانی کا اثر سلطنت کے ہر شعبہ میں نمایاں تھا، اگر اس وقت یورپ کی کوئی مضبوط طاقت حملہ کردیتی تو سلطنت عثمانیہ کے لیے اس کا مقابلہ دشوار ہوجاتا لیکن یورپ کی حکومتیں خود باہمی جنگ اور خانگی انتشار میں مبتلا تھیں اور ان میں دولت عثمانیہ کی اس کم زوری سے فائدہ اٹھانے کی قوت نہ تھی۔

پہلا برطانوی سفیر ۱۶۲۲ء میں سر طامس رو برطانیہ کے سب سے پہلے سفیر کی حیثیت سے باب عالی میں آیا، یہ شاہ جیمس اول کا فرستادہ تھا اور اس کی سفارت کا خاص مقصد ان بحری قزاقوں کے خلاف احتجاج کرنا تھا، جو الجزائر اور تونس کے برطانوی جہازوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، وہ پانچ سال تک قسطنطنیہ میں مقیم رہا اور کسی حد تک اپنے مقصد میں کام یاب بھی ہوا، اس نے اپنے دوران قیام میں سلطنت عثمانیہ کے اختلال و زوال سے متعلق واقعات اور حالات قلم بند کیے ہیں، ان سے مبالغہ کا حصہ نکال دینے کے بعد بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کے ابتدائی دور میں سلطنت کی زبوں حالی کس حد کو پہنچ گئی تھی۔

مراد رابع

۱۰۳۲ھ تا ۱۰۵۰ھ مطابق ۱۶۲۳ء تا ۱۶۴۰ء

سلطان مراد رابع صرف بارہ سال کی عمر میں ۱۰ر ستمبر ۱۶۲۳ء کو تخت نشین ہوا لیکن اس نوعمری میں بھی اس نے جس قوت ارادی کا اظہار کیا اس سے وزراء کو اندازہ ہو گیا کہ عنان حکومت ایک ایسے فرماں روا کے ہاتھ میں آئی ہے جو سلطنت کی تمام بدنظمیوں کو اپنی سطوت و جبروت سے دور کر دے گا، ترک مؤرخ اولیا کا بیان ہے کہ:

> ''تخت نشینی کے بعد جب سلطان مراد خزانہ میں داخل ہوا تو میرا باپ درویش محمد اس کے ساتھ تھا، خزانہ میں طلائی اور نقرئی ظروف میں سے کچھ بھی باقی نہ تھے، صرف بیس ہزار پیاستر[1] اور الماریوں میں چند مونگے اور چینی کے برتن رہ گئے تھے، بادشاہ نے سجدہ کیا اور پھر کہا کہ ان شاء اللہ میں اس خزانہ کو ان ہی لوگوں کی جائیداد سے پر کردوں گا جنہوں نے اسے لوٹا ہے[2]۔''

سلطانہ والدہ مراد کی نوعمری کے باعث سلطنت کا انتظام ابتداءً اس کی والدہ سلطانہ ماہ پیکر کے ہاتھ میں تھا، جو نہایت دانش مند اور مدبر خاتون تھی، سلطانہ والدہ کی قابلیت اس وقت سلطنت کے لیے بے حد اہم اور مفید ثابت ہوئی، خطرات اور تباہیوں کے بادل ہر طرف گھرے ہوئے تھے، سلطنت کے ہر حصہ سے تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں، سرحد پر ایرانی

---

[1] چھوٹے نقرئی سکے [2] کریسی، ج ۱، ص ۳۹۴۔

فوجیں فتح یاب تھیں، باظا پاشا اپنی بغاوت میں کام یاب ہو کر ایشیائے کوچک کا حاکم بنا ہوا تھا، لبنان کے لوگ علانیہ باغی ہو گئے تھے، مصر اور دوسرے صوبوں کے والی بھی اپنی فرماں برداری میں متزلزل تھے، الجزائر، تونس اور طرابلس کی حکومتیں خود مختار ہو چکی تھیں اور بہ اختیار خود یورپ کی حکومتوں سے معاہدے کر رہی تھیں، روسی قزاقوں کے حملہ اور ان کی تباہ کاریاں نہ صرف بحر اسود کے ساحل پر جاری تھیں بلکہ انہوں نے باسفورس میں داخل ہو کر قسطنطنیہ کے ملحق علاقہ میں بھی لوٹ مار شروع کر دی تھی، خود پایہ تخت میں خزانہ خالی تھا، سلح خانہ کا سامان تقریباً ختم ہو چکا تھا، رعایا فاقہ کشی میں مبتلا تھی اور فوج کی سرکشی اور بے راہ روی حد کو پہنچ چکی تھی، ان حالات کے باوجود جب کہ بدامنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور خود مراد کی زندگی خطرہ سے خالی نہ تھی، سلطانہ والدہ نے اپنے تدبر اور اعلیٰ قابلیت سے سلطنت کو نہ صرف سنبھالے رکھا بلکہ رفتہ رفتہ فوج اور وزراء پر کچھ قابو بھی حاصل کر لیا، یہاں تک کہ مراد نے تخت نشینی کے نویں سال زمام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور پھر وہ تمام خرابیاں جو سلطنت کو تباہ و برباد کر رہی تھیں، نہایت سرعت کے ساتھ دور ہونے لگیں۔

فتنہ بغداد مراد کی کم سنی کے زمانہ میں عباس صفوی شاہ ایران کو اپنی سلطنت کے وسیع کرنے کا موقع مل گیا، بکیر آغا نے جو بغداد کا کوتوال تھا، وہاں کے والی کو قتل کر کے شہر پر خود قبضہ کر لیا، دولت علیہ نے اس کے مقابلہ میں حافظ پاشا کو روانہ کیا اور اس نے بغداد کا محاصرہ کر لیا، بکیر آغا نے شاہ عباس کو دعوت دی اور لکھا کہ اگر آپ مجھے یہاں کا والی مقرر کر دیں تو میں شہر آپ کے حوالے کر دوں، شاہ عباس نے یہ شرط منظور کر لی اور فوراً فوج لے کر روانہ ہوا، اس درمیان میں بکیر آغا نے حافظ پاشا سے بھی یہی گفتگو کی اور حافظ پاشا نے بھی اس کی یہ شرط منظور کر لی، چنانچہ اس معاہدہ کے مطابق ترکی فوجیں بغداد میں داخل ہو گئیں، اس کے بعد شاہ عباس نے بغداد پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا، تین ماہ تک محاصرہ جاری رہا، بکیر آغا نے پھر وہی پہلی شرط شاہ عباس کے سامنے پیش کی اور شاہ عباس کی منظوری حاصل کرنے کے بعد

ترکوں سے غداری کر کے ایرانی لشکر کو شہر کے اندر داخل کرادیا، ۱۶۲۳ء میں شاہ عباس نے بغداد پر قبضہ کر لینے کے بعد بکیر آغا کو اس غداری کے صلہ میں قتل کرادیا۔ (فرید بک، ص ۱۲۵)

صدر اعظم کمانکش علی پاشا کے مخالفوں نے بغداد کی شکست کی ذمہ داری اسی کے سر عائد کی اور مراد کو مجبور کر کے اسے قتل کرادیا، اس کے بعد چرکس محمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا لیکن وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد مر گیا، ۱۶۲۴ء میں یہ عہدہ حافظ احمد پاشا کو تفویض ہوا، اسی سال اس نے بغداد پر فوج کشی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا، جو بہت دنوں تک قائم رہا لیکن محصورین کے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور ینی چری نے گھبرا کر محاصرہ جاری رکھنے سے انکار کر دیا، مجبوراً حافظ پاشا محاصرہ اٹھا کر دیار بکر چلا آیا، یہاں پہنچ کر ینی چری نے پھر بغاوت کی، جس کی وجہ سے حافظ پاشا معزول کر دیا گیا اور خلیل پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، خلیل پاشا نے اباظا پاشا کو مطیع بنانے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ ناکام رہا اور اس کے مخالفوں نے دوسرے ہی سال اسے بھی معزول کرادیا، اس کی جگہ خسرو پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، اس نے ارض روم پر فوج کشی کر کے اباظا پاشا کو مطیع کیا اور ۱۶۲۸ء میں اسے بوسنیا کا والی مقرر کیا، اس درمیان میں قسطنطنیہ کی شورش برابر بڑھتی رہی، دارالسلطنت پر تمام تر سرکش ینی چری اور سپاہی فوجوں کا قبضہ تھا، عہدہ داروں کا تقرر اور معزولی ان ہی کی مرضی پر تھی اور وزرائے سلطنت میں سے جو ذرا بھی ان کی مخالفت کرتا قتل کر دیا جاتا۔

ایران پر چڑھائی ۱۶۲۸ء میں شاہ عباس صفوی نے وفات پائی اور اس کا نوعمر لڑکا شاہ مرزا تخت نشین ہوا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خسرو پاشا نے ایران پر فوج کشی کی اور ۱۶۳۰ء میں ہمدان میں داخل ہو گیا، ہمدان فتح کرنے کے بعد وہ بغداد کی طرف بڑھا، درمیان میں کئی بار ایرانیوں نے مقابلہ کیا لیکن خسرو پاشا نے ہر مرتبہ انہیں شکست دی، بغداد پہنچ کر اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا، مگر تھوڑے دنوں کے بعد فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا اور اسے نومبر ۱۶۳۰ء میں محاصرہ اٹھا کر مجبوراً واپس آنا پڑا، محاصرہ اٹھا لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو پاشا

معزول کر دیا گیا اور حافظ پاشا دوبارہ صدر اعظم مقرر ہوا۔

خونِ شہید یوں تو ینی چری اور سپاہی فوجوں کی خودسری بارہا بغاوت کے مناظر پیش کر چکی تھی لیکن فروری ۱۶۳۲ء میں انہوں نے جس سرکشی کا ثبوت دیا وہ مراد کے لیے جس نے اسی سال انتظامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لیا تھا، ایک نہایت تلخ تجربہ تھا، ان باغیوں نے بغداد کی مہم سے ناکام لوٹنے کے بعد رجب پاشا کے بھڑکانے سے ایک روز قصرِ سلطانی کے سامنے جمع ہو کر صدرِ اعظم حافظ پاشا، مفتی اعظم یحییٰ، دفتر دار مصطفیٰ اور سلطان کے چند دوسرے معتمد عہدہ داروں کے قتل کا مطالبہ نہایت گستاخی اور اصرار کے ساتھ پیش کیا، مراد نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، بلکہ انہوں نے اسے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ ان کے مطالبات منظور نہ کرے گا تو اس کا نتیجہ خود اس کے حق میں بہت برا ہوگا، آخر کار مراد نے نہایت مجبور ہو کر حافظ پاشا کو بلایا اور اس سے باغیوں کے مطالبہ کا ذکر کیا، حافظ پاشا نے جواب دیا ”میرے بادشاہ! حافظ جیسے ایک ہزار غلاموں کی جان تجھ پر نثار، میری استدعا صرف یہ ہے کہ تو مجھے اپنے ہاتھ سے قتل نہ کر، بلکہ ان ہی لوگوں کے سپرد کر دے تاکہ مجھے شہادت حاصل ہو اور میرے خون کا وبال ان کے سروں پر آئے“

اس کے بعد **بسم اللہ الرحمن الرحیم لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم انا للہ وانا الیہ راجعون** کہتا ہوا نہایت دلیری کے ساتھ وہ باغیوں کی طرف بڑھا، مراد اس منظر کو دیکھ کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا، وزرائے سلطنت بھی جو اس موقع پر موجود تھے، اشک بار آنکھوں سے اس خونیں تماشا کو دیکھ رہے تھے، جوں ہی حافظ پاشا آگے بڑھا، باغی خوں خوار درندوں کی طرح اس پر جھپٹے، حافظ پاشا نے پہلے حملہ آور کو ایک ہی وار میں ختم کر دیا، یہ دیکھ کر بقیہ سپاہی اس پر ٹوٹ پڑے اور اسے خنجروں سے ہلاک کر ڈالا، ایک ینی چری سپاہی نے اس کے سینہ پر چڑھ کر اس کا سر کاٹ ڈالا، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو لیے تو مراد نے کہا ”خدا کی مرضی پوری ہو لیکن اے خوں خوار انسانو! جو وقت اس نے مقرر کر دیا ہے، اس

وقت ضرور تم سے اس کا انتقام لیا جائے گا، تمہیں نہ خدا کا خوف ہے نہ رسول ﷺ کی شریعت کا احترام"، لیکن باغیوں پر اس وقت اس دھمکی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

فکر انتقام دو مہینے کے اندر بہت سے دوسرے بے گناہ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، خود مراد کی معزولی کے مسئلہ پر بھی فوج میں علانیہ گفتگو ہوتی تھی اور مراد کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ اس کے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ اپنے عزل و قتل کے لیے تیار ہو جائے یا پھر باغیوں کی بیخ کنی کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے، خوش قسمتی سے فوج میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو اپنے ساتھیوں کی سرکشی اور بے راہ روی سے نہایت بے زار تھے، ان لوگوں نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی حمایت کا وعدہ کیا، چنانچہ خفیہ طور پر ایک دلیر اور جاں باز دستہ جس پر ہر حال میں اعتماد کیا جا سکتا تھا، رفتہ رفتہ تیار کر لیا گیا، ینی چری اور سپاہی دستہ کا باہمی افتراق و حسد بھی سلطان کے مقصد میں بہت کچھ معین ہوا اور اس نے ان کی نزاع سے کافی فائدہ اٹھایا، اس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اس شورش کے اصلی بانی رجب پاشا کو دفعۃً خفیہ طور پر قتل کرا دیا، اس کے بعد پھر وہ باغیوں کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوا، ۲۹ رمئی ۱۶۳۲ء کو اس نے ایک دیوان عام منعقد کیا جس میں مفتی اعظم، وزرائے سلطنت، اکابر علما اور دو فوجی سردار جنھوں نے باغیوں کے خلاف سلطان کی اطاعت کا حلف لیا تھا، حاضر تھے، سواروں کے چھ دستے بھی جن کی وفاداری پر اعتماد کیا جا سکتا تھا، مستعد کھڑے تھے، مراد نے پہلے ینی چری دستوں کو اپنے سامنے بلا کر ان کی وفاداری پر اطمینان ظاہر کیا اور کہا کہ مجھے امید ہے تم باغیوں کو سزا دینے میں میرا ساتھ دو گے، ینی چری دستوں نے بآواز بلند اعلان کیا کہ بادشاہ کے دشمن ہمارے دشمن ہیں اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ ہم سلطنت کی کامل اطاعت کریں گے، اس کے بعد مراد "سپاہیوں" کے وفد کی طرف متوجہ ہوا، جو ینی چری فوج کے اس جوش کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے، اس نے ان کی سرکشی پر ملامت کی، "سپاہیوں" نے ادب کے ساتھ معذرت پیش کی کہ گو سلطان کی شکایتیں بجا ہیں تاہم وہ خود

ذاتی طور پر دولت علیہ کے مطیع اور وفادار ہیں، البتہ اپنے ماتحتوں کی اطاعت پر قابو نہیں رکھتے، مراد نے جواب دیا کہ اگر تم وفادار ہو تو وہی حلف لو جو تمہارے بھائی ینی چری دستوں نے ابھی لیا ہے اور اپنے دستوں سے باغیوں کے سرداروں کو گرفتار کر کے میرے حوالے کر دو" سپاہی افسروں نے خوف زدہ ہو کر اطاعت کا حلف لے لیا، اس کے بعد مراد نے قضاۃ سلطنت کو مخاطب کر کے ان کے فیصلوں کی جانب داری پر انہیں ملامت کی، جس پر ایشیا کے ایک عربی النسل قاضی نے کھڑے ہو کر نہایت بے خوفی کے ساتھ عرض کیا "میرے بادشاہ! ان تمام باتوں کا علاج صرف تلوار کی دھار ہے" اس قاضی کا یہ اعلان لکھ لیا گیا اور پھر سلطان، وزرائے سلطنت، مفتی اعظم اور تمام حاضرین نے متفقہ طور پر ایک محضر پر اپنے دستخط کیے، جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ بدامنی اور شورش کو دور کرنے کی حتی الوسع پوری کوشش کریں گے۔

شدتِ انتقام مراد نے اسی روز سے اپنی آزاد حکومت شروع کر دی، باغیوں کے تمام سردار اور وہ سب لوگ جن کو مراد اس بغاوت میں شریک سمجھتا تھا، قتل کر دیے گئے، قسطنطنیہ کے علاوہ صوبوں میں بھی باغیوں کا استیصال یوں ہی کیا جانے لگا اور مہینوں تک قتل و خوں ریزی کا سلسلہ جاری رہا، خفیف سے شبہ پر بھی بڑے بڑے عہدہ دار فوراً قتل کر دیے جاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر سلطنت کے ہر شعبہ کی تمام خرابیاں دور ہو گئیں اور فوج کی سرکشی کا خاتمہ ہو گیا، سلطنت کے طول و عرض میں امن و امان قائم ہو گیا اور عدل و انصاف کی حکومت نظر آنے لگی۔

ایشیائے کوچک کی بغاوت ۱۶۳۰ء ہی میں فرو ہو چکی تھی اور مراد نے اباظا پاشا کی جان بخشی کر کے اسے بوسنیا کا والی مقرر کر دیا تھا لیکن ینی چری کو مطیع کرنے کے بعد اس نے اباظا پاشا کو قسطنطنیہ بلا کر اس فوج کا حاکم بنا دیا، کچھ دنوں تک تو اباظا پاشا مراد کے حسب اطمینان کام کرتا رہا لیکن پھر اپنی کسی بات سے اس کو ناخوش کر دیا جس کی پاداش میں قتل کر دیا گیا (۱۶۳۴ء)۔

مفتی اعظم کا قتل ۱۶۳۳ء میں مراد ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوا لیکن وہ نائیکومیڈیا سے تھوڑی ہی دور آگے بڑھا تھا کہ اس نے وہاں کے قاضی کو کسی جرم میں قتل کرا دیا، اس قتل سے دارالسلطنت کے علماء کی جماعت میں بڑی برہمی پیدا ہوئی اور اس جماعت کے سرداروں نے مراد کے خلاف کہنا شروع کیا، سلطانہ والدہ نے اس کی اطلاع مراد کو دی، وہ فوراً قسطنطنیہ واپس ہوا اور آتے ہی مفتی اعظم کو قتل کرا دیا، تاریخ آلِ عثمان میں سلطان کے حکم سے کسی مفتی اعظم کے قتل کی یہ پہلی اور آخری مثال ہے، اس قتل کے بعد علماء کی شورش بالکل فرو ہوگئی۔

اریواں کی فتح ۱۶۳۵ء میں مراد پھر اپنی مہم پر روانہ ہوا، اس مرتبہ اس کا مقصد صرف ایشیائی صوبوں کا معائنہ کرنا نہ تھا بلکہ ان مقامات کو فتح کرنا بھی مقصود تھا جو پہلے عثمانی مقبوضات میں شامل تھے، چنانچہ اسی سال اس نے اریواں فتح کرلیا، یہ شہر پہلے سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں رہ چکا تھا۔

بغداد کی فتح ۱۶۳۸ء میں مراد اپنے عہد کی آخری اور سب سے بڑی مہم پر روانہ ہوا، بغداد پندرہ سال سے ایرانیوں کے قبضہ میں تھا اور باوجود کئی محاصروں کے ترک اسے واپس لینے میں کام یاب نہ ہوسکے تھے، اسے اول اول سلطان سلیمان اعظم نے فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا تھا لیکن مراد کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال جب کہ بغاوتوں اور بدنظمیوں کے باعث سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا، شاہ عباس صفوی نے بکیر آغا کی غداری سے فائدہ اٹھا کر اس پر قبضہ کرلیا تھا، اب ۱۶۳۸ء میں مراد اس سابق مقبوضہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوا، ۱۵ر نومبر ۱۶۳۸ء کو عثمانی فوجوں نے بغداد پہنچ کر شہر کا محاصرہ کرلیا، محصورین جن کی تعداد تیس ہزار تھی، نہایت دلیری اور جاں بازی سے مقابلہ کرتے رہے لیکن ترکوں کی تعداد، ان کی فوجی تنظیم اور سب سے بڑھ کر خود مراد کی غیر معمولی شجاعت تمام مدافعت پر غالب آئی، دوران محاصرہ میں مراد معمولی سپاہیوں کے دوش بہ دوش کھائیوں میں کام کرتا تھا

اوران کی ہمت قائم رکھنے کے لیے وہ ہر کام میں ان کا شریک رہتا تھا، جب ایرانیوں کے دیکھا کہ وہ کام یابی کے ساتھ مقابلہ نہ کرسکیں گے تو ایک روز انہوں نے اپنے سب سے بڑے پہلوان اور بہادر کو باہر نکال کر ترکوں کو چیلنج دیا کہ وہ بھی دست بہ دست لڑائی کے لیے اپنی فوج کے سب سے بڑے بہادر کو آگے بڑھائیں، یہ چیلنج سن کر مراد خود اس ایرانی پہلوان کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اور دیر تک شمشیر زنی کے جوہر دکھا کر ایک تیغہ ایسا مارا کہ ایرانی کا سر کٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا، مراد اپنی جسمانی قوت اور حربی قابلیت کے لحاظ سے تمام عثمانی لشکر میں کوئی حریف نہیں رکھتا تھا، بہر حال ۲۲ر دسمبر ۱۶۳۸ء کو ترکی توپوں نے فصیل شہر میں آٹھ سو گز چوڑا ایک رخنہ پیدا کر دیا اور اس وقت سے دونوں فوجوں کا اصل مقابلہ شروع ہوا، ترک شہر میں داخل ہونے کے لیے دوڑے لیکن ایرانیوں نے اپنی قابل داد جاں بازی سے دو روز تک انہیں اندر قدم رکھنے سے روکے رکھا، بالآخر (۲۵ر دسمبر ۱۶۳۸ء) تیسرے روز صدر اعظم طیار محمد پاشا فوج لے کر آگے بڑھا اور گو وہ خود گولی کھا کر گرا تاہم ترک گولیوں کی باڑھ سے بے خوف ہو کر لڑتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے، بارہ سو سواروں کا ایک دستہ بغداد کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر مراد فروری ۱۶۳۹ء میں قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوا اور ۱۰ر جون ۱۶۳۹ء کو نہایت شان وشوکت کے ساتھ دار السلطنت میں داخل ہوا، قسطنطنیہ اس سے قبل سلاطین عثمانیہ کی ایسی فاتحانہ واپسی بارہا دیکھ چکا تھا لیکن سلطان مراد رابع کا یہ داخلہ اس قسم کا آخری داخلہ تھا، اس کے بعد پھر کوئی سلطان فتوحات حاصل کر کے پایۂ تخت میں نہیں آیا۔

ایران سے صلح | ۱۵ر ستمبر ۱۶۳۹ء کو ایران اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کی رو سے اریوان ایرانیوں کو واپس کر دیا گیا لیکن بغداد اور اس کے ملحق علاقہ پر عثمانیوں کا قبضہ باقی رہا۔

وفات | ۹ر فروری ۱۶۴۰ء کو مراد نے اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پائی، بغداد سے واپس آنے کے بعد سب سے پہلے اس نے سلطنت کی بحری قوت کو جو بہت کچھ کم زور ہو گئی

تھی، درست کرنے کی کوشش کی اور البانیا اور اس کے قریبی اضلاع میں بغاوت کی جو شورش اس کی ایشیائی مہم کے زمانہ میں پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کیا، لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی آئندہ جنگ وینس سے ہوگی اور اس نے اس جنگ کے لیے تیاریاں شروع بھی کر دی تھیں لیکن اسی دوران میں وہ بخار میں مبتلا ہو گیا جس سے جاں بر نہ ہو سکا، موت سے پہلے اس نے اپنے بھائی ابراہیم کے قتل کا حکم دیا، ابراہیم مراد کے بعد سلطنت کا تنہا وارث تھا، سلطانہ والدہ نے اس کی حکم کی تعمیل نہ ہونے دی اور مراد کے پاس کہلا بھیجا کہ ابراہیم اس کی خواہش کے مطابق قتل کر دیا گیا، مراد اس وقت حالت نزع میں تھا، قتل کی اطلاع پا کر وہ مسکرایا اور پھر فوراً ہی ختم ہو گیا۔

ذاتی اوصاف سلطان مراد رابع آل عثمان کا آخری جنگجو اور فاتح فرماں روا تھا، اس نے صرف آٹھ سال حکومت کی اور صرف اٹھائیس سال کی عمر میں وفات پا گیا لیکن اس قلیل مدت اور نوعمری میں اس نے سلطنت عثمانیہ کو، جس کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا اور جو فوج کی بغاوت، صوبے داروں کے تمرد اور ہر شعبہ کے انتشار کے باعث تباہی اور بربادی سے بالکل قریب پہنچ گئی تھی، تمام خرابیوں اور فسادات سے پاک کر کے از سر نو ایک تازہ زندگی بخش دی، وہ حد درجہ متشدد اور سخت گیر تھا لیکن اس کا تشدد اور اس کی سخت گیری سلطنت کی بقا کے لیے ضروری تھی، اس کا احتساب بعض اوقات ظلم کی حد تک پہنچ جاتا تھا اور سیکڑوں بے گناہ محض شبہ کی بنا پر اس کے حکم سے قتل کر دیے گئے لیکن ایسی حالت میں کہ تمام سلطنت میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک حکومت کا کوئی شعبہ فساد سے پاک نہ تھا، ان بے گناہوں کا خون بھی بہر حال مفید ہی ثابت ہوا، یہ اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ فوج کی باغیانہ سرکشی یک قلم موقوف ہو گئی، عدالتوں میں انصاف ہونے لگا، رعایا کو لگان وصول کرنے والوں کی تعدی کی شکایت باقی نہ رہی اور ملک میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک امن عام اور خوش حالی ہی کے مناظر نظر آنے لگے۔

ابراہیم

۱۰۴۹ھ تا ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۰ء تا ۱۶۴۸ء

سلطان مراد رابع کے بعد اس کا بھائی ابراہیم جو سلطنت عثمانیہ کا تنہا وارث رہ گیا تھا، تخت نشین ہوا، تھوڑے ہی دنوں میں اس نے مراد کے تمام کارناموں پر پانی پھیر دیا، آٹھ سال تک محل میں قید رہنے کی وجہ سے حکومت کی جو تھوڑی بہت اہلیت اس میں پہلے تھی، وہ بھی جاتی رہی اور تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو صرف عیش پرستی کی نذر کر دیا، قتل وخوں ریزی میں وہ بھی مراد ہی کی طرح بے باک تھا لیکن مراد نے اپنے سامنے مفاد سلطنت کا جو مقصد رکھا تھا، ابراہیم کے تشدد کو اس سے دور کا تعلق بھی نہ تھا، اس کی سخت گیری تمام تر اپنے ذاتی اغراض کے لیے تھی، اس نے وہ تمام خزانہ جو مراد نے حسن تدبیر کا کفایت شعاری سے جمع کیا تھا، حرم کے تعیّشات پر صرف کر ڈالا، وہ تمام برائیاں جو سلطنت کو برباد کر رہی تھیں اور جن کا استیصال مراد نے اپنی حکومت کا واحد مقصد قرار دیا تھا، ابراہیم کے عہد میں از سرنو پیدا ہوگئیں اور نہایت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگیں، امور سلطنت میں حرم کا دخل پھر شروع ہو گیا، کچھ دنوں تک تو صدر اعظم قرہ مصطفیٰ نے ابراہیم کو سنبھالنے کی کوشش کی اور مالیات کا انتظام درست رکھنا چاہا لیکن سلطنت کے لیے اس کی خیر خواہی خود اس کے حق میں مہلک ثابت ہوئی اور اس کے مخالفوں نے حرم سلطانی کے ساتھ سازش کر کے ابراہیم کو اس کے قتل پر آمادہ کر دیا، قرہ مصطفیٰ کے قتل کے بعد اس کے جانشین سلطان

زادہ پاشا نے ابراہیم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے ہر فعل کو سراہنا شروع کیا اور اسے یقین دلایا کہ چوں کہ وہ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہے، اس کا ہر قول وفعل حقیقتۂ الہام ربانی کے مطابق ہوتا ہے، ابراہیم اب پہلے سے بھی زیادہ آزاد ہو گیا، مراد کا جمع کیا ہوا خزانہ جب اس کی ضروریات عیش پوری نہ کر سکا تو اس نے سلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدوں کو جن میں فوجی عہدے بھی شامل تھے، فروخت کرنا شروع کیا اور ان عہدوں پر وہی امیدوار مقرر کیے جانے لگے جو بڑی سے بڑی رقم پیش کر سکتے تھے، قدیم محصولوں کے علاوہ متعدد جدید محصول بھی عائد کیے گئے جن میں سے بعضوں کے نام ہی سے ان کی مضحکہ خیز ضرورت ظاہر ہوتی ہے، ابراہیم کو خوش بو خصوصاً عنبر کا بہت شوق تھا، اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک ''عنبر ٹیکس'' نافذ کیا، اسی طرح اسے سمور کا بھی بہت شوق تھا اور اس کے لیے بھی اس نے ایک خاص ٹیکس جاری کیا جس کا نام ''سمور ٹیکس'' تھا، اس نے سلطنت کے تمام والیوں اور بڑے بڑے عہدہ داروں کے نام جاری کیے کہ ایک متعین تعداد سمور کی فراہم کر کے قسطنطنیہ روانہ کی جائے، یہ مطالبہ قاضیوں اور فوجی افسروں سے بھی کیا گیا، ان جدید محصولوں سے تمام سلطنت میں ایک عام برہمی پیدا ہو گئی، حرم کے اخراجات اور تعیّشات کے لیے جب یہ رقمیں بھی ناکافی ثابت ہوئیں تو ابراہیم نے مختلف حیلوں سے بعض بڑے بڑے آدمیوں کی موروثی جائدادوں کو ضبط کر کے فروخت کر ڈالا، رعایا کے صبر وتحمل کا پیمانہ اب لب ریز ہو رہا تھا اور وہ بغاوت کے لیے بالکل آمادہ تھی، ابراہیم نے اپنی بے راہ روی سے ہر طبقہ کو بے زار کر دیا تھا، فوج، علماء کی جماعت اور پایہ تخت کا ہر طبقہ بغاوت کے لیے تیار تھا، چنانچہ ابراہیم کو معزول کرنے کے لیے ایک جماعت نے، جسے اکابر علماء کی حمایت حاصل تھی، کوشش شروع کی، اس سازش کے بانیوں میں ینی چری کے سردار پیش پیش تھے، باغیوں نے ابراہیم کے خلاف حسب ذیل فرد جرم قائم کی:

''بادشاہ نے اپنے جبر وتعدی سے عالم عثمانی کو تباہ کر دیا ہے، عنان سلطنت

عورتوں کے ہاتھوں میں ہے، خزانہ ان کے اخراجات پورا کرنے سے قاصر ہے، رعایا برباد ہوگئی ہے، کفار کی فوجیں سرحدی شہروں کا محاصرہ کر رہی ہیں، ان کے بحری بیڑے دردانیال کو روکے ہوئے ہیں۔''

ابراہیم کی معزولی غرض متفقہ طور پر ابراہیم کو تخت سے اتارنے کا فیصلہ کرلیا گیا، سلطانہ والدہ نے اس کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن بالآخر اسے بھی باغیوں کا مطالبہ منظور کرنا پڑا، چنانچہ ۱۸؍رجب ۱۰۵۸ھ (۸؍اگست ۱۶۴۸ء) کو فوجی سرداروں اور دارالسلطنت کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں نے شہزادہ محمد کو جس کی عمر اس وقت صرف سات سال کی تھی، تخت پر بیٹھا کر اطاعت کا حلف لیا اور ابراہیم کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔

ابراہیم کا قتل ابراہیم کو قید میں صرف دس روز گزرے تھے کہ ''سپاہی'' فوج میں اس کی حمایت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اسے معزول کرنے والوں کو اندیشہ ہوا کہ وہ پھر تخت پر بیٹھا دیا جائے گا، اس خطرہ کو ہمیشہ کے لیے رفع کرنے کی غرض سے انہوں نے مفتی اعظم سے یہ استفتاء کیا:- کیا ایسے فرماں روا کو معزول اور قتل کرنا جائز ہے جو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ان لوگوں کو معمور نہیں کرتا جو ان کے اہل ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو مقرر کرتا ہے جو ان عہدوں کو قیمتاً خریدتے ہیں، مفتی اعظم نے صرف ایک لفظ ''ہاں'' میں اس فتویٰ کا جواب دیا اور اس کے بعد ابراہیم فوراً قتل کر دیا گیا۔

ازف کی مہم ابراہیم کا مختصر عہد حکومت اندرونی اختلال کے باوجود بیرونی فتوحات کے لحاظ سے اہمیت سے خالی نہ تھا، اس عہد میں دو معرکے پیش آئے اور دونوں میں آخر کار دولت عثمانیہ کو فتح حاصل ہوئی، ان میں ایک ازف کی مہم تھی اور دوسری جزیرہ کریٹ کی، ازف کا شہر جو بحر ازف پر واقع ہے اور تجارتی اور حربی دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ اہمیت رکھتا ہے، ابراہیم کی تخت نشینی سے چار سال قبل روسی قزاقوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا، ابراہیم کے پہلے صدر اعظم قرہ مصطفیٰ نے یہ دیکھ کر کے بحر اسود کے شمالی حصہ میں ترکی قوت کو برقرار رکھنے

کی کس قدر ضرورت ہے، ۱۶۴۱ء میں ازف کو ان قزاقوں سے واپس لینے کے لیے ایک فوجی بیڑا روانہ کیا، قزاقوں نے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ترکوں کو مجبوراً واپس ہونا پڑا، دوسرے سال پھر ایک فوج روانہ کی گئی، جس کے ساتھ خان کریمیا، جو دولت علیہ کا باج گزار تھا، ایک لاکھ تاتاریوں کو لے کر شامل ہو گیا، قزاق اس زبردست فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے اس میں آگ لگا دی، ترکوں نے اسے نہایت مضبوطی کے ساتھ از سر نو تعمیر کیا اور قلعہ بند کر کے اسلام پاشا کی ماتحتی میں چھبیس ہزار کا ایک دستہ متعین کر دیا۔

روس سے آویزش قزاق برابر ترکی علاقوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، جس کے جواب میں تاتاری بھی روسی علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہتے تھے، چوں کہ قزاق سلطنت روس کی رعایا سمجھے جاتے تھے، اس لیے ان کے اس طرز عمل سے دولت علیہ اور روس کے درمیان اکثر شکایتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں، زار روس ان قزاقوں کے فعل سے اپنی بریت ظاہر کرتا تھا، چنانچہ اس نے ایک خط سلطان کو لکھ کر یہی معذرت پیش کی کہ قزاق اس کے قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور اپنے جرائم کی سزا سے بچنے کے لیے اتنے دور دراز مقامات میں چلے گئے ہیں کہ حکومت روس کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، مگر اس کو دولت علیہ سے یہ گلہ تھا کہ وہ روس کے خلاف تاتاریوں کی حمایت کرتی ہے، آخر کار سلطان نے وعدہ کیا کہ اگر زار ان قزاقوں کو قابو میں رکھے گا اور خراج کی رقم حسب دستور قدیم خان کریمیا کو ادا کرتا رہے گا تو ترکی فوج روس کے خلاف تاتاریوں کی حمایت نہ کرے گی لیکن زار اور سلطان کے اس معاہدہ کا کوئی خاص اثر ان کی رعایا پر نہ پڑا اور ابراہیم کے عہد میں قزاقوں کا تاتاریوں کی سرحدی جنگ کا سلسلہ برابر قائم رہا، ۱۶۴۶ء میں تاتاری ان قزاقوں کو روس کے صوبوں میں دور تک بھگا لے گئے اور وہاں سے تین ہزار قیدی گرفتار کر لائے، زار نے اس کے جواب میں ازف پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن اس فوج کو کئی بار شکست ہوئی اور موسیٰ

پاشا نے چار سو قیدی اور آٹھ سو روسیوں کے سر مال غنیمت کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیے۔

اسلام گرائی، خان کریمیا روسیوں کا سخت دشمن تھا، اوائل ۱۶۴۸ء میں پولینڈ اور روس کے علاقوں پر حملہ کر کے ان ملکوں کی چالیس ہزار رعایا کو گرفتار کر لایا، پولینڈ اور روس نے اپنے سفراء باب عالی میں بھیجے اور خان کریمیا کے اس فعل کا تدارک چاہا، ابراہیم نے اپنے دو افسروں کو خان کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ ان مسیحی قیدیوں کو قسطنطنیہ روانہ کر دو تا کہ وہ سفراء کے حوالہ کر دیے جائیں، خان نے سلطان کا خط پڑھ کر خشکی سے جواب دیا، میں اور یہاں کے سب لوگ سلطان کے خادم ہیں لیکن اہل روس محض ظاہری طور پر صلح کے خواست گار ہیں، وہ صرف ہماری فتوحات سے دب کر صلح چاہتے ہیں، اگر ہم انہیں مہلت دیے دیتے ہیں تو وہ اناطولیہ کے ساحلوں کو تاراج کر ڈالیں گے، میں ایک سے زائد بار دیوان عالی سے عرض کر چکا ہوں کہ قریبی علاقہ میں دو مضبوط مقامات ایسے تھے جن کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی لیکن جن پر قبضہ کر لینا ہمارے لیے دانش مندی کی بات ہوتی، مگر اب روسیوں نے ان مقامات پر قبضہ کر لیا ہے اور انہوں نے وہاں بیس سے زیادہ فوجی چوکیاں بنا لی ہیں، اگر ہم اس سال بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو وہ اکرمان پر بھی قبضہ کر لیں گے اور پھر تمام مولڈیویا کو فتح کر لیں گے'' یہ جواب دے کر اس نے سلطان کے قاصدوں کو قسطنطنیہ واپس کر دیا۔

کریٹ کی مہم ۱۶۴۵ء میں ابراہیم نے ایک فوج کریٹ کی فتح کے لیے روانہ کی، یہ جزیرہ جمہوریہ وینس کا مقبوضہ تھا، وینس اور دولت عثمانیہ کے درمیان اس وقت کوئی جنگ نہ تھی، کریٹ پر حملہ کرنے کا سبب یہ ہوا کہ مالٹا کے چند بحری قزاقوں نے ترکی تجارتی جہازوں کے ایک بیڑے کو جو قسطنطنیہ سے مصر جا رہا تھا، گرفتار کر لیا اور اسے لے کر کریٹ کے شمالی ساحل پر لنگر انداز ہوئے، ابراہیم اس واقعہ کی خبر پا کر نہایت برہم ہوا اور اس نے پہلے مالٹا ہی پر حملہ کرنا چاہا لیکن اس کے افسروں نے سمجھایا کہ مالٹا کی مہم جسے سلیمان اعظم

جیسا طاقتور سلطان بھی سر نہ کر سکا، آسان نہ ہوگی، اس لیے مالٹا کے بجائے کریٹ پر حملہ کرنا زیادہ مناسب ہے، کریٹ چوں کہ بحر یونان کے مدخل کے قریب نیز قسطنطنیہ اور مغربی ولایتوں (تونس والجزائر وغیرہ) کے راستہ پر واقع تھا، اس لیے اپنے موقع کے لحاظ سے سلطنت عثمانیہ کے لیے بہ نسبت مالٹا کے زیادہ موزوں بھی تھا، پھر چوں کے مالٹا کے بحری قزاق عثمانی جہازوں کو گرفتار کر کے کریٹ ہی کے بندرگاہوں میں لنگر انداز ہوئے تھے، اس لیے جمہوریہ وینس کی گوشمالی بھی ضروری تھی، چنانچہ ایک جنگی بیڑا ۳۰؍اپریل ۱۶۴۵ء کو دردانیال سے روانہ ہوا، اعلان مالٹا پر حملہ کرنے کا ہوا لیکن امیر البحر کو خفیہ ہدایتیں کریٹ کے متعلق دی گئیں، ۲۴؍جون کو یہ بیڑا کریٹ کے مغربی بندرگاہ کانیا (Canea) میں پہنچ گیا، جمہوریہ وینس کو سلطان کے اصلی ارادہ کی اطلاع پہلے سے ہو چکی تھی، اس لیے کریٹ کے تمام قلعے مدافعت کے لیے تیار تھے، جزیرہ کی مقامی فوجیں اکٹھا کر لی گئی تھیں اور وینس سے کمک بھی آ گئی تھی، پھر بھی ساحل کی حفاظت کے لیے یہ فوجیں ناکافی ثابت ہوئیں اور ترکوں نے آسانی کے ساتھ کانیا پر قبضہ کر لیا، دوسرے سال انہوں نے ریٹینو (Retino) کو بھی لے لیا، ان دونوں شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد عثمانی فوج جزیرہ میں داخل ہوئی اور پھر ۱۶۴۸ء میں کریٹ کے پایہ تخت کینڈیا (Candia) کا محاصرہ شروع ہوا جو تقریباً اکیس سال تک جاری رہا، اہل وینس نے کینڈیا کے بچانے کی حتی المقدور پوری کوشش کی، انتقاماً انہوں نے لیمناس (Lemnos) اور ٹینڈاس (Tenedos) کے جزیروں پر جو عثمانی مقبوضات تھے، قبضہ کر لیا اور قسطنطنیہ کے ساحلی علاقوں پر کئی بار چھاپے مارے لیکن ان تمام تدبیروں کے باوجود وہ ترکوں کو کینڈیا کے محاصرہ سے ہٹا نہ سکے اور سلطان محمد رابع کے دور میں یہ شہر فتح ہو گیا اور کریٹ کا جزیرہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

محمد رابع

۱۰۵۸ھ تا ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۴۸ء تا ۱۶۸۷ء

تخت نشینی کے وقت محمد رابع کی عمر صرف سات سال کی تھی، اس نے انتالیس سال حکومت کی، ابتدائی آٹھ سال سلطنت کے لیے ہر طرح کے اندرونی اور بیرونی خطرات سے پر تھے، سلطان کی نوعمری کے زمانہ میں عنانِ حکومت حرم کے ہاتھ میں تھی، اس سے بڑھ کر بدقسمتی یہ تھی کہ خود حرم میں دو جماعتیں ایک دوسرے کی حریف تھیں، ایک کی سردار سابق سلطان ابراہیم کی والدہ تھی، دوسری کی سیادت سلطان وقت کی والدہ کو حاصل تھی، سلطنت کا شیرازہ ان حریفوں کی کشمکش سے پراگندہ ہو رہا تھا، فوج میں دونوں جماعتوں کے حامی موجود تھے اور قسطنطنیہ کی سڑکوں پر اکثر بدامنی اور کشت وخون کے مناظر پیش آتے رہتے تھے، سلطنت کے مختلف صوبوں میں بھی تقریباً یہی حالت تھی، بغاوت اور سرکشی کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، ۱۶۴۹ء میں ایک شخص قاطرجی اوغلی نے ایشیائے کوچک میں علم بغاوت بلند کیا، کورجی بنی نامی ایک دوسرا باغی بھی اس کے ساتھ ہو گیا اور دونوں نے مل کر احمد پاشا والی اناطولیہ کو شکست دے دی، اس کے بعد وہ قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے، لیکن اثنائے راہ میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ ہو گئے، عثمانی فوج نے کورجی بنی کو شکست دے کر اسے قتل کر دیا، قاطرجی اوغلی نے بھی شکست کھائی لیکن سلطان نے اسے معاف کر کے کرمانیہ کا والی بنا دیا اور یہ بغاوت ختم ہوئی، تاہم سلطنت

کے اور حصوں میں جو شورش پیدا ہوگئی تھی وہ بدستور جاری رہی، پایہ تخت میں یہ صورت بہت زیادہ نمایاں تھی، آخر کار حرم کی سازشیں سابق سلطانہ والدہ کے قتل پر ختم ہوئیں۔

آسٹریا کے لیے حکومت عثمانیہ کی یہ پراگندگی نہایت مفید تھی اور وہ اس کے اختلال سے فائدہ اٹھا کر بآسانی ہنگری کو واپس لے سکتی تھی لیکن جنگ سی سالہ نے اس کو اتنا زیادہ چور کر دیا تھا کہ وہ اس اقدام کی جرأت نہ کر سکی، البتہ جمہوریہ وینس سے جنگ کا سلسلہ جس کا آغاز کریٹ کے حملہ سے ہوا تھا، برابر جاری رہا اور جمہوریہ کے ایک جنگی بیڑے نے دردانیال کے قریب ایک عثمانی بیڑے کو شکست دے کر جزائر لیمیناس اور ٹیبید اس پر قبضہ کر لیا، اس نے دردانیال کے دہانہ کی ناکہ بندی بھی کر دی جس کی وجہ سے قسطنطنیہ کے سامان رسد کا راستہ بند ہوگیا، دار السلطنت میں سخت گرانی پھیل گئی، ان بیرونی حملوں کے علاوہ سلطنت کے اندرونی حصہ میں ہر طرح کی بے امنی اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، خوش قسمتی سے عین اس وقت جب کہ دولت علیہ ایک نہایت نازک دور سے گزر رہی تھی اور بہ ظاہر اس کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی، سلطانہ والدہ نے صدر اعظم کے عہدہ پر ایک ایسے شخص کو مقرر کیا جس نے پانچ ہی سال کے اندر تمام فوجی اور ملکی شعبوں کی کامل اصلاح کر کے سلطنت کو نہ صرف تباہی سے بچا لیا بلکہ اس میں از سر نو وہ طاقت و سطوت بھی پیدا کر دی جسے سلطان مراد رابع کے بعد دولت علیہ تقریباً تمام تر کھو چکی تھی۔

محمد کوپریلی | صدر اعظم محمد کوپریلی کا آبائی وطن البانیا تھا، مگر اس کا دادا اماسیا واقع ایشیائے کوچک کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوپری میں آکر آباد ہوگیا تھا، محمد کو ابتدائی تعلیم بھی نصیب نہ ہوئی اور ابھی وہ لڑکا ہی تھا کہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا، حسن اتفاق سے اس کو سلطان کے مطبخ میں نوکری مل گئی، وہاں اپنی فطری ذہانت کی وجہ سے اس نے بہت جلد ترقی کر لی اور کچھ عرصہ کے بعد شاہی مطبخ کا باورچی ہوگیا لیکن حکومت کے بعض اہل نظر نے اس نوجوان کی قابلیت کا اندازہ کر کے اسے باورچی خانہ سے نکالا اور

زیادہ معزز خدمات اس کے سپرد کیں، ہر جگہ اس نے اپنی غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا، چنانچہ آخر میں وہ یکے بعد دیگرے دمشق، طرابلس اور یروشلم کا والی مقرر ہوا اور ان میں سے ہر صوبہ میں اس نے ایک عادل، مضبوط اور نرم دل حاکم کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، پھر جب سلطان محمد رابع کی تخت نشینی کے بعد سلطنت کے ہر حصہ اور حکومت کے ہر شعبہ میں شورش اور ابتری بڑھنے لگی تو صدارت عظمیٰ کی ذمہ داریوں کو تفویض کرنے کے لیے سلطانہ والدہ کی نظر انتخاب بھی محمد کوپریلی ہی پر پڑی، چنانچہ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں محمد کوپریلی نے دولت عثمانیہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اس وقت اس کی عمر ستر سال کی تھی، چوں کہ وہ بوڑھا اور لکھنے پڑھنے سے بالکل نابلد تھا، اس لیے علماء اور اعیان سلطنت نے اس کے تقرر کے خلاف احتجاج کیا لیکن دمشق، طرابلس اور یروشلم کی ولایت کے زمانہ میں کوپریلی نے اپنی قابلیت کا جو ثبوت دیا تھا وہ سلطانہ والدہ کے انتخاب کی پرزور تائید کر رہا تھا، تاہم اس جلیل القدر عہدہ کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے پہلے محمد کوپریلی نے سلطانہ والدہ سے جو نوعمر سلطان کی نمائندہ تھی، چند شرطیں بہ حلف منظور کرالیں، پہلی شرط یہ تھی کہ سلطان اس کی تمام کارروائیوں کو جو وہ بہ حیثیت صدر اعظم عمل میں لائے گا، بغیر کسی بحث کے منظور کرلیا کرے گا، دوسری شرط یہ تھی کہ اسے تمام عہدوں کے تقرر اور امتیازات کے عطا کرنے میں پورا اختیار حاصل ہوگا، تیسری شرط یہ تھی کہ سلطان کو اس پر کامل اعتماد رہے گا اور اس کے خلاف ہر شکایت کو وہ فوراً مسترد کر دے گا۔

ان غیر محدود اختیارات کے ساتھ محمد کوپریلی نے سلطنت کی اصلاح کا کام شروع کیا اور ہر شعبہ کی خرابیوں کو اس سختی کے ساتھ دور کیا جو مراد رابع کے طریق اصلاح کی نمایاں خصوصیت تھی، غیر متدین عہدہ دار، غیر منصف قضاۃ، فوج کے سرکش سردار و سپاہی سب کے سب فوراً قتل کر دیے گئے، یہی حشر ان لوگوں کا ہوا جو کوپریلی کے خلاف سازش کرتے ہوئے پائے گئے یا جن پر اس سازش کا شبہ بھی ہوا، قسطنطنیہ میں درویشوں کی ایک جماعت

نے شورش برپا کر رکھی تھی، کوپریلی نے ان سب کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا، ان میں سے ایک درویش نے جس کا اثر عوام پر بہت زیادہ تھا، کوپریلی کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا چاہا، اس نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا، اسی طرح اس نے کلیسائے یونان کے بطریق اعظم کو بھی جو درپردہ امیرِ ولاچیا کو بغاوت کے لیے ابھارنا چاہتا تھا، گرفتار کر کے سولی دے دی، اس کی باریک بیں نگاہ سے کوئی بے عنوانی اور کسی سازش کی خفیہ سے خفیہ تیاری بھی چھپی نہ رہتی، اس کے جاسوس سلطنت کے بعید ترین حصوں میں بھی نہایت سرگرمی سے کام کرتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے اس کی ہیبت صوبے داروں اور فوج کے بڑے بڑے عہدہ داروں سے لے کر حکومت کے ادنیٰ ملازموں تک کے دلوں میں یکساں طور پر بیٹھی ہوئی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی پنج سالہ صدارت میں چھتیس ہزار آدمی اس کے حکم سے قتل کیے گئے، بابِ عالی کے خاص جلاد ذوالفقار کا بیان ہے کہ خود اس کے ہاتھ سے چار ہزار سے زیادہ آدمی پھانسی پا کر باسفورس میں پھینک دیے گئے۔

محمد کوپریلی کا یہ تشدد بادی النظر میں نہایت ظالمانہ معلوم ہوتا ہے لیکن سلطنت میں جو شورش اور بغاوت پھیلی ہوئی تھی اس کا تدارک تشدد کے بغیر ممکن ہی نہ تھا، یہ اسی سختی کا نتیجہ تھا کہ صرف پانچ سال کی مدت میں ہر طرف امن و امان اور عدل و انصاف دکھائی دینے لگا، تمام شورشیں دیکھتے دیکھتے فرو ہو گئیں، فوج کی سرکشی جاتی رہی اور سلطنت کے ہر شعبہ کا نظام درست ہو گیا۔

محمد کوپریلی نے نہ صرف سلطنت کے اندرونی نظم و نسق کو درست کیا بلکہ بیرونی حملوں کو بھی روکا، اس نے عثمانی بیڑے کو از سرِ نو تعمیر کرایا، جس کی وجہ سے بحر الجین میں دولت علیہ کی سطوت پھر قائم ہو گئی، اس نے وینس کے جہازوں کو شکست دے کر جزائر لیمناس و ٹینیڈ اس واپس لے لیے اور کینڈیا کا محاصرہ جو محمد رابع کے ابتدائی عہد میں فوج کی سرکشی کے باعث کسی حد تک کمزور ہو گیا تھا، پھر پوری شدت کے ساتھ جاری کرایا۔

۱۰۷۲ھ (۱۶۶۱ء) میں محمد کوپریلی نے وفات پائی، انتقال سے پہلے اس نے سلطان اور سلطانہ والدہ سے اپنے لڑکے احمد کوپریلی کو اپنا جانشین نامزد کرالیا تھا، مرتے وقت بھی وہ سلطنت کی بہبودی سے غافل نہ تھا، چنانچہ اس نے سلطان سے مندرجہ ذیل چار نصیحتوں پر خاص طور سے کاربند رہنے کی تاکید کی:

۱- عورتوں کا مشورہ کبھی نہ سنا جائے، ۲- کسی رعیت کو حد سے زیادہ دولت مند نہ ہونے دیا جائے، ۳- سلطنت کا خزانہ ہمیشہ پر رکھا جائے، ۴- سلطان خود ہمیشہ گھوڑے کی پیٹھ پر رہے اور فوج کو ہمیشہ حرکت میں رکھے۔

احمد کوپریلی محمد کوپریلی کی وفات کے وقت سلطان محمد رابع بیس سال کا ہو چکا تھا اور اب وہ عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا لیکن اسے شکار کا بے حد شوق تھا اور اسی میں اپنا تمام وقت صرف کرتا تھا، اس نے سلطنت کا سارا انتظام نئے صدر اعظم احمد کوپریلی کے سپرد کر دیا تھا اور اس پر پورا اعتماد رکھتا تھا، ۱۶۶۱ء سے لے کر اپنی وفات (۱۶۷۶ء) تک احمد کوپریلی ہی دراصل سلطنت عثمانیہ کا فرماں روا تھا، وہ اپنی لیاقت، اپنے تدبر اور اپنی عظمت کے لحاظ سے دولت عثمانیہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ممتاز صدر اعظم خیال کیا جاتا ہے، تمام عثمانی اور مسیحی مؤرخین کو اس کی حیرت انگیز قابلیت پر اتفاق ہے، تقرر کے وقت اس کی عمر صرف چھبیس سال کی تھی، محمد کوپریلی نے اسے بہترین تعلیم دلوائی تھی اور انتظام سلطنت کی تعلیم خود اپنی نگرانی میں دی تھی، نیز ایک صوبہ کی ولایت پر مامور کر کے صدارت عظمٰی کی ذمہ داریوں کے لیے بھی اسے پہلے سے تیار کر دیا تھا، ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے بھی احمد کوپریلی نہایت ممدوح تھا، اس کی خوش خلقی اور منکسر مزاجی خاص طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیتی تھی، وہ شرعی احکام کی پابندی نہایت سختی سے کرتا اور اس کی زندگی اسلامی زندگی کا ایک قابل تقلید نمونہ تھی، جس کا اثر اس کے ہم عصر وزیروں اور عہدہ داروں پر بھی پڑا، اس کے ان ہی محاسن کی بنا پر ترک اسے فاضل احمد کہتے تھے۔

احمد کوپریلی بھی اپنے والد کی طرح ایک مضبوط قوت ارادی اور پختہ عزم رکھتا تھا تاہم اس میں وہ تشدد نہ تھا، جو محمد کوپریلی کی وزارت کی خصوصیت تھی، احمد فطرتاً زیادہ حلیم اور نرم دل تھا، تقرر کے بعد ایک سال تک تو اس نے سختی جاری رکھی لیکن پھر اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اور سلطنت کا انتظام بغیر کسی سختی کے ہوتا رہا، اسے رعایا کا بہت زیادہ خیال تھا، ان کی بہبودی کے لیے اس نے وہ سب کچھ کیا جو اس کے امکان میں تھا، خصوصاً اس نے محصولوں کا بار بہت ہلکا کر دیا، سپاہی جاگیرداروں کی سخت گیری اور پاشاؤں نیز مقامی عہدہ داروں کے مظالم سے رعایا بہت پریشان تھی، احمد نے ان مصیبتوں سے بھی اسے نجات دلائی، کچھ عرصہ سے مسیحی کلیساؤں کی تعمیر پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، احمد نے ان رکاوٹوں کو بالکل دور کر دیا، باوجود اس کے کہ اسے مختلف ملکوں سے جنگ کرنی پڑی، اس نے خزانہ کو ہمیشہ پر رکھا، اس کی غیر معمولی قابلیت کا اندازہ فوج مہمات سے زیادہ اس کے ملکی انتظامات سے ہوتا ہے، اس کی حربی لیاقت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی اور اس نے متعدد اہم فتوحات سے سلطنت کو وسعت دی تاہم اسے دو بار سخت شکست اٹھانی پڑی، جس سے دولت علیہ کی عظمت کو خاصہ صدمہ پہنچا، پہلی اہم شکست آسٹریا کے مقابلہ میں پیش آئی اور دوسری پولینڈ کے مقابلہ میں۔

آسٹریا سے جنگ ۱۶۶۳ء میں آسٹریا سے لڑائی چھڑ گئی، یہ جنگ ان مناقشات کا نتیجہ تھی جو ڈیڑھ صدی سے ہنگری اور ٹرانسلوینیا میں جاری تھے، دو سال پیش تر سے آسٹریا اور دولت عثمانیہ کے حامیوں کے درمیان صوبوں میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہو رہی تھیں، جن میں دونوں سلطنتوں کے فوجی افسر جو سرحدی علاقوں پر متعین تھے حصہ لیتے رہے، ۱۶۶۳ء میں احمد کوپریلی ایک زبردست فوج لے کر آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ ہوا، اس نے بلغراد پہنچ کر دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور پھر شمال میں نوہزل کی طرف بڑھا، یہ قلعہ یورپ کے سنگین ترین قلعوں میں تھا اور آسٹریا کو اس کی مضبوطی پر پورا بھروسہ تھا لیکن پانچ ہفتہ کے محاصرہ کے بعد ۲۵ رصفر ۱۰۷۴ھ مطابق ۲۸ رستمبر ۱۶۶۳ء کو محصورین نے ہتھیار ڈال کر قلعہ عثمانیوں

کے سپرد کر دیا، نوہزل کی فتح کے بعد احمد کو پریلی نے متعدد دوسرے قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا، اس کے بعد موسم سرما گزارنے کے لیے وہ بلغراد واپس گیا۔

دوسرے سال مئی میں وہ پھر نوہزل آیا اور وہاں سے دریائے مور کو عبور کر کے ۷/جولائی ۱۶۶۴ء کو قلعہ سرینوار فتح کر لیا، ۲۶/جولائی کو وہ کومورن (Komorn) پہنچا جو ہنگری اور آسٹائریا کی سرحد پر دریائے راب کے لب ساحل واقع تھا، اگر وہ اس دریا کو عبور کر لیتا تو ویانا کا راستہ صاف ہو جاتا لیکن آسٹریا اور ہنگری کی فوجیں اس کی راہ میں حائل تھیں، آسٹریا کی مدد کے لیے کانٹ کولینی (Count Coligny) کی سرکردگی میں فرانس کے مبارزین بھی آ گئے تھے، مسیحی فوج کا یہ سالار کانٹ مونٹے کوکولی (Count Montecucoli) تھا جو اپنے وقت کا نہایت ممتاز جنرل تھا، عیسائیوں کی تعداد عثمانیوں سے بہت کم تھی لیکن جنگ سیرسٹیز (۱۵۹۶ء) کے بعد سے جب کہ عثمانیوں نے آسٹریا کو بری طرح شکست دی تھی، آسٹریا اور ہنگری کی فوجوں نے اپنی تنظیم اور اسلحوں میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی، برخلاف اس کے عثمانیوں کے فوجی نظام میں اندرونی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں اور وہ اسلحوں کی ترقی میں عیسائی حکومتوں کا ساتھ نہ دے سکے تھے، جنگ سی سالہ کے دوران میں فن حرب میں بعض اہم اصلاحیں ہو گئی تھیں، جس سے عثمانی فوجیں نا آشنا تھیں، اس لحاظ سے اگرچہ مسیحی فوج کی تعداد عثمانی فوج سے بہت کم تھی تاہم فنی حیثیت سے وہ اپنے مقابل پر فوقیت رکھتی تھی۔

جنگ سینٹ گاتھرڈ ۸/محرم ۱۰۷۵ھ (یکم اگست ۱۶۶۴ء) کو دونوں فوجیں خانقاہ سینٹ گاتھرڈ (St. Gotthard) کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، عثمانیوں کو اپنی کثرت تعداد کے باوجود شکست ہوئی اور ان کے دس ہزار آدمی مارے گئے، آسٹریا کی فوجوں کو بھی اتنا کافی نقصان پہنچا کہ وہ ترکوں کا تعاقب نہ کر سکیں اور احمد کوپریلی اپنی بقیہ فوج کو آسانی کے ساتھ واپس لے آیا۔

اس جنگ کی اہمیت یہ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ پہلی زبردست شکست تھی جو عثمانیوں کو آسٹریا کے ہاتھوں پہنچی، جنگ موہاکز (۱۵۲۶ء) کے بعد سے اس وقت تک آسٹریا کی فوجوں پر عثمانیوں کی فوقیت مسلم تھی، جنگ سینٹ گاتھرڈ نے دولت علیہ کی اس دیرینہ فوقیت کو صدمہ پہنچایا اور یورپ کو پہلی بار معلوم ہوا کہ عثمانیوں کی فوجی قوت مائل بہ انحطاط ہے، ترک سپاہیوں کی ذاتی شجاعت میں اب بھی کوئی فرق نہ تھا لیکن ان کے اسلحے اور جنگ کے طریقے اس وقت بھی وہی تھے جو سلیمان اعظم کے عہد میں رائج تھے، فن حرب میں وہ یورپ کی ترقی یافتہ فوجوں سے پیچھے پڑ گئے تھے، یہی ان کی شکست کا اصلی سبب تھا۔

صلح نامۂ واسوار سینٹ گاتھرڈ کی شکست کے بعد جو صلح نامہ بیس سال کے لیے واسوار میں مرتب ہوا، اس کی دفعات بہ حیثیت مجموعی دولت علیہ کے موافق تھیں اور وہ دراصل صلح نامہ سیلواتورک کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، اس صلح نامہ کی رو سے طے پایا کہ اہل آسٹریا اور ترک دونوں ٹرانسلوینیا کو خالی کر دیں اور اپافی (Apafy) کو جس کی حمایت باب عالی نے کی تھی، وہاں کا فرماں روا بنایا جائے اور وہ سلطان کو خراج ادا کرتا رہے، یعنی ٹرانسلوینیا پر سلطان کی سیادت تسلیم کر لی گئی، سیر یوار اور نو ہزل کے قلعوں پر تو ترکوں کا قبضہ قائم رکھا گیا، ہنگری کی سات ولایتوں میں سے تین آسٹریا کو دے دی گئیں اور چار سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لی گئیں، اس کے علاوہ شہنشاہ آسٹریا نے دو لاکھ فلورن تاوان جنگ سلطان کو ادا کرنا منظور کیا[1]، یہ صلح نامہ دولت علیہ کے لیے ہر طرح قابل اطمینان تھا، احمد کوپریلی نے میدان جنگ میں زبردست شکست کھانے کے بعد بھی سلطنت کے مقبوضات میں اضافہ کر دیا تھا۔

کینڈیا کی فتح ۱۶۶۷ء میں احمد کوپریلی کینڈیا کی مہم پر روانہ ہوا، جس کا محاصرہ بیس سال

[1] میریٹ، ص ۱۱۶۔

سے جاری تھا، اہل وینس موروسینی (Morosini) کی قیادت میں جو بعد میں فاتح موریا کے لقب سے مشہور ہوا، نہایت جاں بازی کے ساتھ کینڈیا کی مدافعت کر رہے تھے، احمد کوپریلی کے پہنچ جانے کے بعد محاصرہ کی شدت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی لیکن اسی کے ساتھ محصورین کا جوش و استقلال بھی بڑھتا گیا، تاہم جب انہوں نے یہ دیکھا کہ زیادہ دنوں تک مقابلہ نہ کر سکیں گے تو ایک بہت بڑی رقم احمد کوپریلی کے سامنے پیش کر کے درخواست کی کہ وہ محاصرہ اٹھا کر واپس چلا جائے، صدر اعظم نے جواب دیا "ہم لوگ روپیہ کا کاروبار نہیں کرتے، ہم کینڈیا کو فتح کرنے کی غرض سے جنگ کر رہے ہیں اور کسی قیمت پر اسے نہ چھوڑیں گے" چنانچہ محاصرہ اسی سختی کے ساتھ جاری رہا، ۱۶۶۹ء میں ایک فرانسیسی جنگی بیڑا جس میں چھ ہزار سپاہی اور فرانس کے طبقہ امراء کے بہترین مبارزین تھے، کینڈیا کی مدد کے لیے پہنچا، اس کے بعد ہی پوپ اور مبارزین مالٹا کی کمک بھی آ گئی، اس متحدہ بیڑے نے جس میں ستر جہاز تھے، عثمانیوں پر سمندر کی جانب سے گولے برسانا شروع کیے اور محصورین سامنے سے گولہ باری کرتے رہے لیکن اس دوطرفہ حملہ کے باوجود احمد کوپریلی نے کوئی قدم پیچھے نہ ہٹایا، آخر کار مجبور ہو کر موروسینی نے ۶ ستمبر ۱۶۶۹ء کو باعزت شرائط کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے اور یہ محاصرہ جو تقریباً اکیس سال سے جاری تھا، ختم ہوا، کریٹ کے پورے جزیرہ پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا، چند دنوں کے بعد جمہوریہ وینس اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلح نامہ ہو گیا، جس کی رو سے وینس نے کریٹ کا سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا جانا تسلیم کر لیا، البتہ سال کے تین چھوٹے چھوٹے بندرگاہوں پر تجارتی اغراض کے لیے وینس کا قبضہ باقی رکھا گیا، فتح کے بعد احمد کوپریلی کئی ماہ تک کینڈیا میں مقیم رہا اور وہاں کی حکومت کا نظم و نسق درست کر کے قسطنطنیہ واپس آیا۔

پولینڈ سے جنگ احمد کوپریلی کی تیسری مہم خاص توجہ کی مستحق ہے، کیوں کہ اس سے اس نزاع کی ابتدا ہوتی ہے جس کا سلسلہ دولت عثمانیہ اور روس کے درمیان حال تک قائم رہا،

۱۶۷۰ء میں اوکرین کے قزاقوں نے جو پولینڈ کی رعایا تھے، حکومت سے بعض حقوق کا مطالبہ کیا، یہ مطالبہ نامنظور کر دیا گیا اور ان کو زیر کرنے کے لیے حکومت پولینڈ نے ایک فوج جنرل سوبیسکی (Sobieski) کی سرکردگی میں اوکرین روانہ کی، قزاقوں نے اپنے سردار ڈوریسینسکو (Dorescensko) کے علم کے نیچے اس فوج کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن آخر کار انہوں نے محسوس کیا کہ دولت عثمانیہ کی مدد کے بغیر وہ کام یاب نہ ہو سکیں گے، چنانچہ ڈوریسینسکو ۱۶۷۲ء میں قسطنطنیہ آیا اور اپنی قوم کی طرف سے باب عالی میں نذر اطاعت پیش کر کے سرپرستی کی استدعا کی، سلطان نے اس کی درخواست قبول کی اور اوکرین کو سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ قرار دے کر اسے وہاں کا سنجق بے مقرر کر دیا، ساتھ ہی خان کریمیا کو حکم بھیجا کہ قزاقوں کی مدد کرے اور چھ ہزار کا ایک ترکی دستہ بھی ان کی مدد کے لیے اوکرین روانہ کیا، باب عالی کی ان کارروائیوں کے خلاف پولینڈ نے احتجاج کیا، زار روس نے بھی سلطان کو دھمکی دی کہ اگر اس نے قزاقوں کی مدد کی تو روس پولینڈ کی حمایت کرے گا، صدر اعظم نے اس دھمکی کی پرواہ نہ کی اور پولینڈ اور روس دونوں کو یہ جواب دیا کہ اوکرین کی نسبت باب عالی کا فیصلہ اپنی جگہ پر قائم رہے گا، احمد کوپریلی نے خود اپنی قلم سے ایک خط سفیر پولینڈ کو لکھا جس میں اوکرین کے قزاقوں کی مظلومیت دکھا کر یہ بتایا کہ جب انہوں نے دولت عثمانیہ کے دامن میں پناہ لے لی تو ان کی حمایت کرنا باب عالی پر فرض ہو گیا، غرض ۱۶۷۲ء میں پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس کا سلسلہ چار سال تک قائم رہا۔

صلح نامۂ بوزاکس اس مہم پر احمد کوپریلی کے ساتھ سلطان محمد رابع خود بھی روانہ ہوا، وہ فوج لے کر پوڈولیا میں داخل ہوا، جو پولینڈ کا ایک صوبہ تھا، احمد کوپریلی نے پوڈولیا کے پایہ تخت کمینیک (Kaminiec) کا محاصرہ کر لیا، اس قلعہ کی تسخیر اس وقت تک ناممکن خیال کی جاتی تھی لیکن صرف نو روز کے محاصرہ کے بعد ۲۶ راگست ۱۶۷۲ء کو ترکوں نے اسے فتح کر لیا، ۹ رستمبر کو دوسرا مشہور اور مضبوط شہر لمبرگ (Lemberg) بھی فتح ہو گیا، ان فتوحات کے بعد

مائیکل شاہ پولینڈ نے صلح کی درخواست کی اور صلح نامہ بوزاکس (Bucsacs) پر دستخط کر کے پوڈولیا اور اوکرین کے صوبے سلطنت عثمانیہ کے حوالے کر دیے اور دو لاکھ بیس ہزار دوکات سالانہ خراج دینا منظور کیا، صلح کے بعد محمد رابع ایک فاتح کی حیثیت سے ادرنہ کو واپس ہوا۔

تجدید جنگ لیکن یہ صلح بالکل عارضی ثابت ہوئی، سوبیسکی اور پولینڈ کے دوسرے امراء نے اسے یک قلم مسترد کر دیا اور از سر نو جنگ کی تیاریاں کرنے لگے، چنانچہ ۱۶۷۳ء میں احمد کوپریلی پولینڈ کی سرکوبی اور زار روس کی تنبیہ کے لیے جس نے گذشتہ جنگ میں پولینڈ کو مدد پہنچائی تھی، پھر روانہ ہوا لیکن ۱۱/ نومبر ۱۶۷۳ء کو سوبیسکی نے دفعۃً ترکی لشکر پر جو خوزیم (Khoczim) کے قریب خیمہ زن تھا، چھاپا مارا اور کوپریلی کو سخت شکست دی، ولاچیا اور مولڈیویا کے فرماں رواؤں نے عین وقت پر غداری کی اور اپنے اپنے دستے لے کر سوبیسکی کی فوج سے مل گئے، دوسرے سال باب عالی نے پھر ایک فوج اوکرین کی مہم پر بھیجی لیکن سوبیسکی کے مقابلہ میں جس کی حمایت سلطنت روس اب علانیہ طور پر کر رہی تھی، اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اور پولینڈ اور روس کی متحدہ فوج کے سامنے اسے پسپا ہونا پڑا، ۱۶۷۴ء میں شاہ مائیکل کی وفات پر سوبیسکی پولینڈ کے تخت پر بیٹھایا گیا اور دوسرے ہی سال اس نے لمبرگ میں ترکوں کو ایک اور زبردست شکست دی، مگر اس شکست کے باوجود ترکوں کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور بالآخر سوبیسکی کو زرانہ (Zurawna) میں شکست دے کر انھوں نے پوڈولیا کے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا۔

صلح نامۂ زرانہ اب سوبیسکی کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی، صلح نامۂ زرانہ ۲۷/ اکتوبر ۱۶۷۶ء) میں کمیک اور پوڈولیا پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا اور تمام اوکرین علاوہ چند مقامات کے سلطنت عثمانیہ کے زیر سیادت آ گیا۔

احمد کوپریلی کی وفات اس صلح کے تین ہی روز بعد احمد کوپریلی نے وفات پائی، اگرچہ اسے آسٹریا اور پولینڈ کے مقابلہ میں سینٹ گاتھرڈ اور خوزیم میں فاش شکستیں ہوئی تھیں،

تاہم اس نے خوش انتظامی اور حسن تدبیر سے ان کی پوری تلافی کر دی اور پوڈولیا، کریٹ، نوہزل اور سیرنورا (ہنگری) کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر کے اس کی وسعت میں اہم اضافے کر دیے، ان بیرونی فتوحات کے علاوہ اس نے سلطنت کی اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کو بھی ختم کر دیا، جہاں تک سلطنت کے حسن انتظام، عدل وانصاف نیز مالی اور فوجی قوت کا تعلق ہے، کسی وزیر نے اس سے زیادہ کارنامے نہیں دکھائے اور یہ سب کچھ اس نے بغیر کسی ظلم وتشدد کے کیا، اس نے رعایا کے تمام طبقوں کی سرپرستی کی اور ہر مذہب وملت کے پیرووں کے ساتھ یکساں طور پر عدل وانصاف برتا، عہد وپیمان کی پابندی اس کا ایک مخصوص وصف تھا، وہ علوم وفنون کا بہت بڑا مربی تھا، اپنی بے نظیر لیاقت اور کارگزاریوں کے لحاظ سے وہ سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا وزیر خیال کیا جاتا ہے۔

قرہ مصطفیٰ احمد کوپریلی کی وفات پر توقع کی جاتی تھی کہ سلطان اس کے بھائی مصطفیٰ کوپریلی کو، جو مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا اور جس میں احمد کے بہتیرے اوصاف پائے جاتے تھے، صدر اعظم مقرر کرے گا، لیکن اس توقع کے خلاف اس نے اپنے داماد قرہ مصطفیٰ کو اس عہدہ پر مامور کیا، یہ انتخاب سلطنت کے لیے حد درجہ مضرت رساں ثابت ہوا، قرہ مصطفیٰ کا نصب العین تمام تر اپنی ذاتی ترقی تھا، اس میں وہ اہلیت مطلق نہ تھی جو دولت عثمانیہ کے وزیر اعظم میں ہونی چاہیے تھی، بااین ہمہ اس کے حب جاہ اور ہوس عظمت کی کوئی انتہا نہ تھی، دولت کا وہ بے حد حریص تھا، چنانچہ سلطنت کے بڑے بڑے عہدے اور امتیازات معمولی قیمتوں پر فروخت کر دیتا تھا، اس طرح اس نے بہت زیادہ دولت جمع کر لی، تھوڑے ہی دنوں میں اس کی سختیوں کی وجہ سے رعایا پریشان ہوگئی، اسی ہوس عظمت کے ماتحت جو اس کے مزاج کی نمایاں خصوصیت تھی، وہ آسٹریا پر حملہ کر کے ویانا کی فتح کا حوصلہ رکھتا تھا، کیوں کہ ویانا کی فتح کے بعد وہ اپنے لیے دریائے ڈینوب اور دریائے رہائن کے درمیانی علاقوں کی فرماں روائی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن آسٹریا کی طرف بڑھنے سے پہلے روس سے

جنگ چھڑ گئی جس میں قرہ مصطفیٰ کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

اوکرین قرہ مصطفیٰ کی سختیوں کی وجہ سے اوکرین کے قزاق بہت عاجز آ گئے تھے، یہاں تک کہ مجبور ہو کر انہوں نے فروری ۱۶۷۷ء میں علم بغاوت بلند کر دیا، روس نے ان کی حمایت کی، یہ اطلاع پا کر قرہ مصطفیٰ ایک فوج لے کر اوکرین میں داخل ہوا، وہاں اسے باغیوں کے علاوہ روس اور پولینڈ کی فوجوں سے بھی مقابلہ پیش آیا اور اس کو شکست ہوئی، دوسرے سال تازہ فوجوں کے ساتھ وہ پھر لوٹا اور ۲۱ راگست ۱۶۷۸ء کو اس نے قلعہ سیزرائم (Cehzrym) فتح کر لیا، تین سال تک مختلف معرکے پیش آئے جس میں کبھی ایک فریق کو فتح ہوئی، کبھی دوسرے کو، بالآخر ۱۶۸۱ء سلطنت عثمانیہ اور روس کے درمیان صلح ہو گئی اور باب عالی اوکرین سے دست بردار ہو گیا، پانچ سال بعد روس اور پولینڈ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے پورے اوکرین پر روس کی سیادت تسلیم کر لی گئی۔

ویانا کا دوسرا محاصرہ ۱۶۸۲ء میں قرہ مصطفیٰ کو آسٹریا پر حملہ کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا، ہنگری کا جو حصہ آسٹریا کے زیر حکومت تھا، اس نے شہنشاہ لیوپولڈ کی مذہبی تعدیوں سے عاجز آ کر بغاوت کر دی، باغیوں کے سردار توکولی (Tokoly) نے آسٹریا سے آزادی کا اعلان کر کے اپنے کو ہنگری کا فرماں روا قرار دیا اور سلطان کی سیادت قبول کر لی[1] قرہ مصطفیٰ کے لیے یہ موقع نہایت غنیمت تھا، اس نے ایک بہت بڑی فوج جس کا تخمینہ دو لاکھ پچھتر ہزار کیا جاتا ہے، اور نہ میں جمع کی اور ۱۶۸۳ء کے اوائل میں ویانا کے قصد سے روانہ ہو گیا، راستہ میں اسے کوئی مزاحمت پیش نہیں آئی اور وہ آسانی کے ساتھ ویانا پہنچ گیا، شہنشاہ لیوپولڈ کے پاس اس زبردست فوج کے مقابلہ کے لیے کوئی سامان نہ تھا، اس کے سپاہیوں کی تعداد پینتیس ہزار سے زیادہ نہ تھی، جن میں سے گیارہ ہزار ویانا کے اندر متعین تھے، اس نے سوبیسکی سے مدد کی درخواست کی، پولینڈ اور سلطنت عثمانیہ میں حال ہی میں ایک صلح نامہ ہو چکا تھا لیکن

---

[1] میریٹ، ص ۱۴۲۔

سوبیسکی نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی اور شہنشاہ کی مدد کے لیے پچاس ہزار سپاہیوں کو بھیجنے کا وعدہ کرلیا، لیکن سوبیسکی کی فوج ویانا سے زیادہ فاصلہ پر تھی اور آٹھ ہفتہ سے قبل نہیں پہنچ سکتی تھی، اس میں شبہ نہیں کہ اگر قرہ مصطفیٰ پوری مستعدی سے کام لیتا اور دوران محاصرہ میں پوری قوت سے حملہ کرتا تو ویانا پولینڈ کی کمک آنے سے پیش تر ہی فتح ہو جاتا لیکن اسے اپنی طاقت اور غنیم کی کم زوری پر حد سے زیادہ بھروسہ تھا اور وہ یقین رکھتا تھا کہ دنیا کی طاقت ویانا کو اس کے پنجہ سے چھڑا نہیں سکتی۔

غرض ویانا کا دوسرا محاصرہ ۱۵ر جولائی ۱۶۸۳ء کو شروع ہوا، شہنشاہ لیوپولڈ اپنے خاندان کے ساتھ بھاگ کر بویریا چلا گیا تھا لیکن محصورین نے کانٹ اسٹارمبرگ (Stahremberg) کی سرکردگی میں نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، شہر کے بیس ہزار باشندے بھی سپاہیوں کے دستہ کے ساتھ شامل ہو گئے، انہوں نے بھی فوج کے ساتھ جاں بازی کے جوہر دکھائے، تاہم ترکی توپ خانوں نے شہر کی دیواروں کو کئی مقام پر بالکل مسمار کردیا، اگر قرہ مصطفیٰ ایک عام حملہ کا حکم دیے دیتا تو شہر کے فتح ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن اس کے حرص وہوس نے یہ نادر موقع کھو دیا، وہ اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ اہل شہر محاصرہ سے عاجز آ کر آخر میں خود ہتھیار ڈال دیں گے اور پھر شہر کی تمام دولت پر وہ تنہا قبضہ کرلے گا، جو ایک عام حملہ کی کام یابی میں ممکن نہ تھا کیوں کہ اس وقت مال غنیمت تمام فوج کا حق ہو جاتا، اسی توقع اور ہوس نے آخری حملہ کو ملتوی رکھا، اس درمیان میں سوبیسکی تیزی کے ساتھ ویانا کی جانب کوچ کرتا رہا اور آخر کار شہزادہ چارلس آف لورین (Charles of Loraine) سے آملا جو آسٹریا کی شاہی فوج کا سپہ سالار تھا اور ویانا سے کچھ فاصلہ پر اس کا انتظار کررہا تھا، دونوں سپہ سالاروں نے متحد ہو کر ٹولم (Talm) کے مقام پر دریائے ڈینوب کو عبور کیا اور پھر وہ نہایت دشوار گزار راستہ سے ہو کر ترکی لشکر کے عقب پر پہنچ گئے، قرہ مصطفیٰ آسانی کے ساتھ سوبیسکی اور شہزادہ چارلس کو دریا عبور کرنے یا اس دشوار گزار راستہ کے طے

کرنے سے روک سکتا تھا لیکن اپنی طاقت پر حد سے بڑھے ہوئے اعتماد نے اس کو غافل رکھا اور وہ اس وقت متنبہ ہوا جب غنیم اس کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔

ترکوں کی شکست سوبیسکی کو عثمانی لشکر کی ترتیب دیکھ کر اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا، اس نے قرہ مصطفیٰ کی نسبت حقارت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا کہ "اس شخص نے لشکر کی ترتیب غلط طریقہ پر دی ہے، وہ جنگ کے متعلق کچھ نہیں جانتا، ہم ضرور اسے شکست دیں گے" پھر اس نے اپنی فوج کو مخاطب کر کے بتایا کہ ویانا تمام مسیحی یورپ کا قلب ہے، جس کی مدافعت ایک مقدس فرض ہے، ویانا کو ترکوں سے چھڑا لینا حقیقۃً سارے یورپ کو محفوظ کر لینا ہے، فوج کے دینی جوش کو برانگیختہ کرنے کے بعد اس نے حملہ کا حکم دیا، حملہ اس قدر شدید تھا کہ عثمانی لشکر اس کی تاب نہ لا سکا، حملہ کی شدت سوبیسکی کی موجودگی کے باعث اور زیادہ محسوس ہو رہی تھی، اس کی فاتحانہ شہرت کا غلغلہ تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا، سب سے پہلے تاتاریوں کے قدم اکھڑے، ان کے بھاگنے سے ترکی فوج کے دوسرے دستوں پر بھی اثر پڑا اور پوری فوج میں انتشار پیدا ہو گیا، قرہ مصطفیٰ نے ینی چری کو شہر کے سامنے خندقوں میں چھوڑ دیا تھا اور بقیہ فوج کے ساتھ سوبیسکی اور شہزادہ چارلس کے متحدہ حملہ کا مقابلہ کر رہا تھا، جو اس کے عقب سے ہوا تھا، تاتاریوں کے پسپا ہو جانے کے بعد سوبیسکی نے ترکی لشکر کے قلب پر حملہ کر دیا، عثمانی فوج باوجود اپنی کثرت کے اس حملہ کا مقابلہ نہ کر سکی اور اس کے قدم اکھڑ گئے، عیسائیوں نے ترکوں کے تمام خیموں اور سامانوں پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد وہ ینی چری دستوں کی طرف بڑھے، جن پر اب دونوں طرف سے حملہ ہونے لگا، پشت سے سوبیسکی کی فوج حملہ کر رہی تھی اور سامنے سے آسٹریا کی شاہی فوج گولیاں برسا رہی تھی، ینی چری اپنی بے مثل جاں بازی کے ساتھ ان حملوں کا مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا ایک ایک فرد داد شجاعت دیتا ہوا مارا گیا، سوبیسکی کی فتح اب مکمل ہو گئی، تین سو توپیں، نو ہزار گولہ بارود کی گاڑیاں اور پچیس ہزار خیمے مال غنیمت میں ہاتھ آئے۔

قرہ مصطفیٰ کا قتل قرہ مصطفیٰ سوبیسکی کے تعاقب سے بچ کر بودا پہنچا اور وہاں عثمانی فوج کے چند بڑے بڑے افسروں کو اس شکست کا ذمہ دار قرار دے کر جو تمام تر اس کی نااہلیت اور حرص وہوس کا نتیجہ تھی، قتل کرادیا، اس کے بعد وہ موسم سرما گزارنے کے لیے بلغراد چلا گیا، وہاں سلطان کے حکم سے وہ خود قتل کردیا گیا اور اس کی تمام جائیداد ضبط کرلی گئی۔

شکست ویانا کا اثر ویانا کا یہ دوسرا محاصرہ جس میں ترکوں کو ایسی زبردست شکست ہوئی پہلے محاصرہ سے جو ۱۵۲۹ء میں سلیمان اعظم کی سرکردگی میں ہوا تھا، بہت کچھ مختلف تھا، سلیمان سامان رسد اور اسلحوں کی عدم فراہمی کی وجہ سے محاصرہ اٹھالینے پر مجبور ہوگیا تھا، غنیم کو میدان جنگ میں اس سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور وہ اپنی پوری فوج کے ساتھ قسطنطنیہ واپس آگیا، برخلاف اس کے قرہ مصطفیٰ نے ایک ایسی فوج سے جو ترکی لشکر سے تعداد میں بہت کم تھی، میدان جنگ میں شکست کھائی اور اس کے ہزاروں سپاہی ہلاک ہوگئے، اس شکست کا اثر دولت عثمانیہ کی عظمت پر بہت برا پڑا، دنیا کو معلوم ہوگیا کہ عثمانی فتوحات کا دور اب ختم ہوگیا اور وسط یورپ کی سلطنتیں جو دو سو برس سے مستقل طور پر ترکی حملوں سے خائف چلی آتی تھیں، اب ہمیشہ کے لیے مطمئن ہوگئیں۔

مسیحی اتحاد ویانا میں ترکوں کی شکست سے تمام یورپ میں شادیانے بجنے لگے اور ان عیسائی حکومتوں نے جو سلطنت عثمانیہ کی مغربی سرحدوں پر واقع تھیں بیک وقت اس پر حملہ کردیا، یورپ نے ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ کا اعلان کیا اور اس کے لیے عیسائی حکومتوں کا ایک مقدس اتحاد ۱۶۸۴ء میں قائم کیا جس میں آسٹریا، پولینڈ، وینس اور مالٹا شریک ہوئے اور ۱۶۸۶ء میں روس بھی شامل ہوگیا۔

مزید شکستیں جدید صدر اعظم ابراہیم پاشا نے ان حملہ آوروں کے مقابلہ کی حتی المقدور پوری کوشش کی لیکن ویانا کی شکست میں عثمانی فوجوں اور خصوصاً توپ خانوں کا جو نقصان ہوا تھا، اس کی تلافی فوراً ممکن نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا کی شاہی فوجوں نے جن میں پولینڈ اور

جرمنی کے مختلف صوبوں کی فوجیں بھی شامل ہوگئی تھیں، شہزادہ چارلس کی سرکردگی میں گران، نوہزل، اوفن اور زیجیڈین جیسے اہم اور مضبوط مقامات پر قبضہ کرلیا اور پھر بلغراد کے علاوہ ہنگری کے ان تمام قلعوں کو فتح کرلیا جن پر ترک قابض تھے، کروشیا کا صوبہ بھی جو ڈیڑھ سو برس سے سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ تھا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

ادھر وینس نے بوسنیا اور البانیا پر حملہ کردیا اور موروسینی جمہوریہ کی فوجیں لے کر موریا میں داخل ہوا اور کون، توارنیو، کورنتھ، ایتھنز اور دوسرے اہم شہروں پر قبضہ کرلیا، تقریباً پورا یونان وینس کے قبضہ میں آ گیا، یونانیوں نے اس حملہ کی مدافعت میں ترکوں کو کسی قسم کی مدد نہیں دی لیکن جمہوریہ کی فتح کے بعد انہیں معلوم ہوگیا کہ اہل وینس کی حکومت ترکوں کے مقابلہ میں کتنی زیادہ سخت اور ظالمانہ ہے، لارڈ ایورسلے نے بھی بادل ناخواستہ اس کا اعتراف کیا ہے[1]۔

۱۸ رجون ۱۶۸۶ء کو آسٹریا کی فوجوں نے شہزادہ چارلس کے زیر قیادت بودا کا محاصرہ کرلیا، صدر اعظم سلیمان پاشا نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن تازہ کمک پہنچنے سے قبل شہر فتح ہوگیا، عبدی پاشا اور ترکی دستہ جو قلعہ کی مدافعت کر رہا تھا، نہایت جاں بازی کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا، یہ شہر ایک سو پینتالیس سال سے ترکوں کے قبضہ میں تھا اور اس مدت میں اس نے چھ محاصروں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا لیکن ۱۳ رشوال ۱۰۹۷ھ مطابق ۲ رستمبر ۱۶۸۶ء کو یہ ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر کبھی سلطنت عثمانیہ کے قبضہ میں نہ آیا۔

۳ رشوال ۱۰۹۸ھ (۱۲ راگست ۱۶۸۷ء) کو موہاکز کا معرکہ پیش آیا، ایک سو ساٹھ برس پہلے اسی مقام پر سلطان سلیمان اعظم نے اہل ہنگری کو زبردست شکست دے کر ان کے نصف ملک پر قبضہ کرلیا تھا، اس مرتبہ ویسی ہی شکست ترکوں کو اٹھانی پڑی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلاوونیا اور کروشیا کے علاقے مستقل طور پر سلطنت آسٹریا میں شامل کرلیے گئے، پانی امیر

[1] ایورسلے، ص ۱۸۱۔

ٹرانسلوینیا نے جو دولت عثمانیہ کا باج گزار تھا، اب آسٹریا کی سیادت قبول کر لی۔

سلطان کی معزولی ان پیہم شکستوں کی وجہ سے عثمانی فوج میں سخت برہمی پھیلی ہوئی تھی، اس کے افسروں نے متفقہ طور پر سیاوُش پاشا کو اپنا سپہ سالار اعظم منتخب کیا اور صدر اعظم سلیمان پاشا کے قتل کا مطالبہ پیش کیا، سلطان نے فوج کی برہمی اور بغاوت کے آثار دیکھ کر یہ مطالبہ منظور کر لیا اور سلیمان پاشا کی جگہ سیاوُش پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، سلیمان پاشا سلطان کے حکم سے قتل کر دیا گیا، امید تھی کہ اس مطالبہ کے پورا ہونے کے بعد فوج مطمئن ہو جائے گی اور قسطنطنیہ کا رخ نہ کرے گی لیکن اور نہ پہنچنے کے بعد وہ دار السلطنت کی طرف روانہ ہوئی اور وہاں آ کر خود سلطان کی معزولی کا مطالبہ کرنے لگی، سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ داروں نے بھی جو قسطنطنیہ میں موجود تھے، متفقہ طور پر اس مطالبہ میں فوج کا ساتھ دیا، چنانچہ مصطفیٰ کوپریلی نے جو اس وقت قائم مقام صدر اعظم تھا، علماء کی ایک مجلس منعقد کر کے سلطان کے عزل کی نسبت استفتا کیا، تمام علماء نے بغیر کسی اختلاف کے معزولی کا فتویٰ دیا، ساتھ انہوں نے اس کے بھائی سلیمان کو اس کا جانشین منتخب کیا، چنانچہ ۲ محرم ۱۰۹۹ھ مطابق ۸ نومبر ۱۶۷۷ء کو محمد رابع تخت سے اتار کر محل کے اس حصہ میں نظر بند کر دیا گیا جہاں اب تک اس نے سلیمان کو نظر بند کر رکھا تھا اور سلیمان کو وہاں سے لا کر تخت پر بیٹھایا گیا، پانچ سال بعد ۸ ربیع الثانی ۱۱۰۴ھ مطابق ۷ ا دسمبر ۱۶۹۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمد رابع کو شکار سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ اسی میں گزارتا تھا، اس نے سلطنت کا سارا انتظام صدر اعظم کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا تھا، سلطنت کی خوش قسمتی سے ۱۶۷۶ء تک عنان حکومت ایسے وزیروں کے ہاتھ میں تھی جو سلطان کے تمام تر اعتماد کے مستحق تھے، محمد کوپریلی اور اس کے بعد احمد کوپریلی نے دولت علیہ کی جو عظیم الشان خدمتیں انجام دیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں لیکن احمد کوپریلی کی وفات پر قرہ مصطفیٰ کے تقرر نے وہ تمام خرابیاں از سر نو پیدا کر دیں جن کو دور کرنا اس کے ممتاز پیش رووں

کا خاص مقصد تھا، قرہ مصطفیٰ کی نااہلیت اور پھر اس کی غیر معمولی حرص وہوس مزید تباہیوں کا باعث ہوئی، جس کا پیش خیمہ ویانا کی زبردست شکست تھی، اس شکست نے تقریباً تمام یورپ کو بیک وقت سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر دیا، قرہ مصطفیٰ کے جانشین ابراہیم پاشا اور سلیمان پاشا نے مدافعت کی انتہائی کوششیں کیں لیکن ویانا کی شکست نے سلطنت کی قوت کو توڑ دیا تھا اور تقریباً تمام معرکوں میں ترکوں کے قدم اکھڑتے ہی گئے، ان پے در پے ہزیمتوں سے فوج میں بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے، پہلے تو اس نے صدر اعظم سلیمان پاشا ہی کو ذمہ دار قرار دے کر قتل کر دینا چاہا لیکن اس کے قتل کے بعد بھی اس کا غصہ فرو نہ ہوا اور اس نے خود سلطان کی معزولی پر اصرار شروع کیا، گو محمد رابع براہ راست ان شکستوں کا ذمہ دار نہ تھا لیکن قرہ مصطفیٰ جیسے نالائق وزیر کا تقرر صرف اسی کے انتخاب سے عمل میں آیا تھا اور یہی تقرر سلطنت کی تمام خرابیوں اور تباہ کاریوں کا سبب ثابت ہوا۔

الجزائر و تونس کی آزادی سلطان محمد رابع کے عہد میں دولت عثمانیہ کو ایک شدید صدمہ یہ بھی پہنچا کہ الجزائر اور تونس کی حکومتیں آزاد ہو گئیں، ان حکومتوں کی آزادی کے لیے کسی خاص سنہ کی تعیین نہیں کی جا سکتی لیکن مؤرخین کو اس پر اتفاق ہے کہ یہ آزادی سترہویں صدی کے وسط میں حاصل ہوئی، اس کے اسباب اس صدی کے ابتدا ہی میں پیدا ہو گئے تھے، جب کہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کا تقرر ذاتی لیاقت اور تجربہ کے بجائے سفارش اور رشوت کی بنا پر کیا جانے لگا تھا اور سلطنت کے دوسرے صوبوں کے حکام کی طرح الجزائر اور تونس کے صوبہ داروں نے بھی بڑی بڑی قیمتیں ادا کر کے اپنے عہدے حاصل کرنا شروع کر دیے تھے، کچھ دنوں کے بعد الجزائر اور تونس کے مقامی فوجی دستوں نے اپنے سردار خود ہی منتخب کرنا شروع کیے، ابتداءً تو یہ انتخاب منظوری کے لیے سلطان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا وہ یا تو منتخب شدہ امیدوار کو مقرر کر دیتا تھا یا اس کے بجائے کسی دوسرے کا تقرر کر دیتا تھا، یہ شکل بھی تھوڑے ہی دنوں قائم رہی اور پھر اس انتخاب کو سلطان

کے سامنے پیش کرنے کا رواج بھی جاتا رہا، رفتہ رفتہ ان فوجی سرداروں نے جو ڈے کہلاتے تھے، حکومت کی اصلی قوت اپنے ہاتھوں میں لے لی اور بالآخران پاشاؤں کو برطرف کردیا جو برائے نام صوبہ دار بنا کر قسطنطنیہ سے بھیجے جاتے تھے، اس طرح ان دونوں صوبوں نے خودمختاری حاصل کرلی، کبھی کبھی وہ باب عالی کی مدد اپنے جنگی بیڑے سے کرتے رہتے تھے لیکن دولت عثمانیہ کے محکوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اسلامی اخوت کی بنا پر، دونوں حکومتوں کے پاس جنگی جہازوں کے مضبوط بیڑے تھے جو بحرروم میں چکر لگاتے رہتے تھے اور وہاں سے نکل کر بحراٹلانٹک کے علاقوں پر چھاپا مارا کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ آئیس لینڈ اور اسکینڈی نیویا بھی پہنچ جاتے تھے، آئرلینڈ پر تو ان کے حملہ اکثر ہوتے رہتے تھے، سلطنت عثمانیہ سے ان حکومتوں کی آزادی کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ دوسری سلطنتیں باب عالی سے جنگ کا اعلان کیے بغیر الجزائر اور تونس کے بحری جہازوں پر حملے کرتی رہتی تھیں اور ان حملوں سے ان کے اور دولت علیہ کے باہمی تعلقات پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑتا تھا، چنانچہ ۱۶۱۷ء میں ایک فرانسیسی بیڑے نے امیر البحر بولو (Beaulieu) کی سرکردگی میں الجزائر کے بیڑے پر حملہ کرکے اس کے بہت سے جہازوں کو غرق کردیا، اسی طرح ۱۶۲۰ء میں انگریز امیر البحر سررچرڈ مانسل نے الجزائر پر حملہ کیا کیوں کہ گذشتہ پانچ سال کے اندر الجزائر کے جہازوں نے چارسو انگریزی تجارتی جہازوں کو گرفتار کرلیا تھا لیکن اس حملہ سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، ۱۶۵۵ء میں ایک دوسرے انگریزی بیڑے نے جو امیر البحر بلیک کی قیادت میں تھا، تونس پر گولے برسا کر اس کے جہازوں کی ایک بڑی تعداد جلا ڈالی، اس کے بعد بلیک الجزائر کی طرف بڑھا، وہاں کے ڈے نے بغیر کسی جنگ کے تمام انگریزی قیدیوں کو رہا کردیا، ان دونوں صورتوں میں انگلستان اور دولت علیہ کے درمیان کسی جنگ کا اعلان نہیں ہوا اور نہ سلطان نے انگلستان کے اس فعل پر کوئی شکایت کی۔

۱۶۶۳ء میں انگلستان، الجزائر اور دولت علیہ کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا

جس کی رو سے انگلستان کو یہ حق دیا گیا کہ اگر الجزائر کی طرف سے معاہدہ شکنی ہو تو انگلستان اس سے انتقام لے سکتا ہے، مگر اس سے انگلستان اور دولت علیہ کے تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوگی، چنانچہ اس عہد نامہ کے مطابق انگلستان کو بارہا الجزائر پر حملہ کرنے کا اتفاق ہوا لیکن یہ حملے بیش تر بے سود ثابت ہوئے۔

غرض سلطنت عثمانیہ سے الجزائر اور تونس کی آزادی ۱۶۵۰ء کے قریب عمل میں آئی، الجزائر نے تقریباً دو سو برس تک اپنی خود مختاری قائم رکھی لیکن ۱۸۳۰ء میں فرانس نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، تونس کی آزادی نصف صدی سے زائد تک قائم رہی، ۱۸۸۱ء میں یہ حکومت بھی سلطنت فرانس میں شامل کر لی گئی۔

نظام ینی چری میں تبدیلی سلطان محمد رابع کے عہد میں ینی چری کے نظام میں ایک اہم ترمیم کی تکمیل ہوئی، ابتداءً یہ فوج تمام تر ان نوجوانوں پر مشتمل ہوتی تھی جو ہر سال سلطنت کی عیسائی رعایا میں سے منتخب کیے جاتے تھے لیکن سلطان مراد رابع کے وقت سے عیسائی لڑکوں کی قید اٹھا دی گئی، چوں کہ یہ فوج تمام افواج عثمانی میں سب سے زیادہ معزز خیال کی جاتی تھی اور اس کے سپاہیوں کو بہت سے ملکی اور فوجی فوائد حاصل تھے، اس لیے ترکی النسل اور مسلمان امیدوار بھی نہایت شوق کے ساتھ اس میں داخل ہونے کے خواستگار ہوئے، چنانچہ قدیم دستور میں پہلے یہ ترمیم کی گئی کہ ینی چری سپاہیوں کے بچوں کو بھی اس میں داخلہ کا حق دیا گیا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد دوسرے مسلمان امیدوار بھی لیے جانے لگے اور عیسائی رعایا سے ہر سال جو مطالبہ ہوا کرتا تھا، اس میں بہت کچھ تخفیف ہو گئی لیکن ۱۶۷۵ء سے، جو صدر اعظم احمد کوپریلی کی وزارت کا آخری سال تھا، عیسائی لڑکوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا، اس ترمیم کے مکمل ہو جانے پر ینی چری کی تعداد میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا، ینی چری سپاہیوں کے بڑے بڑے دستے سلطنت کے خاص خاص شہروں میں متعین کر دیے گئے، جہاں وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ مختلف کاروبار میں مشغول ہو گئے اور

صرف جنگ کے موقعوں پر سلطنت کی دوسری فوجوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے، ان کی خاص راہبانہ اور فوجی زندگی کا خاتمہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔

شکار سے حد درجہ شغف ہونے کے باوجود علوم وفنون کی سرپرستی میں سلطان محمد رابع اپنے پیش رووں سے پیچھے نہ تھا، اسے علماء کی صحبت سے خاص دلچسپی تھی، مؤرخین کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کرتا تھا، وہ انہیں اپنے دربار میں مامور رکھتا اور ان کی کتابوں کی تصحیح خود اپنے قلم سے کرتا تھا۔

سلیمان ثانی

۱۰۹۹ھ تا ۱۱۰۳ھ مطابق ۱۶۸۷ء تا ۱۶۹۱ء

فوج کی سرکشی سلطان سلیمان ثانی بچپن سے محل میں نظر بند رہنے کے بعد پینتالیس سال کی عمر میں تخت سلطنت پر آیا، اس طویل نظر بندی کے باوجود اس نے اپنے پیش رو سے کہیں زیادہ تدبر اور بیدار مغزی کا ثبوت دیا اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس کی تخت نشینی چند سال قبل عمل میں آئی ہوتی تو سلطنت کو ان تباہیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو محمد رابع کے عہد کے آخری سالوں میں اس پر ہر طرف سے نازل ہوگئی تھیں، دولت عثمانیہ کو جو صدمہ گذشتہ عہد میں پہنچ چکا تھا، اس کی تلافی فوراً ممکن نہ تھی، خصوصاً اس صورت میں کہ فوج باغی ہو رہی تھی اور پایہ تخت کے علاوہ مختلف صوبوں میں بھی سرکشی اور بغاوت کے آثار نمایاں تھے، سلیمان پاشا کا قتل اور محمد رابع کا عزل فوج ہی کی بغاوت کا نتیجہ تھا، سلیمان ثانی نے فوج کی برہمی دور کرنے اور اسے قابو میں لانے کی غرض سے تخت نشینی کے موقع پر بہت کچھ انعام و اکرام تقسیم کیا اور اس کی سرکشی پر کوئی مواخذہ نہ کیا لیکن چند ہی روز کے بعد وہ پھر باغی ہوگئی اور قسطنطنیہ میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا، متعدد وزراء محض ان باغیوں کی خواہش پر علاحدہ کر دیے گئے، آخر میں انہوں نے صدر اعظم سیاوش پاشا کے محل پر بھی حملہ کیا اور اسے قتل کر کے حرم میں داخل ہو گئے اور اس کی بیوی (جو سلطان محمد رابع کی بیٹی تھی) اور بہن اور دوسری خواتین کے ساتھ نہایت گستاخی کے ساتھ پیش آئے، باغیوں کے ساتھ قسطنطنیہ

کے تمام بدمعاش اوراوباش بھی شریک ہوگئے تھے، جن میں عیسائی، یہودی اور مسلمان سب ہی شامل تھے، یہاں تک کہ ان کی شورش اور لوٹ مار نے شہر کے عام باشندوں کو بھی عاجز کردیا، آخرکار علماء کے ابھارنے پر عوام اور خود ینی چری فوج کے وہ دستے جو محض فوری جوش سے متاثر ہوکر اس ہنگامہ میں شریک ہوگئے تھے، باغیوں کی سرکوبی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور بہ مشکل ان کو قابو میں لائے اور ان کے سرداروں کو گرفتار کرکے قتل کردیا، مفتی اعظم اور تین دوسرے بڑے علماء جو اس شورش میں کسی حد تک ینی چری باغیوں کے زیر اثر تھے، اپنے عہدوں سے برطرف کردیے گئے اور ان کی جگہ زیادہ متدین اور قابل اعتماد اشخاص مقرر کیے گئے، اس طرح پایہ تخت میں تھوڑا بہت امن قائم ہوگیا، لیکن بغاوت کا خطرہ قطعی طور پر زائل نہ ہوا اور صوبوں میں شورش وسرکشی کے مظاہرے عرصہ تک جاری رہے تاہم جون ۱۶۸۸ء میں امن وامان اس حد تک قائم ہوگیا تھا کہ سلطان نے ایک فوج مرتب کرکے ہنگری کی سرحد پر روانہ کی۔

ہجوم مصائب آسٹریا کو دولت عثمانیہ کے اس اختلال وانتشار سے فائدہ اٹھانے کا کافی موقع مل گیا تھا، اس عرصہ میں اس کی تین فوجیں شہزادہ چارلس آف لورین (Charles of Lorraine) شہزادہ لوئی آف بیڈین (Louis of Baden) اور شہزادہ یوجین آف سوائے (Eugene of Savoy) کی سرکردگی میں جو اپنے وقت میں یورپ کے ممتاز ترین جنرل تھے، سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں کی طرف بڑھتی رہیں، ۱۴ر دسمبر ۱۶۸۷ء کو انہوں نے قلعہ ایرلا واقع ہنگری کا محاصرہ کرکے اسے فتح کرلیا، اس کے بعد بلغراد کا راستہ کھل گیا اور انہوں نے اس کا محاصرہ شروع کیا، صرف تین ہفتہ کی گولہ باری کے بعد بلغراد کے ترک کمانڈر کی غداری سے یہ حد درجہ اہم شہر جو ہنگری کا دروازہ تھا، ۲۰ر اگست ۱۶۸۸ء کو دولت عثمانیہ کے ہاتھ سے آسانی کے ساتھ نکل گیا، شہزادہ لوئی نے تقریباً اسی زمانہ میں بوسنیا پر حملہ کرکے اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا، ادھر ڈلماشیا بغاوت کرکے عثمانی حکومت سے آزاد

ہوگیا، اس کے بعد آسٹریا کی فوجوں نے نیش اور وڈین پر بھی قبضہ کرلیا اور ۱۶۸۹ء میں ہنگری کے صرف دو قلعوں تمیسوار اور وار آڑ دین پر ترکوں کا قبضہ باقی رہ گیا، سرویا اور بوسنیا کے بیش تر علاقے ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

سلطنت کے جنوبی حصہ میں بھی غنیم کی فتوحات کا یہی حال تھا، موروسینی نے تمام موریا فتح کرکے اس میں وینس کی حکومت قائم کردی تھی، البتہ پولینڈ اور روس کے مقابلہ میں ترک اور ان کے حلیف تاتار کامیاب تھے، ۱۶۸۸ء میں کریمیا کی تاتاری فوج نے ایک پولش فوج کو شکست دے کر پولینڈ کے ایک بڑے حصہ کو تاراج کرڈالا، دوسرے سال روس بھی دولت علیہ کے خلاف اتحادیوں سے مل گیا اور ایک فوج کریمیا پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی لیکن ترکوں نے روسی فوج کو مار کر بھگایا، ترکی فتوحات کا دائرہ وہیں تک پہنچ کر ختم ہوگیا، باقی ہر طرف شکستوں ہی کا سامنا تھا اور سلطنت عثمانیہ کے قدیم مقبوضات پر دشمنوں کا قبضہ دکھائی دے رہا تھا، صوبہ جات بلقان پر آسٹریا کی فوجیں حملہ آور ہورہی تھیں، سرویا اور بوسنیا کے بہترین حصے آسٹریا کے زیر حکومت آچکے تھے، تمام یونان اور البانیا پر جمہوریہ وینس کے نمائندہ موروسینی کا قبضہ تھا، علاوہ بریں دولت عثمانیہ کا بحری بیڑا وینس، پوپ، مبارزین مالٹا اور ڈیوک آف ٹسکنی (Duke of Tuscony) کے متحدہ بیڑوں سے شکست کھا کر بہت کچھ کم زور ہوچکا تھا۔

مصطفیٰ کوپریلی

مصائب کا یہ ہجوم دیکھ کر سلطان نے نومبر ۱۶۸۹ء میں ایک دیوان اورنہ میں منعقد کیا اور موجودہ صورت حال کی نسبت ارکان مجلس سے مشورہ کیا، سب نے بالاتفاق یہی رائے دی کہ کوپریلی زادہ مصطفیٰ پاشا صدر اعظم مقرر کیا جائے، چنانچہ احمد کوپریلی کے انتقال کے تیرہ سال بعد جو دولت علیہ کے لیے ہر طرح کی خرابی اور بربادی کا زمانہ تھا، خاندان کوپریلی کا یہ تیسرا فرد سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے طلب کیا گیا۔

تقرر کے وقت مصطفیٰ کوپریلی کی عمر باون سال کی تھی، محمد اور احمد کوپریلی کے

دوران وزارت میں وہ مختلف ذمہ دار عہدوں پر کام کر چکا تھا، عنان حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے اس نے تمام مشاہیر سلطنت کو مدعو کر کے ایک دیوان منعقد کیا اور ان کے سامنے دولت علیہ کی زبوں حالی کا صحیح صحیح نقشہ پیش کیا، اس نے بتایا کہ اگر ہمارا یہی حال رہا تو آئندہ معرکہ میں غنیم قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے نظر آئے گا، اس کے بعد وہ حکومت کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا اور بعض ایسے محصول جو اس کے پیش رووں نے غیر ضروری طور پر عائد کر رکھے تھے، جن سے رعایا نہایت پریشان تھی، موقوف کر دیے اور بجائے ان کے امرائے دولت اور اعیان حکومت سے جنھوں نے رعایا پر سختی کر کے خوب دولت جمع کی تھی بڑی بڑی رقمیں وصول کیں اور سلطنت کا خزانہ پر کر دیا، اس نے خود اپنے تمام نقرئی ظروف خزانہ عامرہ میں منتقل کر دیے اور اس کے دسترخوان پر صرف تانبے کے برتن نظر آتے تھے، اس طرح فوج کی فوری ضروریات کے لیے سرمایہ جمع ہوگیا، اس کے بعد اس نے فوج کے لیے نئے سپاہی بھرتی کرنا شروع کیے اور ان تمام آزمودہ کار سپاہیوں اور افسروں کو جو گذشتہ جنگوں کے بعد برطرف کر دیے گئے تھے یا پنشن پا رہے تھے دوبارہ طلب کر کے اس نئی فوج کے ہر دستہ میں تقسیم کر دیا تاکہ نئے سپاہی ان کے تجربہ سے فائدہ اٹھا سکیں، اس کے سلطنت کے اہم صوبوں میں ایسے گورنر مقرر کیے جن پر اسے پورا اعتماد تھا، ترکی بحریہ کی اصلاح اور مضبوطی کے لیے بھی جو گذشتہ معرکوں میں بہت کمزور ہوگیا تھا، اس نے مختلف تدبیریں اختیار کیں اور لائق افسروں کو مقرر کیا، اس نے بہت سی تجارتی پابندیاں بھی جو نامناسب اور غیر ضروری تھیں، اٹھا دیں۔

عیسائی رعایا کے ساتھ مخصوص رعایتیں مصطفیٰ کوپریلی کو تمام رعایا کی فلاح و بہبود کا بے حد خیال تھا اور وہ سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کرتا تھا، اس کی عدالت میں مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہ تھی، اس عموم میں سلطنت کی عیسائی رعایا کو ایک خاص خصوص حاصل تھا، مصطفیٰ پاشا ان کے ساتھ خاص رعایتیں کرتا تھا، وہ دیکھتا تھا کہ

جو مسیحی حکومتیں ترکی پر حملہ آور ہو رہی ہیں انہیں دولت عثمانیہ کی عیسائی رعایا سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے، چنانچہ البانیا کی عیسائی رعایا وینس کی فوجوں میں شامل ہو رہی تھی اور سرویا کے باشندے شہنشاہ آسٹریا کی مدد کے لیے تیار تھے، یونان میں موروسینی کی کام یابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے عیسائیوں نے حملہ آوروں کا استقبال کیا اور ان کے لیے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں، ان واقعات کو دیکھ کر مصطفیٰ پاشا نے عیسائیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی، چنانچہ اس نے اپنے تقرر کے بعد فوراً ہی تمام پاشاؤں کے نام احکام جاری کیے کہ عیسائی رعایا پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے اور ان کو پوری مذہبی آزادی عطا کی جائے، ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس نے سخت سزائیں دینا شروع کیں، عیسائی رعایا پر مختلف محصول عائد تھے، اس نے جزیہ کے علاوہ تمام محصول معاف کر دیے، جزیہ کی بھی آمدنی کے لحاظ سے تین قسمیں کر دیں، طبقۂ امراء پر چار دوکات فی شخص مقرر کیے، متوسط درجہ کے لوگوں پر دو دوکات اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں پر ایک دوکات پہلے عیسائی رعایا کو صرف اپنے قدیم کنیسوں کی مرمت کا حق حاصل تھا وہ کوئی نیا کنیسہ تعمیر نہیں کر سکتے تھے، مصطفیٰ پاشا نے یہ پابندی اٹھا دی اور انہیں جدید کنیسوں کی تعمیر کا حق بھی دے دیا، چنانچہ اس کے دورِ وزارت میں بہت سے نئے کنیسے تعمیر کیے گئے، ان تمام رعایتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی رعایا میں دولت علیہ کے ساتھ ایک عام ہمدردی پیدا ہو گئی، خصوصاً ان عیسائیوں میں جو کلیسائے یونان کے پیرو تھے کیوں کہ مغرب کی عیسائی حکومت جو کلیسائے رومہ کی متبع تھیں ان پر قابو پانے کے بعد نہایت ظالمانہ برتاؤ کرتی تھیں اور انہیں بہ جبر اپنے مذہب کا پیرو بنانا چاہتی تھیں، چنانچہ یونان کے عیسائیوں کو موروسینی کی حکومت کا ایسا ہی تلخ تجربہ ہوا اور انہوں نے ان کی تعدیوں سے عاجز آ کر بغاوت کر دی، مصطفیٰ کوپریلی نے لائبریس (Liberuez) نامی ایک یونانی کو جو سات سال سے ترکوں کی قید میں تھا، آزاد کر کے ایک ترکی فوج کے ساتھ موریا روانہ کیا، باغیوں نے اس

فوج کی مدد سے اہلِ وینس کو اپنے ملک سے نکال کر باہر کیا اور پھر بہ طیب خاطر دولت علیہ کی حمایت میں آ گئے، کیوں کہ یہ ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی تھی[1]۔

مصطفیٰ کوپریلی کا طرزِ زندگی نہایت سادہ تھا اور نمود و نمائش سے اسے بالطبع نفرت تھی، ضروری باتوں کے علاوہ وہ گفتگو نہ کرتا تھا، اس کے متعلق مشہور تھا کہ نہ اس نے کبھی کوئی جرم کیا اور نہ کوئی غیر ضروری لفظ استعمال کیا، لڑائیوں میں دوسرے سپاہیوں کے ساتھ وہ عام طور پر پیدل ہی کوچ کرتا تھا، اس کا خیمہ اپنی سادگی اور بے تکلفی میں ممتاز رہتا تھا، مطالعہ سے اسے خاص ذوق تھا اور اس سے کبھی نہ تھکتا، حتیٰ کہ دورانِ جنگ میں بھی جب وہ اپنے خیمہ میں واپس آتا تو کتابیں دیکھا کرتا تھا، اس کے اوصافِ حمیدہ کی بنا پر لوگ اسے ''کوپریلی صالح'' کے لقب سے پکارتے تھے۔

مقدونیا کی فتح | مصطفیٰ کوپریلی کے تقرر کے وقت آسٹریا کی فوجیں مقدونیا تک پہنچ گئی تھیں اور وہاں کے عیسائی باشندے اپنے بطریق کی قیادت میں ان کو مدد پہنچا رہے تھے، ایک عیسائی سردار کارپوس (Karpos) نے آسٹریا کی سرپرستی میں آزادی کا اعلان کر کے کرال (Karal) کا قدیم لقب بھی اختیار کر لیا تھا، چنانچہ اب سلطنت عثمانیہ کے یورپین مقبوضات کے قلب پر حملہ شروع ہو گیا تھا، ان حالات میں کوپریلی نے ایک مجلس جنگ منعقد کی، جس میں سلیم گرائی، خان کریمیا اور ہنگرین سردار تکیلی بھی حاضر تھا اور مجلس کا فیصلہ حاصل کرنے کے بعد خالد پاشا سرعسکر موریا کی سرکردگی اور سلیم گرائی کی معیت میں ایک فوج مقدونیا کو روانہ کی، ترکی اور تاتاری فوجوں نے جرمنی، آسٹریا اور البانیا کی متحدہ فوجوں کو دو معرکوں میں شکست دی اور کارپوس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، مقدونیا اور اس کے نواح کے وہ تمام اہم مقامات جن پر آسٹریا کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، ترکوں نے واپس لے لیے۔

مزید عثمانی فتوحات | مقدونیا کی فتوحات کے بعد کوپریلی نے دوسرے حصوں کے

---

[1] فریڈبک، ص ۱۳۹۔

تحفظ کا سامان شروع کیا اور اگست ۱۶۹۰ء میں ایک زبردست فوج کے ساتھ بلغاریا اور سرویا سے ہوتا ہوا آسٹرین فوجوں کے مقابلہ کے لیے بڑھا، صوفیا اور نیش کے درمیان ڈراگومان کے مقام پر دو روز تک سخت معرکہ رہا، جس میں بالآخر آسٹرین فوجوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں، اس کے بعد مصطفیٰ کوپریلی نے نیش کا محاصرہ کرلیا اور صرف تین ہفتہ میں اسے فتح کرلیا، ادھر ٹرانسلوینیا میں تکیلی نے جسے ترکوں کی حمایت حاصل تھی، تخت پر قبضہ کرکے دولت عثمانیہ کی سیادت کا اعلان کردیا، نیش کو فتح کرنے کے بعد کوپریلی سمندریا کی طرف بڑھا اور چار ہی روز میں اسے بھی فتح کرکے ودین پر دوبارہ قبضہ کرلیا، ودین کی فتح کے بعد اس نے بلغراد کا محاصرہ کیا اور محاصرہ کے بارہویں روز عثمانی لشکر قلعہ میں داخل ہوگیا، اس اہم شہر میں ایک فوجی دستہ متعین کرنے کے بعد اور سرویا سے آسٹرین فوجوں کو نکال کر مصطفیٰ کوپریلی فاتح کی حیثیت سے قسطنطنیہ کو واپس ہوا، دارالسلطنت میں اس کا استقبال بڑے جوش وخروش کے ساتھ کیا گیا۔

سلیمان کی وفات ۱۰ رمئی ۱۶۹۱ء کو مصطفیٰ کوپریلی ایک تازہ لشکر کے ساتھ پھر آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ ہوا لیکن اس جنگ کے ختم ہونے سے قبل ہی سلطان سلیمان ثانی کا انتقال ہوگیا۔

احمد ثانی

۱۱۰۲ھ تا ۱۱۰۶ھ مطابق ۱۶۹۱ء تا ۱۶۹۵ء

سلطان سلیمان ثانی کی وفات پر اس کا بھائی احمد ثانی ۱۳؍جولائی ۱۶۹۱ء کو تخت نشین ہوا، اس نے مصطفیٰ کوپریلی کو صدر اعظم کے عہدہ پر برقرار رکھا اور سلطنت کے تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں چھوڑ دیے، کوپریلی نے عثمانی فوجیں بلغراد میں جمع کیں اور وہاں سے آسٹریا کی شاہی فوجوں کے مقابلہ کے لیے دریائے ڈینوب کے دائیں ساحل سے ہوتا ہوا شمال کی طرف بڑھا، ۱۹؍اگست ۱۶۹۱ء کو سلانکیمان (Salankeman) کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، ساتھ ہی عیسائی اور ترکی بیڑوں میں بھی دریائے ڈینوب میں چھڑ گئی، ترکی بیڑے نے عیسائی بیڑے کو شکست دی لیکن اس فتح سے ترک فائدہ نہ اٹھا سکے کیوں کہ بری جنگ میں انہیں سخت ہزیمت ہوئی، مصطفیٰ کوپریلی نے اپنے آزمودہ کار رفقاء کے مشورہ کے خلاف کمک کا انتظار کیے بغیر آسٹرین فوج پر حملہ کر دیا، جب اس نے دیکھا کہ ترکوں کے قدم اکھڑ رہے ہیں تو خود تلوار لے کر عیسائی فوج کے قلب میں گھس گیا اور تیغ زنی کے جوہر دکھاتا ہوا مارا گیا، عثمانی فوجیں اس کی شہادت کے بعد میدان جنگ میں ٹھہر نہ سکیں اور بھاگ کھڑی ہوئیں، اس کے بعد آسٹریا کی ایک فوج نے ٹرانسلوینیا پر حملہ کیا اور تکیلی کو وہاں سے نکال کر اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

احمد ثانی کی بقیہ مدت سلطنت میں جنگ کا سلسلہ کم و بیش برابر جاری رہا لیکن یہ

تمام لڑائیاں چھوٹی چھوٹی تھیں اور ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، البتہ جمہوریہ وینس سے جو لڑائی ہوئی اس نے جزیرہ سافر سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گیا، ان شکستوں اور اندرونی بغاوتوں کے علاوہ اس عہد میں وبا اور قحط کے بھی کئی حملے ہوئے، سمرنا میں ایک بڑا زلزلہ آیا جس سے بہت نقصان پہنچا اور پھر ستمبر ۱۶۹۳ء میں خود قسطنطنیہ میں ایک زبردست آگ لگی جو اس زلزلہ سے بہت زیادہ برباد کن ثابت ہوئی۔

۲۲/ جمادی الثانی ۱۱۰۶ھ (۶/ فروری ۱۶۹۵ء) کو احمد ثانی نے انتقال کیا۔

مصطفیٰ ثانی

۱۱۰۶ھ تا ۱۱۱۵ھ مطابق ۱۶۹۵ء تا ۱۷۰۳ء

احمد ثانی کی وفات پر معزول سلطان محمد رابع کا لڑکا شہزادہ مصطفیٰ تخت نشین ہوا، یہ نہایت شجاع اور اولوالعزم فرماں روا تھا، تخت نشینی کے تیسرے ہی روز اس نے ایک ''خط شریف'' جاری کیا جس میں سلطنت کے افسوس ناک حالات بیان کر کے انہیں اپنے پیش روؤں کی غفلت اور عیش پسندی کا نتیجہ قرار دیا اور ان کی اصلاح کے لیے پوری آمادگی اور مستعدی ظاہر کی، اس وقت آسٹریا، روس، وینس اور پولینڈ سے لڑائی کا سلسلہ کم وبیش جاری تھا، مگر سب سے زیادہ خطرہ آسٹریا کی طرف سے تھا، چنانچہ مصطفیٰ نے دیوان منعقد کر کے اعیان حکومت سے یہ دریافت کیا کہ غنیم کے مقابلہ میں فوجوں کا روانہ کر دینا کافی ہوگا یا اسے خود بھی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں جانا چاہیے، تین دن تک غور و مشورہ کرنے کے بعد دیوان اس فیصلہ پر پہنچا کہ میدان جنگ میں سلطان کا جانا نہ صرف اس کی ذات کو خطرہ میں ڈالنا ہے بلکہ اس سے لشکر کے اخراجات میں بھی بہت اضافہ ہو جائے گا، چنانچہ دیوان نے متفقہ طور پر یہ گذارش کی کہ ذات سلطانی کو جنگ کے خطرات میں ڈالنا مناسب نہیں، فوج کی کمان صدر اعظم کو سپرد کر دینا کافی ہوگا لیکن سلطان نے اس معروضہ کا صرف اس قدر جواب دیا کہ ''مجھے فوج کے ساتھ جانے پر اصرار ہے'' چنانچہ اس عزم کے مطابق ۱۶۹۵ء کے موسم گرما میں وہ بلغراد سے تمیسوار کو روانہ ہوا اور راستہ میں متعدد اہم قلعے جو

آسٹریا کے قبضہ میں جا چکے تھے، دوبارہ فتح کر لیے، ۲۲؍ستمبر ۱۶۹۵ء کو آسٹریا کی فوج جو وٹیرانی (Veterani) کے زیر کمان تھی، لیوگوس کے قریب مقابلہ ہوا، سلطان کو شاندار فتح ہوئی اور وٹیرانی اور اس کی نصف فوج ماری گئی۔

جنگ کی تیاری موسم سرما میں جنگ ملتوی ہوگئی، اس فرصت میں مصطفیٰ اپنے وزراء کی مدد سے مالیات کی درستگی اور فوج کے اضافہ و تنظیم میں ہمہ تن مصروف رہا، اس نے تمبا کو، حبشی خواجہ سرا اور دیگر تعیشات پر بڑے بڑے ٹیکس عائد کیے، اکثر عمائدین سلطنت نے بھی وقت کی ضرورت اور سلطان کے جوش سے متاثر ہو کر سلطنت کی مدد میں سرگرمی دکھائی اور آئندہ جنگ کے لیے فوجیں اکٹھا کیں، جن کے مصارف انہوں نے خود برداشت کیے، مصطفیٰ نے قسطنطنیہ اور ادرنہ کے شاہی باغبانوں (بوستانجی) میں سے تین ہزار پیدل سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کی، جسے اس موقع پر اس نے تین رسالوں میں تقسیم کر کے خاص اہتمام سے تعلیم دلوائی۔

ابتدائی فتوحات ۱۶۹۶ء میں مصطفیٰ ایک زبردست فوج کے ساتھ پھر آگے بڑھا اور تمیسوار کے قریب آسٹرین فوج کو جو ڈیوک ڈی ساکس (Duke Desaxe) کی سرکردگی میں تھی، شکست دے کر تمیسوار کو غنیم کے محاصرہ سے چھڑا لیا، اس کے بعد ہنگری کے ان قلعوں کو جو ابھی دولت عثمانیہ کے قبضہ میں تھے، مزید فوجی دستوں سے مستحکم کر کے ادرنہ واپس آ گیا، ان فتوحات سے ترکوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور ان میں ایک تازہ جوش پیدا ہو گیا، عثمانی فوجوں نے جو ایک عرصہ سے مدافعانہ جنگ میں پسپا ہوتی آ رہی تھیں، اب فاتحانہ طور پر دشمن کے مقابلہ میں بڑھنا شروع کیا اور توقع کی جانے لگی کہ مصطفیٰ ثانی کے مبارک عہد میں پچھلے عہدوں کی تلافی ہو جائے گی لیکن دوسرے سال ۱۶۹۷ء میں آسٹریا کے ساتھ جو معرکہ پیش آیا اس نے تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا اور سلطنت عثمانیہ کی ہیبت بالآخر یورپ کے دل سے نکل گئی۔

زنتا کی شکست ۱۶۹۷ء میں مصطفیٰ ایک تازہ فوج کے ساتھ بلغراد سے روانہ ہو کر

ہنگری میں داخل ہوا اور شمال میں دریائے تھائیس کی طرف بڑھا، آسٹریا کی فوجیں اس وقت شہزادہ یوجین (Eugene) کے زیر کمان تھیں، جو اپنے عہد کا سب سے زیادہ مشہور جنرل تھا، ۱۱ر ستمبر کو دونوں فوجوں کا مقابلہ لب ساحل زنتا (Zenta) کے مقام پر ہوا، ترکوں نے وہاں ایک پل بنا لیا تھا اور سلطان اپنے سواروں اور توپ خانہ کے بڑے حصہ کے ساتھ دریا کو عبور کر کے اس کے دوسرے کنارہ پر پہنچ چکا تھا لیکن پیدل سپاہی ابھی اسی کنارہ پر تھے، شہزادہ یوجین دفعۃً ان کے سر پر آ پہنچا اور ان سپاہیوں پر جو اس وقت تک دریا عبور نہ کر سکے تھے، حملہ کر دیا، بدقسمتی سے ترکی فوج کے مختلف دستے اس وقت باہمی جھگڑوں میں مبتلا تھے، افسروں میں بھی اختلافات تھے اور ان میں سے بعض صدر اعظم الماس محمد پاشا سے بغض و عداوت رکھتے تھے، میدان جنگ ہی میں ینی چری کی ایک بڑی تعداد نے بغاوت کر دی اور خود اپنے افسروں کو قتل کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ترک شہزادہ یوجین کے حملہ کی تاب نہ لا سکے اور انہیں بری طرح شکست ہوئی، ان کے چھبیس ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گئے اور دس ہزار دریا عبور کرنے کی کوشش میں غرق ہو کر ہلاک ہو گئے، ان کے علاوہ صدر اعظم، چار وزیر اور بہت سے فوجی افسر کام آئے، سلطان جو دریا کے دوسرے کنارہ سے اس جنگ کو دیکھ رہا تھا، بھاگ کر تمیسوار پہنچا اور وہاں سے بلغراد ہوتا ہوا قسطنطنیہ واپس آ گیا، اس کے بعد اس کی بقیہ فوج بھی بلغراد سے ہو کر اورنہ چلی آئی، اس کے بعد شہزادہ یوجین دریائے ڈینوب کو عبور کر کے بوسنیا میں داخل ہوا اور اس کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، زنتا کی شکست ترکوں کی فوجی طاقت کے زوال کا ایک ایسا اعلان تھی جس کی آواز یورپ کے دور دراز گوشوں میں بھی جا پہنچی اور مغربی سلطنتیں اب اپنے کو عثمانی حملوں سے بالکل محفوظ خیال کرنے لگیں۔

حسین کوپریلی | جنگ زنتا کے چھ روز بعد سلطان مصطفیٰ ثانی پھر خاندان کوپریلی کی طرف متوجہ ہوا اور سلطنت کو تباہی سے بچانے کے لیے اسی خاندان کے ایک فرد حسین

کوپریلی کو صدر اعظم مقرر کیا، حسین کوپریلی صدر اعظم محمد کوپریلی کا بھتیجا تھا اور اس میں انتظام سلطنت کا وہ غیر معمولی ملکہ جو کوپریلی خاندان کا نمایاں امتیاز تھا، بہت زیادہ پایا جاتا تھا، محاصرہ ویانا کی ناکامی تک حسین کوپریلی ایک آزاد مزاج نوجوان تھا اور محض عیش وعشرت سے سروکار رکھتا تھا لیکن ویانا کی عبرت ناک شکست کے بعد اس نے اپنے قومی فرض کو محسوس کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو استعداد عطا فرمائی تھی اسے دولت علیہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا، صدر اعظم کے عہدہ پر فائز ہونے سے پیش تر وہ مختلف اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکا تھا، اور اپنی لیاقت واہلیت کا ثبوت دے چکا تھا، ۱۶۹۷ء میں صدر اعظم مقرر ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے سلطنت کی فوجی قوت کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں مالیات کی طرف خاص توجہ کی، گذشتہ جنگ میں خزانہ پر بہت زیادہ بار پڑ چکا تھا، اس کی تلافی کے لیے اس نے مختلف تدبیریں اختیار کیں، مثلاً پہلے کافی پر محصول لگایا، پھر حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں پر ایک قسم کا انکم ٹیکس عائد کیا اور آخر میں جائداد موقوفہ کی آمدنی سے بھی دولت علیہ کی شدید ضروریات کے لیے ایک بڑی رقم حاصل کی، اس طرح اس نے کافی سرمایہ فراہم کر کے سلطنت کے یورپین صوبوں کی حفاظت کے لیے پچاس ہزار پیادوں اور اڑتالیس ہزار سواروں کی ایک فوج تیار کر لی، اس کے علاوہ اس نے ایک بیڑا بحر اسود میں بھیجا اور دوسرا بحر روم میں لیکن دراصل تمام تیاریاں اس نے مدافعت کے لیے کی تھیں اور ان سے کوئی جارحانہ اقدام مقصود نہ تھا کیوں کہ وہ سلطنت کی کمزوری سے خوب واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر جنگ پھر شروع ہوگئی تو اس کا نتیجہ سلطنت کے حق میں مزید تباہیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا، بہر حال ان تیاریوں کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ آسٹریا کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور ترکی فوج کے سپہ سالار روان طبان پاشا نے شہزادہ یوجین کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا یہاں تک کہ اس نے بوسنیا کو خالی کر دیا۔

سقوطِ ازف — اس درمیان میں وینس سے جنگ کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس کی فوجیں

ڈلماشیا میں آگے بڑھتی جارہی تھیں، یونان میں اہل وینس کے قدم خاکنائے کورنتھ سے آگے پہنچ چکے تھے، اگرچہ نگروپونٹ پر وہ قبضہ نہ کر سکے اور ترکی امیر البحر نے ان کے بیڑوں کو دوبارہ شکست دے کر جزیرہ کیوس (Chios) کو واپس لے لیا، پولینڈ سے گو اس وقت کوئی جنگ نہ تھی لیکن خان کریمیا کے حملے کو ابھی دو ہی سال گزرے تھے اور اہل پولینڈ دولت علیہ کے خلاف ہر ممکن موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے لیکن سب سے بڑا خطرہ روس کا تھا، پیٹر اعظم اپنی وسیع سلطنت کو روز بہ روز زیادہ طاقت ور بنا رہا تھا، اس نے آسٹروی اور فرانسیسی فوجوں کے نمونہ پر ایک مضبوط فوج تیار کر لی تھی لیکن اصلی زور وہ بحری طاقت پر دے رہا تھا، کیوں کہ وہ بحر اسود میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا، اسی مقصد کے لیے وہ دولت عثمانیہ کے خلاف پوری قوت سے جنگ کرنا چاہتا تھا، سب سے پہلے اس نے ازف پر قبضہ کرنا چاہا اور ۱۶۹۵ء میں ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا، یہ محاصرہ ناکام رہا اور تیس ہزار سپاہیوں کی لاشیں میدان میں چھوڑ کر اسے پسپا ہونا پڑا لیکن دوسرے سال اس نے پھر تازہ فوجوں کے ساتھ شہر کا محاصرہ کیا اور اس کے بحری بیڑے نے ترکی بیڑے کو شکست دی، اب کی بار محاصرہ کامیاب رہا اور ۲۸ / جولائی ۱۶۹۶ء کو ازف نے ہتھیار ڈال دیے۔

صلح نامۂ کالووٹز غرض زنتا کی شکست کے وقت دولت علیہ ہر طرف سے دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور حسین کوپریلی کے حسن انتظام کے باوجود اس میں بیک وقت تمام دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی، حسین کوپریلی اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھا، چنانچہ جب سفیر برطانیہ لارڈ پیجیٹ (Lord Paget) نے برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت سے صلح کی تحریک شروع اور شرط صلح یہ قرار دی کہ ہر فریق کا قبضہ اس کی فتوحات پر قائم رکھا جائے تو حسین کوپریلی نے ایک دیوان منعقد کر کے اس مسئلہ کو ارکان حکومت کے مشورہ کے لیے پیش کیا، ذاتی طور پر وہ صلح کا حامی تھا اور اسی کی تحریک سے دیوان نے بھی برطانیہ اور ہالینڈ کی وساطت منظور کی مگر صلح کا مذکورۂ بالا اصول سلطان مصطفیٰ کے لیے کسی طرح قابل

قبول نہ تھا اور اس نے اس کی منظوری چند اہم ترمیمات پر مشروط کر دی، بالآخر یہ طے پایا کہ صلح کا مسئلہ ایک کانگریس کے سپرد کر دیا جائے، جس میں دولت عثمانیہ، آسٹریا، روس، پولینڈ، وینس، برطانیہ اور ہالینڈ کے نمائندے شریک ہوں، اس کانگریس کے لیے کارلووٹز کے مقام تجویز ہوا، جو پیٹر وارڈین کے قریب واقع تھا، ابتداءً روس کانگریس کی شرکت سے انکار کرتا رہا، کیوں کہ اور وہ ازف کے علاوہ اور مقامات پر بھی قبضہ کرنے کا خواہش مند تھا اور یہ لارڈ پیجٹ کے پیش کردہ اصول کی بنا پر ممکن نہ تھا لیکن دوسری سلطنتوں نے مجبور کر کے اسے بھی کانگریس میں شریک کیا، بہتر روز کے بحث و مباحثہ کے بعد فی الجملہ لارڈ پیجٹ کے اصول کے مطابق ایک صلح نامہ ۲۴ رجب ۱۱۱۰ھ (۲۶ جنوری ۱۶۹۹ء) کو مرتب کیا گیا، جو صلح نامۂ کارلووٹز (Carlowitz) کے نام سے مشہور ہے، اس کے رو سے آسٹریا کا قبضہ ٹرانسلوینیا، سلاوونیا اور ہنگری کے ان تمام علاقوں پر جو دریائے مروش کے شمال اور دریائے تھائیس کے مغرب میں واقع تھے قائم رکھا گیا، اب ہنگری میں عثمانیوں کے سابق مقبوضات میں سے صرف ایک ثلث پر ان کی حکومت باقی رہ گئی، آئندہ کے لیے وہ خراج بھی موقوف کر دیا گیا، جو شہنشاہ آسٹریا، ہنگری اور ٹرانسلوینیا کی طرف سے سلطان کی خدمت میں پیش کرتا تھا، وینس کا قبضہ موریا اور البانیا پر باقی رکھا گیا لیکن آبنائے کورنتھ کے شمال میں جو مقامات اس نے فتح کیے تھے، وہ لارڈ پیجٹ کے اصول کے باوجود دولت عثمانیہ کو واپس دلا دیے گئے، البتہ جزیرہ زنط کا خراج اسے معاف کر دیا گیا، پولینڈ کو پوڈولیا اور کامینک واپس مل گئے، روس کا قبضہ شہر ازف اور بحر ازف کے شمالی علاقوں پر قائم رکھا گیا، پیٹر اعظم کو اس سے سیری نہ ہوئی اور اس نے صرف دو سال کے لیے اس صلح نامہ پر دستخط کیے، دوسری حکومتوں نے پچیس سال کے لیے صلح کا معاہدہ کیا۔

صلح نامۂ کارلووٹز کی نسبت کریسی آل عثمان کے مشہور جرمن مؤرخ فان ہیمر کی رائے نقل کرتا ہے کہ یہ صلح نامہ نہ صرف اس وجہ سے یادگار رہے گا کہ اس نے اہم ملکی

تبدیلیوں کو برقرار رکھا اور نہ محض اس وجہ سے کہ اس کے بعد ہی سلطنت عثمانیہ کی فاتحانہ طاقت کا رعب دلوں سے زائل ہو گیا، بلکہ اس وجہ سے بھی یادگار رہے گا کہ اس موقع پر باب عالی اور روس نے پہلی بار ایک عام یورپین کانگریس میں شرکت کی اور اس کانگریس میں برطانیہ اور ہالینڈ کے نمائندوں کو داخل کر کے جب کہ ان دونوں میں سے کوئی حکومت بھی جنگ میں شریک نہ تھی، سلطان اور زار روس دونوں نے اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ مفاد عامہ کے لیے یورپ کی حکومتیں دوسری سلطنتوں کے باہمی نزاعات میں دخل دے سکتی ہے۔

ملکی اصلاحات صلح نامۂ کارلووٹز کے تکملہ کے بعد حسین کوپریلی نے سلطنت کے اندرونی معاملات کی جانب توجہ کی، گذشتہ جنگ کے آخری سالوں میں کریمیا، مصر اور عرب میں بغاوت شروع ہو گئی تھی، ایران کی سرحد پر بھی بہت شورش تھی، حسین کوپریلی نے ان تمام بغاوتوں کا استیصال کر کے سلطنت کے ہر حصہ میں امن وامان قائم کیا، اس کے بعد اس نے حکومت کے ہر شعبہ کی اصلاح شروع کی، چنانچہ فوج، بحریہ، مالیات، مدارس وجوامع، اوقاف، تمام شعبوں میں اصلاحات جاری کیں، بحریہ کے لیے اس نے ایک جدید ''قانون نامہ'' مرتب کیا، کوپریلی کو عیسائی رعایا کی بہبودی کا خاص طور پر خیال رہتا تھا اور وہ ان کے ساتھ بڑی رعایتیں کرتا تھا، چنانچہ اس نے بوسینا اور نبات کے عیسائیوں کا ایک سال کا جزیہ معاف کر دیا اور رومیلیا کے عیسائی رعایا کے ذمہ جو محصول باقی تھا، اسے بھی چھوڑ دیا، اس نے مسجدیں، مدرسے، بازار اور چھاؤنیاں سلطنت کے ہر حصہ میں بہت کثرت سے تعمیر کرائیں لیکن ان تمام خدمات کے باوجود بعض دشمنوں نے اس کے خلاف سلطان کے کان بھرنا شروع کیے، یہ دیکھ کر حسین کوپریلی نے ستمبر ۱۷۰۲ء میں اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا، چند ہی دنوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

دال طبان پاشا حسین کوپریلی کی وفات پر سلطان نے دال طبان پاشا کو صدر اعظم مقرر کیا، وہ ایک جنگ جو سپاہی تھا اور جنگ کے علاوہ کسی اور بات سے دل چسپی نہ رکھتا تھا،

اس نے معاہدہ کارلووٹز کو چاک کر ڈالنا چاہا لیکن رعایا اور فوج دونوں اس کی پالیسی کو سلطنت کے لیے مضر خیال کرتے تھے اور دونوں نے مل کر سلطان سے اس کی معزولی کی درخواست کی، مفتی فیض اللہ بھی جو ابتداءً اس کا طرف دار تھا، بعد میں سخت مخالف ہو گیا اور اسی کی کوشش سے دال طبان پاشا معزول کر دیا گیا۔

مصطفیٰ کی معزولی دال طبان پاشا کے بعد رامی محمد پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، وہ حسین کوپریلی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے ان مفاسد کی اصلاح شروع کی جو کوپریلی کے بعد پھر سلطنت میں رونما ہونے لگے تھے، اس سلسلہ میں بہت سے لوگ جن کو نقصان پہنچ رہا تھا، اس کے مخالف ہو گئے اور اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے، چوں کہ وہ کوئی ممتاز فوجی افسر نہ تھا، اس لیے ینی چری بھی اس سے خوش نہ تھے اور بعض مفسدوں کے ابھارنے پر انہوں نے سلطان سے اس کی معزولی کا مطالبہ کیا، اس مطالبہ نے جنوری ۱۷۰۳ء میں بغاوت کی شکل اختیار کر لی اور قسطنطنیہ ینی چری کی شورشوں کا مرکز بن گیا، فوج نے رامی محمد پاشا کے علاوہ مفتی فیض اللہ کی معزولی کا بھی مطالبہ کیا، سلطان اس وقت ادرنہ میں تھا، اس نے مفتی فیض اللہ کو تو معزول کر دیا لیکن رامی محمد پاشا کا معاملہ اپنے قسطنطنیہ پہنچنے تک ملتوی رکھا، باغیوں نے اب خود سلطان کے عزل کی تحریک کی اور علماء سے اس کے متعلق فتویٰ حاصل کر لیا، سلطان نے اپنا خاص ینی چری دستہ باغیوں کے مقابلہ میں روانہ کیا لیکن دستہ بھی ان ہی میں شامل ہو گیا، یہ دیکھ کر مصطفیٰ ۲؍ربیع الاول ۱۱۱۵ھ (۱۵؍اگست ۱۷۰۳ء) کو تخت سے اتر آیا اور باغیوں نے اس کے بھائی احمد کو تخت پر بیٹھایا، اسی سال ۲۲؍شعبان (۳۱؍دسمبر ۱۷۰۳ء) کو مصطفیٰ کا انتقال ہو گیا۔

سلطان مصطفیٰ ثانی ایک دانش منداور بیدار مغز سلطان تھا، ابتدائے عہد میں اس نے بڑی ہمت اور شجاعت کا ثبوت دیا اور متعدد اہم فتوحات حاصل کیں لیکن زنتا کی شکست کے بعد سلطان کی فوجی قوت اتنی کم زور ہو گئی تھی کہ آسٹریا سے کام یاب مقابلہ کرنا ممکن نہ

تھا، ایسی حالت میں صلح کے لیے راضی ہو جانا مصلحت وقت کے عین مطابق تھا، بعض یورپین مؤرخین مصطفیٰ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ معاہدہ کارلووٹز کے بعد اس کی جنگی سرگرمیاں بالکل موقوف ہو گئیں اور وہ عیش وعشرت میں مصروف ہو گیا لیکن واقع یہ ہے کہ سلطنت میں جنگ کی طاقت نہ تھی، علاوہ بریں ہر طرف بغاوت برپا تھی، جس کا استیصال نہایت ضروری تھا، نیز حکومت کے تمام شعبے اصلاح کے محتاج تھے، مصطفیٰ نے ان ہی امور کی طرف اپنی توجہ رکھی اور صدر اعظم حسین کوپریلی کی مدد سے ان ہی کا تکملہ کیا، جب وہ ان اصلاحات سے فارغ ہوا تو دال طبان پاشا اور رامی محمد پاشا کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے اور ان کے بعد ہی فوج نے خود اس کی معزولی کا فیصلہ کیا، ان حالات میں اس نے جو کچھ سلطنت کے لیے کیا اس سے زیادہ ممکن بھی نہ تھا۔

احمد ثالث

۱۱۱۵ھ تا ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۰۳ء تا ۱۷۳۰ء

سلطان احمد ثالث کی تخت نشینی ینی چری کی بغاوت کا نتیجہ تھی، اس لیے تخت پر آنے کے بعد اس نے بہت کچھ انعام و اکرام دے کر باغیوں کو راضی کیا اور ان کے مطالبہ پر مفتی فیض اللہ آفندی کے قتل کی اجازت دے دی، مفتی موصوف کا جرم یہ تھا کہ وہ اس فوج کی خودسری کے مخالف تھے لیکن یہ خون جلد رنگ لایا اور سلطان نے قابو پانے کے بعد ینی چری سے پورا قصاص لیا اور ان کے بہت سے افسروں کو قتل کرا دیا، اس نے احمد پاشا صدر اعظم کو جو باغیوں کا منتخب کردہ تھا، معزول کر دیا اور اس عہدہ پر اپنے بہنوئی داماد حسن پاشا کو مامور کیا لیکن سازشوں نے حسن پاشا کی صدارت کو بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہنے دیا اور وہ بھی معزول کر دیا گیا، اس کے بعد متعدد اشخاص صدر اعظم مقرر ہوئے اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد علاحدہ کر دیے گئے، چنانچہ اس عہد کے ابتدائی پندرہ سالوں میں بارہ صدر اعظم یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹر اعظم کی خارجی پالیسی کی طرف جیسی توجہ کرنی چاہیے تھی، دولت علیہ نہ کر سکی اور روس کی طاقت بڑھتی ہی چلی گئی۔

روس سے جدید معاہدہ ۱۷۰۰ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان جو معاہدہ تھا، پیٹر اس پر دیانت داری کے ساتھ قائم نہ تھا، وہ اپنی مملکت کے جنوبی صوبوں میں جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا، احمد ثالث نے تخت نشینی کے بعد پیٹر کو اس امر کی شکایت لکھ بھیجی لیکن

سلطنت کے اندرونی اختلال کی وجہ سے جو ینی چری کی سرکشی کے باعث شروع میں پیدا ہوگیا تھا، وہ کسی جنگی مظاہرہ کے لیے تیار نہ تھا، روس بھی سویڈن سے قوت آزمائی کر رہا تھا اور دولت عثمانیہ سے کوئی نئی جنگ چھیڑ دینا اس کی مصلحت کے بھی خلاف تھا، چنانچہ ۱۷۰۵ء میں دونوں سلطنتوں میں ایک جدید معاہدہ ہوا اور جنگ کچھ دنوں کے لیے پھر ملتوی ہوگئی، تاہم دولت علیہ روس کی نقل وحرکت سے غافل نہ تھی اور بحر اسود کے ساحل پر پیٹر جو نئے قلعے تعمیر کرا رہا تھا، ان کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

چارلس پیٹر کی زیادہ تر توجہ فی الحال سویڈن کی جانب تھی، جس کا فرماں روا چارلس دوازدہم نہایت بہادری کے ساتھ روس کی پوری طاقت کا مقابلہ کر رہا تھا، ترکوں کو چارلس کے ساتھ بہت ہمدردی تھی لیکن روس کے ساتھ جو معاہدہ ہو چکا تھا اس کی وجہ سے وہ چارلس کی مدد کرنے سے معذور تھے، ۸؍جولائی ۱۷۰۹ء کو پلٹوا (Paltowa) کے مقام پر چارلس کو سخت شکست ہوئی اور اس نے بھاگ کے سلطنت عثمانیہ کے حدود میں پناہ لی، سلطان احمد ثالث نے اس کا استقبال شاہانہ احترام کے ساتھ کیا لیکن اس کی حمایت میں پیٹر سے جنگ شروع کردینے پر تیار نہ ہوا، البتہ جب پیٹر نے یہ خواہش کی کہ چارلس کو پناہ نہ دی جائے تو سلطان نے صاف جواب دے دیا کہ آئین شرافت کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور پیٹر کی دھمکیوں کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔

روس سے اعلانِ جنگ پلٹوا کے معرکہ کے بعد پیٹر نے لیوونیا (Livonia) کو فتح کیا جس سے بحر بالٹک میں داخل ہونے کی راہ کھل گئی، اس کے بعد وہ دولت علیہ کی طرف متوجہ ہوا اور بحر اسود میں دخل حاصل کرنے کے لیے کریمیا پر حملہ کی تیاری کرنے لگا، ازف کے قلعہ اور بحر ازف کے شمالی مشرقی ساحل پر اس کا قبضہ پہلے سے تھا، اس نے تگنروگ (Taganrog) اور دوسرے قلعوں کو جن سے کریمیا پر زد پڑتی تھی، مستحکم کرلیا، سلطان پیٹر کی ان جنگی تیاریوں کو دیکھ رہا تھا، دونوں سلطنتوں کے تعلقات چارلس کے قیام کی وجہ سے اور

زیادہ کشیدہ ہو گئے تھے، وہ برابر سلطان کو روس سے جنگ کرنے کے لیے ابھارتا رہا تھا، سلطان پر ابتدا میں اس ترغیبوں کا اثر نہ پڑا لیکن جب خان کریمیا نے آستانہ میں حاضر ہو کر ان تمام خطرات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جو پیٹر کی تیاریوں نے پیدا کر دیے تھے تو بالآخر مجبور ہو کر اس نے ۲۸ر نومبر ۱۷۱۰ء کو روس سے جنگ کا اعلان کر دیا، ۲۵ر فروری ۱۷۱۱ء کو پیٹر کی طرف سے بھی ماسکو کے سب سے بڑے کلیسا میں ترکوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا گیا، اس نے اس جنگ کو ایک مذہبی جنگ قرار دیا جس کا مقصد یورپ سے ترکوں کو نکال دینا تھا، روسی علم کے ایک جانب صلیب کی تصویر بنی ہوئی تھی اور دوسری جانب یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے ''خدا اور مسیحیت کے لیے''۔

مئی ۱۷۱۱ء میں صدر اعظم بلط جی محمد پاشا عثمانی فوجوں کے ساتھ مولڈیویا کی طرف روانہ ہوا، جس کا امیر دولت علیہ سے غداری کر کے پیٹر سے مل گیا تھا اور پیٹر اس کی مدد سے بلقان کی سلافی قوموں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف ابھار رہا تھا[1]، چنانچہ پیٹر بھی اپنی فوج لے کر مولڈیویا میں داخل ہوا، روسی فوجوں کی تعداد عثمانی فوجوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی، تاہم پیٹر اپنے جوش میں آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ دریائے پرتھ کو عبور کر کے اس کے ساحل پر خیمے نصب کر دیے، وہاں پہنچ کر اسے اپنی غلطی معلوم ہوئی، کیوں کہ اس کے ایک بازو پر دریائے پرتھ اور دوسرے پر ایک وسیع دلدل تھا اور سامنے کی پہاڑیوں پر بلط جی محمد پاشا اپنی فوجوں کے ساتھ قابض تھا، روسی فوجیں عثمانی توپوں کی زد میں آ چکی تھیں، جن سے بچ کر دریا کو عبور کرنا ممکن نہ تھا۔

زار کا حال زار پیٹر کو اپنے سپاہیوں کی ہلاکت اور اپنی گرفتاری کا پورا یقین تھا، اس موقع پر اس نے جو خط روسی سینٹ (مجلس قومی) کے نام ماسکو روانہ کیا تھا، اس سے اس کی بے چارگی اور مایوسی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے:

---

[1] سوانح پیٹر اعظم، از اسٹیفن گریہم، مطبوعہ لندن، ۱۹۲۹ء، ص ۱۹۸۔

''میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ جھوٹی خبر سے فریب کھا کر اور اپنی کسی غلطی کے بغیر میں اپنے کو اس حالت میں پاتا ہوں کہ ترکی فوج نے مجھے خود میرے لشکر میں بند کر رکھا ہے، ہمارے سامان رسد کی فراہمی منقطع کر دی گئی ہے اور ہمیں ہر لحہ ہلاک یا قید ہو جانے کا خطرہ ہے، بجز اس کے کہ خدا کسی غیر متوقع طریقہ پر ہماری مدد کرے، اگر میں ترکوں کے ہاتھ گرفتار ہو جاؤں تو پھر تم مجھے اپنا زار اور فرماں روا نہ سمجھنا اور نہ میرے کسی حکم کی پرواہ کرنا جو میری طرف سے تمہارے پاس پہنچایا جائے، خواہ تم میرے خط کو پہچان ہی کیوں نہ لو بلکہ خود میری آمد کے منتظر رہنا، اگر میں ہلاک ہو جاؤں اور تمہیں میری وفات کی تصدیق شدہ اطلاع ملے تو اس وقت تم میرا جانشین اس شخص کو منتخب کر لینا جو تم میں سب سے زیادہ اہل ہو[1]''

صلح نامۂ پرتھ پیٹر اور اس کی فوج کی حالت ایسی ہی تھی، روسی تمام تر ترکوں کے رحم و کرم پر تھے، اگر ترک چاہتے تو انہیں قتل کر ڈالتے یا گرفتار کر لیتے، ایسے نازک وقت میں جب خود پیٹر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ مایوس ہو کر اپنے خیمہ میں پڑا ہوا تھا، اس کی بیوی کیتھرائن نے کمالِ ذکاوت اور دانش مندی سے ایک ایسی راہ نکالی جس سے پیٹر اور اس کی فوج کو سلامتی کے ساتھ روس واپس چلے جانے کا موقع مل گیا، اس نے اپنے تمام زیورات اور جو کچھ نقد لشکر میں جمع ہو سکا، سب اکٹھا کر کے صدر اعظم کے نائب کے پاس عثمانی لشکر میں بھیجا اور درخواست کی کہ صلح کی گفتگو کے لیے جنگ چند دنوں تک ملتوی کر دی جائے، نائب کی سفارش سے صدر اعظم بلطہ جی محمد پاشا اس گفتگو کے لیے راضی ہو گیا، پیٹر کے حریف چارلس دوازدہم کا نمائندہ کاؤنٹ پونیاٹوسکی (Count Poniatowski) اور خان کریمیا عثمانی لشکر میں موجود تھے اور دونوں نے ایسے نادر موقع پر جب کہ پیٹر ان کی مٹھی میں آ چکا تھا، صلح کی نہایت شدید مخالفت کی لیکن صدر اعظم نے ان کی مخالفت کے باوجود ایسے شرائط پر صلح کر لی جو اس کی دانست میں سلطنت عثمانیہ کے لیے نہایت مفید تھے، چنانچہ

---

[1] لارڈ ایورسلے، ص ۱۹۳۔

۲۱ رجولائی ۱۷۱۱ء کو صلح نامہ مرتب ہو گیا، صلح نامہ میں دفعات کو درج کرنے سے پہلے یہ الفاظ لکھے گئے "اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فتح مند اسلامی فوج نے زار روس کو اس کی تمام فوجوں کے ساتھ دریائے پرتھ کے قریب گھیر لیا ہے اور زار روس نے صلح کی درخواست کی ہے اور اسی کی درخواست پر مندرجہ ذیل دفعات مرتب اور منظور کی جاتی ہیں:

۱- زار روس نے قلعہ ازف اور اس کے ملحق علاقوں سے اپنا قبضہ اٹھا لینا منظور کیا اور ان کو اسی حالت میں سلطنت عثمانیہ کے حوالہ کر دینے کا وعدہ کیا جس حالت میں اس نے ان پر قبضہ کیا تھا۔

۲- زار روس نے منظور کیا کہ اس کا نیا شہر تگنروگ جو بحر ازف پر واقع تھا، نیز اس علاقہ کے بعض دوسرے قلعے جو اس نے تعمیر کرائے تھے، سب مسمار کر دیے جائیں اور پھر کبھی تعمیر نہ ہوں، علاوہ بریں کمنسکی (Kermienrki) میں اس نے جو توپیں اور فوجی سامان اکٹھا کیے تھے، وہ سب باب عالی کو دے دیے جائیں۔

۳- زار نے معاہدہ کیا کہ آئندہ وہ اہل پولینڈ اور ان قزاقوں کے معاملات میں جو پولینڈ یا خان کریمیا کے محکوم ہیں، دخل نہ دے گا اور ان کے علاقوں سے روسی فوجیں ہٹا لے گا۔

۴- چوتھی دفعہ میں تجارت کو آزاد قرار دیا گیا لیکن یہ شرط رکھی گئی کہ آئندہ کوئی روسی سفیر قسطنطنیہ میں مقیم نہ ہو گا، کریسی لکھتا ہے کہ اس شرط کی وجہ غالباً وہ سازشیں تھیں جو روس یونانیوں اور دولت عثمانیہ کی دوسری عیسائی رعایا سے کرتا رہتا تھا۔

۵- اہل روس ان مسلمانوں کو آزاد کر دیں جن کو انہوں نے دوران جنگ میں یا جنگ سے قبل گرفتار کر لیا ہے۔

۶- شاہ چارلس کو روس سے ہو کر اپنے ملک سوئیڈن جانے کی اجازت دی گئی اور زار نے معاہدہ کیا کہ راستہ میں اس سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے گی، اس دفعہ میں

اس امر کی بھی سفارش کی گئی کہ روس اور سویڈن باہم صلح کر لیں۔

۷-باب عالی کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ آئندہ وہ اہل روس کو کوئی نقصان نہ پہنچائے گا اور اسی طرح اہل روس کی طرف سے معاہدہ ہوا کہ وہ سلطان کی رعایا اور ماتحتوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں گے[1]۔

جب اس صلح نامہ کی خبر قسطنطنیہ پہنچی اور معلوم ہوا کہ پیٹر اس طرح قبضہ میں آکر صاف نکل گیا تو سلطان سخت برہم ہوا، بلطہ جی محمد پاشا کو واپسی پر صدارت کے عہدے سے علاحدہ کر دیا گیا اور اس نے نائب عثمان اور رئیس آفندی عمر کو جن کے متعلق خیال تھا کہ یہ صلح ان ہی کی کوششوں سے عمل میں آئی ہے، سلطان نے قتل کرا دیا، اس نے صلح نامہ کے منظور کرنے سے بھی انکار کر دیا اور روس سے پھر جنگ کی تیاری شروع کر دی لیکن بعض وزرائے سلطنت اور زیادہ تر سفیر برطانیہ سر سٹن (Sir R. Sutton) کے مشورہ سے سلطان جنگ سے باز رہا اور دو سال بعد زار روس کے ساتھ ایک دوسرا صلح نامہ مرتب کیا گیا جس میں بلطہ جی محمد پاشا کے صلح نامہ کی تمام دفعات شامل تھیں۔

بلطہ جی کا جرم اکثر مؤرخین نے بلطہ جی کے صلح نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس پر بددیانتی کا الزام عائد کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس نے کیتھرائن کی رشوت قبول کر کے دولت علیہ کے مفاد کو نظر انداز کر دیا اور زار روس اور اس کی پوری فوج پر قابو پانے کے بعد ان کو یوں ہاتھ سے نکل جانے دیا، لارڈ ایورسلے نے صدر اعظم کی مدافعت میں جو باتیں پیش کی ہیں ان سے یہ الزام دور ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ جو شخص صدارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہو اور اسے دولت پیدا کرنے کے لیے بڑے سے بڑے مواقع حاصل ہوں وہ کیتھرائن کی پیش کردہ نہایت حقیر رقم کے لیے اپنی ذات اور اپنے ملک کو فروخت کر دینے پر آمادہ ہو گیا ہو، یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ زارنیہ نے وہ تحائف

---

[1] کریسی، جلد۲، ص ۱۲۳-۱۲۲۔

صدر اعظم کے نائب کی خدمت میں بھیجے ہوں، تا کہ وہ سفارش کر کے صلح کی گفتگو کی اجازت حاصل کر لے، بلط جی نے جن شرائط پر صلح کی ان سے بہتر شرائط اس کے خیال میں ممکن نہ تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ زار روس اور اس کی فوج کو گرفتار اور ہلاک کر سکتا تھا لیکن اس سے روسیوں میں نہایت سخت اشتعال پیدا ہو جاتا اور وہ انتقام کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سلطان نے عثمان اور رئیس آفندی کو توقتل کرادیا لیکن بلط جی محمد پاشا کو جس کی دستخط سے صلح نامہ کا نفاذ ہوا تھا، صرف معزول کر دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے بلط جی کو پہلے ہی سے صلح کے اختیارات دے رکھے تھے، بظاہر سلطان کا قصد علاقہ ازف سے آگے بڑھ کر سلطنت روس میں اپنے مقبوضات کا دائرہ بڑھانے کا نہ تھا، پھر جنگ کو جاری رکھنے میں ان سے بہتر کن شرائط پر صلح ہو سکتی تھی؟

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ بلط جی محمد پاشا نے جن شرائط پر صلح کی تھی وہ روس کے لیے اس درجہ باعث ننگ تھے کہ اس عار کو دور کرنے کے لیے روس کی طرف سے جنگ کا پھر چھیڑا جانا لازمی اور ناگزیر تھا لیکن خود پیٹر کا خیال اس سے مختلف تھا، رہائی کے بعد اس نے نئی جنگ کے لیے کوئی آمادگی ظاہر نہیں کی، برخلاف اس کے معاہدہ پرتھ کے دو سال بعد اس نے دولت عثمانیہ کے ساتھ ایک دوسرا معاہدہ بھی کیا جس کی دفعات روس کے لیے ویسی ہی سخت تھیں، اس نے اپنے عہد کی بقیہ مدت میں کوئی معاہدہ شکنی نہ کی بلکہ چند سالوں کے بعد سلطنت ایران کے ایک بڑے حصہ کی تقسیم کے لیے دولت علیہ کے ساتھ ایک نئے معاہدہ میں شریک ہو گیا[1] پچیس سال تک روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان پھر کوئی جنگ پیش نہیں آئی۔

موریا کی فتح ۱۷۱۵ء میں صدر اعظم داماد علی پاشا نے موریا پر حملہ کیا جو معاہدہ کارلووٹز کی رو سے سلطنت عثمانیہ سے چھین کر جمہوریہ وینس کو دے دیا گیا تھا، معاہدہ مذکور کے وقت

---

[1] ایورسلے، ص ۱۵۶-۱۵۵۔

دولت علیہ اس قدر کم زور ہوگئی تھی کہ وہ اس قدیم مقبوضہ کے تحفظ سے بالکل معذور تھی لیکن اب جب کہ اس کی طاقت بہت کچھ بڑھ چکی تھی اور خیال تھا کہ سلطنت آسٹریا جس کی حمایت سے جمہوریہ وینس موریا پر قبضہ پانے میں کام یاب ہوئی تھی، اس جنگ میں دخل نہ دے گی، موریا کو واپس لے لینے کا موقع بہت اچھا تھا، معاہدہ کارلووٹز میں جمہوریہ وینس بھی شریک تھی، اس لیے باب عالی بغیر کسی معقول عذر کے اس پر حملہ نہیں کرسکتا تھا، اتفاق سے نقض عہد خود وینس کی طرف سے پیش آیا، اس نے مونٹی نیگرو کے باشندوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرنے میں مدد پہنچائی، داماد علی پاشا کے لیے جو اپنی جنگ جوئی اور شجاعت میں مشہور تھا اور کافی ہوا اور وہ فوج جو روس کی جنگ کے لیے تیار کی گئی تھی، موریا کے محاذ پر بھیج دی گئی، جنگ کی ابتدا محاصرہ کورنتھ سے ہوئی، تین ہفتہ کی مدافعت کے بعد ۷ر جولائی ۱۷۱۵ء کو کورنتھ نے ہتھیار ڈال دیے، اس کے بعد عثمانی فوج دو حصوں میں تقسیم ہوکر پورے دریا میں پھیل گئی اور جمہوریہ وینس کے تمام قلعوں کو مثلاً موڈن، کورن اور رینو یکے بعد دیگرے فتح کرلیا، صرف ایک سوا ایک روز کی جنگ میں سارا موریا فتح ہوگیا، وہاں کے یونانی باشندوں نے اہل وینس کو بالکل مدد نہ دی، برخلاف اس کے انہوں نے اپنے سابق آقاؤں کے ظلم وتعدی سے بچنے کے لیے ترکوں کا استقبال کیا[1]۔

آسٹریا سے جنگ داماد علی پاشا کا قصد تھا کہ موریا کی فتح کے بعد کارفو اور بحر یونان کے دوسرے جزیروں پر بھی جو وینس کے زیر حکومت تھے، قبضہ کرلے، مگر اس موقع پر چارلس ششم شہنشاہ آسٹریا درمیان میں آگیا اور اوائل ۱۷۱۶ء میں اس نے دولت علیہ کے خلاف جمہوریہ وینس سے اتحاد کرلیا، چارلس کا یہ فعل باب عالی کے لیے سخت اشتعال کا باعث ہوا اور صدر اعظم داماد علی پاشا نے اسے معاہدۂ کارلووٹز کی خلاف ورزی قرار دے کر دیوان سلطنت میں جنگ کی تجویز پیش کی، آسٹریا کے مقابلہ میں سابق شکستوں کی یاد ہنوز

---

[1] ایورسلے، ص ۱۵۷۔

اتنی تازہ تھی کہ اس مسئلہ پر بہت زیادہ بحث و مباحثہ ہوا لیکن بالآخر مفتی اعظم نے صدر اعظم کی تجویز کے موافق رائے دی اور آسٹریا کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا گیا، داماد علی پاشا ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ روانہ ہو کر بلغراد پہنچا، بلغراد سے پوری فوج پیٹروارڈین کی طرف روانہ ہوئی اور وہیں ۱۰/اگست ۱۷۱۶ء کو آسٹریا کی فوج سے مقابلہ ہوا، جس کا امیر عسکر مشہور سپہ سالار شہزادہ یوجین تھا، ابتدا میں عثمانیوں کو نمایاں کام یابی ہوئی لیکن شہزادہ یوجین کے مخصوص دستے نے جو اس وقت تک محفوظ رکھا گیا تھا، دفعۃً حملہ آور ہو کر جنگ کا نقشہ بدل دیا اور ترکوں کے قدم اکھڑ گئے، داماد پاشا نے یہ دیکھ کر اپنے سرداروں کی ایک جماعت ساتھ لی اور جہاں لڑائی گھمسان ہو رہی تھی ٹوٹ پڑا لیکن اس کی حیرت انگیز شجاعت اور جاں بازی فوج کے اکھڑے ہوئے قدم کو نہ روک سکی اور وہ خود ایک کاری زخم کھا کر گر گیا، اس کے ساتھی اسے اٹھا کر کارلووٹز لے گئے جو پیٹروارڈین سے تھوڑے فاصلہ پر واقع تھا لیکن وہ اس زخم سے جاں بر نہ ہو سکا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

داماد پاشا کے زخمی ہونے کے بعد ترکوں کی ہمت پست ہو گئی اور وہ میدان چھوڑ کر بلغراد کی طرف بھاگے، یوجین نے ان کے خیموں پر قبضہ کر لیا، مال غنیمت میں ایک سو چالیس توپیں بھی ہاتھ آئیں۔

اس کے بعد یوجین نے تمیسوار کا رخ کیا، جو ہنگری میں ترکوں کا آخری اہم قلعہ تھا، چنانچہ پیٹروارڈین کی لڑائی کے بیس روز بعد اس نے تمیسوار کا محاصرہ کر لیا، پانچ ہفتہ کے محاصرہ کے بعد ۲۵/نومبر ۱۷۱۶ء کو قلعہ نے ہتھیار ڈال دیے، اس سال آسٹریا سے پھر کوئی جنگ نہیں ہوئی، اس درمیان میں وینس سے بھی لڑائی کا سلسلہ جاری رہا، چوں کہ عثمانی فوجوں کا بڑا حصہ آسٹریا سے جنگ کرنے میں مصروف تھا، اس لیے وینس کے مقابلہ میں زیادہ کام یابی نہ ہو سکی اور کارفو کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔

بلغراد دوسرے سال ۱۷۱۷ء میں صدر اعظم خلیل پاشا کے زیر قیادت ایک دوسری

زبردست فوج آسٹریا کے مقابلہ میں قسطنطنیہ سے روانہ ہوئی، شہزادہ یوجین نے آگے بڑھ کر بلغراد کا محاصرہ کرلیا، تین ہفتہ کے بعد عثمانی فوجیں نمودار ہوئیں اور اس نے خود محاصرہ کرنے والوں کو گھیر لیا، یوجین کے لیے یہ وقت نہایت نازک تھا، بلغراد کا محصور عثمانی دستہ اس کے سامنے تھا اور خلیل پاشا کی پوری فوج اس کے پشت پر تھی، اس میں شبہ نہیں کہ اگر خلیل پاشا فوراً ہی حملہ کر دیتا تو کامیابی یقینی تھی لیکن اس نے تاخیر سے کام لیا اور آسٹریا کی فوج کے گرد ایک حصار قائم کرنے کی کوشش کی، یوجین سمجھتا تھا کہ اگر یہ حصار قائم ہو گیا تو سامان رسد کا فراہم ہونا محال ہو جائے گا اور پھر اس کے لیے کچھ عرصہ کے بعد ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہ جائے گا، اس خطرہ کو پیش نظر رکھ کر اس نے غیر معمولی جرأت سے کام لیا اور ۱۶/ اگست ۱۷۱۷ء کو خلیل پاشا کی فوج پر دفعۃً خود حملہ کر دیا، خلیل پاشا اس غیر متوقع اور اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھا، عثمانیوں کے پیر اکھڑ گئے اور اپنی کثرت کے باوجود انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی، ان کے بیس ہزار سپاہی مقتول اور زخمی ہوئے، ایک سو تیں توپیں اور آلات حرب کا ایک نہایت وافر ذخیرہ دشمنوں کے ہاتھ آیا، دوسرے روز بلغراد اور اس کے فوجی دستہ نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور قلعہ یوجین کے حوالہ کر دیا۔

بلغراد کی فتح کے بعد آسٹریا کی فوجیں آگے بڑھ کر سرویا اور مغربی ولاچیا کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئیں، انہوں نے سرویا کے باشندوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی مگر بارہ ہزار سے زیادہ آدمیوں نے ان کا ساتھ نہ دیا کیوں کہ سرویا کے لوگ ترکی حکومت کے مقابلہ میں آسٹریا کی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے[1]، اسی وجہ سے دریائے ڈینوب کے جنوبی علاقوں پر آسٹریا کا یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا، بائیس سال کے بعد عثمانیوں نے بلغراد کو پھر فتح کرلیا اور آسٹریا والوں کو سرویا سے نکال باہر کیا۔

معاہدۂ پسارووچ | بلغراد کی شکست کی سزا میں خلیل پاشا صدارت کے عہدہ سے علاحدہ

---

[1] ایورسلے، ص ۲۰۰۔

کر دیا گیا اور اس کی جگہ ابراہیم پاشا جو سلطان کا داماد تھا صدرِ اعظم مقرر ہوا، وہ ارکان سلطنت کی اس جماعت کا ہم نوا تھا جو آسٹریا سے انتقام لینے کی خواہاں تھی لیکن انگلستان اور ہالینڈ کے سفیروں نے پھر مصالحت کی گفتگو شروع کر دی اور اس اصول پر صلح کرا دینی چاہی کہ ہر فریق اپنی موجودہ فتوحات پر قابض رہے، یہ شرط آسٹریا کے لیے تو مفید تھی لیکن دولت علیہ کے لیے سخت نقصان دہ تھی، بہر حال کچھ تامل کے بعد سلطان آخر میں راضی ہو گیا اور صلح نامہ مرتب کرنے کی کارروائی شروع ہوئی، سرویا کے ایک چھوٹے سے گاؤں پسارووچ (Pussarowitch) میں ایک کانگریس منعقد کی گئی اور وہاں ۲۲ رشعبان ۱۱۳۰ھ مطابق ۲۱ رجولائی ۱۷۱۸ء کو ایک معاہدہ مرتب ہوا جو ''معاہدۂ پسارووچ'' کے نام سے مشہور ہے۔

اس معاہدہ کی رو سے آسٹریا کو نہ صرف تمیسوار اور اس کا علاقہ مل گیا اور اس طرح ہنگری کا وہ حصہ بھی جو معاہدۂ کارلووٹز کے بعد سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت رہ گیا تھا، اس کے قبضہ میں آ گیا، بلکہ ولاچیا اور سرویا کا ایک بڑا حصہ، بوسنیا کے بعض علاقے، نیز بلغراد، سمندریا، رمنک اور بہت سے دوسرے شہر اس کے ہاتھ آئے، لیکن جمہوریہ وینس کو جس کی حمایت میں آسٹریا نے ہتھیار اٹھائے تھے، پورا موریا دولت عثمانیہ کے حوالے کر دینا پڑا اور اگرچہ ڈلماشیا کے چند چھوٹے چھوٹے قلعوں پر اس کا قبضہ باقی رکھا گیا، تاہم اسے ساحل ایڈریاٹک کے بعض غیر مفتوحہ علاقوں سے دست بردار ہو جانا پڑا تاکہ سلطنت عثمانیہ اور جمہوریہ رگوسا کے تعلقات میں روک نہ پیدا ہو اور دولت علیہ وینس کے دست برد سے رگوسا کا تحفظ کر سکے، کارفو اور بحر یونان کے دوسرے جزیروں پر وینس کا قبضہ قائم رہا، سلطنت عثمانیہ کی طرف سے اس بات کا معاہدہ کیا گیا کہ الجزائر، تونس، طرابلس اور رگوسا کے بحری ڈاکوؤں کا سدباب کر دیا جائے گا اور ہنگری کے باغیوں کو آسٹریا کی جدید سرحد کے قریب رہنے کی ممانعت کر دی جائے گی۔

جنگ ایران ۱۷۲۰ء میں روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ''دائمی صلح'' کے لیے ایک

معاہدہ مرتب ہوا، جہاں تک روس کا تعلق ہے یہ معاہدہ اس اتحاد کا نتیجہ تھا جو اس کے بعض سابق حلیفوں نے اس وقت اس کے خلاف قائم کرلیا تھا اور جس کی شرکت کی دعوت آسٹریا اور انگلستان کے سفیروں نے باب عالی کو بھی دی تھی، پیٹر نے اتحاد کے آئندہ خطرات کا اندازہ کر کے باب عالی کو اس سے علاحدہ رکھنے کی کوشش کی اور صلح نامہ مذکور کے ذریعہ بظاہر ہمیشہ کے لیے اسے اپنا حلیف بنالینا چاہا، لیکن یہ ''دائمی صلح'' دو ہی سال کے بعد معرض خطر میں آگئی اور قریب تھا کہ دونوں فریق سلطنت ایران کے بعض حصوں کی تقسیم پر باہم دست و گریباں ہوجائیں، شاہ عباس صفوی کی وفات کے بعد ہی دولت ایران کا زوال شروع ہوگیا اور اس کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی گئی، اس کی ہم سایہ حکومتیں موقع کی منتظر تھیں، چنانچہ ۱۷۲۲ء میں افغانی سردار امیر محمود نے پچاس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایران پر حملہ کردیا اور بہ آسانی اصفہان پر قابض ہوگیا، شاہ حسین کے لڑکے طہماسپ نے تخت و تاج کی واپسی کے لیے زار روس اور باب عالی سے مدد کی درخواست کی، پیٹر نے بحر کاسپین اور بحر اسود کے ساحلی علاقوں کے معاوضہ میں مدد کا وعدہ کیا اور ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج بھی روانہ کردی، پیٹر کا یہ اقدام باب عالی کے لیے تشویش اور برہمی کا باعث ہوا اور قریب تھا کہ دونوں سلطنتوں میں جنگ چھڑ جائے لیکن سفیر فرانس کی وساطت سے جنگ کی نوبت نہ آئی اور ۱۷۲۳ء میں دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ ہوگیا جس کے رو سے شمالی ایران کا ایک بڑا حصہ فریقین نے باہم تقسیم کرلیا، باب عالی کو جارجیا، اریوان، تبریز اور باکو کے صوبے دیے گئے اور روس نے شروان اور بحر کاسپین کے بعض ساحلی علاقوں کو اپنے لیے منتخب کیا، روس ان علاقوں پر صلح نامہ کی رو سے پہلے ہی قبضہ کرچکا تھا، دولت علیہ کو اپنے حصہ پر قبضہ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کرنی پڑی، ایرانیوں نے مقابلہ کیا لیکن ترک مدائن، ادیوان، تبریز اور بعض دوسرے علاقوں کو یکے بعد دیگرے فتح کرتے گئے اور شاہ طہماسپ کو مجبوراً صلح کرنی پڑی، تھوڑے دنوں کے بعد امیر

محمود نے شاہ طہماسپ کو شکست دے کر ایران کے تخت پر پھر قبضہ کر لیا اور سلطنت عثمانیہ کی مخالفت سے بچنے کے لیے مذکورۂ بالا صوبوں پر باب عالی کی سیادت تسلیم کر لی، ۱۷۲۵ء میں امیر محمود کا انتقال ہو گیا اور اس کا ایک عزیز شاہ اشرف تخت نشین ہوا، ۱۳/ اکتوبر ۱۷۲۷ء کو شاہ اشرف اور باب عالی کے درمیان ایک جدید صلح نامہ ہوا لیکن اسی سال ایک ایرانی سردار نادر قلی خان نے شاہ طہماسپ کی حمایت میں اصفہان پر چڑھائی کی اور متعدد معرکوں میں افغان کو شکست دی، شاہ اشرف قتل ہوا اور شاہ طہماسپ پھر تخت پر بیٹھا، طہماسپ نے تخت پر آتے ہی باب عالی سے ایرانی صوبوں کی واپسی کا مطالبہ کیا اور سلطان کے انکار پر نادر خان کی سرکردگی میں سلطنت عثمانیہ کے مقابلہ میں فوجیں روانہ کیں، نادر خان کے میدان میں آتے ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا اور عثمانی فوجوں کے قدم اکھڑنے لگے، قسطنطنیہ میں خبر پہنچی کہ ایرانی فوج سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہو رہی ہے، اس خبر سے دفعۃً پایۂ تخت میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور ینی چری کے ایک دستہ نے پطرد نا خلیل کی سیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا، تھوڑے ہی عرصہ میں یہ وبا تمام فوج میں پھیل گئی۔

فوج کی بغاوت اور سلطان کی معزولی

فوج کی بغاوت کا ظاہری سبب تو وہ شکست تھی جو نادر خان کے مقابلہ میں عثمانیوں کو ہوئی لیکن ممکن ہے کہ باب عالی کی امن پسندانہ پالیسی بھی ینی چری کی جنگجو طبیعت کے لیے ناقابل برداشت رہی ہو، اگرچہ بعض سرحدی علاقوں میں وقتاً فوقتاً شورشیں ہوتی رہیں، تاہم صدر اعظم ابراہیم پاشا کی وزارت کا دور جو ۱۷۱۸ء سے ۱۷۳۰ء تک قائم رہا، سلطنت کے لیے غیر معمولی طور پر امن و سکون کا زمانہ تھا، شاید یہی امن پسندی ابراہیم پاشا کے قتل اور پھر سلطان کے عزل کا باعث ہوئی، باغیوں نے ابراہیم پاشا، قبودان پاشا (امیر البحر) اور مفتی اعظم کے خلاف یہ الزام قائم کیا کہ یہ لوگ عجمیوں سے صلح کرنا چاہتے ہیں اور اس جرم کی بنا پر سلطان سے ان کے قتل کا مطالبہ کیا، سلطان نے خود اپنی جان کو خطرہ سے خالی نہ دیکھ کر صدر اعظم اور قبودان پاشا کو قتل کرا دیا، البتہ مفتی اعظم کے

قتل سے انکار کر دیا، لیکن اب باغیوں کی جرأت اور بڑھ گئی اور انہوں نے سلطان کو بھی تخت چھوڑنے پر مجبور کیا، احمد ثالث اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پا کر خاموشی کے ساتھ تخت سے دست بردار ہو گیا اور اپنے بھتیجے محمود کو محل سے بلا کر اپنی جگہ بٹھا دیا، اس کے بعد وہ محل کے اس حصہ میں چلا گیا جہاں محمود اب تک نظر بند تھا اور وہیں چند سال کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان احمد ثالث نے ستائیس سال حکومت کی، اس طویل مدت میں سلطنت عثمانیہ کو آسٹریا، روس، وینس اور ایران سے متعدد معرکے پیش آئے لیکن معاہدہ پساروویچ کے رو سے مقبوضات کا جو حصہ ہاتھوں سے نکل گیا تھا، ازف اور موریا کی واپسی اور ایرانی فتوحات نے نہ صرف ان کی تلافی کر دی بلکہ بہ حیثیت مجموعی سلطنت کے رقبہ میں اضافہ کر دیا، باوجود متعدد جنگوں کے خزانہ آخر وقت تک پُر تھا، حالاں کہ نہ کوئی غیر معمولی ٹیکس جاری کیا گیا اور نہ رعایا کو جبر و تشدد کی شکایت ہوئی۔

پہلا مطبع احمد خود بھی صاحب علم تھا اور علوم و فنون کی سرپرستی شاہانہ طریقہ پر کرتا تھا، چنانچہ اسی کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں مطبعوں کا رواج ہوا اور پہلا مطبع قسطنطنیہ میں قائم کیا گیا لیکن مفتی اعظم نے مطبعوں کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی تھی کہ قرآن مجید طبع نہ کیا جائے۔

ولاچیا اور مولڈیویا کے یونانی حکام اسی عہد میں ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتوں میں بھی ایک خاص تبدیلی عمل میں آئی، اب تک ان ریاستوں کی حکومت وہیں کے کسی ممتاز امیر کے سپرد کر دی جاتی تھی لیکن چوں کہ ۱۷۱۱ء میں مولڈیویا کے امیر نے دولت عثمانیہ سے غداری کر کے پیٹر اعظم کا ساتھ دیا تھا اور پیٹر کی حمایت میں سلافی قوموں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا تھا، اس لیے باب عالی نے اس کے بعد سے ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتوں پر ان دولت مند یونانی امراء کو مقرر کرنا شروع کیا جو قسطنطنیہ کے ایک خاص حصہ فنار میں رہا کرتے تھے، مگر یہ نظام دولت علیہ کے حق میں بہت مضر ثابت ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلطان محمود اول کے عہد میں اس کے نقصانات ظاہر ہونے لگے۔

محمود اوّل

۱۱۴۳ھ تا ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۳۰ء تا ۱۷۵۴ء

احمد ثالث کے تخت سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد باغیوں اور اعیان سلطنت نے سلطان مصطفیٰ ثانی کے لڑکے محمود کو تخت پر بیٹھایا لیکن چند ہفتوں تک محمود صرف نام کا سلطان تھا اور اصل حکومت باغیوں کے سردار پطرد نا خلیل کے ہاتھ میں تھی، اس نے سلطنت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ داروں کو برطرف کرادیا اور ان کی جگہ اپنی جماعت کے آدمیوں کو مقرر کرایا، ایک یونانی بوچر ینا کی (Yanaki) نے گذشتہ بغاوت میں اسے کچھ روپے قرض دیے تھے، اس احسان کے معاوضہ میں اس نے دیوان کو مجبور کر کے اسے مولڈیویا کا حاکم مقرر کرایا لیکن بالآخر پطرد نا خلیل اور اس کے ساتھیوں کی دست درازیاں ناقابل برداشت ہوگئیں اور سلطان کے وفادار افسروں نے ان سرکشوں کے استیصال کا عزم کرلیا، ینی چری اور دوسرے فوجی دستوں نے بھی جو سلطان احمد ثالث کے معزول کرنے میں شریک تھے، پطرد نا خلیل کی مخالفت پر آمادگی ظاہر کی اور اس شرط کے ساتھ کہ ان سے ان کی گذشتہ سرکشی اور بغاوت کے متعلق باز پرس نہ کی جائے گی، سلطان محمود کی حمایت کا وعدہ کرلیا، چنانچہ ایک روز پطرد نا خلیل اور اس کے اکیس ساتھ دیوان میں بلائے گئے اور وہیں سلطان کے سامنے انہیں قتل کر دیا گیا، تین روز کے اندر ان کا دوست ینا کی اور اس کے سات ہزار ساتھی بھی قتل کر دیے گئے اور اس طرح تقریباً دو ماہ کی شورش کے بعد یہ بغاوت فرو ہوئی۔

جنگ ایران پایہ تخت میں امن قائم ہونے کے بعد ایران سے جنگ چھڑ گئی اور عثمانی فوج شاہ طہماسپ کی فوج پر متعدد معرکوں میں غالب آئی، یہ دیکھ کر طہماسپ نے صلح کی درخواست کی اور ۱۰/ جنوری ۱۷۳۲ء کو دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوا، جس کے رو سے تبریز، اردھان، ہمدان اور لورستان، ایران کو واپس کر دیے گئے اور سلطنت عثمانیہ نے داغستان، جارجیا، ناخ شیوان، ایوان اور تفلیس کے علاقے پائے لیکن یہ صلح عارضی ثابت ہوئی، نادر خان نے جو شاہ طہماسپ کی طرف سے سیستان، آذربیجان، مازندران اور خراسان کا حاکم تھا، اس کی شدید مخالفت کی، اس نے اپنی فوج کے ساتھ اصفہان پر چڑھائی کی اور شاہ طہماسپ کو تخت سے اتار کر اس کے لڑکے عباس ثالث کو تخت پر بیٹھایا اور عباس کی نابالغی کے زمانہ تک اپنے کو اس کا مدار المہام قرار دیا، مدار المہام کی حیثیت سے اس نے پہلا کام یہ کیا کہ صلح نامہ کو مسترد کر دیا، پھر وہ عثمانی علاقہ کی طرف بڑھا اور بغداد کا محاصرہ کر لیا، صدر اعظم عثمان پاشا بغداد کی مدد کے لیے روانہ ہوا، ۹/ جولائی ۱۷۳۳ء کو دریائے دجلہ کے کنارے سخت معرکہ ہوا، جس میں نادر خان کو نہایت کاری زخم آیا اور اس کے ساتھی اسے میدان جنگ سے اٹھا لے گئے، بغداد ایرانیوں کے محاصرہ سے آزاد ہو گیا، اسی سال عثمان پاشا ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے پھر آگے بڑھا اور انہیں شکست دی لیکن تیسرے معرکہ میں جو کرکود کے قریب نادر خان سے پیش آیا تھا، ترکوں کو فاش شکست ہوئی اور خود عثمان پاشا ایک جاں باز سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا، عثمان پاشا کے بعد ترکوں نے نادر خان کے مقابلہ میں متعدد بار شکست کھائی، بالآخر دولت عثمانیہ کی طرف سے صلح کی گفتگو شروع ہوئی، اس درمیان میں یکم دسمبر ۱۷۳۵ء کو نادر خان نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور عباس ثالث کو تخت سے برطرف کر کے خود ایران کا بادشاہ بن بیٹھا، نامہ و پیام کے ایک طویل سلسلہ کے بعد شرائط صلح طے ہو گئے اور ۱۷/ اکتوبر ۱۷۳۶ء کو فریقین نے صلح نامہ پر دستخط کر دیے، دونوں سلطنتوں کے حدود وہی قرار پائے جو ۱۶۳۹ء

میں سلطان مراد رابع کے معاہدہ میں قائم کیے گئے تھے، ان حدود کے ماوراء باب عالی نے تمام مفتوحہ علاقے سلطنت ایران کو واپس کر دیے۔

روسی خطرہ دولت عثمانیہ نے ایران کے ساتھ صلح کرنے میں صرف اس وجہ سے عجلت کی تھی کہ روس کی فوجیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں، روس نے دولت علیہ اور ایران کی جنگ کو اپنے مفاد کے موافق سمجھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور بجائے اس کے کہ بحر کاسپین کے ان ایرانی علاقوں پر قبضہ رکھنے کی کوشش کرتا جو پیٹر اعظم اور سلطان احمد ثالث کے معاہدہ کے مطابق ۱۷۲۴ء میں اسے حاصل ہوئے تھے، اپنی پوری توجہ عثمانی علاقوں کی جانب مبذول کرنی چاہی جن کا حصول اسے نسبتاً زیادہ آسان نظر آتا تھا، اسی غرض سے اس نے ۱۷۳۵ء میں نادر خان سے صلح کر لی اور بحر کاسپین کے وہ تمام علاقے جو معاہدۂ مذکورہ کے رو سے اسے حاصل ہوئے تھے، سلطنت ایران کو واپس کر دیے۔

دولت عثمانیہ کے خلاف روس کا جارحانہ اقدام حقیقۃً اس ناعاقبت اندیشانہ طرز عمل کا نتیجہ تھا جو وزرائے سلطنت نے مغربی حکومتوں سے متعلق اختیار کر رکھا تھا، وہ حتی الوسع دوسری حکومتوں کی آویزش سے بچنا چاہتے تھے لیکن تاریخ کے اس سبق سے چشم پوشی کر رہے تھے کہ جو سلطنت دشمنوں سے گھری رہنے کے باوجود ان سے کنارہ کش رہنا چاہتی ہے، وہ آخر کار اس وقت میدان جنگ میں آنے پر مجبور ہوتی ہے جب کامیابی کے اکثر مواقع ہاتھ سے نکل چکتے ہیں، سلطنت عثمانیہ کے وزراء روس اور آسٹریا کی دشمنی سے بے خبر نہ تھے مگر وہ اپنی طرف سے تصادم پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ جب پولینڈ کی جنگ جانشینی میں باب عالی کو گذشتہ معاہدوں کی بنا پر جائز طور پر مداخلت کا حق حاصل ہوا تب بھی غیر جانب داری کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

قبضۂ پولینڈ پولینڈ تقریباً ایک صدی سے خلفشار اور بدامنی کا شکار ہو رہا تھا اور روس، آسٹریا اور پرشیا کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں، پیٹر اعظم کی خارجی سیاست کے دو نہایت

اہم جزو تھے، پولینڈ اور دولت عثمانیہ وہ ان دونوں کو فتح کر کے روس کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بنا دینا چاہتا تھا لیکن جہاں تک سلطنت عثمانیہ کا تعلق تھا، یہ ایک ایسا نصب العین تھا جس کی حقیقت خود اس کے ذہن میں خواب سے زیادہ نہ تھی، چنانچہ واقعہ پرتھ نے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور ترکوں کے محاصرہ سے زندہ اور سلامت نکل آنا ہی اسے اپنی سب سے بڑی کامیابی نظر آئی، تاہم وہ آخر وقت تک اپنے مقصد کے حصول کے لیے تیاریاں کرتا رہا اور اگر ۱۷۲۵ء میں وہ وفات نہ پا گیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ معاہدہ پرتھ کی تنسیخ کے لیے زور آزمائی کرتا، پھر بھی اس نے اپنے جانشینوں کے لیے جو وصیت نامہ چھوڑا، اس میں دولت عثمانیہ اور پولینڈ کی نسبت خصوصیت کے ساتھ تاکید درج کی اور اس کے بعد اس کے تمام جانشینوں نے اس وصیت کی تکمیل کو سلطنت کا اہم ترین مقصد قرار دیا، پولینڈ اپنے اندرونی اختلال اور کمزوریوں کی وجہ سے روس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تھا، خصوصاً جب کہ آسٹریا اور پرشیا بھی اس کے خلاف روس سے متحد ہو گئے تھے، یہ اتحاد ۱۷۳۲ء میں ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ عمل میں آیا تھا، جو حقیقۃً روس، آسٹریا اور پرشیا کے درمیان پولینڈ کی تقسیم کا دیباچہ تھا۔

۱۷۳۳ء میں پولینڈ کے فرماں روا آگسٹ ثانی کا انتقال ہو گیا، یہ شخص روس کے زیر اثر تھا اور روس اور آسٹریا نے اسی کے لڑکے آگسٹ ثالث کو تخت پر بیٹھانا چاہا لیکن اہل پولینڈ نے مخالفت کی اور ایک ملکی رئیس اسٹانسلاس کو منتخب کر لیا، اسٹانسلاس کو فرانس کی حمایت حاصل تھی، کیوں کہ وہ شاہ لوئی پانزدہم کا خسر بھی تھا، علاوہ بریں فرانس کی سیاسی مصلحت اس امر کی مقتضی بھی تھی کہ پولینڈ کو روس اور آسٹریا کی دست برد سے محفوظ رکھا جائے، کیوں کہ پولینڈ کی کمزوری سے آسٹریا کو قوت پہنچنے کا اندیشہ تھا اور آسٹریا کی دشمنی لوئی چہاردہم کے عہد سے فرانس کی سیاست کا ایک ضروری عنصر تھی، اسی بنا پر اسٹانسلاس کے انتخاب کے بعد جب روسی اور آسٹروی فوجیں پولینڈ میں داخل ہوئیں اور اسٹانسلاس کو

مجبوراً تخت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور فرانسیسی سفیر مقیم قسطنطنیہ نے باب عالی سے درخواست کی کہ اس حق صریح کی مدافعت کی غرض سے جو پولینڈ کو اپنے فرماں روا کے انتخاب میں حاصل ہے، نیز اس ضمانت کی بنا پر جو فاکزن (Falksen) اور قسطنطنیہ کے سابق معاہدوں کے رو سے دولت علیہ کو پولینڈ کی آزادی اور استقلال کی نسبت سپرد کی گئی ہے، آسٹریا اور روس کی اس بے جا مداخلت کے خلاف احتجاج کے طور پر اس جنگ میں فرانس کا ساتھ دے، سفیر فرانس نے پولینڈ کا استقلال قائم رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ پولینڈ روس اور دولت علیہ کے درمیان بطور ایک آہنی دیوار کے ہے اور اسی سلسلہ میں اس نے دولت علیہ سے متعلق روس کی سیاست کو بھی واضح طور پر بیان کیا لیکن وزرائے سلطنت نے اس کی تمام حجتوں کو نظر انداز کر دیا اور بشیر آغا کے زیر اثر جو سلطان محمود اول کا معتمد خاص اور حقیقۃً سلطنت کے تمام حل وعقد کا ذمہ دار تھا، عدم مداخلت کے اصول پر بدستور قائم رہے۔

جنگ روس اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس نے پولینڈ کی جنگ جانشینی سے فارغ ہو کر خود سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات پر حملہ کر دیا، پیٹر اعظم کی تدبیر یہ تھی کہ ترکی پر پولینڈ کی راہ سے حملہ کیا جائے، اب چوں کہ پولینڈ روس کے زیر اثر آ چکا تھا اور باب عالی نے اس اقتدار کو روکنے کی کوئی سعی نہیں کی تھی، اس لیے روسی حملہ کا سدباب ناممکن تھا، روس واقعہ پرتھ کا داغ ذلت مٹانے کے لیے بیتاب تھا، اس کے جاسوس پیٹر اعظم کے زمانہ ہی میں بلغاریا، سرویا اور رومانیا میں پہنچ گئے تھے اور عیسائی رعایا کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھار رہے تھے۔

دولت علیہ سے اعلان جنگ کے لیے کسی عذر کی تلاش زیادہ دشوار نہ تھی، جنگ کا فیصلہ اسی وقت ہو گیا تھا جب روس کی عنان حکومت ۱۷۳۰ء میں ملکہ اینی کے ہاتھ میں آئی، پانچ سال کی تاخیر صرف مناسب موقع کے انتظار میں گوارا کی گئی، چنانچہ ۱۷۳۵ء میں جب عثمانی فوجیں ایران میں مصروف پیکار تھیں اور تاتاری دستے ان کی کمک کے لیے کوہ قاف

کے علاقوں سے گزر رہے تھے تو روس نے اس نزاع کی بنا پر جو کوہِ قاف کے شمالی صوبوں سے متعلق دولت علیہ سے چلی آرہی تھی، ان دستوں کی مزاحمت کی اور تاتاری علاقوں پر حملہ کر دیا، باب عالی نے روس کے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کیا، روس نے اس کے جواب میں تاتاری قبائل کی شکایتوں کا دفتر کھول دیا، نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ مئی ۱۷۳۶ء میں قسطنطنیہ میں خبر پہنچی کہ زارینہ اینی کی فوج نے مارشل میونخ (Munich) کی قیادت میں ازف کے قریب دو قلعوں پر قبضہ کر کے خود ازف کا محاصرہ بھی کر لیا ہے، مجبوراً دولت علیہ نے ۲۸ رمئی ۱۷۳۶ء کو روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

روسی فوج کے سپہ سالار اعظم مارشل میونخ نے یہ جنگ نہایت بلند حوصلوں کے ساتھ شروع کی تھی، وہ قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے زارینہ سے وعدہ کیا تھا کہ ترکوں کو یورپ سے نکال کر رہے گا، قسطنطنیہ کی راہ میں پہلا سنگ گراں کریمیا تھا، اس کو ہٹا کے بحر اسود پر روسی اقتدار کا قائم کر لینا اس مہم کا پہلا مرحلہ تھا، چنانچہ مارشل میونخ چون ہزار سپاہیوں کے ساتھ کریمیا کی طرف بڑھا اور پیریکوپ (Perekop) کے قلعہ بند شہر کو فتح کرتا ہوا جو بر اعظم اور کریمیا کی درمیانی خاکنائے پر واقع تھا، کریمیا میں داخل ہو گیا اور پہنچتے ہی قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا، اس زمانہ میں کریمیا نہایت دولت مند ملک تھا، ترکی کے ساتھ اس کی تجارت بہت بڑھی ہوئی تھی، چنانچہ کوسلوف (Koslof) سے جو کریمیا کے مغربی ساحل کی خاص بندرگاہ تھی ہر سال دو لاکھ مویشی اور بکثرت غلہ استنبول بھیجا جاتا تھا، مشرقی ساحل کا شہر کافہ غلاموں کی تجارت کی غالباً دنیا میں سب سے بڑی منڈی تھی[1]۔

شہر کوسلوف اپنی تجارت اور دولت کے لحاظ سے تمام کریمیا میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، ۱۷ رجون ۱۷۳۶ء کو روسیوں نے اسے فتح کر کے لوٹ لیا، وہاں سے میونخ باغچہ سرائے کی طرف بڑھا جو خوانین کریمیا کی قدیم جائے سکونت تھی، باغچہ سرائے کا تاتاری دستہ

---

[1] کیمبرج ماڈرن ہسٹری، ج ۶، ص ۳۰۵۔

صرف تھوڑی دیر مقابلہ کر کے پسپا ہو گیا، کریسی لکھتا ہے کہ تب میونخ نے اپنے روسی اور قزاق سپاہیوں کو اس شہر کے سامنے لا کر کھڑا کیا، جس کی مدافعت کرنے والا کوئی باقی نہ رہ گیا تھا، پھر اپنی فوج کے ایک چوتھائی حصہ کو چند مقررہ گھنٹوں کے لیے بھیجنا شروع کیا تاکہ شہر کے اندر جا کر لوٹ مار کرے، اس وحشیانہ اور ظالمانہ کام کی تکمیل پوری طرح کی گئی، دو ہزار مکانات اور تمام پبلک عمارتیں برباد ہو گئیں، خوانین کا وسیع محل، وہ عالی شان کتب خانہ جسے سلیم گرائی نے قائم کیا تھا اور وہ جسے کریمیا کے جیسوئیٹ (Jesuit) مشن نے قائم کیا تھا، سب جل کر خاک سیاہ ہو گئے، اس کے بعد روسیوں نے سیمفروپولس (Simpherolis) پر حملہ کیا جو باغچہ سرائے کے شمالی مشرق میں واقع تھا، اس کے باشندے اور اس کی دولت سپاہیوں کی درندگی اور لوٹ مار کے حوالہ کر دی گئی اور اس کی عمارتیں شعلوں کی نذر کر دی گئیں، کریمیا کی تمام مہم میں میونخ کی فوج نے سفاکی و درندگی، سبعیت و بربریت کی انتہا کر دی، روسیوں نے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ذرا بھی رحم نہیں کیا، جہاں روسی فوجوں کی مطلق مزاحمت نہیں کی گئی، وہاں بھی انہوں نے شہروں اور قصبوں میں آگ لگا دی اور باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا، قدیم یادگاریں بے رحمی کے ساتھ مٹا دی گئیں، کتب خانے اور مدرسے شعلوں کی نذر کر دیے گئے اور قومی عمارتیں اور عبادت گاہیں قصداً اور عمداً برباد کر ڈالی گئیں، پوری مہم (جو بغیر کسی اعلان جنگ کے شروع کر دی گئی تھیں) خالص سیتھین درندگی کی روح کے ساتھ ترتیب اور انجام دی گئی۔[1]

اس درمیان میں اور سمتوں میں بھی روس کی دوسری فوجیں بڑھتی جا رہی تھیں، چنانچہ تھوڑے دنوں کے محاصرہ کے بعد جنرل لاسکی نے ازف کو فتح کر لیا اور کلبرن (Kilburn) کے تاتاری دستہ نے جنرل لیونٹو (Leontieu) کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، بقول کریسی "جنگ کے پہلے سال میں روس کا فریب اور اس کی طاقت تقریباً ہر جگہ کامیاب رہی" البتہ نومبر ۱۷۳۶ء میں جب میونخ کی فوجیں موسم سرما کی شدت سے بچنے کے لیے

---

[1] کریسی، جلد ۲ ص ۱۸۱، ۱۸۰۔

کریمیا سے نکل آئی تھیں تو فتح گرائی جدید خان کریمیا یوکرین پر حملہ آور ہوا اور وہاں کے روسی دستہ کو شکست دے کر تیس ہزار روسی قیدیوں کے ساتھ کریمیا لوٹ آیا۔

آسٹریا کا فریب دولت علیہ اب جنگ کو ختم کر دینا چاہتی تھی اور اس نے فرانس، سوئیڈن اور آسٹریا کے سفیروں کے ذریعہ روس سے صلح کی متعدد بار کوششیں کیں، روس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ سلطنت عثمانیہ کی موجودہ مشکلات سے فائدہ اٹھانے کے لیے آسٹریا خود بھی بیتاب ہے، اس نے صلح کے بجائے جنوری ۱۷۷۳ء میں آسٹریا سے ایک خفیہ معاہدہ کر لیا جس کی اہم ترین دفعہ یہ تھی کہ دونوں سلطنتیں متحد ہو کر ترکی پر حملہ آور ہوں گی، مگر چوں کہ آسٹریا اپنے ارادہ سے باب عالی کو بے خبر رکھنا چاہتا تھا اور خوب تیار ہو کر اسی طرح اچانک حملہ کرنا چاہتا تھا جس طرح بغیر کسی اعلان جنگ کے روس نے ازف اور کریمیا پر چڑھائی کی تھی، اس لیے باب عالی کی خواہش پر اس نے بظاہر روس سے صلح کرانے کی کوشش کی اور ۱۷۷۳ء کے اوائل میں بمقام نیمی روف (Nemirof) ایک مجلس منعقد کی، جہاں روس اور آسٹریا کے سفیروں نے دولت عثمانیہ کے وکلاء سے صلح کی گفتگو شروع کی، جس کا سلسلہ نومبر ۱۷۷۳ء تک قائم رہا لیکن باب عالی کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی اور صلح نہ ہو سکی، روس اور آسٹریا کی طرف سے صلح کے جو شرائط پیش کیے گئے وہ اس درجہ سخت تھے کہ دولت علیہ کے لیے ان کا تسلیم کرنا قطعاً محال تھا، روس کے مطالبات یہ تھے کہ وہ تمام سابق صلح نامے جو باب عالی اور اس کے درمیان ہو چکے ہیں، منسوخ قرار دیے جائیں، کریمیا، کیوبان اور وہ تمام علاقے جن میں تاتاری قبائل آباد ہیں، اس کے حوالے کر دیے جائیں، ولاچیا اور مولڈیویا کا استقلال تسلیم کر کے انہیں روس کی حفاظت اور سیادت میں دے دیا جائے، باب عالی فرماں روائے روس کے لیے ''شہنشاہ'' کا لقب تسلیم کرے اور روسی جہازوں کو بحر اسود، باسفورس اور دردانیال سے ہو کر بحر روم میں آنے جانے کی آزادی دے دی جائے، مذکورہ بالا مطالبات کے علاوہ روس نے ایک کروڑ چالیس لاکھ

روبل کا مطالبہ بھی پیش کیا، آسٹریا نے اپنے لیے بوسنیا اور سرویا کے سارے علاقوں کو صلح کی قیمت قرار دی، عثمانی وکلاء نے ان اہانت آمیز شرائط کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور صلح کی یہ مجلس ایک طویل نشست کے بعد ناکام ہو کر برخاست ہوگئی۔

لیکن ناکامی صرف اسی حد تک تھی جہاں تک ترکوں کا تعلق تھا، روس اور آسٹریا کی کام یابی میں کوئی شبہ نہ تھا، اس لیے ان کا مقصد ترکوں کو صلح کے فریب میں مبتلا رکھ کر آئندہ مہم کے لیے خفیہ طور پر تیار ہونا تھا اور وہ پوری طرح حاصل ہوگیا، چنانچہ صلح کی گفتگو ہنوز جاری ہی تھی کہ روس اور آسٹریا دونوں نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف حصوں پر حملہ کر دیا، ۱۷۳۷ء کے اوائل میں مارشل میونخ نے ستر ہزار سپاہ کے ساتھ اوکزاکوف (Oczakoff) پر حملہ کر دیا، جو بحر اسود کے شمالی ساحل پر ایک نہایت اہم عثمانی قلعہ تھا اور جنرل لاسکی چالیس ہزار روسیوں کو لے کر کریمیا میں داخل ہوا اور میونخ کی قائم کردہ مثال کے مطابق قتل وغارت گری شروع کر دی، اوکزاکوف کے ترکی دستے نے، جو بیس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھا، نہایت جاں بازی کے ساتھ مدافعت کی لیکن بدقسمتی سے محاصرہ کے چند ہی دنوں بعد قلعہ کے سب سے بڑے بارودخانہ میں آگ لگ گئی، جس سے چھ ہزار ترک سپاہی ہلاک ہوگئے، سر عسکر اس واقعہ سے گھبرا گیا، خصوصاً یہ دیکھ کر قلعہ کے اندر شعلے زیادہ تیز ہو رہے ہیں اور ان سے مزید نقصان کا اندیشہ ہے اور باہر روسی فوج تازہ حملہ کے لیے تیار ہو رہی ہے، اس نے صلح کا سفید علم بلند کر کے اس شرط کے ساتھ ہتھیار ڈال دیے کہ وہ اور اس کی سپاہ فوجی قیدی خیال کی جائے گی لیکن روسیوں نے اس شرط کی قطعاً پرواہ نہ کی اور قلعہ میں داخل ہو کر بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا، بالآخر مارشل میونخ کو سر عسکر اور اس کے سپاہیوں کی حفاظت کے لیے روسی فوج کا ایک دستہ قلعہ میں روانہ کرنا پڑا لیکن اس وقت تک عثمانی دستہ کا ایک بہت بڑا حصہ قتل ہو چکا تھا اور صرف تین ہزار ترک سر عسکر کے ساتھ میونخ کے لشکر میں زندہ پہنچ سکے، روسی فوج کو بھی اس معرکہ میں بہت زیادہ نقصان پہنچا، چنانچہ اوکزاکوف میں ایک مضبوط دستہ متعین کرنے کے

بعد میونخ یوکرین کولوٹ آیا اور اس سال کسی دوسری مہم پر روانہ ہونے کی ہمت نہیں کی، جنرل لاسکی ۲۳/جولائی ۱۷۳۶ء کو کریمیا میں داخل ہو گیا تھا، قرہ سو بازار کے قریب تاتاریوں کو شکست دے کر اس نے تمام ملک میں قتل وخوں ریزی کا بازار گرم کر دیا اور ایک ماہ کی قتل و غارت گری اور آتش زنی کے بعد جب بہیمیت اور بربریت کی پیاس کسی قدر کم ہوئی تو اگست میں واپس چلا گیا، کریسی کا بیان ہے کہ روسی فخر کرتے تھے کہ اس مختصر سے حملہ میں انہوں نے چھ ہزار مکانات، اڑتیس مسجدیں، دو گرجے اور پچاس چکیاں جلا ڈالیں۔

آسٹریا کی شکست اسی سال (۱۷۳۶ء) میں آسٹریا نے بھی جس کے وکلاء نیمی روف کی کانگریس میں ترکوں کو صلح کی گفتگو میں مصروف رکھے ہوئے تھے، بغیر کسی اعلان جنگ کے دفعۃً نیش پر حملہ کر دیا اور جولائی ۱۷۳۶ء میں ایک فوج فیلڈ مارشل سکنڈروف (Seckendrof) کی سرکردگی میں سرویا کو روانہ کی اور دوسری بوسنیا میں بھیجی، نیش پر قبضہ پانے کے بعد سکنڈروف نے اپنی فوج کا ایک حصہ ودین کی فتح کے لیے روانہ کیا لیکن عثمانیوں کو اس شہر کے استحکام کا موقع مل گیا تھا، اس لیے آسٹروی فوجیں جن پر شہزادہ یوجین کی سابق فتوحات کا نشہ ہنوز طاری تھا، پے درپے حملوں کے باوجود اس مہم میں کامیاب نہ ہو سکیں، اس شکست کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ آسٹریا کے جنرل آپس ہی میں جھگڑنے لگے اور پھر ان کی باہمی مخالفتوں سے فوج میں جو کمزوری رونما ہونے لگی تھی، اس میں وبا اور سامان رسد کی قلت نے اور اضافہ کر دیا، برخلاف اس کے ترک صدر اعظم زیر سیادت حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، ان کی فطری دلیری فرانس کے مشہور ماہر حرب بونیوال (Bouneval) کی معیت و مشورہ سے جو مسلمان ہو کر عثمانی فوجوں کے نظام وتربیت کا نگراں مقرر ہو گیا تھا اور زیادہ مؤثر ہو گئی، سیکنڈروف نے شکست کھا کر اپنی بقیہ فوجوں کے ساتھ ہنگری کا رخ کیا، ترکوں نے نیش کو واپس لے لیا اور آسٹروی علاقہ کے متعدد حصوں میں داخل ہو گئے، بوسنیا کی مہم کا نتیجہ بھی ایسا ہی رہا، وہاں کے مسلمان باشندوں نے بہادری کے ساتھ آسٹریا کی فوجوں کا

مقابلہ کیا اور آخر کار انہیں بوسنیا سے نکال باہر کیا۔

دوسرے سال شہنشاہ آسٹریا نے نئے جنرلوں کی سرکردگی میں تازہ فوجیں روانہ کیں اور پھر ترکوں کی طرف سے بھی ایک نیا صدر اعظم یغان محمد پاشا ان کے مقابلہ میں بڑھا اور پیش قدمی کر کے میڈیا پر قبضہ کر لیا، جو ہنگری کے علاقہ میں تھا اور پھر آگے بڑھ کر دریائے ڈینوب کے ساحل پر اورسوا (Orsova) کے اہم قلعہ کا محاصرہ کر لیا، میڈیا سے قریب کورینا کے مقام پر آسٹروی فوجوں کو ایک لڑائی میں عارضی کامیابی نصیب ہوئی، (۴ر جولائی ۱۷۳۸ء) لیکن فوراً ہی صدر اعظم تازہ فوجوں کے ساتھ پہنچ گیا اور غنیم کو بھگا کر سمندریا پر قبضہ کر لیا، ۱۵ر اگست ۱۷۳۸ء کو اورسوا نے بھی ہتھیار ڈال دیے، آسٹروی فوجیں بھاگ کر بلغراد میں پناہ گزیں ہوگئیں۔

روس کے مقابلہ میں ترکوں کی یہ کامیابی کوئی شان دار نہ تھی، تاہم ۱۷۳۸ء میں انہوں نے روسیوں کو بحر اسود کے ساحل پر آگے بڑھنے سے روکے رکھا، مارشل میونخ نے دریائے نیپر اور دریائے بوگ کو عبور کر کے چند ترکی اور تاتاری دستوں کو شکست دی لیکن جب بندر کے محاصرہ کی غرض سے دریائے نیسٹر تک پہنچا تو وہاں اس کا سامنا ایک مضبوط عثمانی لشکر سے ہوا، جو بندرگاہ کی راہ میں حائل تھا اور جس پر غلبہ پانا اس کے لیے ناممکن ثابت ہوا، متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں جن میں سے ایک میں ساسی گرائی نے بیس ہزار تاتاری اور اسی قدر عثمانی سپاہ کی مدد سے روسیوں کو سخت شکست دی، میدان جنگ میں روسی فوج کو جو نقصان پہنچا، اس سے زیادہ نقصان وبا اور سامان رسد کی قلت نے پہنچایا اور میونخ کے لیے اپنی بقیہ سپاہ کے ساتھ یوکرین لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اسی سال جنرل لاسکی نے تیس پینتیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ کریمیا پر پھر حملہ کیا، یہ تیسرا حملہ تھا، پہلے دو حملوں میں چوں کہ روسیوں نے ملک کو حتی الامکان پوری طرح تباہ کر دیا تھا، اس لیے جنرل لاسکی کو سامان رسد کی فراہمی میں سخت دشواریاں پیش آئیں اور اسے مجبوراً بہت جلد کریمیا سے نکل جانا پڑا۔

مشرقی تجویز ۱۷۳۰ء کے موسم سرما میں فرانس کی وساطت سے صلح کی گفتگو پھر چھیڑی گئی، دولت علیہ جنگ ختم کرنے کی غرض سے بہت کچھ نقصان برداشت کرنے پر تیار تھی لیکن روس کا نشۂ فتح کسی طرح صلح کی اجازت نہ دیتا تھا اور اس نے ایسے شرائط پیش کیے جن کا قبول کرنا دولت علیہ کے لیے قطعاً محال تھا، زارنیہ اور روس کی وزارت حرب پر مارشل میونخ کا اثر بہت زیادہ تھا اور میونخ ہی کی مخالفت نے صلح کی تمام کوششوں کو ناکام کر دیا، اس نے زارنیہ کو یقین دلایا کہ یورپ میں سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا جو تعداد میں اپنے مسلمان حکمرانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، ترکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے اور اس کی نگاہیں زارنیہ روس کی طرف لگی ہوئی ہیں، جسے وہ اپنا جائز فرماں روا تسلیم کرتی ہے، اس نے اس بات پر زور دیا کہ عیسائی رعایا کے جوش سے فائدہ اٹھانے اور قسطنطنیہ کی طرف بڑھنے کا بس یہی موقع ہے کہ ابھی روسی فتوحات کا اثر رعایا کے دلوں پر تازہ ہے، بہت ممکن ہے کہ ایسا موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے، زارنیہ نے میونخ کی اس ''مشرقی تجویز'' (Oriental Project) کو منظور کیا اور اس کی ہدایت کے مطابق سلطنت عثمانیہ کے یورپین صوبوں میں اپنے جاسوس روانہ کیے تاکہ عیسائی رعایا کو دولت علیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کریں۔

۱۷۳۹ء میں میونخ نے جنگ کا سلسلہ پھر شروع کیا اور مولڈیویا کی سرحد میں داخل ہونے کے لیے اس نے پوڈولیا کی راہ اختیار کی جو اس وقت مملکت پولینڈ کا ایک صوبہ تھا، پولینڈ اس جنگ میں کسی فریق کا شریک نہ تھا لیکن میونخ اس طرح پوڈولیا میں داخل ہوا جیسے کسی دشمن کے ملک میں داخل ہوتے ہیں، راستہ میں روسی فوجوں نے جی بھر کے لوٹ مار کی اور یوں اس صوبہ کو ویران کرتے ہوئے مولڈیویا کی سرحد کو عبور کر کے خوزیم کے مقام پر ایک ترکی لشکر کو شکست دی، اس کے بعد میونخ یاسی کی طرف بڑھا جو مولڈیویا کا پایہ تخت تھا اور اس پر قبضہ کر لیا، پھر اس نے بندر کا رخ کیا اور چاہتا تھا کہ بندر اور اس علاقہ کے دوسرے قلعوں کو فتح کرتا ہوا جنوب کی طرف یورپین ترکی قلب میں داخل ہونے کی کوشش

کرے لیکن اثنائے راہ میں اسے اپنے حلیف آسٹریا کی تباہ کن شکست کی اطلاع ملی اور معلوم ہوا کہ آسٹریا نے بہت دب کر سلطنت عثمانیہ سے صلح کر لی ہے۔

آسٹریا کی فیصلہ کن شکست واقع یہ تھا کہ اسی درمیان میں آسٹریا کی فوجوں نے پھر سرویا پر حملہ شروع کر دیا تھا والیس (Wallis) اور نائپرگ (Neiperg) آسٹریا کے دو نئے اور مشہور جنرلوں نے ایک زبردست فوج کے ساتھ پیٹروارڈین سے نکل کر جنوب کا رخ کیا، ادھر صدر اعظم الحاج محمد پاشا تقریباً دو لاکھ سپاہ لے کر ان کے مقابلہ کے لیے آ رہا تھا، سمندریا اور پیٹروارڈین کے درمیان کروٹزکا (Krotzka) کے مقام پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا، آسٹریا کو سخت شکست ہوئی اور اس کی فوجوں نے بھاگ کر بلغراد میں پناہ لی، عثمانیوں نے تعاقب کیا اور بلغراد پر گولہ باری شروع کر دی۔

صلح نامۂ بلغراد والیس اور نائپرگ کا سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا، ان کی ہمت چھوٹ گئی اور بقول ایورسلے وہ صلح کے لیے ویسے ہی بے چین تھے جیسے اس مہم کی ابتدا میں لاف زن اور آمادۂ جنگ نظر آتے تھے، بالآخر سفیر فرانس ولینوف (Villeneuve) کی وساطت سے شرائط صلح طے ہو گئے اور آسٹریا نے اپنے حلیف روس سے مشورہ کا انتظار بھی نہیں کیا، اس نے بلغراد اور بوسنیا، سرویا اور ولاچیا کے تمام علاقے جو صلح نامۂ پسارووچ کے وقت اسے دیے گئے تھے، دولت علیہ کو واپس کر دیے، اس صلح نامہ پر یکم ستمبر ۱۷۳۹ء کو فریقین کے دستخط ہو گئے، آسٹریا کی طرف سے ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ دولت علیہ روس کے ساتھ بھی صلح کر لے، چنانچہ مارشل میونخ کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی، میونخ کو آسٹریا کی شکست اور بلغراد کے صلح نامہ کا حال معلوم کر کے سخت غصہ آیا لیکن اب اس کے لیے بھی صلح کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیوں کہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ الحاج محمد پاشا کی عظیم الشان فوج کا مقابلہ آسٹریا کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، زارنیہ کو بھی مجبوراً صلح کے لیے آمادہ ہونا پڑا اور میونخ کے تمام منصوبے جو اس نے قسطنطنیہ کی فتح کی نسبت باندھ رکھے تھے، دفعۃً خاک میں مل گئے، روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جو

شرائط صلح ۱۸ ستمبر ۱۷۳۹ء مطابق ۱۴ جمادی الآخر ۱۱۵۲ھ میں طے ہوئے ان کی رو سے مولڈیویا اور کریمیا کی تمام فتوحات اور شہر اوکزاکوف سے روس دست بردار ہوگیا، نیز اس نے معاہدہ کیا کہ شہر ازف مسمار کردیا جائے گا، ازف کا علاقہ دونوں سلطنتوں کے درمیان حد فاصل قرار پایا، صلح نامہ کی تیسری دفعہ میں یہ شرط خاص طور پر رکھی گئی کہ بحر ازف یا بحر اسود میں روس کا کوئی بیڑا رہنے نہ پائے گا اور نہ وہ ان سمندروں کے ساحل پر کوئی جہاز تعمیر کرسکے گا، بحر ازف اور بحر اسود میں روس کی جنگی یا تجارتی جہازوں کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا گیا اور تجارتی اغراض کے لیے صرف جہازوں کے استعمال کی اجازت دی گئی۔

صلح نامۂ بلغراد دولت علیہ کے لیے ایک عظیم الشان کامیابی تھی، اس نے معاہدہ پساروویچ کی اہانت کا داغ دھودیا اور آسٹریا اور روس کو ترکوں کے عزم شجاعت سے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی وہ دور ہوگئی، یورپین مؤرخین اس صلح نامہ کو فرانس کی حکمت عملی کی ایک نمایاں کامیابی قرار دیتے ہیں اور اس کے تکملہ کا سہرا ولینوف کے سر باندھتے ہیں، بلاشبہ ولینوف کی وساطت سے کام لیا گیا لیکن اس سے پہلے بھی دوران جنگ میں اس نے کئی بار صلح کی کوشش کی تھی، مگر ہر کوشش بے سود اور ناکام ثابت ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ اصل حکمت عملی قوت کی ہے، دنیا نے ہمیشہ سے صرف اسی حکمت عملی کو تسلیم کیا ہے اور تاریخ کا ہر صفحہ اسی کی کارفرمائی کا شاہد ہے، بلغراد کا صلح نامہ صرف کروٹز کی فیصلہ کن جنگ کا نتیجہ تھا، ورنہ دنیا کی کوئی طاقت آسٹریا اور روس کو ان شرائط کے منظور کرنے پر راضی نہیں کرسکتی تھی۔

سوئڈن سے معاہدہ ولینوف کو رسوخ باب عالی میں حاصل تھا، اسے کام میں لاکر اس نے ۱۷۴۰ء میں دولت عثمانیہ اور سویڈن کے درمیان بھی ایک معاہدہ کرادیا، جس کے رو سے فریقین روس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کے پابند ہوگئے، فرانس کی خارجی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ پولینڈ میں روس کے اثر کو قائم ہونے سے روکا جائے، چنانچہ اس معاہدہ کی غرض بھی یہی تھی لیکن چند ہی سالوں کے بعد جب روس، پرشیا اور آسٹریا نے متحد

ہوکر پولینڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تو نہ فرانس کو مدافعت کی جرأت ہوئی اور نہ دولت علیہ اس غارت گری کو روک سکی۔

فرانس کے لیے مخصوص مراعات ولینوف کی کوشش سے فرانس کو جو مخصوص فائدہ پہنچا وہ یہ تھا کہ باب عالی نے ۱۶۷۳ء کے معاہدہ کی تجدید کر کے ان تمام حقوق کا تحفظ کر دیا جو فرانسیسی تاجروں کے لیے سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھے، نیز ۱۷ ستمبر ۱۷۴۰ء کے معاہدہ کے ذریعہ بعض جدید حقوق کے اضافہ کے ساتھ قدیم حقوق میں بھی فرانس کے حسب خواہ ترمیم کر دی، سلطان نے محمد سعید کو اپنا خاص سفیر بنا کر شاہ فرانس کے پاس روانہ کیا تا کہ وہ سلطان کی طرف سے تجارتی مراعات کو پیش کرے، شاہ فرانس نے سلطان کے شایان شان اعزاز کے ساتھ سفیر کا استقبال کیا اور اس کی واپسی پر دو جنگی جہاز اور کچھ فرانسیسی توپچی سلطان کی خدمت میں بھیجے تا کہ عثمانی فوجوں میں وہ جدید طریقے جاری کریں جنہیں فرانس کے ممتاز ماہر فن حرب لوفوا نے فرانسیسی فوجوں میں رائج کیا تھا۔

یورپین حکومتوں کی باہمی لڑائیاں صلح نامۂ بلغراد کے بعد تقریباً تیس سال تک سلطنت عثمانیہ اور اس کی ہم سایہ سلطنتوں کے درمیان کوئی جنگ پیش نہیں آئی، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ باب عالی موقع پانے کے باوجود جارحانہ اقدام سے اجتناب کرتا رہا لیکن بڑا سبب یہ تھا کہ آسٹریا اور روس جو اس کی سب سے بڑی دشمن سلطنتیں تھیں، خود اپنے جھگڑوں میں مبتلا تھیں اور انہیں متحد ہو کر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی فرصت نہ تھی، ۱۷۴۰ء میں آسٹریا کے شہنشاہ چارلس ششم کا انتقال ہو گیا اور اس کی لڑکی میریا تھریسا (Maria Theresa) تخت پر بیٹھی لیکن آسٹریا کی تقریباً تمام ہم سایہ عیسائی مملکتوں نے میریا کی مخالفت کی اور فرانس کی سرکردگی میں آٹھ سال تک اس جنگ کو جاری رکھا جو آسٹریا جنگ جانشینی (War of Austrian Succession) کے نام سے موسوم ہے اور جو بالآخر صلح نامۂ ایلا شپیل (۱۷۴۸ء) کے تکملہ پر میریا کے حق میں ختم ہوئی، اسی طرح ۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۳ء تک ''جنگ ہفت سالہ'' کا

سلسلہ قائم رہا جس نے یورپ کی سلطنتوں کو باہمی نزاعات میں مصروف رکھا، دولت علیہ نے ان میں سے کسی جنگ میں بھی حصہ نہیں لیا، حالاں کہ اپنے قدیم دشمن آسٹریا کی پریشان حالی سے فائدہ اٹھا کر ہنگری کے سابق عثمانی مقبوضات کو واپس لے لینے کا یہ بہت اچھا موقع تھا، برخلاف اس کے وہ نہایت دیانت داری کے ساتھ معاہدہ بلغراد کی پابندی پر قائم رہی، یورپ کے قانون سیاست کے رو سے اس کی یہ خاموشی انتہائی غیر دانش مندی پر مبنی تھی لیکن جو قانون سیاست سے بلند تر اصول یعنی اخلاق کا پابند ہے، وہ اسی خاموشی کا متقاضی تھا، باب عالی نے نہ صرف ان جنگوں کی شرکت سے اجتناب کیا بلکہ اپنے اثر سے محاربین میں صلح کرانے کی بھی امکانی کوشش کی، دشمن کی کم زوری سے فائدہ نہ اٹھانے میں دولت علیہ نے جس بلندی اخلاق کا ثبوت دیا، اس کا اعتراف یورپین مؤرخین بھی کرتے ہیں۔

مختلف شورشیں جہاں تک یورپ کی سلطنتوں کا تعلق تھا، ۱۷۶۸ء تک دولت عثمانیہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی لیکن ۱۷۴۳ء میں ایران سے پھر لڑائی چھڑ گئی، جو تین سال تک جاری رہنے کے بعد ۱۷۴۶ء میں تقریباً ان ہی شرائط پر ختم ہوئی جن پر سلطان مراد رابع کے عہد میں ایران اور باب عالی کے درمیان صلح نامہ ہوا تھا، اس جنگ کے علاوہ سلطنت کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً مقامی پاشاؤں کی بغاوتیں بھی برپا ہوتی رہیں جن سے کامل امن وسکون قائم نہ ہو سکا، دور دراز صوبوں کے والی کبھی کبھی مطلق العنان ہو جاتے تھے اور حکومت کو بعض اوقات ان کی سرکشی سے چشم پوشی کرنی پڑتی تھی، بغاوت کا سب سے زیادہ اثر مصر کے صوبہ میں تھا، جو بتدریج دولت علیہ کے قبضہ واقتدار سے نکلا جا رہا تھا۔

ایک سیاسی غلطی ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں میں بعض ترکی خاندانوں کو مخصوص امتیازات حاصل تھے جن میں سب سے زیادہ اہم امتیاز وہاں کی زمینوں کا لگان وصول کر کے باب عالی میں پیش کرتا تھا، چوں کہ سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوت وقتاً فوقتاً رونما ہوتی رہتی تھی، اس لیے ان خاندانوں کی سرکشی کے اندیشہ سے باب عالی نے وہ

امتیازات ان سے لے کر قسطنطنیہ کے دولت مند تاجروں کو دے دیے، ان میں زیادہ تر یونانی تاجر تھے، جنھوں نے اپنی دولت کے معاوضہ میں بڑے بڑے القاب حاصل کر لیے تھے، ولاچیا اور مولڈیویا کے شریف ترک خاندانوں کی جگہ پر یہی دولت مند تاجر سرکاری مال گزاری وصول کرنے کے لیے مقرر کیے گئے، ان لوگوں نے رعایا کے ساتھ نہایت سختی اور تشدد کا برتاؤ کیا اور ترک شرفاء پر بڑے مظالم کیے، یہاں تک کہ قدیم ترک خاندان یکے بعد دیگرے ختم ہوتے گئے اور ان کے بجائے تاجروں کے نئے خاندان قائم ہو گئے، ان کی سختی اور تشدد کا سب سے زیادہ مضر نتیجہ یہ ہوا کہ عام رعایا برگشتہ ہو کر روس کی طرف مائل ہو گئی[1]۔

وہابی تحریک سلطنت کی مختلف شورشوں میں ایک نہایت اہم شورش وہابی تحریک کی تھی، جس کا آغاز اسی عہد میں شیخ عبدالوہاب نجدی نے کیا تھا، اس تحریک میں ابن سعود امیر نجد کی حمایت سے بہت کچھ قوت آگئی تھی اور باب عالی کو اس کے فرو کرنے میں خاصی کاوش کرنی پڑی لیکن سلطان محمود کے عہد میں اس کا اثر بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی گیا اور اس کے جانشینوں کی کوششیں بھی اس کے استیصال میں ناکام رہیں تا آں کہ سلطان محمود ثانی کے عہد میں محمد علی پاشا والی مصر نے اس فرقہ کی سیاسی قوت کو توڑ کر اس کے آخری امیر کو گرفتار کر لیا اور اسے ۱۸۱۸ء میں قسطنطنیہ روانہ کر دیا جہاں وہ قتل کر دیا گیا۔

وفات ۲۷ رصفر ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۷۵۴ء کو سلطان محمود اول نے وفات پائی، اس کو تعمیرات سے بہت دل چسپی تھی، اس نے قسطنطنیہ نیز مختلف صوبوں میں متعدد عظیم الشان عمارتیں بنوائیں ''جامع نور عثمانی'' کی تعمیر اسی نے شروع کی تھی، اس نے چار کتب خانے بھی پایہ تخت میں قائم کیے، وہ اپنے عدل و حلم اور تمام رعایا کے ساتھ یکساں انصاف کرنے میں خاص طور پر مشہور تھا۔

---

[1] فرید بک، ص ۱۵۱۔

عثمان ثالث

۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۷ء

سلطان محمود خاں اوّل کی وفات پر اس کا بھائی عثمان خاں ثالث تخت نشین ہوا، اس نے صرف تین سال حکومت کی اور اپنے مختصر عہد میں سلطان محمود ہی کے سیاسی اصولوں کا پابند رہا، چنانچہ ہم سایہ حکومتوں سے کوئی آویزش نہیں ہوئی، آسٹریا کی جنگ جانشینی کے بعد ۱۷۵۶ء میں ''جنگ ہفت سالہ'' شروع ہوگئی، جس نے یورپین حکومتوں کو دو مخالف جماعتوں میں تقسیم کر کے سات سال تک وسط یورپ کو میدان کارزار بنائے رکھا، دولت عثمانیہ کے لیے یہ دوسرا نادر موقع تھا، جب وہ دشمنوں کی باہمی جنگ سے فائدہ اٹھا سکتی تھی، مگر عثمان ثالث اس جنگ میں اخلاق و شرافت کے اسی اصول پر قائم رہا جس کی مثال محمود اول نے آسٹریا کی جنگ جانشینی کے موقع پر پیش کی تھی، سلطنت کے اندرونی نظم و نسق میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، اس عہد میں کوئی اہم واقع پیش نہیں آیا۔

۱۶/صفر ۱۱۷۱ھ مطابق ۳۰/اکتوبر ۱۷۵۷ء کو سلطان عثمان ثالث نے وفات پائی۔

مصطفیٰ ثالث

۱۱۷۱ھ تا ۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۵۷ء تا ۱۷۷۳ء

عثمان ثالث کے بعد مصطفیٰ ثالث تخت پر آیا، یہ سلطان احمد ثالث کا لڑکا تھا، تخت نشینی کے وقت اس کی عمر پچاس سال کی تھی اور یہ طویل مدت امور سلطنت سے علاحدہ محل کے ایک حصہ میں بسر ہوئی تھی، تاہم فطری اہلیت نے تجربہ کی کمی بہت کچھ پوری کر دی تھی اور اگر روس سے جنگ نہ چھڑ گئی ہوتی تو کوئی شبہ نہیں کہ اس کی فرض شناسی اور تدبر سے سلطنت کو بہت فائدہ پہنچتا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ مصطفیٰ نام کے جتنے سلطان ہوئے ان سب کے عہد میں سلطنت عثمانیہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچا اور اس کے مقبوضات کے اہم حصے دشمنوں کے ہاتھوں میں چلے گئے، تاہم مصطفیٰ ثالث کے عہد کے ابتدائی چھ سال جب انصرام حکومت صدر اعظم راغب پاشا کے ہاتھ میں تھا، دولت علیہ کی خوش حالی اور ترقی کے سال تھے۔

راغب پاشا راغب پاشا سلطان محمود اول کے آخری دور میں صدر اعظم رہ چکا تھا، اپنی غیر معمولی لیاقت، تدبر اور حسن انتظام کے لحاظ سے وہ صدر اعظم صوقوللی پاشا اور وزرائے کوپریلی کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے، اپنی وفات تک اس نے دولت علیہ کو دوسری سلطنتوں کی آویزش سے محفوظ رکھا اور قیام امن کے ساتھ پوری توجہ سلطنت کی فلاح و بہبود پر صرف کرتا رہا، اس نے سلطنت کے مختلف صیغوں کی اصلاح کی، اوقاف کی نگرانی کا خاص طور پر اہتمام کیا، شفاخانے بنوائے اور اپنی جیب خاص سے ایک کتب خانہ عام قائم کیا، گرانی اور

قحط کے سد باب کے لیے اس نے اندرون ملک میں ذرائع حمل ونقل کو آسان بنا دینے کی ایک ایسی تجویز اختیار کی جس کی تکمیل نہایت درجہ مفید ثابت ہوتی لیکن اسے پورا کرنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہوگیا، وہ تجویز یہ تھی کہ خلیج نائیکومیڈیا کے مشرقی سرے سے ایک نہر نکال کر جھیل سنبجا (Sabandja) میں ملادی جائے اور دوسری نہر جھیل سنبجا سے نکال کر دریائے سقاریہ میں ملادی جائے، جو بحر اسود میں گرتا ہے، اس طرح باسفورس سے گزرے بغیر خلیج نائیکومیڈیا سے بحر اسود تک آمد و رفت ہو جاتی، ان دو بڑی نہروں سے چھوٹی چھوٹی نہروں کا سلسلہ قائم کر دیا جاتا جن سے ملک کے ایک حصہ کی چیزیں دوسرے حصوں تک بہت آسانی کے ساتھ منتقل کی جاسکتی تھیں، تجارتی فائدہ کے علاوہ سنبجا میں ترکی بحریہ کا بھی ایک محفوظ اور مضبوط مرکز قائم کیا جاسکتا تھا، یہ تجویز کوئی نئی نہیں تھی، مصطفیٰ ثالث سے قبل سلیمان اعظم، مراد ثالث اور محمد رابع نے بھی اس کو عملاً شروع کر دیا تھا لیکن تکملہ کسی سے بھی نہ ہوسکا، کریسی کا بیان ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے قیام سے پہلے بھی دوبار بیتھنیا کے فرماں رواؤں نے اور ایک بار شہنشاہ ٹریجن (Trajan) نے اسی تجویز کو اختیار کیا تھا، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے فوائد کے احساس کے باوجود اس کی تکمیل کسی نے بھی نہ کی، حالاں کہ نہ فاصلہ زیادہ تھا اور نہ زمین ایسی تھی جس کی کھدائی دشوار ہوتی۔

پرشا سے اتحاد راغب پاشا کی خارجی سیاست اہم ترین مقصد یہ تھا کہ دولت عثمانیہ کو روس اور آسٹریا کی دشمنی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے دوسری عیسائی مملکتوں سے اتحاد قائم کیا جائے، آسٹریا کی جنگ جانشینی اور پھر جنگ ہفت سالہ کے بعد پرشا کا شمار یورپ کی نہایت طاقت ور مملکتوں میں ہونے لگا تھا اور اس کے فرماں روا فریڈرک ثانی سے روس اور آسٹریا دونوں حد درجہ بغض وعناد رکھتے تھے، راغب پاشا نے اسی بنا پر پرشا کی دوستی کو بہت ضروری خیال کیا اور اس کے لیے شروع ہی سے کوشش کرتا رہا، بالآخر ۱۷۶۱ء میں باب عالی اور پرشا کے درمیان ایک معاہدۂ اتحاد مرتب ہوگیا اور فریڈرک ثانی کے سفیر نے قسطنطنیہ

میں اس پر دستخط کر دیے، فریڈرک کو دولت عثمانیہ سے اتحاد کرنے میں روس اور آسٹریا کی دشمنی سے قطع نظر اس وجہ سے بھی تامل نہ ہو کہ اس کے برعکس صورت اختیار کرنے میں اسے کوئی خاص فائدہ نظر نہ آتا تھا، کیوں کہ اس کا ملک ہر طرف عیسائی مملکتوں سے گھرا ہوا تھا اور اگر سلطنت عثمانیہ کا کوئی علاقہ نکل بھی جاتا تو اس سے پرشا کی مملکت میں اضافہ ہونے کا امکان نہ تھا، اسی قسم کا اتحاد سوئڈن، نیپلز اور ڈنمارک سے بھی پہلے ہی قائم کر لیا گیا تھا، راغب پاشا چاہتا تھا کہ پرشا سے دوستی کا جو معاہدہ ہوا ہے، اسے مستحکم کرنے کے لیے اس شرط کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ فریقین جارحانہ اور مدافعانہ جنگوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں گے لیکن اس مسئلہ میں گفتگو کرنے کا سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ۱۷۶۳ء میں راغب پاشا کا انتقال ہو گیا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

فریڈرک کا نقض عہد راغب پاشا کی وفات کے بعد سلطان نے انتظام حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لیا، وہ ایک نہایت جفاکش اور لائق فرماں روا تھا اور سلطنت کی فلاح و بہبود کا دل سے خواہاں تھا لیکن اپنے وزیروں اور فوج کے بڑے بڑے افسروں کے انتخاب میں اکثر غلطی کر جاتا جو سلطنت کے لیے مضر ثابت ہوتی، اتفاق یہ ہے کہ اس کے ہم عصر فرماں رواؤں میں دو ایسے تھے جو اپنی غیر معمولی لیاقت اور طاقت کے اعتبار سے یورپ کے عظیم ترین فرماں رواؤں میں شمار کیے جاتے تھے، یعنی کیتھرائن ثانیہ جس نے ۱۷۶۳ء میں اپنے شوہر زار کو قتل کرا کے روس کے تخت پر قبضہ کر لیا تھا اور فریڈرک ثانی جو اپنے کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں فریڈرک اعظم کے نام سے مشہور ہے، یہ صحیح ہے کہ فریڈرک اور باب عالی کے درمیان دوستی کا ایک معاہدہ ہو چکا تھا لیکن یہ معاہدہ اسی وقت تک قائم رہا جب تک اس کی پابندی فریڈرک کی ہوس وخود غرضی کے لیے روک نہ بنی، جوں ہی اس نے محسوس کیا کہ پرشا کے اغراض اس معاہدہ کے مسترد کر دینے ہی سے پورے ہو سکتے ہیں، اس نے بلا تامل اسے توڑ کر دولت عثمانیہ کے دشمنوں سے رشتۂ اخوت جوڑ لیا۔

کیتھرائن ثانیہ کیتھرائن ثانیہ ایک فوجی بغاوت کے بعد تخت پر آئی تھی، جن فوجی سرداروں نے اس کے شوہر زار روس کو قتل کر کے اسے تخت پر بیٹھایا تھا، وہ مزید قتل و غارت گری کے لیے بیتاب تھے اور ان کی نگاہیں ہر کم زور مملکت کی طرف اٹھتی تھیں جس پر روس کی دست اندازی آسانی سے ممکن تھی، اس مقصد کے لیے انہوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ پہلے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے اندرون ملک میں خانہ جنگی شروع کرادیتے اور پھر کم زور جماعت کی حمایت کے بہانہ سے دخل اندازی کرنے لگتے اور جب خود ان ہی کی پیدا کی ہوئی بدامنی ان کی کوششوں سے ترقی کر جاتی تو قیام امن کے دعوے کے ساتھ روسی فوجیں اس ملک میں داخل کر کے اس پر قبضہ کر لیتے، کیتھرائن کے عہد کے ابتدائی سالوں میں یہ تدبیر خصوصیت کے ساتھ پولینڈ میں عمل میں لائی گئی، پرشا بھی اس غارت گری میں روس کا شریک ہو گیا، فریڈرک ثانی کو روس اور آسٹریا کے خلاف دولت عثمانیہ کے اتحاد کی خواہش باقی نہ رہی، بلکہ اس نے ۱۷۶۴ء میں کیتھرائن کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا، جس کے رو سے فریقین پابند ہو گئے کہ ایک دوسرے کے مقبوضات کا تحفظ کریں گے اور عہد کیا کہ اگر کسی فریق پر حملہ ہو گیا تو دوسرا فریق دس ہزار پیدل اور ایک ہزار سواروں سے اس کی مدد کرے گا لیکن اگر روس پر ترکوں نے حملہ کیا یا پرشا پر فرانسیسیوں نے تو مدد بجائے فوج کے نقد کی شکل میں ہو گی، اس معاہدہ کی ایک خفیہ دفعہ بھی تھی جس کا تعلق پولینڈ سے تھا اور اس کے تکملہ کے چند ہی روز بعد دونوں حکومتوں کے درمیان پولینڈ کی تقسیم کی نسبت ایک تازہ معاہدہ بھی ہو گیا، جس میں میریا تھریسیا بھی شریک کی گئی، روس اور پرشانی فوجوں نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا اور کیتھرائن کے ایک سابق آشنا اسٹانسلانس پونیاٹوسکی (Stanislans Poinatowski) کو بجبر پولینڈ کے تخت پر بیٹھایا گیا، حالاں کہ پولینڈ کے باشندے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھے، روسی جنرل رپنن (Repnin) نے وارسا میں ڈکٹیٹر کی حیثیت اختیار کر لی، باب عالی نے روس اور پرشا کی اس ظالمانہ کارروائی کے خلاف سخت احتجاج کیا، مگر ان

سلطنتوں نے مطلق پرواہ نہ کی، برخلاف اس کے روس نے اپنے طرز عمل سے ظاہر کر دیا کہ وہ باب عالی کو جنگ پر مجبور کر دینا چاہتا ہے، اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کریمیا، موریا، مونٹی نگرو اور جارجیا کے علاقوں میں دولت علیہ کے خلاف بغاوت پھیلانے کی کوشش کی، اس کے علاوہ جب پولینڈ کے وطن پرستوں کے حدود میں پناہ گزیں ہوئی تو روسی جنرل ویسمین (Wessmann) نے بلطہ تک اس کا تعاقب کیا، جو بسرابیا کی سرحد پر خان کریمیا کے علاقہ میں واقع تھا اور شہر پر گولہ باری کر کے اسے برباد کر دیا۔

اعلانِ جنگ روس کی مذکورہ بالا کارروائیوں سے مجبور ہو کر سلطان نے ۶ را کتوبر ۱۷۶۸ء کو قسطنطنیہ میں ایک دیوان منعقد کیا اور ارا کین سلطنت سے اس باب میں مشورہ کیا، سب نے بالاتفاق روس کی دراز دستوں کی بنا پر جنگ کی رائے دی اور پولینڈ کے ساتھ اس کے طرزِ عمل کو معاہدۂ بلغراد کی خلاف ورزی قرار دے کر جنگ کو ضروری قرار دیا، البتہ صدر اعظم محسن زادہ پاشا تنہا شخص تھا جس نے اس رائے کی مخالفت کی، اصول کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے کہ دولت علیہ اس وقت جنگ کے لیے کافی طور پر تیار نہ تھی اور پوری تیاری کے بغیر لڑائی چھیڑ دینا کسی طرح مناسب نہ تھا، اس مخالفت کی بنا پر جو بعد کے واقعات سے بالکل حق بہ جانب ثابت ہوئی، وہ صدارت کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ امین محمد پاشا جو سلطان کا داماد تھا، صدر اعظم مقرر ہوا، دیوان کے فیصلہ کے مطابق ۶ را کتوبر ۱۷۶۸ء کو اعلان جنگ کر دیا گیا۔

آغازِ جنگ اعلان جنگ میں عجلت کی گئی، موسم سرما میں ایشیا کی فوجوں کو منتقل کرنا بہت دشوار تھا اور اسی وجہ سے ۱۷۶۹ء کے موسم بہار تک عثمانی فوجیں اکٹھا نہ ہو سکیں لیکن یہ تاخیر روس کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی، اس نے سلطنت عثمانیہ کے شمالی علاقوں پر حملہ شروع کر دیا، اعلان جنگ کے وقت ترکی قلعوں کی حالت بھی قابل اطمینان نہ تھی، نہ ان کی قلعہ بندی مستحکم تھی اور نہ سامان رسد کافی مقدار میں جمع تھا، موسم سرما میں باب عالی نے ہر کمی کو

پورا کرنے کی کوشش کی، مگر وقت تنگ تھا، موسم بہار میں باقاعدہ جنگ شروع ہونے تک بھی پوری تیاری نہ ہو سکی۔

ابتدائی فتح بہرحال جنگ کے ابتدائی دور میں کریم گرائی، خان کریمیا نے روسیوں کو عاجز کر دیا، جنوری ۱۷۶۹ء میں اس نے بلطہ میں ایک لاکھ تاتاری سپاہیوں کا ایک زبردست لشکر تیار کر کے دریائے بوگ کو عبور کیا اور دو ہفتہ تک روس کے جنوبی علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا رہا، اس مہم میں بیرون دی توت (Baron de Tott) مشہور فرانسیسی ماہر حرب بھی اس کے ساتھ تھا، جسے شاہ فرانس نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و تربیت کے لیے باب عالی میں بھیجا تھا، جنوبی روس کی لشکر کشی کے بعد کریم گرائی کریمیا کو واپس آ گیا اور ایک ہی ماہ کے اندر اس کا انتقال ہو گیا، لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے یونانی طبیب نے اسے زہر دے دیا، یہ طبیب امیر ولاچیا کا آدمی تھا، اس کی وفات پر سلطان نے دولت گرائی کو کریمیا کا خان مقرر کیا لیکن کریم گرائی کی لیاقت و شجاعت سے اسے کوئی مناسبت نہ تھی۔

روس کی تیاریاں اسی درمیان میں کیتھرائن نے پانچ فوجیں میدان جنگ کو روانہ کیں، پہلی فوج نے شہزادہ گالٹزن (Galitzen) کی سرکردگی میں مولڈیویا پر حملہ کر کے خوزیم کا محاصرہ کر لیا، دوسری فوج جنرل رومانزوف (Romarzoff) کے زیر قیادت دریائے نیپر اور بحر ازف کے درمیان روسی قلعوں کے استحکام اور ازف اور تگزوک کے قلعوں کی ازسرنو تعمیر کے لیے روانہ ہوئی، جو معاہدۂ بلغراد کے رو سے مسمار کر دیے گئے تھے، تیسری فوج دس گیارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ پولینڈ پر قبضہ کرنے کے لیے بڑھی تاکہ اس طرف سے ترکوں کو مدد نہ مل سکے، چوتھی نے قبارطہ اور کیوبان کے تاتاری علاقوں کا رخ کیا اور پانچویں تفلیس کی طرف روانہ ہوئی تاکہ وہاں سے شہزادگان جارجیا کے ساتھ مل کر ارض روم اور طرابزون پر حملہ کرے، ساتھ ہی مونٹی نگرو کی عیسائی رعایا کے پاس روپیہ، سامان حرب اور فوجی افسر روانہ کیے گئے کہ انہیں ترکوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کریں۔

امین پاشا کی نااہلی روس کی ان تیاریوں کے باوجود امین پاشا ۱۷۶۹ء تک مقابلہ کے لیے روانہ نہ ہوسکا اور روانہ ہونے کے بعد بھی خود یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ کوچ کس سمت کو ہونا چاہیے، اس نے فوجی افسروں کو مشورہ کے لیے جمع کیا اور فن حرب سے اپنی عدم واقفیت کا اعتراف صاف الفاظ میں کرتے ہوئے فوج کی نقل وحرکت سے متعلق ان کی رائے دریافت کی، اس نے کہا:

> ''مجھے جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے، فوج کی نقل وحرکت کا فیصلہ آپ لوگوں پر ہے، اور یہ آپ ہی بتائیں گے کہ افواج عثمانیہ کی کامیابی کے لیے بہترین تدبیریں کیا ہوں گی، آپ لوگ بلاتکلف اپنے خیالات ظاہر کریں اور اپنے مشورہ سے میری رہنمائی کریں۔''

افسران فوج کو سپہ سالار کے اس اعتراف نااہلی پر سخت تعجب ہوا لیکن ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بحث ومباحثہ کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کریں، چنانچہ متعدد افسروں نے مختلف رائیں پیش کیں، آخر میں صرف اس پر اتفاق ہوسکا کہ دریائے ڈینوب کو عبور کرکے مولڈیویا میں داخل ہوجائیں اور پھر جیسی صورت مناسب ہو اس کے مطابق عمل کریں، چنانچہ فوج نے دریائے ڈینوب کو عبور کیا، پھر دریائے پرتھ کے ساحل پر خاندپی پہنچی جو خوزیم اور باسی کے درمیان واقع ہے، وہاں سامان رسد کی قلت اور پسوؤں اور مچھروں کی کثرت نے سپاہیوں کو پریشان کردیا اور امین پاشا نے مجبور ہوکر بندر کا رخ کیا لیکن اس طرف بھی وہی دشواریاں پیش آئیں جن سے خاندپی میں دوچار ہونا پڑا تھا، اس درمیان میں شہزادہ گالٹزن پوڈولیا سے تازہ افواج لے کر ترکوں کے مقابلہ کی تیاریاں کررہا تھا، روس نے پولینڈ کو مجبور کرکے اس سے دولت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کرادیا تھا جس کے جواب میں باب عالی نے بھی بادل ناخواستہ پولینڈ کے خلاف ہتھیار اٹھالیے، خوزیم کے قریب روسی اور عثمانی فوجوں میں متعدد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں جن میں صدراعظم امین پاشا اور گالٹزن دونوں نے اپنی نااہلی کا پورا پورا ثبوت دیا، سلطان نے امین

پاشا کو معزول کر کے واپس بلا لیا اور اگست ۱۷۶۹ء میں اسے قتل کرا دیا، امین پاشا کا جانشین صدر اعظم علی پاشا ایک بہادر افسر تھا، سالار عسکر ہونے کے بعد اس نے روسی فوجوں پر خوزیم کے قریب متعدد حملے کیے اور پولینڈ میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن آخر کار اسے ہزیمت ہوئی اور ۱۸/ ستمبر ۱۷۶۹ء کو خوزیم نے ہتھیار ڈال دیے، ترکی فوجوں نے پسپا ہو کر دریائے ڈینوب کی طرف کوچ کیا، کیتھرائن نے بھی گالٹزن کو اس کی نالائقی کی بنا پر واپس بلا لیا اور اس کی جگہ رومانزوف کی روسی فوجوں کا سپہ سالار اعظم مقرر کیا، جس نے تھوڑے ہی دنوں میں تمام مولڈیویا پر قبضہ کر لیا۔

موریا میں روس کی شکست لیکن اس کام یابی سے کیتھرائن کے حوصلوں کی تشفی نہ ہوئی، اس کی ''مشرقی تجویز'' کا اہم ترین مقصد ترکوں کو یورپ سے نکال دینا تھا، یہی مقصد پیٹر اعظم کے پیش نظر بھی تھا اور مارشل میونخ کی تمام سرگرمیاں بھی صرف اسی کے لیے تھیں، یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے روسی فوجوں کی فتوحات کے علاوہ عیسائی رعایا کو بھی دولت علیہ کے خلاف برگشتہ کر دینا بہت ضروری تھا، چنانچہ کیتھرائن نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے آدمیوں کو خفیہ طور پر راہبوں کے لباس میں یونان اور یورپین ترکی کے جنوبی علاقوں میں بھیجنا شروع کر دیا تھا تاکہ عیسائی رعایا کو علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کر رکھیں، موریا کی یونانی رعایا میں کیتھرائن کے فرستادوں کی کوششیں خاص طور پر کام یاب ہوئیں اور ان لوگوں نے اصرار کے ساتھ کیتھرائن سے مدد کی درخواست کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر بالکل تیار ہیں، یہ وقت دولت علیہ کے لیے مختلف پریشانیوں کا وقت تھا، ایک طرف اگر کریمیا اور دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں پر روسی فوجیں غالب آ رہی تھیں تو دوسری طرف مصر کے والی علی بیگ نے تقریباً خود مختاری حاصل کر لی تھی، پھر شام میں بھی بغاوت پھیلی ہوئی تھی، روس نے باغیوں کی مدد کر کے ان کی ہمتوں کو اور بھی بڑھا دیا اور کیتھرائن کو توقع ہوگئی کہ ایک ہی کوشش میں یونان، مصر اور شام

تینوں صوبے سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل جائیں گے، یونان والوں کے اصرار پر اس نے ایک بحری جنگی بیڑا الکسیز اورلوف (Alexisorloff) کی سرکردگی میں روانہ کیا جو فروری ۱۷۷۰ء میں ساحل موریا کے سامنے نمودار ہوا، باغیوں نے روسی فوج کا پرجوش استقبال کیا اور اس علاقہ کے ترک باشندوں پر جن کی تعداد نسبتہً بہت کم تھی، شدید ترین مظالم توڑے[1]، محسن زادہ پاشا سابق صدر اعظم موریا کا حاکم تھا، اس نے نہایت استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر یونانی باغیوں اور ان کے روسی حلیفوں کو میدان جنگ میں شکست دی، روسی دستہ شکست کھا کر اپنے جہازوں پر بھاگا اور فوراً لنگر اٹھا کر یونانیوں کو خیرباد کہتا ہوا روانہ ہو گیا، واپسی میں جزائر موڈن وکورن پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، ۷؍جولائی ۱۷۷۰ء کو جزیرہ سیوس (Seios) کے قریب ایک عثمانی بیڑہ سے مقابلہ ہوا، ترکوں کو شکست ہوئی لیکن اس جنگ میں عثمانی بیڑے کے ایک افسر حسن الجزائری نے اپنی حیرت انگیز شجاعت کا لوہا غنیم سے بھی منوا لیا، اس نے اپنا جہاز روسی امیر البحر کے جہاز کے قریب لے جا کر گولہ باری شروع کر دی اور دشمن سے گھرے ہونے کے باوجود کمال بےخوفی کے ساتھ لڑتا رہا، یہاں تک کہ دونوں جہازوں میں آگ لگ گئی۔

عثمانی جہازوں کی بربادی عثمانی بیڑہ شکست کے بعد شسمہ (Tehesma) کی چھوٹی سی بندرگاہ میں پناہ گزیں ہوا، جہاں روسی امیر البحر الفنسٹن (Elphinstone) نے اس کا محاصرہ کر لیا، الفنسٹن ایک انگریز افسر تھا جس کی خدمات روس نے حاصل کر لی تھیں، اس کے علاوہ اور بھی متعدد انگریز روسی بیڑہ کے ذمہ دار عہدوں پر مامور تھے، ان ہی میں سے ایک نے جس کا نام ڈگڈیل (Dugdale) تھا، الفنسٹن اور ایک دوسرے انگریز افسر گریگ (Gregg) کے مشورہ سے عثمانی بیڑہ کو برباد کر دینے کی ایک نہایت خطرناک تدبیر اختیار کی، وہ اپنے جہاز کو لے کر شسمہ کی بندرگاہ میں داخل ہوا، جہاں عثمانی جہاز ایک دوسرے سے

---

[1] ایورسلے، ص ۲۱۴۔

ملے ہوئے محصور کھڑے تھے اور جب ان کے قریب پہنچ گیا تو ایک جہاز میں آگ لگا دی، آگ لگنے سے قبل ہی اس جہاز کے تمام روسی سپاہی اپنی جان بچانے کے لیے پانی میں کود پڑے تھے اور اس کو تنہا چھوڑ دیا تھا لیکن ڈگڈیل نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر عثمانی بیڑہ کے ایک جہاز میں آگ لگا دی، یہ آگ فوراً ہی دوسرے جہازوں تک پھیل گئی اور چوں کہ بندرگاہ کے تنگ ہونے کی وجہ سے تمام جہاز پاس ہی پاس کھڑے ہوئے تھے، اس لیے پورا بیڑا دیکھتے ہی دیکھتے جل کر برباد ہوگیا، صرف ایک جہاز باقی رہ گیا جسے روسیوں نے گرفتار کرلیا اور پھر شسمہ کے شہر، قلعہ اور توپ خانہ پر بھی انہوں نے قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد الفنسٹن نے چاہا کہ روسی بیڑہ کے ساتھ فوراً دردانیال کو روانہ ہوجائے اور بحر مارمورا میں داخل ہوکر قسطنطنیہ پر گولہ باری شروع کردے لیکن اورلوف نے اس تجویز پر عمل کرنے میں پس وپیش اور تاخیر کی، ترکوں نے اس کی اطلاع پاتے ہی دردانیال کے دونوں ساحلوں پر دو دو توپ خانے آمنے سامنے نصب کردیے اور اس مورچہ بندی کے بعد روسی جہازوں کے لیے دردانیال میں داخل ہونا ناممکن ہوگیا۔

حسن کی حیرت انگیز کامیابی ادھر سے مایوس ہوکر اورلوف روسی بیڑہ کے ساتھ جزائر لمنوس پہنچا اور وہاں اپنی فوجیں اتار کر جزیرہ کے خاص قلعہ کا محاصرہ کرلیا، دو ماہ کے محاصرہ کے بعد قلعہ کے ترکی دستہ نے بعض شرائط پر ہتھیار ڈال دینا منظور کیا لیکن اسی درمیان میں حسن الجزائری نے باب عالی سے اس بات کی اجازت حاصل کرلی کہ قسطنطنیہ کے چار ہزار اوباشوں کی ایک فوج مرتب کرکے لمنوس کو روسی پنجہ سے چھڑا لینے کی کوشش کرے، جب اس سے کہا گیا کہ ایسی فوج سے یہ مہم سر نہ ہوسکے گی تو اس نے جواب دیا کہ اگر حملہ ناکام رہا تو بھی اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ دارالسلطنت کے بدمعاشوں میں چار ہزار کی کمی ہوجائے گی، چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۷۷۰ء کو علی الصباح اس عجیب وغریب فوج کے ساتھ لمنوس کے مشرقی

ساحل پر اتر کر اس نے محاصرہ کرنے والوں پر اچانک حملہ کر دیا، روسیوں کا اکثر حصہ قتل ہو گیا، بقیہ اپنی جان لے کر بھاگا اور جہازوں پر سوار ہو کر فوراً روانہ ہو گیا، اس مہم کی حیرت انگیز کامیابی کے بعد سلطان نے حسن کو عثمانی بحریہ کا قبودان پاشا مقرر کیا، حسن نے ایک تازہ بیڑا مرتب کر کے چند ہی روز کے بعد بندر مونڈریسو (Mondreso) کے قریب روسی بیڑہ کو پھر شکست دی، اورلوف کو مجبوراً اپنے جہاز لے کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔

علی بیگ کی بغاوت اس وقت مصر اور شام میں بغاوت برپا تھی، اورلوف نے باغی مملوکوں کے سردار علی بیگ کی مدد کے لیے چار ہزار روسی فوجی سپاہی شام میں اتارے، عکہ کے عامل شیخ طاہر نے بھی علی بیگ کا ساتھ دیا، چنانچہ شیخ طاہر اور روسی فوج کی مدد سے اس نے غزہ، بیت المقدس، یافا اور دمشق وغیرہ شام کے متعدد بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا، وہ چاہتا تھا کہ اس کے بعد اناطولیہ پر حملہ آور ہو لیکن مصر کے ایک مملوک امیر ابو ذہب نے جو علی بیگ کا عزیز تھا، خود اس کے خلاف بغاوت کر دی جس کے مقابلہ کے لیے علی بیگ کو مصر واپس جانا پڑا، علی بیگ کو شکست ہوئی اور وہ مع اپنے چار سو روسی مددگاروں کے ساتھ مارا گیا، ابو ذہب نے علی بیگ اور روسی امراء کے سر کاٹ کر قسطنطنیہ بھیج دیے۔

ترکوں کی مسلسل شکست اس درمیان میں دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں میں روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور عثمانی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں، ۱۷۷۰ء میں روسی سپہ سالار رومانزوف نے تمام مولڈیویا کو تاراج کر ڈالا، صدر اعظم خلیل پاشا تیس ہزار عثمانی سپاہ اور تاتاریوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مقابلہ کے لیے آگے بڑھا، کرتال کے مقام پر دونوں فوجیں مقابل ہوئیں، میدان روسیوں کے ہاتھ رہا اور ترک اپنی توپیں اور بہت کچھ سامان چھوڑ کر منتشر ہو گئے، ۱۷۷۰ء کے آخر تک دریائے ڈینوب کے شمال میں عثمانی قلعے تھے، سب پر روس کا قبضہ ہو گیا، صدر اعظم کی فوج میں صرف دو ہزار سپاہی باقی رہ گئے، آئندہ سال (۱۷۷۱ء) عثمانی اقتدار کے لیے اور زیادہ برباد کن ثابت

ہوا، شہزادہ ڈول گوروکی (Dolgoruki) اسّی ہزار روسی اور ساٹھ ہزار تاتاری سپاہ کے ساتھ، جو کیتھرائن کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، کریمیا پر حملہ آور ہوا، سلیم گرائی خان کریمیا نے شروع میں تو مقابلہ کیا لیکن جلد ہمت ہار گیا اور ملک کو روسیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر قسطنطنیہ روانہ ہو گیا، اس کے یوں بھاگ کھڑے ہونے سے تاتاریوں کی ہمت چھوٹ گئی اور بہتوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر اناطولیہ میں پناہ لی، جو باقی رہ گئے، انہوں نے روسی فاتحوں سے صلح کر لینی چاہی، ڈول گورکی نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا اور وعدہ کیا کہ زارنیہ کی زیر سیادت اہل کریمیا کی آزادی برقرار رکھی جائے گی اور کریمیا کے شاہی خاندان کا ایک رکن وہاں کا فرماں روا مقرر کر دیا جائے گا، اس وعدہ کی بنا پر تاتاریوں نے زارنیہ کی وفاداری کا حلف لیا اور اپنے اڑتالیس نمائندوں کو سلیم گرائی کے دولڑکوں کے ساتھ کیتھرائن کے دربار میں سینٹ پیٹرس برگ روانہ کیا، اس کے بعد کافہ، کرش اور ینی قلعہ کے قلعوں نے اپنے دروازے روسیوں کے لیے کھول دیے، کریمیا میں جو ترکی دستہ متعین تھا، اس نے روسی فوج کا مقابلہ کیا لیکن اس کی تعداد غنیم کے مقابلہ میں اس قدر کم تھی کہ مقاومت بے سود ثابت ہوئی اور شکست کے بعد ترکی سر عسکر گرفتار ہو کر سینٹ پیٹرس برگ بھیج دیا گیا، سارے کریمیا پر روس کا تسلط قائم ہو گیا، اسی سال روسی فوجوں نے یکے بعد دیگرے ولاچیا اور مولڈیویا پر بھی قبضہ کر لیا اور خوزیم اور ریاسی کے اہم قلعے بھی فتح کر لیے، البتہ اوکزاکوف اور کلبرن کی مدافعت میں عثمانی فوجیں کامیاب رہیں اور محسن زادہ پاشا نے روسیوں کو شکست دے کر گرجیوو (Giurgevo) کے قلعہ پر جو دریائے ڈینوب کے ساحل پر واقع تھا، دوبارہ قبضہ کر لیا مگر جارجیا اور منگریلیا سے ترکوں کو پسپا ہونا پڑا۔

یورپ کی خدائی روسی فوجوں کی ان فتوحات سے اب آسٹریا اور پرشا کی حکومتیں متردد نظر آنے لگیں، کیوں کہ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت خود ان کے لیے خطرناک ہو رہی تھی، چنانچہ دونوں نے کوشش شروع کی کہ کسی طرح دولت عثمانیہ اور روس میں صلح ہو جائے، اس

جنگ میں یورپین حکومتوں کی سیاست مکر وفریب کا ایسا نمونہ تھی، جس کی مثال صرف یورپ ہی کی تاریخ میں مل سکتی ہے، اس اجمال کی تفصیل کے لیے سطور ذیل ملاحظہ ہوں۔

فرانس حکومت فرانس دولت عثمانیہ کی دوست اور روس کی دشمن تھی، اس کی خارجی سیاست کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ دولت علیہ سے مل کر روس کے دائرہ اقتدار کو بڑھنے سے روکے، خصوصاً پولینڈ کو اس کی زد سے محفوظ رکھے لیکن اس کے باوجود وہ روس سے ترکوں کی حمایت میں جنگ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، برخلاف اس کے اس کی پالیسی یہ تھی کہ جنگ سے علاحدہ رہ کر سلطنت عثمانیہ اور روس کو باہم لڑا دے، تاکہ دونوں ایک ہی وقت میں کم زور ہو جائیں، فرانس کے وزیر اعظم شوازیل (Choiseul) نے دسمبر ۱۷۶۹ء میں ایک خط پرنس کونٹز (Kunitz) وزیر اعظم آسٹریا کو اس مضمون کا لکھا کہ ترکی اور روس کی جنگ جتنے ہی عرصہ تک قائم رہے، فرانس اور آسٹریا کے اتحاد کے لیے مفید ہے، کیوں کہ اس صورت میں دونوں حریف یکساں طور پر کم زور ہو جائیں گے اور اگر زمانہ نے مساعدت کی تو اس سے ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوں گے[1]، نہ صرف یہ کہ اس جنگ کے جاری رکھنے میں حکومت فرانس اپنا فائدہ دیکھ رہی تھی بلکہ روس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لیے باب عالی کو اپنی ترغیبوں سے مجبور بھی اسی نے کیا، چنانچہ جب کیتھرائن کے ایجنٹ یونان، کریٹ، بوسنیا اور مونٹی نگرو میں پہنچ کر عیسائی رعایا کو دولت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے لگے تو فرانس کے سفیر ورجنیز (Vergennes) نے اس بات پر زور دیا کہ روس کی ان کارروائیوں کا جواب دیا جائے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد جب اہل پولینڈ کی ایک جماعت روس کے مظالم سے تنگ آکر سلطنت عثمانیہ کی سرحد میں پناہ گزیں ہوئی اور روسی دستوں نے وہاں اس کا تعاقب کیا تو باب عالی کو اعلان جنگ پر آمادہ کرنے میں زیادہ دخل سفیر فرانس ہی کے مشورہ کو تھا، حکومت فرانس کے نزدیک یہ جنگ اتنی اہم اور ضروری تھی کہ اس نے اپنے سفیر کو اس عظیم الشان خدمت کے

---

[1] المسئلۃ الشرقیۃ از مصطفیٰ کامل پاشا، مطبوعہ مصر، حصہ اول، صفحہ ۴۰-۳۹۔

صلہ میں تین ملین کی گراں قدر رقم پیش کی تھی، مگر ورجنیز نے اس رقم کو واپس کر دیا اور لکھا کہ اعلان جنگ ہوگیا ہے، میں نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کی، تین ملین کی رقم جو میرے کام کے لیے بھیجی گئی ہے واپس کرتا ہوں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے[1]۔

انگلستان فرانس کی دشمنی تو چھپی ہوئی تھی لیکن انگلستان کا طرزِ عمل واضح طور پر مخالفانہ تھا، گو بظاہر وہ بھی اپنے کو دولت عثمانیہ کی حیثیت سے پیش کر رہا تھا، چنانچہ جیسا کہ مصطفیٰ کامل پاشا نے لکھا ہے، اٹھارہویں صدی میں انگلستان کی سیاست دولت عثمانیہ کی نسبت دو رخی تھی، ایک طرف تو وہ روسیوں کو جنگ میں پوری مدد دے رہا تھا اور دوسری طرف دولت عثمانیہ کی دوستی کا دم بھر رہا تھا، تاکہ اس کے رازوں سے واقف ہو کر حکومت روس کو باخبر کرتا رہے، انگلستان کی اس پالیسی کے مختلف اسباب تھے، چند ہی سال قبل انگلستان نے فرانس کو شکست دے کر ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، جس کی وجہ سے فرانس اس کا سب سے بڑا دشمن تھا اور چوں کہ فرانس دولت عثمانیہ کا حلیف تھا، اس لیے قدرتاً انگلستان روس کی جانب مائل ہوا، روس اور انگلستان کے اتحاد میں اس وجہ سے بھی سہولت ہوئی کہ ابھی تک روس کی توجہ ہندوستان کی جانب مبذول نہیں ہوئی تھی اور انگلستان کو روس کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا تھا، علاوہ بریں ان دونوں سلطنتوں میں تجارتی تعلقات بھی تھے، روس کی درآمد تمام تر انگلستان سے ہوتی تھی، اگر انگلستان روس کا ساتھ نہ دیتا تو ان تجارتی تعلقات کا منقطع ہو جانا یقینی تھا لیکن چوں کہ اسی زمانہ میں انگلستان اپنی سلطنت کے اندرونی خلفشار میں مبتلا تھا، یعنی ایک طرف امریکہ کے نوآبادکار آزادی اور خود مختار حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم کرنے کی جدوجہد جاری تھی، اس لیے روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ میں وہ کوئی نمایاں حصہ نہ لے سکا، تاہم اس کے متعدد جنگی جہاز روسی بیڑہ میں شامل تھے اور بہت سے انگریز افسر روسی جہازوں اور فوجوں میں کام

[1] میریٹ، ص ۱۴۷۔

کررہے تھے، پھر بھی جیسا کہ اوپر بیان ہوا وہ دولت علیہ کی دوستی کے پردہ میں روس کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا اور اعلانیہ دشمنی کو اپنے مقصد کے خلاف سمجھتا تھا، اس لیے اس نے ۱۷۷۰ء میں باب عالی کے سامنے اپنی خدمات روس سے صلح کرانے کے لیے پیش کیں، اس کے جواب میں باب عالی نے سفیر برطانیہ کو یہ لکھا کہ "یہ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ انگلستان اپنی وساطت سے صلح کرانے کی تجویز پیش کررہا ہے، حالاں کہ اس کے جہاز روسی بیڑہ میں شامل ہو کر ہم سے جنگ کررہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ اس کی یہ تجویز صرف روس کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے ہے، پس انگلستان کو چاہیے کہ اپنی پالیسی صاف طور پر ظاہر کردے تاکہ باب عالی کو معلوم ہو جائے کہ وہ کس کے ساتھ ہے[1]" اس جواب کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کو معلوم ہو گیا کہ باب عالی اس کی دورخی پالیسی سے واقف ہے، چنانچہ اس نے شرمندہ ہو کر اپنے جہاز اور افسر روس سے واپس بلالیے لیکن یہ اس وقت ہوا جب لڑائی قریب ختم کے تھی، پھر بھی انگلستان روس کے ساتھ حق دوستی کچھ نہ کچھ ادا کرتا رہا، چنانچہ جب باب عالی نے پرشا اور آسٹریا سے یہ خواہش کی کہ وہ درمیان میں پڑکر صلح کرادیں تو برطانوی سفیر نے ایک جاسوس کی طرح اس کی اطلاع حکومت روس کو دے دی تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں، کیتھرائن کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے جنرل رومانزوف کو ہدایت کی کہ وہ صدر اعظم کو لکھے کہ روس باب عالی کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنے کے لیے تیار ہے، بشرطیکہ سفیر روس اوبرسکوف جو اعلان جنگ کے وقت قسطنطنیہ میں قید کرلیا گیا تھا، آزاد کردیا جائے اور پرشا اور آسٹریا کو صلح کے مقابلہ میں نہ پڑنے دیا جائے کیوں کہ ایسی صورت میں فرانس بھی دخل دے گا اور اس کی مداخلت زارینہ کو قطعاً منظور نہیں ہے، روس کے ساتھ انگلستان کی شرکت کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ دوران جنگ میں جب فرانسیسی وزیراعظم شوازیل نے اپنی مجلس میں یہ تجویز پیش کی کہ روسی بیڑوں پر ضرب لگائی جائے تو قبل اس

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا، ص ۴۸۔

کے کہ خود فرانس کی مجلس میں یہ تجویز منظور کر دی جائے، برطانوی وزارت نے یہ اعلان کیا کہ روس کے خلاف ہر کارروائی انگلستان کی اہانت اور دشمنی تصور کی جائے گی[1]، اسی کے ساتھ حکومت فرانس کا بھی اس تجویز کو نامنظور کر دینا یہ واضح کر دیتا ہے کہ دولت عثمانیہ کے ساتھ اس کی دوستی کی حقیقت کیا تھی۔

پرشا فریڈرک اعظم بھی روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، مگر اس طرح کہ دولت عثمانیہ کو نقصان نہ پہنچنے پائے اور وہ روس سے جنگ کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا بلکہ اس کا حلیف ہونے میں اپنا فائدہ دیکھ رہا تھا، اس کی خارجی سیاست کے دو اہم جزو تھے، پولینڈ کی تقسیم اور سلطنت عثمانیہ کی بقاء، پولینڈ کی سرحد مملکت پرشا سے ملی ہوئی تھی، اور پرشا کو اپنے حدود کی توسیع کا موقع صرف پولینڈ ہی میں حاصل تھا جس پر روس کے فریب واستبداد کا تسلط قائم تھا، گو حکومت بظاہر حکومت پولینڈ کے ہاتھ میں تھی، فرانس پولینڈ کی تقسیم کا سخت مخالف تھا اور چوں کہ آسٹریا فرانس کا حلیف تھا، اس لیے فریڈرک کے لیے ضروری تھا کہ تقسیم پولینڈ کا لالچ دے کر آسٹریا کو فرانس کی دوستی سے علاحدہ کرے، آسٹریا اور روس کی شرکت کے بغیر فریڈرک کے لیے اپنا مقصد حاصل کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ جب روس اور دولت عثمانیہ کی جنگ شروع ہوئی تو فریڈرک نے اس بات کی کوشش کی کہ آسٹریا کو فرانس کے اتحاد سے علاحدہ کر کے پرشا، روس اور آسٹریا کا ایک اتحاد ثلاثہ پولینڈ کی تقسیم کے لیے قائم کرے لیکن جب فریڈرک کے سفیر نے روسی وزیر اعظم سے اس مسئلہ میں گفتگو کی تو مؤخر الذکر نے یہ جواب دیا کہ اتحاد ثلاثہ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کی تقسیم بھی ہونا چاہیے، فریڈرک اس کے لیے راضی نہ تھا، بظاہر تو اس میں پرشا کا فائدہ تھا لیکن جیسا کہ مصطفیٰ کامل پاشا فرماتے ہیں فریڈرک پرشا کا حقیقی فائدہ دولت عثمانیہ کی بقا اور استقلال میں دیکھتا تھا، وہ اپنی بصیرت سے یہ دیکھ رہا تھا کہ پرشا اور روس کی دوستی ایک روز ختم ہو جائے گی اور اس

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا، ص ۴۷ و میریٹ، ص ۱۴۹۔

وقت سلطنت عثمانیہ کا قیام بطور ایک قلعہ اور چٹان کے ہوگا، جو روس کو آگے بڑھنے سے روکے گی اور جس کی قوت پر پرشا اعتماد کرے گا، بہر حال حکومت روس کے اس جواب کے باوجود فریڈرک نے تقسیم پولینڈ کی تجویز ترک نہ کی، بلکہ اس مقصد کے لیے اس نے آسٹریا سے ایک مخفی اتحاد کرنا چاہا، اخفا کا اہتمام صرف اس غرض سے کیا گیا کہ حکومت روس کو تشویش پیدا ہو جائے اور وہ پرشا کے ساتھ اتحاد کرنے کی ضرورت محسوس کرے، چنانچہ شہر نیس میں فریڈرک نے میریا تھریسیا اور اس کے لڑکے جوزف ثانی سے جو انتظام سلطنت میں اب اپنی ماں کا شریک تھا، ملاقات کی اور اگست ۱۷۶۹ء میں آسٹریا اور پرشا کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہوگیا، روس چوں کہ اس معاہدہ کے مضمون سے ناواقف تھا، اس لیے اس کو یہ خطرہ ہوا کہ اس معاہدہ میں مسئلۂ شرقیہ کا فیصلہ اس کے مفاد کے خلاف کیا گیا ہے، چنانچہ جیسا کہ فریڈرک نے پیش بینی کی تھی، روس کو بھی پرشا کے ساتھ اتحاد کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور ۱۲/ اکتوبر ۱۷۶۹ء کو اس نے ۱۷۶۴ء کے معاہدہ کی تجدید کر دی جس کے رو سے روس اور پرشا آٹھ سال کے لیے حلیف بن گئے تھے، فریڈرک کی خواہش پر اس تازہ معاہدہ کی مدت ۱۷۸۰ء تک بڑھا دی گئی۔

اس کے بعد فریڈرک نے یہ چاہا کہ روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان صلح کرا دے، باب عالی کی طرف سے بھی صلح کے لیے پرشا اور آسٹریا کی وساطت کی خواہش کی گئی لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا سفیر انگلستان نے باب عالی کی اس خواہش کی اطلاع حکومت روس کو کر دی اور کیتھرائن نے پرشا اور آسٹریا کی وساطت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اسی اثنا میں روسی فوجیں بندر اور اکرمان وغیرہ پر قابض ہوگئیں اور ان فتوحات سے روس کے حوصلے بہت بڑھ گئے، چنانچہ جب فریڈرک نے دولت عثمانیہ اور روس میں صلح کرانے کے لیے کیتھرائن سے اصرار شروع کیا تو اس نے ۲۰/ ستمبر ۱۷۷۰ء کو فریڈرک کو ایک خط لکھا جس میں صلح کے شرائط حسب ذیل قرار دیے۔

ازف اور کاباردا پر روس کا قبضہ تسلیم کرلیا جائے اور ولاچیا اور مولڈیویا کی حکومتیں دولت عثمانیہ کی فرماں روائی سے آزاد کردی جائیں یا یہ دونوں صوبے تاوان جنگ کے طور پر چوتھائی صدی کے لیے روس کو دے دیے جائیں، بسرابیا اور کریمیا کے تاتاریوں کی خود مختاری تسلیم کرلی جائے، بحر اسود میں روسی جہازوں کو آزادی حاصل ہو، یونانی مجمع الجزائر میں سے ایک جزیرہ روس کو دے دیا جائے اور ان تمام یونانیوں کے لیے جنھوں نے دوران جنگ میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی تھی، عام معافی کا اعلان کردیا جائے[1]۔

مذکورہ بالا شرائط معلوم کرنے کے بعد فریڈرک نے اپنے بھائی پرنس ہنری کو جو سینٹ پیٹرس برگ میں مقیم تھا، ۳؍جنوری ۱۷۷۱ء کو یہ لکھا کہ ''روس کے شرائط صلح نے مجھے حیرت زدہ کردیا ہے اور میں انہیں ترکوں اور اہل آسٹریا کے سامنے پیش کرنے سے معذور ہوں، کیوں کہ وہ قطعاً ناقابل قبول ہیں'' پھر ۵؍جنوری ۱۷۷۱ء کو اس نے خود کیتھرائن کو بھی ایک خط لکھا کہ اگر وہ آسٹریا کے ساتھ جنگ کرنے سے بچنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ازف اور گاربادا کے لینے اور بحر اسود میں جہاز رانی کی آزادی حاصل کرنے پر قناعت کرے، فریڈرک خوب جانتا تھا کہ ولاچیا اور مولڈیویا پر روس کا قبضہ آسٹریا کو کسی طرح گوارا نہ ہوگا، کیوں کہ ان ہی صوبوں پر خود آسٹریا کی نظریں بھی لگی ہوئی تھیں۔

آسٹریا اس جنگ میں حکومت آسٹریا کی پالیسی سب سے زیادہ پرفریب تھی، وہ روس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہوکر دولت عثمانیہ سے اتحاد بھی کرنا چاہتی تھی اور اس اتحاد سے فائدہ اٹھا کر سلطنت عثمانیہ کے بعض علاقوں پر قبضہ بھی کرلینا چاہتی تھی، چنانچہ وہ کبھی دولت علیہ کی طرف مائل ہوتی اور کبھی روس کی طرف، علاوہ بریں وہ دولت علیہ کو فرانس کے اتحاد سے جو خود اس کا حلیف بھی تھا، علاحدہ کردینا چاہتی تھی کیوں کہ اس اتحاد کی صورت میں وہ باب عالی کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی، فرانس اس وقت مالی معاوضہ میں دولت عثمانیہ کی مدد اپنے

[1] مصطفیٰ کامل پاشا، ص ۵۰-۴۹۔

جہازوں سے کرنے پر آمادہ تھا لیکن آسٹریا کے سفیر مقیم قسطنطنیہ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور عثمانی وزراء کو سمجھایا کہ خشکی کی لڑائی میں بحری بیڑے مفید نہ ہوں گے اور یہ کہ فرانس کا مقصد دراصل دولت علیہ کی مدد کرنا نہیں ہے بلکہ روس کی دشمنی میں وہ ایک طویل مدت تک جنگ کو جاری رکھنا چاہتا ہے، عثمانی وزراء نے اس رائے کی صحت کو تسلیم کر کے فرانس کی تجویز نامنظور کر دی، آسٹریا کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں روس کا تسلط کریمیا پر ہو گیا، جس کی وجہ سے باب عالی کو آسٹریا کے ساتھ اتحاد کرنا بہت غنیمت معلوم ہوا اور اس نے عجلت سے کام لیا، چنانچہ ٦/ جولائی ۱۷۷۲ء کو دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا، جس کے شرائط حسب ذیل تھے:

۱- روس کے مقابلہ میں آسٹریا دولت عثمانیہ کی مدد کرے گا۔

۲- سلطنت عثمانیہ کا کوئی حصہ آسٹریا علاحدہ نہ ہونے دے گا۔

۳- دولت عثمانیہ کی عزت کے خیال سے آسٹریا پولینڈ کے استقلال کی حفاظت کرے گا۔

۴- اس کے معاوضہ میں دولت عثمانیہ نے عہد کیا کہ وہ ایک کروڑ تیرہ لاکھ پچاس ہزار فلورن کی رقم آسٹریا کو ادا کرے گی۔

۵- نیز ولاچیا کو چک کا علاقہ آسٹریا کے حوالہ کر دے گی اور

٦- سلطنت عثمانیہ میں آسٹریا کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے ہر طرح سے مدد کرے گی۔

اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ فریقین اسے مخفی رکھیں گے، خصوصاً فرانس سے جو اس وقت آسٹریا کا حلیف تھا۔

سفیر آسٹریا نے جب اس معاہدہ کی نقل اپنی حکومت کے پاس دستخط کے لیے بھیجا تو کونتز دولت عثمانیہ کی طرف سے مطمئن ہو گیا اور اب اسے روس کو دھمکی دینے کا ایک اچھا

آلہ ہاتھ آ گیا، اس کا مقصد روس پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے علاقوں پر قبضہ کرنا آسٹریا کو شریک کیے بغیر آسان نہ ہوگا، کونتز اس میں کام یاب رہا، کیتھرائن نے اپنے ایک خاص سفیر کو سلطنت عثمانیہ کی تقسیم سے متعلق مندرجہ ذیل تین تجویزیں لے کر حکومت آسٹریا کے پاس بھیجا۔

۱- سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا، البانیا اور مقدونیا پر آسٹریا قبضہ کر لے اور سلطنت عثمانیہ کے بقیہ حصے مع قسطنطنیہ کے روس کے لیے چھوڑ دے۔

۲- ولاچیا، سرویا، بلغاریا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا لے لے اور مقدونیا، البانیا، رومانیا، اکثر جزائر یونان، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ روس کو دے دے، کریمیا اور موریا خودمختار حکومتیں کر دی جائیں۔

۳- ترکوں کو دریائے ڈینوب کے شمالی علاقوں پر باقی رکھا جائے، سرویا، بوسنیا اور ہرزیگووینا کے صوبے آسٹریا کو دے دیے جائیں، بحر اسود کے ساحلی علاقوں پر روس کا قبضہ ہو جائے اور تاتاری صوبے آزاد رہیں[1]۔

روسی سفیر نے تقسیم پولینڈ سے متعلق بھی بعض تجویزیں پیش کیں، حکومت آسٹریا نے باوجود اس معاہدہ کے جو اس نے ابھی حال میں باب عالی سے کیا تھا اور جس نے سلطنت عثمانیہ کے تحفظ و استقلال کا ذمہ لیا تھا، نیز پولینڈ کی تقسیم کے روکنے کا عہد کیا تھا، روس کے پیش کردہ شرائط پر گفتگو شروع کر دی، برخلاف اس کے باب عالی نے جو معاہدہ آسٹریا سے کیا تھا، اس پر وہ دیانت داری کے ساتھ قائم رہا اور ۲۵ رجولائی ۱۷۷۱ء کو اس رقم کی ایک قسط جس کی ادائیگی معاہدۂ مذکور میں اس نے اپنے ذمہ لی تھی، حکومت آسٹریا کے پاس روانہ کر دی، حکومت آسٹریا نے اس رقم کو تو لے لیا مگر باب عالی کے تقاضوں کے باوجود معاہدہ پر دستخط کرنے سے گریز کرتی رہی، کونتز چاہتا تھا کہ روس کے ساتھ ایک ایسا

---

[1] مصطفیٰ کامل پاشا، ص ۵۶-۵۵۔

معاہدہ ہو جائے جس سے آسٹریا کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچے، جتنا دولت عثمانیہ سے اتحاد کرنے میں پہنچتا تھا، اس کو یہ بھی خوف تھا کہ اگر وہ ترکوں کے ساتھ اتحاد کرلے گا تو روس اور پرشا پولینڈ کو باہم تقسیم کرلیں گے اور اسے کچھ نہ دیں گے، بہرحال جب باب عالی کی طرف سے اس معاہدہ پر دستخط کرنے کا اصرار ہوا تو کونتز نے ۴ر اکتوبر ۱۷۷۱ء کو ایک مخلصانہ تحریر باب عالی میں بھیجی اور اسے اطمینان دلایا کہ حکومت آسٹریا اپنے معاہدہ پر وفاداری کے ساتھ قائم ہے لیکن معاہدہ پر دستخط کرنا اب بھی ٹال گیا۔

اسی اثنا میں برطانوی سفیر مقیم قسطنطنیہ کو اس خفیہ معاہدہ کی نقل ہاتھ آگئی، اس نے اس کی ایک نقل فریڈرک اعظم اور کیتھرائن کے پاس بھیج دی، فریڈرک نے اپنے سفیر کو ہدایت کی کہ باب عالی کو حکومت آسٹریا کی خود غرضیوں سے متنبہ کردے اور یہ ظاہر کردے کہ وہ دولت عثمانیہ کو کس قدر نقصان پہنچانا چاہتی ہے، اس نے اپنے سفیر مقیم پیرس کو بھی لکھا کہ وزارت فرانس کے سامنے یہ تجویز پیش کرے کہ روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان صلح کرانے کے لیے ایک کانفرنس قسطنطنیہ میں منعقد کی جائے، فریڈرک کا مقصد یہ تھا کہ آسٹریا نے دولت علیہ اور فرانس کے ساتھ جو غداری کی ہے، وہ یورپین سلطنتوں کے سامنے کھل جائے، مگر وزارت فرانس اس کانفرنس کی تحریک کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئی۔

اس درمیان میں جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور روسی فوجوں میں فتوحات کے باوجود کمزوری کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، خصوصاً پولینڈ میں یہ آثار زیادہ نمایاں تھے، روس کی مالی حالت بھی روز بہ روز زیادہ خراب ہوتی جارہی تھی، ان حالات کو دیکھتے ہوئے کیتھرائن اب جنگ کو ختم کرنے پر مائل ہوئی، چنانچہ اس نے ۲ر دسمبر ۱۷۷۱ء کو فریڈرک کے پاس ایک خط بھیجا جس میں یہ لکھا کہ حکومت روس مولڈیویا اور ولاچیا کے مطالبہ سے دست بردار ہوتی ہے لیکن اس کے معاوضہ میں یہ چاہتی ہے کہ دولت عثمانیہ بندر اور کرناکوف کے شہر اس کے حوالے کردے، اسی خط میں کیتھرائن نے تقسیم پولینڈ سے متعلق فریڈرک کی تجویز

بھی منظور کر لی، اس شرط کے ساتھ کہ اگر آسٹریا روس سے جنگ کرے تو فریڈرک روس کی مدد کے لیے بیس ہزار فوج ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں میں روانہ کرے۔

تقسیم پولینڈ اس مسئلہ میں فریڈرک اور کیتھرائن کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی، اس کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ پرشا اور روس پولینڈ کی تقسیم پر متحد ہو گئے، اس اتحاد کی وجہ سے آسٹریا کے سامنے صرف دو صورتیں رہ گئیں، یا تو وہ ان معاہدوں کو پورا کرے جو اس نے فرانس اور دولت عثمانیہ کے ساتھ کیے تھے اور پولینڈ کو تقسیم نہ ہونے دے یا پھر روس اور پرشا سے مل کر خود بھی پولینڈ کی تقسیم میں شریک ہو جائے اور فرانس اور دولت علیہ کے معاہدوں کی پرواہ نہ کرے، کونتز نے یورپین حکومتوں کے اس اصول کی بنا پر کہ سیاست میں عہد و پیمان کوئی چیز نہیں، دوسری صورت اختیار کی، چنانچہ ۲۸/جنوری ۱۷۷۲ء کو اس نے حکومت روس کو لکھا کہ آسٹریا نے تقسیم پولینڈ کی تجویز نیز سلطنت عثمانیہ سے متعلق کیتھرائن کے مطالبات کو منظور کر لیا ہے اور یہ توقع ظاہر کی ہے کہ پولینڈ کی طرح سلطنت عثمانیہ کی تقسیم بھی عمل میں آئے گی اور آسٹریا کو بھی اس تقسیم میں حصہ ملے گا، اپنی حکومت کی اس غداری پر خود میریا تھریسیا نے بھی نفرین کرتے ہوئے اقرار کیا کہ ''آسٹریا نے جو سیاست اختیار کی وہ شرافت، سلطنت کی عزت، عہد و پیمان اور عقیدہ کے بالکل مخالف تھی[1]۔'' بہر حال کونتز کی اس پالیسی کی وجہ سے تقسیم پولینڈ کی تجویز پر روس، پرشا اور آسٹریا کا اتفاق ہو گیا اور اس بدقسمت ملک کی جو پہلے ہی سے روس کے فریب اور دراندازیوں کا شکار اور اس کے پیدا کیے ہوئے فتنوں کی وجہ سے جماعتوں کے باہمی نزاعات میں مبتلا تھا، پہلی تقسیم ۱۷۷۲ء میں ہو گئی، باب عالی نے جب یہ دیکھا کہ حکومت آسٹریا اس کے ساتھ فریب کر رہی ہے تو اس نے معہودہ رقم کی آئندہ قسط نہیں بھیجی، کونتز نے اس چیز کو دولت عثمانیہ اور آسٹریا کے اتحاد کی شکست کا سبب قرار دیا، حالاں کہ جس معاہدہ کی بنا پر یہ اتحاد قائم ہوا تھا، اس پر کونتز نے آخر وقت تک دستخط

[1] مصطفیٰ کامل پاشا،ص ۶۰۔

نہیں کیے تھے اور نہ حکومت آسٹریا کی طرف سے معاہدہ کی کوئی شرط پوری کی گئی تھی، برخلاف اس کے باب عالی کو جس نے دیانت داری کے ساتھ رقم مذکور کی ایک قسط آسٹریا کو ادا کردی تھی اور آسٹریا نے اسے بلا تامل قبول بھی کرلیا تھا،، اسی معاہدہ کے فریب میں مبتلا رکھ کر کونٹز نے نہ صرف پولینڈ بلکہ سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے متعلق بھی کیتھرائن سے مراسلت شروع کردی تھی۔

صلح کانفرنسیں جب دولت عثمانیہ کو یہ معلوم ہوا کہ روس ولاچیا اور مولڈیویا کے صوبوں سے دست بردار ہو کر صلح کے لیے آمادہ ہے تو وہ بھی راضی ہوگئی اور دونوں حکومتوں کے نمائندے شرائط صلح طے کرنے کے لیے ۱۰ رجون ۱۷۷۲ء کو شہر تو کشانی میں جمع ہوئے، بیس روز کی گفت وشنید کے بعد تاتاریوں کی آزادی کے مسئلہ کے علاوہ اور تمام شرائط پورے ہوگئے، ترک نمائندے اس بات پر زور دے رہے تھے کہ تاتاریوں کا دولت عثمانیہ کے زیر اقتدار رہنا ضروری ہے، کیوں کہ سلطان کو بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین کے ان پر فرماں روائی کا حق حاصل ہے، حکومت روس نے اس مطالبہ کو منظور نہ کیا، چنانچہ اسی بات پر کانفرنس شکست ہوگئی، چند مہینوں کے بعد روس نے ایک دوسری کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی اور دولت علیہ نے اسے منظور کرلیا، چنانچہ یہ کانفرنس بخارسٹ میں منعقد ہوئی اور شرائط صلح پر مہینوں بحث ومباحثہ ہوتا رہا، اس کانفرنس میں روس اس بات پر راضی تھا کہ تاتاری کو دولت عثمانیہ کے زیر سیادت رہنے دیا جائے لیکن وہ کرش اور اینی قلعہ کو چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہ ہوا اور دولت علیہ ان دونوں قلعوں سے دست بردار ہونے پر راضی نہ ہوئی، بالآخر ۱۵ رفروری ۱۷۷۳ء کو روسی سفیر اوبرسکوف نے کیتھرائن کی طرف سے مندرجہ ذیل شرائط صلح باب عالی میں پیش کرکے الٹی میٹم دیا کہ اگر یہ شرائط قبول نہ کیے گئے تو جنگ ازسرنو شروع کردی جائے گی۔

۱- روس تاتاریوں کی آزادی کا محافظ قرار دیا جائے اور کرش اور ینی قلعہ کے

قلعوں پر روس کا قبضہ قائم رکھا جائے۔

۲- بحر اسود اور بحر الجین میں روس کے تجارتی اور جنگی جہازوں کو آمد ورفت کی پوری آزادی حاصل ہو۔

۳- مذکورہ بالا قلعوں کے علاوہ کریمیا کے تمام دوسرے قلعے تاتاریوں کو واپس کر دیے جائیں۔

۴- مولڈیویا کا امیر گریگوری غیکا (Gregory Ghika) جو اس وقت روسیوں کے قبضہ میں تھا، پھر مولڈیویا کا موروثی فرماں روا مقرر کر دیا جائے اور وہ ہر تین سال میں ایک بار اپنی ریاست کی ایک سال کی آمدنی بطور خراج باب عالی کو پیش کرتا رہے۔

۵- روس کا ایک مستقل نمائندہ قسطنطنیہ میں مقیم رہے۔

۶- کلبرن پورے مالکانہ حقوق کے ساتھ روس کو دے دیا جائے اور اوکزاکوف کا قلعہ مسمار کر دیا جائے۔

۷- باب عالی روس کے فرماں رواؤں کے لیے ''پادشا'' کا لقب نیز سلطنت عثمانیہ کے ان عیسائی باشندوں کی حمایت کا حق تسلیم کرے جو کلیسائے یونان سے تعلق رکھتے ہوں[1]۔

بخارسٹ کانفرنس کی ناکامی سلطان اور وزراءِ سلطنت صلح کے خواہاں تھے اور مذکورہ بالا شرائط میں سے دفعہ اول کے علاوہ ہر دفعہ منظور کر لینے پر آمادہ تھے، دفعہ اول میں بھی روس بالآخر اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ تاتاریوں پر دولت علیہ کی سیادت قائم رکھی جائے، البتہ وہ کرش اور ینی قلعہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوا اور یہی مسئلہ کانفرنس کی ناکامی کا سبب بن گیا، باب عالی نے صورت حال سے مجبور ہو کر اور تمام شرائط منظور کر لیے، مگر کرش اور ینی قلعہ سے دست بردار ہونا اسے کسی طرح منظور نہ تھا، جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مفتی اعظم اور سلطنت کے تمام علماء نے اس شرط کے قبول کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا، نیز دیوان

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۲۴۲۔

میں بھی اس کی مخالفت شدت سے کی گئی تھی، علماء کی مخالفت کے باوجود اس شرط کو قبول کر کے اگر صلح کر لی جاتی تو اس سے قسطنطنیہ میں بغاوت برپا ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا، چنانچہ کرش اور ینی قلعہ کے تنازعہ پر بخارسٹ کی صلح کانفرنس بھی شکست ہوگئی اور جنگ از سرنو شروع کر دی گئی۔

محسن زادہ پاشا نوکشانی اور بخارسٹ کانفرنسوں کے دوران قیام میں صلح کا جو وقفہ میسر آ گیا تھا، اس سے فائدہ اٹھا کر صدر اعظم محسن زادہ پاشا نے استحکام سلطنت کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، ۱۷۶۸ء میں جنگ شروع ہونے سے پیش تر بھی وہ صدر اعظم رہ چکا تھا لیکن چوں کہ اس نے سلطان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ پوری طرح تیار ہونے سے قبل جنگ شروع کر دینا دولت عثمانیہ کے لیے مضر ہوگا، اس لیے مصطفیٰ نے اسے صدارت کے عہدہ سے معزول کر دیا تھا، اس کے بعد وہ موریا کا سر عسکر مقرر ہوا اور وہاں اس نے روسیوں اور یونانیوں کو زبردست شکست دے کر موریا میں عثمانی تسلط کو از سرنو قائم کر دیا، اس شان دار کامیابی کے صلہ میں سلطان نے اسے صوبہ ودین کا سر عسکر مقرر کیا، جو شمال کا سرحدی صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا، وہاں بھی محسن زادہ پاشا کی لیاقت خاص طور پر نمایاں رہی، دوران جنگ میں سلطان مصطفیٰ کو احساس ہوا کہ محسن زادہ پاشا کو صدارت کے عہدہ سے معزول کرنے میں اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی، چنانچہ ۱۷۷۱ء کے آخر میں اس نے دوبارہ اس کو صدر اعظم مقرر کیا، محسن زادہ پاشا نے فوکشانی اور بخارسٹ کی کانفرنسوں میں صلح کے لیے انتہائی کوشش کی تھی لیکن پندرہ ماہ کی اس مغتنم فرصت میں جب کہ شرائط صلح پر گفتگو اور مراسلت ہوتی رہی، اس نے عثمانی فوجوں کی تنظیم و استحکام میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ہر ممکن ذریعہ سے ان کے اندر دشمن کے مقابلہ کے لیے ایک تازہ جوش پیدا کرنے کی کوشش کی، پیہم شکستوں نے فوج کے اخلاق بھی خراب کر دیے تھے، سپاہیوں میں ایک طرف تو لوٹ مار کی عادت پیدا ہو رہی تھی اور دوسری طرف

وہ دشمن کی قوت سے مرعوب ہونے لگے تھے، محسن زادہ پاشا نے لوٹ مار کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں اور جن افسروں نے دشمن کے مقابلہ میں بزدلی دکھا کر اپنی فوج کے سامنے ایک بری مثال قائم کی تھی، انہیں قتل کرا دیا، اس نے شکست خوردہ دستوں کو از سر نو منظّم کیا اور اہل بوسنیا اور سلطنت کے دوسرے جنگ جو قبائل سے تازہ فوجیں تیار کیں، اس نے دریائے ڈینوب کے ان قلعوں کو جو اس وقت تک ترکوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے، خصوصاً سلسٹر یا کو تازہ دستوں اور سامان رسد سے خوب مستحکم کر لیا اور شوملہ کو اپنا فوجی مستقر بنایا۔

معرکہ سلسٹر یا ۱۷۷۳ء کے موسم بہار میں جنگ پھر چھڑ گئی، روسی اور عثمانی فوجوں کے درمیان متعدد معرکے ہوئے جن میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے فریق کو فتح ہوئی لیکن ان فتوحات سے روس کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا، کیوں کہ سلسٹر یا، وارنا اور شوملہ کے مضبوط اور اہم قلعوں پر ترک ابھی تک بدستور قابض تھے، آخر کار جنرل رومانزوف نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے سلسٹر یا کا محاصرہ کر لیا، سلسٹر یا کے سر عسکر عثمان پاشا نے آگے بڑھ کر رومانزوف کو دریا عبور کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر جنرل وایسمین کے حملہ نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا اور اس کی فوج بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتی ہوئی سلسٹر یا میں واپس آ گئی، اس کے بعد رومانزوف نے شہر پر گولہ باری شروع کی، ستّر توپیں پیہم گولے برسا رہی تھیں، یہاں تک کہ دیواروں میں کئی جگہ رخنے پیدا ہو گئے اور روسی فوجیں شہر کے اندر داخل ہونے کے لیے پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئیں، چھ گھنٹہ تک نہایت سخت معرکہ رہا، ترک حیرت انگیز جاں بازی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن رومانزوف مسلسل تازہ دستے اپنی فوج کی مدد کے لیے بھیجتا جاتا تھا، آخر کار ترکوں کو پسپا ہونا پڑا اور روسی شہر کے اندر پہنچ گئے، مگر یہ کامیابی عارضی تھی، شہر کے اندر ترکوں نے عثمان پاشا کے زیر قیادت جس دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اس نے رومانزوف کی آنکھیں کھل گئیں، آبادی کے تمام

مرد دشمن کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے ہر ہر قدم پر روسیوں کو آگے بڑھنے سے روکا اور ایسی شدت سے لڑے کہ روسی بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہوئے، ان کے آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے اور ایک ہزار زخمی ہوئے، عثمان پاشا کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان نے اسے ''غازی'' کا لقب عطا کیا۔

روسی مظالم اس کے بعد روسیوں نے قرہ سو کے مقام پر عثمانی لشکر پر حملہ کیا اور اسے شکست دی، اس کامیابی سے ان کے حوصلے بڑھ گئے اور رومانزوف نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ وارنا کی طرف روانہ کیا اور دوسرا شوملہ کی طرف، شوملہ کے راستہ میں بازار جیک کا غیر محفوظ شہر پڑتا تھا، جس کا تقریباً پورا فوجی دستہ اور اکثر باشندے شہر خالی کر کے چلے گئے تھے، روسیوں نے اسے نہایت آسانی سے فتح کر لیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے ''فتح کی سہولت نے ان کو شہر کی باقی ماندہ آبادی کے ساتھ جو تقریباً تمام تر کمزور اور بوڑھے مردوں، بے کس عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھی، انتہائی وحشیانہ سلوک کرنے سے باز نہیں رکھا'' عورتیں، بوڑھے اور بچے سب کے سب دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کے مار ڈالے گئے۔

روس کی شکست لیکن روسیوں کو ان مظالم کی سزا بہت جلد مل گئی، جب شوملہ میں قرہ سو کی شکست اور بازار جیک کی تباہی کی اطلاع پہنچی تو صدر اعظم نے فوجی افسروں کی ایک مجلس منعقد کر کے مشورہ کیا، رئیس آفندی (وزیر خارجہ) عبدالرزاق نے اپنی خدمات پیش کیں، چنانچہ وہ واصف آفندی (ترک مؤرخ) مفتی فلپو پولیس اور صرف چار سو آدمیوں کے دستہ کے ساتھ جو تقریباً تمام تر اسی کے ملازم تھے، روسیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو گیا، راستہ میں اس نے عثمانی فوج کے منتشر دستوں کو جو شکست کے بعد گرد و نواح کے علاقوں میں پھیل گئے تھے، از سر نو جمع کیا اور انہیں لے کر ربیچہ کے مقام پر روسی فوج کے مقدمۃ الجیش کو شکست دی، اس کے بعد وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا دفعۃً بازار جیک کے روسی دستوں پر ٹوٹ پڑا، روسی اس اچانک حملہ سے ایسا بدحواس ہوئے کہ اپنا تمام سامان

چھوڑ کر بھاگے، یہاں تک کہ ترکوں نے علاوہ اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخیرہ کے بقول فان ہیمر چولہے پر چڑھی ہوئی گوشت کی دیگچیوں پر بھی قبضہ کرلیا[1]، اسی درمیان میں روسیوں کو وارنا میں بھی سخت شکست ہوئی، ان کے دو ہزار آدمی مارے گئے اور مال غنیمت میں دس توپیں اور سامان کی سو گاڑیاں ترکوں کے ہاتھ آئیں، وارنا کی جنگ اور بازارجیک پر دوبارہ قبضہ ۱۷۷۳ء کی مہم کے آخری معرکے تھے، اس مہم میں ترکوں کی کامیابی کا پلہ بہ نسبت روسیوں کے بہت بھاری تھا۔

وفات ۲۵؍دسمبر ۱۷۷۳ء کو سلطان مصطفیٰ ثالث کا انتقال ہوگیا۔

مصطفیٰ اپنے اکثر پیش رووں کی طرح ایک بلند علمی ذوق رکھتا تھا، اس نے بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں اور تعلیم کو ترقی دی، ملکی اصلاحات کی ضرورت وہ شدت سے محسوس کرتا تھا اور اس سلسلہ میں اس نے بعض اہم اصلاحات جاری کیں، مثلاً حرم کے اخراجات میں بہت کچھ تخفیف کردی، صیغہ اوقاف کا کام قزلراغاسی کے ہاتھ سے نکال کر صدر اعظم کے سپرد کردیا اور مالیات کی درستی کی کوشش کی لیکن جب سے روس کی جنگ کا سلسلہ شروع ہوا، مصطفیٰ کی ساری توجہ سلطنت کے تحفظ کی جانب مبذول رہی اور اندرونی اصلاحات کا کام ملتوی ہوگیا، پھر بھی اس کا یہ کارنامہ کم قابل قدر نہیں کہ اس نے بعض اصلاحات کو عمل میں لاکر سلیم ثالث اور محمود ثانی کے لیے ایک عمدہ مثال قائم کردی۔

---

[1] فرید بک، ص ۱۵۹۔

عبدالحمید اوّل

۱۱۸۷ھ تا ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۷۳ء تا ۱۷۸۹ء

مصطفیٰ ثالث کے بعد اس کا بھائی عبدالحمید تخت پر آیا، روس سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا، کیتھرائن نے سابق ہزیمتوں کی تلافی کے لیے کافی تیاریاں کر لی تھیں، برخلاف اس کے ترک اب جنگ کو ختم کر دینا چاہتے تھے، عام باشندوں کے علاوہ فوج کے افسر، وزراء اور خود سلطان بھی صلح کے خواہاں تھے، صرف علماء کی جماعت یہ عذر پیش کر رہی تھی کہ سلطان کے لیے بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین کے تاتاریوں کو اپنی سیادت سے محروم کر دینا اور کرش اور ینی کے قلعوں کو جو کریمیا کے اہم ترین قلعے تھے، روسیوں کے حوالے کر دینا کسی طرح مناسب نہیں لیکن ۱۷۷۴ء کی مہم کا آغاز ہی ترکوں کے لیے اس قدر خلاف توقع ہوا کہ علماء کے ان دلائل کے باوجود باب عالی کو صلح کا فیصلہ کر لینا پڑا۔

ترکوں کی شکست ۱۴/ اپریل ۱۷۷۴ء کو صدر اعظم محسن زادہ پاشا اپنے مستقر شوملہ سے نکل کر ہرسوا کی طرف بڑھا جہاں روسی فوجیں ایک نئے جنرل سوارو (Suwarrow) کی سرکردگی میں لڑائی کے لیے تیار کھڑی تھیں، سوارو نے ترکوں کے حملہ کا انتظار نہیں کیا، بلکہ خود پیش قدمی کر کے کوزلیجہ کے مقام پر صدر اعظم کی فوج پر حملہ آور ہوا اور اسے شکست دی، ترکی لشکر کا تمام سامان مع انتیس توپوں کے روسیوں کے ہاتھ آیا، محسن زادہ پاشا نے شوملہ واپس آکر دیکھا کہ اس کے پچیس ہزار سپاہیوں میں سے صرف آٹھ ہزار باقی رہ گئے ہیں،

کچھ تو میدان جنگ میں کام آئے لیکن زیادہ تر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے، اپنی قلیل جمعیت کے ساتھ روس کی فاتح فوج کا روکنا جواب تیزی کے ساتھ شوملہ کی طرف بڑھتی آرہی تھی محال تھا، بدقسمتی سے ینی چری نے عین اس نازک موقع پر بغاوت کر دی اور جب رئیس آفندی نے ان کو دشمن کے مقابلہ کے لیے مجتمع کرنے کی کوشش کی تو اس کا سر اڑا دیا، اس حالت میں صدر اعظم نے اپنے ایک افسر کو روسی سپہ سالار رومانزوف کے پاس بھیجا اور التوائے جنگ کی خواہش کی، رومانزوف نے اس سے انکار کر دیا لیکن شرائط صلح پر گفتگو کرنے کے لیے صدر اعظم کو دعوت دی، چنانچہ محسن زادہ پاشا نے سلطان کی اجازت حاصل کرنے کے بعد دولت عثمانیہ کے وکلاء کو روانہ کیا تا کہ شہزادہ ریپن سے جو سلطنت روس کا نمائندہ تھا، شرائط صلح کریں۔

صلح نامۂ کینارجی ۱۶ر جولائی ۱۷۷۴ء کو کینارجی (Kainardji) کے مقام پر مجلس صلح منعقد ہوئی اور صرف سات گھنٹوں کی گفت وشنید کے بعد تمام شرائط فریقین کے درمیان طے ہو گئے، فوکشانی اور بخارسٹ کی صلح کانفرنسوں کی مدت اور نتائج کے مقابلہ میں کینارجی کا یہ صلح نامہ حد درجہ حیرت انگیز ہے لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے کہ دونوں فریق اب جنگ کو ختم کر دینے کے دل سے خواہاں تھے، روس کا حال باوجود اس کی شان دار فتوحات کے سلطنت عثمانیہ سے کہیں زیادہ خراب تھا، دورانِ جنگ میں اس کا جانی اور مالی نقصان بہت زیادہ ہو چکا تھا اور اس کے سپاہیوں کی جتنی تعداد میدان جنگ میں کام آئی تھی اس سے زیادہ سامان رسد کی کمی اور وبائی بیماریوں سے ہلاک ہو گئی تھی، اس کے متعدد صوبے طاعون نے برباد کر ڈالے تھے، استراخان کے قریب کے ایک علاقہ حکومت روس کے مظالم کی وجہ سے تقریباً ویران ہو گیا تھا، وہاں کے چار لاکھ باشندے نقل مکان کر کے ۱۷۷۱ء میں سلطنت چین میں جا کر آباد ہو گئے تھے، علاوہ بریں پوگاشف (Pugatoheff) کے دعویٰ سلطنت سے خود روس کے اندر ایک ایسی شورش پیدا ہو گئی تھی جس نے چند ہی دنوں میں خانہ

جنگی کی شکل اختیار کرلی اور پوگاشف کے حامیوں نے ۱۷۷۳ء اور ۱۷۷۴ء میں جنوبی روس کے تمام علاقے تاراج کر ڈالے، پوگاشف نسلاً ایک روسی قزاق تھا، گذشتہ جنگ میں وہ روسی فوج کا افسر رہ چکا تھا، مگر کسی وجہ سے فوج سے علاحدہ ہوگیا، اور کچھ دنوں ادھر ادھر پھرتا رہا، پھر ۱۷۷۳ء میں دفعتہً اس نے اعلان کیا کہ میں کیتھرائن کا مقتول شوہر شہنشاہ پیٹر ثالث ہوں جسے تخت سلطنت کی خاطر کیتھرائن نے اپنے عاشقوں سے سازش کرکے اپنی دانست میں قتل کرادیا تھا، چوں کہ روس میں بہت سے لوگ کیتھرائن کی حکومت کے خلاف تھے، اس لیے وہ پوگاشف کے ساتھ ہوگئے، صلح کے لیے روس کی آمادگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تقسیم پولینڈ کا پہلا معاہدہ حال ہی میں ہوا تھا اور کیتھرائن اس بات کی سخت ضرورت محسوس کر رہی تھی کہ دولت عثمانیہ کی طرف سے مطمئن ہو کر پوری توجہ کے ساتھ پولینڈ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کرے، کریسی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگر یہ حالات پیش نظر رکھے جائیں تو پھر اس فیاضی اور عالی ہمتی کی حقیقت کھل جاتی ہے، جو روس نے بزعم خود سلطنت عثمانیہ کے ساتھ معاہدہ کینارجی میں برتی اور زیادہ سخت شرائط پر اسے مجبور نہ کیا،[1] صلح نامہ کے شرائط تو چار روز قبل ہی طے ہوگئے تھے لیکن رومانزوف نے دستخط کے لیے ۲۱ رجولائی کی تاریخ مقرر کی جو معاہدہ پرتھ کے تکملہ کی تاریخ تھی، مقصد یہ تھا کہ آئندہ وہ تاریخ روسیوں کے بجائے عثمانیوں کی شکست وذلت کی یادگار رہے، کینارجی کا مقام بھی اس وجہ سے منتخب کیا گیا تھا کہ وہیں ایک سال قبل روسی جنرل وایسمین ترکوں کے ہاتھ سے جنگ میں مارا گیا تھا۔

صلح نامۂ کینارجی اٹھائیس دفعات پر مشتمل تھا، ان میں دو خفیہ دفعات کا اضافہ بھی کیا گیا، جن کے رو سے باب عالی نے یہ وعدہ کیا کہ تین سال کے اندر چار ملین روبل حکومت روس کو ادا کرے گا اور کیتھرائن نے ذمہ لیا کہ روسی بیڑا بحر الجین سے فوراً واپس بلا لیا جائے گا، اور دفعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۲۵۷۔

روس تقریباً ان تمام عثمانی علاقوں سے دست بردار ہو گیا جن پر اس کی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا، کریمیا البتہ دولت علیہ کو واپس نہ ملا، بلکہ سرحد پولینڈ تک بسرابیا کا تاتاری علاقہ اس کے ساتھ شامل کر کے ایک مستقل تاتاری حکومت قائم کر دی گئی، جس کے خان کے انتخاب کا حق صرف تاتاریوں کو دیا گیا اور اس انتخاب میں روس اور باب عالی کی مداخلت ممنوع قرار دی گئی، اس دفعہ میں یہ تصریح خاص طور پر کر دی گئی تھی کہ کسی عذر کی بنا پر حکومت روس یا دولت عثمانیہ خان کریمیا کے انتخاب میں دخل نہ دے گی اور نہ مملکت مذکورہ کے خانگی، سیاسی، ملکی اور اندرونی معاملات میں مداخلت کرے گی، بلکہ دونوں قوم تاتار کو سیاسی اور ملکی حیثیت سے ان طاقتوں کے ہم پلہ تسلیم کریں گی، جو خود مختار ہیں اور صرف خدا کے زیر فرمان ہیں، تاہم کریمیا اور دوسرے تاتاری علاقوں میں سے روس نے کرش، ینی قلعہ، ازف اور کلبرن کے قلعوں اور ان کے ملحق اضلاع پر اپنا قبضہ قائم رکھا، یہ استثنا اپنے اندر آئندہ خطرات کا بہت کچھ سامان رکھتا تھا، کیوں کہ ان علاقوں پر قابض رہنے سے روس کو کریمیا پر حملہ کرنے کا ہر وقت موقع حاصل تھا، قبارطہ کے دونوں علاقے بھی، اگر چہ وہاں کے باشندے مسلمان تھے، روس کو دیے گئے، باقی اور تمام عثمانی مقبوضات جو روس نے دوران جنگ میں فتح کر لیے تھے اور جن میں ولاچیا، مولڈیویا، بسرابیا، جارجیا اور منگریلیا شامل تھے، سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے، اوکزاکوف کے قلعہ اور ضلع پر ترکوں کا قبضہ قائم رہا، ولاچیا اور مولڈیویا کو دولت عثمانیہ کے حوالے کرتے ہوئے یہ تصریح کر دی گئی کہ وہاں کے باشندوں کے تمام باغیانہ جرائم جو دوران جنگ میں سرزد ہوئے تھے، معاف کر دیے جائیں گے، عیسائی رعایا کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی اور آئندہ ان پر زیادہ نرمی کے ساتھ حکومت کی جائے گی، دولت عثمانیہ کی طرف سے سفیر روس متعینہ قسطنطنیہ کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ بوقت ضرورت ان صوبوں کے حق میں باب عالی میں معروضات پیش کرے اور وعدہ کیا گیا کہ ان معروضات کی سماعت پوری توجہ کے ساتھ کی جائے گی۔

عام عیسائی رعایا کے متعلق جو دفعہ صلح نامہ میں شامل کی گئی وہ نہایت اہم تھی، اس کے رو سے حکومت روس کو سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت کا حق حاصل ہو گیا اور روس کے سفیروں کو باب عالی میں عیسائیوں کی طرف سے معروضات پیش کرنے کی اجازت دے دی گئی، یہ حق کسی دوسری مسیحی حکومت کو نہیں دیا گیا، روس کی رعایا کو بیت المقدس کی زیارت کی بھی عام اجازت دی گئی، یہ زائرین ہر قسم کے محصول سے معاف کر دیے گئے اور باب عالی نے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا۔

روس اور دولت عثمانیہ کے تجارتی جہازوں کو اس تمام سمندروں میں جو ان سلطنتوں کے کنارے واقع تھے، آمد و رفت کی پوری آزادی دی گئی، اسی دفعہ میں روس کو یہ حق بھی دیا گیا کہ سلطنت عثمانیہ کے جس حصہ میں مناسب سمجھے اپنے قونصل مقیم رکھے لیکن دولت علیہ کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اپنے قونصل سلطنت روس میں بھیجے، اس کے لیے صرف اسی قدر کافی سمجھا گیا کہ اس کی رعایا کو روس میں بری اور بحری تجارت کی اجازت دے دی گئی اور عثمانی تاجروں کے ساتھ مراعات کا وعدہ کیا گیا۔

صلح نامہ میں یہ بھی طے پایا کہ آئندہ ایک روسی سفیر قسطنطنیہ میں مقیم رہا کرے گا اور زار روس ''بادشاہ'' کے لقب سے پکارا جائے گا، باب عالی نے زار روس کے لیے ''بادشاہ'' کا لقب اس وقت تک تسلیم نہیں کیا تھا، معاہدۂ کینارجی سے قبل دونوں سلطنتوں کے درمیان جتنے معاہدے اور صلح نامے ہو چکے تھے، سب کالعدم قرار دیے گئے، علاوہ اس معاہدہ کے جو علاقہ ازف کے حدود اور سرحد کیوبان کے تعین کے لیے ۱۷۰۰ء میں ہوا تھا، اس کی پابندی بدستور قائم رکھی گئی۔

صلح نامہ کی کسی دفعہ میں پولینڈ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں آیا، حالاں کہ ابتداءً جنگ کے من جملہ اور اسباب کے ایک اہم سبب قبضہ پولینڈ بھی تھا، ایک اور معنی خیز بات یہ تھی کہ اس صلح نامہ کی ترتیب میں کوئی دوسری حکومت شریک نہیں کی گئی، یہ کیتھرائن کی ایک

کھلی ہوئی کامیابی تھی۔

صلح نامۂ کینارجی کی اہمیت صلح نامہ کینارجی بہ لحاظ اپنے نتائج کے ان تمام صلح ناموں سے زیادہ اہم ہے جو دولت عثمانیہ کے آغاز وزوال کے بعد باب عالی اور عیسائی حکومتوں کے درمیان اس سے قبل ہو چکے تھے، دولت علیہ کی فوجی قوت کا خوف یورپ کے دل سے صلح نامہ کارلووٹز کے بعد ہی نکل گیا تھا لیکن صلح نامہ کینارجی نے یہ حقیقت بھی واضح کردی کہ ترکوں کے لیے خود اپنے مقبوضات کا تحفظ بھی دشوار ہو گیا ہے، کریمیا اور دوسرے تاتاری علاقوں کا سلطنت عثمانیہ کے حدود سے نکل جانا دولت علیہ کے انحطاط وزوال کی ایک ناقابل انکار شہادت تھی، صلح نامہ کارلووٹز کے بعد ہنگری کی عیسائی رعایا دولت عثمانیہ کی حکومت سے آزاد ہو گئی تھی لیکن کریمیا ایک خالص اسلامی صوبہ تھا اور اس کا ہاتھ سے نکل جانا ہنگری کی دست برداری سے بہت زیادہ اہم تھا، صلح نامہ کینارجی میں کریمیا کی آزادی صاف الفاظ میں تسلیم کر لی گئی تھی اور فریقین نے اس کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کا سختی سے عہد کیا تھا لیکن یہ آزادی محض روسی تسلط کا دیباچہ تھی، کریمیا کو دولت عثمانیہ سے آزاد کرانے کی کوشش کیتھرائن نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ اس پر قبضہ کرنا آسان ہو جائے، چنانچہ صلح نامہ کے چند ہی دنوں بعد اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کریمیا میں اندرونی خلفشار پیدا کرانا شروع کر دیا اور پھر اپنے ہی برپا کیے ہوئے فتنہ کو دبانے کی حیلہ سے اس نے اپنی فوجیں بھیج کر پورے ملک پر قبضہ کر لیا، اس صلح نامہ کی ایک دوسری اہم دفعہ جس کے نتائج دولت عثمانیہ کے لیے نہایت مضر تھے، وہ تھی جس میں روس کو سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی حمایت کا حق خصوصاً ان عیسائیوں کی جو کلیسائے یونان سے وابستہ تھے، دیا گیا تھا، یہ ایک ایسا حق تھا جو مستقبل میں دولت علیہ کے لیے اہم ترین خطرات سے پُر تھا، مصطفیٰ کامل پاشا فرماتے ہیں کہ:

”عیسائی رعایا کی حمایت سے متعلق جو شرط رکھی گئی اس سے دولت عثمانیہ ہمیشہ

کے لیے ایک آفت میں مبتلا ہوگئی، کیوں کہ اس کے بعد ہر یورپین سلطنت دولت علیہ کے معاملات میں عیسائیت کے نام پر دخل دینے لگی اور پھر جب کبھی دولت علیہ اور یورپ کی کسی حکومت میں جنگ ہوتی تو اس کا سب مسیحیت اور اس کے حقوق قرار دیے جاتے[1]۔"

بعض اصلاحات صلح نامہ کینارجی کا اخلاقی اثر ترکوں پر برا پڑا، وہ روس کی طاقت سے مرعوب نظر آنے لگے، تاہم ایک جماعت استقلال کے ساتھ سلطنت کی خدمت کے لیے مستعد رہی اور شکست و ہزیمت کی اس کاری ضرب سے بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی، اس جماعت کا سب سے زیادہ ممتاز فرد حسن پاشا الجزائری تھا، سلطان کو اس پر کامل اعتماد تھا اور اس نے حسن پاشا کو تقریباً غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے، حسن پاشا نے بری اور بحری فوجوں کو از سر نو منظّم کرنے کے لیے بعض نہایت مفید اصلاحات جاری کرنی چاہیں لیکن جہاں تک بری فوج کا تعلق تھا، اسے کامیابی نہیں ہوئی، ینی چری اور سپاہی دستوں نے جدید آلات حرب اور اصلاح شدہ فوجی قواعد کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، البتہ بحریہ کی اصلاح میں حسن پاشا کی کوششیں ایک حد تک بارآور ہوئیں، ایک انگریز جہاز ساز کی مدد سے اس نے نئے طرز کے جنگی جہاز تعمیر کرائے اور الجزائر اور دوسری بربری ریاستوں نیز بحر ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل کی بندرگاہوں سے بہترین جہاز رانوں کو بلا کر ان جہازوں پر مقرر کیا، اس نے کپتانوں کو مجبور کیا کہ اپنے جہازوں کی دیکھ بھال ہمیشہ خود کرتے رہیں، اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ لائق اور تجربہ کار جہاز رانوں کی کافی تعداد ضرورت ناگہانی کے لیے ہر وقت قسطنطنیہ میں موجود رہے، پہلے یہ دستور تھا کہ موسم سرما میں جہاز بندرگاہوں میں کھڑے کر دیے جاتے تھے اور جہاز رانوں کو رخصت کر دیا جاتا تھا، حسن پاشا نے اس دستور کے خطرہ کو ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ دارالسلطنت کو یوں غیر محفوظ چھوڑ دینے سے روسی جہاز بحر اسود کے بندرگاہوں سے نکل کر باسفورس پر آسانی

[1] مصطفیٰ کامل پاشا، ص ۶۵۔

سے قابض ہو سکتے ہیں اور پھر وہ عثمانی بیڑہ کو اس کی بندرگاہوں میں فنا کر سکتے ہیں، چنانچہ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ جس طرح بری فوجوں کے لیے قسطنطنیہ میں بارکیں بنی ہوئی ہیں، جن میں وہ موسم سرما میں قیام کرتی ہیں، اسی طرح جہاز رانوں کے لیے بھی بارکیں بنوا دی جائیں لیکن صدر اعظم اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں نے خفیہ طور پر اس تجویز کی پرزور مخالفت کی کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ دارالسلطنت میں اتنی بڑی بحری فوج کے قیام سے حسن پاشا کو کس قدر قوت حاصل ہو جائے گی، چوں کہ صدر اعظم ان بارکوں کی تعمیر کے لیے روپیہ دینے میں برابر حیلے حوالے کرتا رہا، اس لیے مجبور ہو کر حسن پاشا نے خود اپنے ذاتی روپیہ سے جہاز رانوں کے لیے ایک مستقر مختصر پیمانہ پر تعمیر کرا دیا، اس نے جہاز کے افسروں کی فنی تعلیم کے لیے ایک بحری مدرسہ بھی قائم کیا لیکن اس کی یہ تمام تجویزیں سلطنت کے دوسرے عہدہ داروں کی مخالفت کی وجہ سے آخر کار ناکام رہیں، اسی مخالفت کی وجہ سے وہ نظام جاگیری کی اصلاح میں بھی کامیاب نہ ہو سکا، جو اہل دربار کی غیر دیانت داری کے باعث نہایت ابتر ہو رہا تھا اور جنگ کے موقعوں پر باب عالی کو اس کے فائدے سے بہت کچھ محروم رہنا پڑتا تھا۔

بغاوتوں کا استیصال حسن پاشا کی ان تجویزوں کے ناکام رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی غرض سے جو گذشتہ جنگ کے دوران میں سلطنت کے مختلف صوبوں میں نمودار ہو گئی تھیں، اکثر پایہ تخت سے باہر رہنا پڑتا تھا، اور اس کے حریفوں کو اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جاتا تھا، چنانچہ شام میں شیخ طاہر نے خودسری اختیار کر لی تھی، سلطان نے حسن پاشا کو اس کی تنبیہ کے لیے روانہ کیا، حسن پاشا نے عکہ کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا اور شیخ طاہر کو قید میں ڈال دیا، پھر اس نے مکہ کے ملحق علاقہ کو بھی سر کیا اور بغاوت کا فتنہ کچھ دنوں کے لیے فرو ہو گیا۔

دو ہی سال کے بعد ۱۷۷۸ء میں حسن پاشا کو موریا کی سرکشی دور کرنے کے لیے

جانا پڑا، ۱۷۷۰ء میں جب روسی جنرل اورلوف کی حمایت میں موریا کے یونانی باشندوں نے دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا تو البانی دستے ان کے مقابلہ میں بھیجے گئے تھے اور انہوں نے یونانیوں اور روسیوں کو شکست دے کر بھگا دیا تھا، یہ دستے امن قائم ہونے کے بعد وہیں رہ گئے تھے اور اب انہوں نے خود دولت علیہ کے خلاف سر اٹھایا، وہ ہر طرف لوٹ مار کرتے پھرتے تھے اور قتل و غارت گری میں ان کے یہاں یونانیوں اور ترکوں کی کوئی تفریق نہ تھی، حسن پاشا نے موریا پہنچ کر ان کو شکست دی اور وہاں سے نکال باہر کیا، اس کے بعد سلطان نے اسے موریا کا حاکم مقرر کر دیا، اس نے ازسرنو امن وامان قائم کیا اور زراعت و تجارت کو ترقی دی۔

کچھ دنوں کے بعد مصر میں مملوکوں کی بغاوت رونما ہوئی، سلطان نے حسن پاشا کو ان کی سرکوبی کے لیے بھی روانہ کیا، چنانچہ اس نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا اور باغیوں کے زیر کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، اگر تھوڑی سی مہلت اسے اور مل گئی ہوتی تو وہ مصر کی بغاوت کا بھی استیصال کر دیتا لیکن ۱۷۸۷ء میں روس سے جنگ کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور سلطان نے اسے قسطنطنیہ واپس بلا لیا۔

کیتھرائن کے منصوبے صلح نامۂ کینارجی کی سیاہی ابھی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں پھر شروع کر دیں، اس کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا، یعنی ترکوں کو یورپ سے نکال کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا، یہ مقصد پیٹر اعظم کی وصیت کے مطابق حکومت روس کا اولین فرض قرار پا چکا تھا، چنانچہ جب ۱۷۶۸ء میں کیتھرائن نے اپنی فوجیں سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیں تو اس کی غرض یہ نہ تھی کہ چند قلعوں پر قابض ہو جائے اور بحر اسود میں روسی جہازوں کو آمد و رفت کی اجازت دے دی جائے، بلکہ وہ شروع سے آخر تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی لیکن حالات خلاف توقع پیش آئے، ترکوں کا عزم و استقلال ان کی شجاعت کے

مساوی ثابت ہوا اور روسی فوجوں کو بعض سخت شکستیں اٹھانی پڑیں، جان و مال کے شدید نقصان کے علاوہ پوگا شف کی پیدا کردہ خانہ جنگی نے بھی کیتھرائن کو صلح کے لیے مجبور کیا لیکن جب ۱۱رجنوری ۱۷۷۵ء کو پوگا شف گرفتار ہوکر قتل کر دیا گیا نیز پولینڈ کے ان صوبوں پر جواز روئے تقسیم روس کے ہاتھ آئے تھے، پوری طرح تسلط قائم ہوگیا تو کیتھرائن کے دل میں قسطنطنیہ کی فتح کا حوصلہ پھر جوش زن ہوا، چنانچہ یہ اسی حوصلہ کی ایک بین شہادت تھی کہ جب ۱۷۷۸ء میں کیتھرائن کا دوسرا پوتا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام قسطنطین رکھا اور اس کی رضاعت اور پرورش و پرداخت کے لیے یونانی عورتیں مقرر کیں اور جب وہ لڑکا بڑا ہوا تو بڑے بڑے لائق یونانی اساتذہ سے اس کو تعلیم دلوائی، اس طرح شہزادہ نے یونانی زبان میں مہارت حاصل کر لی، ایک انگریز مسٹر اٹین (Eton) جو اس وقت سینٹ پیٹرس برگ میں مقیم تھا اور شہزادہ پوٹمکن اور حکومت روس کے دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں سے گہرے تعلقات رکھتا تھا، بیان کرتا ہے کہ شہزادہ قسطنطین کی ساری تعلیم اسی مقصد کو سامنے رکھ کر دی گئی تھی کہ وہ قسطنطنیہ کے تخت کا اہل ہو سکے اور اس وقت تک کسی شخص کو بھی زارنیہ کے اس ارادہ کے متعلق کوئی شبہ نہ تھا۔[1]

اٹین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ۱۷۷۹ء میں کیتھرائن اور شہزادہ پوٹمکن نے ایک اسکیم مرتب کی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ کے نوآبادکاروں کے خلاف روس انگلستان کو پوری مدد دے اور اس کے معاوضہ میں انگلستان روس کی مدد کرے جب وہ پھر ترکوں پر حملہ آور ہو، چنانچہ اس اسکیم کے مطابق جزیرہ مائنرکا (Minorca) جو اس وقت انگریزوں کے قبضہ میں تھا، روس کو دیا جانے والا تھا تاکہ بحر روم میں روسی جہازوں کے لیے ایک اسٹیشن کا کام دے، نیز یونانی باغیوں کے جمع ہونے کے لیے ایک محفوظ مقام حاصل ہو جائے، پوٹمکن اس اسکیم کو برطانوی سفیر مقیم سینٹ پیٹرس برگ کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ

---

[1] کریسی، جلد۲، ص۲۷۱۔

روس کے وزیر خارجہ کانٹ پانین (Count Panin) نے جو انگلستان کے مقابلے میں فرانس کا حامی تھا، درمیان میں پڑ کر اس معاملہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا، اٹین لکھتا ہے کہ اس اسکیم کی ناکامی پر پوٹمکن مرتے وقت تک افسوس کرتا رہا اور وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دولت عثمانیہ کے خلاف روس کی کامیابی انگلستان سے اتحاد کرنے پر منحصر ہے[1] خود کیتھرائن کا ذاتی خیال اس سے مختلف تھا۔

سلطنت عثمانیہ کی مجوزہ تقسیم گزشتہ جنگ میں کیتھرائن کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ سلطنت عثمانیہ سے متعلق اپنے حوصلوں کو پورا کرنا آسٹریا کی شرکت کے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ اس نے ترکوں سے لڑائی چھیڑنے سے پہلے شہنشاہ جوزف ثانی سے جو میریا تھریسیا کی وفات (۱۷۸۰ء) کے بعد سلطنت آسٹریا کا مطلق العنان فرماں روا تھا دو ایک بار ملاقات کی اور اسے اپنا گرویدہ اور اپنی ''مشرقی تجویز'' کا پرجوش حامی بنا لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جون ۱۷۸۱ء میں دونوں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ سے ایک معاہدہ ہو گیا جس کے رو سے کیتھرائن اور جوزف نے مشرق ادنیٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کیا، اس معاہدہ میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن ستمبر ۱۷۸۲ء میں کیتھرائن نے جوزف کے سامنے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی ایک مستقل اسکیم پیش کی۔

اسکیم کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ روس اور آسٹریا متحد ہو کر ترکوں کو ان کے تمام یورپین مقبوضات سے نکال دیں گے اور ان کے نکل جانے کے بعد پھر ان علاقوں کی تقسیم میں کوئی دشواری باقی نہ رہے گی، مجوزہ تقسیم یہ تھی کہ اوکزاکوف دریائے بوگ اور دریائے نیسٹر کا درمیانی علاقہ اور بحر الجین کے دو جزیرے روس کو دے دیے جائیں، مولڈیویا، بسرابیا اور ولاچیا کو متحد کر کے ڈاسیا کے نام سے ایک آزاد مملکت قائم کر دی جائے اور شہزادہ پوٹمکن کو اس کا بادشاہ بنا دیا جائے، آسٹریا کے حصہ میں سرویا، بوسنیا، ہرزیگووینا اور ڈلماشیا کے

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۲۷۴۔

صوبے رکھے گئے تھے، ڈلماشیا چوں کہ وینس کا مقبوضہ تھا، اس لیے اس کی تلافی کے لیے وینس کو موریا، قبرص (سائپرس) اور کریٹ دیے گئے، کیتھرائن کو یورپین حکومتوں میں سے مخالفت کا اندیشہ صرف فرانس کی طرف سے تھا، اس لیے فرانس کو راضی کرنے کے لیے مصر وشام کے صوبے اس کے سامنے پیش کیے جانے والے تھے لیکن اس اسکیم میں سب سے زیادہ دل چسپ حصہ وہ تھا جس میں ایک بازنطینی سلطنت کا نقشہ مرتب کیا گیا تھا یعنی تھریس، مقدونیا، بلغاریا، شمالی یونان اور البانیا کو ملا کر ایک نئی سلطنت قائم کی گئی تھی جس کا پایہ تخت قسطنطنیہ تھا اور کیتھرائن کا دوسرا پوتا شہزادہ قسطنطین اس سلطنت کا فرماں روا قرار دیا گیا تھا، چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس شہزادہ کی تعلیم وتربیت میں یہی مقصد کیتھرائن کے پیش نظر تھا، کیتھرائن کو اپنی اسکیم کی کام یابی پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے پہلے ہی سے اس نئی سلطنت کے لیے ایک سکہ بھی ڈھلوالیا تھا، جس کے ایک طرف شہزادہ قسطنطین کے چہرے کی شبیہ تھی اور دوسری طرف ایک تمثیلی نشان تھا جو ہلال پر صلیب کی آئندہ فتح ونصرت کو ظاہر کرتا تھا، یورپین حکومتوں کے اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے کہ مبادا سلطنت روس اور جدید بازنطینی سلطنت بعد میں ایک ہی فرماں روا کے زیر حکومت آجائیں، کیتھرائن کافی ضمانت دینے پر آمادہ تھی[1]۔

شہنشاہ جوزف کو مذکورہ بالا اسکیم سے پورا پورا اتفاق نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ اس تقسیم میں آسٹریا کا حصہ کم رکھا گیا ہے، وہ ڈلماشیا کے علاوہ اِسٹریا (Istra) کا علاقہ بھی چاہتا تھا اور سرویا کے علاوہ ولاچیا کو چک کا بھی امیدوار تھا، اسے یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ دریائے ڈینوب کے بقیہ علاقے سلطنت عثمانیہ سے نکل کر روس کے دائرۂ اقتدار میں آجائیں، تاہم وہ سمجھتا تھا کہ کیتھرائن کی مخالفت کرنے سے بجز نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس لیے اس نے اس اسکیم کو منظور کر کے کیتھرائن کی دوستی کو قائم رکھا۔

کریمیا پر روس کا قبضہ | یہ اسکیم بہرحال کاغذ ہی تک محدود رہی اور کیتھرائن کے حوصلوں

[1] میریٹ، ص ۱۵۶-۱۵۵۔

کے باوجود عمل میں نہ آسکی لیکن ۱۷۸۳ء میں اس نے کریمیا پر قبضہ کرکے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، باضابطہ قبضہ تو ۱۷۸۳ء میں ہوا مگر اس کے لیے کوشش صلح نامہ کینارجی کے بعد ہی سے شروع ہوگئی تھی، اس صلح نامہ میں حکومت روس نے عہد کیا تھا کہ وہ کریمیا کے اندرونی اور ملکی معاملات میں مداخلت نہ کرے گی اور نہ اس کے فرماں روا کے انتخاب میں کوئی دخل دے گی لیکن اس کے باوجود اس نے ''دوستانہ مشورہ'' کے طور پر کریمیا کے اندرونی معاملات میں ابتدا ہی سے دخل دینا شروع کردیا تھا اور جب باب عالی نے احتجاج کیا کہ یہ ''معاہدہ کینارجی'' کی صریح خلاف ورزی ہے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اہل کریمیا کے باہمی جھگڑوں سے خود روس کے سرحدی علاقوں پر مضر اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، تاتاریوں نے دولت گرائی کو اپنا خان منتخب کیا تھا، کیتھرائن نے اسے اپنے اثر میں لانے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوئی، اس لیے اس نے اب یہ تدبیر اختیار کی کہ سازشوں کے ذریعہ سے دولت گرائی کے خلاف ملک میں شورش برپا کرادی اور پھر اس شورش کو فرو کرنے کے حیلہ سے اپنی فوجیں کریمیا میں روانہ کیں، روسی افسر برابر یہ اعلان کرتے جاتے تھے کہ ان کا مقصد ہرگز کریمیا کو فتح کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ صرف امن قائم کرنے کے لیے آئے ہیں، بہر حال انہوں نے دولت گرائی کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کردیا اور اس کی جگہ شاہین گرائی کو منتخب کرایا، یہ شخص روس کے زیر اثر اور تاتاریوں میں حد درجہ نامقبول تھا، چنانچہ کیتھرائن کے حسب توقع بہت جلد اس کے خلاف شورش برپا ہوگئی اور تاتاریوں نے اسے تخت سے معزول کردینا چاہا، چوں کہ باب عالی بھی شاہین کا مخالف تھا، اس لیے اس نے ۱۷۷۶ء میں ایک وفد سینٹ پیٹرس برگ روانہ کیا اور کیتھرائن سے مدد کی درخواست کی، کیتھرائن اسی موقع کا انتظار کررہی تھی، اس نے شاہین کو اپنی سرپرستی کا اطمینان دلایا اور روسی سپہ سالار رومانزوف کو حکم دیا کہ فوجیں تیار رکھی جائیں تاکہ اگر ترک اس معاملہ میں روس کی مخالفت کریں تو ان کا مقابلہ کیا جائے لیکن باب عالی میں اس وقت روس سے جنگ

چھیڑنے کی قوت نہ تھی، البتہ کیوبان کے تاتاری قبائل نے روس کی اس خطرناک مداخلت کے خلاف ہتھیار اٹھائے لیکن جنرل سوارو نے شکست دے کر ان کا زور توڑ دیا، ۱۷۷۹ء میں باب عالی اور روس کے درمیان ایک جدید معاہدہ ہوگیا، جس میں صلح نامہ کینارجی کی دفعات از سر نو تسلیم کی گئیں، حالاں کہ کریمیا کے ساتھ روس کا طرزِ عمل صلح نامہ مذکور کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تھا، اس معاہدہ میں سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے شاہین گرائی کو کریمیا کا جائز فرماں روا بھی تسلیم کیا۔

لیکن شاہین گرائی زیادہ دنوں تک تخت پر نہ رہ سکا، پوٹمکن نے اپنے ایجنٹ خان کے دربار میں متعین کر دیے، انہوں نے اس کو روسی رسم و رواج اور روسی لباس اختیار کرنے کی ترغیب دی، جس سے تاتاریوں کے قومی اور مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچا اور اس کے خلاف عام بے زاری پھیلنے لگی، ان روسیوں نے اسی پر اکتفانہ کیا بلکہ شاہین کے خلاف جو شورش پھیل رہی تھی، اسے اپنی خفیہ کوششوں سے بہت بڑھا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا اعلانیہ بغاوت پر آمادہ ہوگئی، اب شاہین کے ان روسی مشیروں نے اسے کیتھرائن سے فوجی مدد طلب کرنے کی رائے دی، وہ غریب ان کے ہاتھوں میں کچھ ایسا مجبور ہو رہا تھا کہ چارو ناچار اس کو روس سے مدد کی درخواست کرنی پڑی، چنانچہ فوراً روسی فوجیں کریمیا میں پہنچ گئیں اور بغاوت فرو کر دی گئی لیکن اب کیتھرائن کو تاتاریوں کی فلاح و بہبود کے لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ کریمیا بلا تاخیر سلطنت روس میں شامل کر لیا جائے، جن احساس ناشناسوں نے اس تجویز کی مخالفت کی انہیں بے دردی سے قتل یا جلاوطن کر دیا گیا اور شاہین گرائی کو مجبور کیا گیا کہ زارنیہ کے حق میں کریمیا اور کیوبان کی مملکت سے دست بردار ہو جائے، اس سے ایک تحریر بھی اس مضمون کی حاصل کر لی گئی کہ اس کے خاندان کے وہ افراد جو وراثۃً تخت و تاج کے مستحق ہوتے، آئندہ ہمیشہ کے لیے کریمیا کی فرماں روائی سے معزول کئے گئے۔

ظلم و فریب کی اس حیرت انگیز کارروائی کے لیے سند جواز بھی ویسی ہی بے نظیر

پیش کی گئی، چنانچہ تاتاریوں کے ملک پر اس طرح قبضہ کر لینے کے بعد کیتھرائن کی طرف سے جو اعلان اپریل ۱۷۸۳ء میں شائع کیا گیا، وہ اسی قسم کی خداعیوں سے پر تھا جس کا نمونہ تقسیم پولینڈ کے موقع پر یورپ کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا، یعنی کریمیا اور کیوبان کو سلطنت روس میں شامل کر لینے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ قوم تاتار کو طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کے مصائب سے نجات دلائی جائے اور روس کے سایۂ عاطفت میں پرامن زندگی کی نعمتوں سے بہرہ اندوز کیا جائے، مغربی یورپ میں کیتھرائن کے اس الطاف خسروانہ پر تحسین وآفریں کے نعرے بلند ہونے لگے لیکن خود تاتاریوں نے ان نعمتوں کی ناقدری کی اور ایک جماعت ملکی آزادی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، جنرل پوٹکن (جو شہزادہ پوٹمکن کا عزیز تھا) نے فوراً ہی ان کی تنبیہ کر دی، قتل عام میں تیس ہزار تاتاری جن میں بوڑھے، بچے، عورتیں سبھی شامل تھے، تہ تیغ کر دیے گئے، روسیوں کے مظالم سے بچنے کے لیے ہزاروں وطن چھوڑ کر بھاگ گئے، بھاگنے والوں میں پچھتر ہزار آرمینی عیسائی بھی تھے، جن میں سے سات ہزار کے علاوہ باقی سب فاقہ کشی اور سردی کی شدت سے راستہ ہی میں ہلاک ہو گئے[1]۔

فرانسیسی مؤرخ ژون کیئر اس سلسلہ میں روکیئر کا ذیل بیان نقل کرتا ہے:

"صلح نامۂ کینارجی کے نتائج بہت جلد محسوس ہو گئے، مسقووی کارپردازوں کی سازشوں سے قرم میں فساد ہوا، دولت غرائے معزول کیا گیا اور اس کی جگہ شاہین عزائے مقرر ہوا، جس نے آپ کو کیتھرائن کی سرپرستی میں دیا، امراء نے نئے خان قرم کے خلاف بغاوت کی، خان نے روس سے مدد کی درخواست کی، (۱۷۸۳ء) پوٹمکن نے فوراً ستر ہزار آدمیوں کے ساتھ قرم پر حملہ کر دیا لیکن اس کی فتح کو فتح کی دیوی نے شرف نہیں بخشا، قتل کے ساتھ یہ فتح حاصل ہوئی اور پھانسیوں کے ساتھ اس کا اعلان ہوا، خود خان کی آنکھوں کے سامنے کئی ہزار شریف تاتاری سنگسار اور قتل کر دیے گئے، روسیوں نے بدقسمت شاہین

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۲۷۶۔

> غرائے کو ایک زمانہ تک ٹال مٹول میں رکھا، آخر بے چارے کو اپنی سلطنت سے جس کی اس نے تحقیر کی تھی، دست کش ہونا پڑا، بعد ازاں روسیوں نے اس کو کالوگا میں قید کیا، اس کو سخت تکلیفیں دیں اور اس کے ساتھ نہایت وحشیانہ برتاؤ کیا اور بالآخر اس کو ترکوں کے انتقام کے لیے سرحدی علاقے پر چھوڑ دیا، ترکوں نے اس کو پکڑا اور رہوڈس روانہ کیا، جہاں فرانسیسی قونصل کی مزاحمت کے باوجود قتل کر دیا گیا[1]۔"

کریمیا کے مذکورہ بالا واقعات کی خبر جب قسطنطنیہ پہنچی تو وہاں سخت اضطراب پیدا ہوا لیکن اس وقت دولت عثمانیہ کی فوجی قوت ایسی نہ تھی کہ روس کے خلاف فوراً اعلان جنگ کر دیا جاتا، فرانس کو بھی کیتھرائن کی اس کارروائی سے نہایت تشویش ہوئی، چنانچہ اس نے روس کے مقابلہ میں جس کی قوت اب خطرناک طور پر بڑھتی جارہی تھی، مغربی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کرنا چاہا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس نے انگلستان کی طرف توجہ کی اور جون ۱۷۸۳ء میں فرانسیسی سفیر مقیم لندن نے انگلستان کے وزیر خارجہ مسٹر فاکس (Fox) سے مل کر کہا کہ شاہ فرانس کو سینٹ پیٹرس برگ کی وزارت سے یہ سرکاری اطلاع ابھی ملی ہے کہ روس نے کریمیا اور کیوبان پر قبضہ کر لیا، کیا انگلستان اس قسم کی فتح کو بے اعتنائی کے ساتھ دیکھتا رہے گا؟ فاکس نے جواب دیا کہ مجھے اس میں شبہ ہے کہ روس نے حقیقۃً ان صوبوں پر قبضہ کر لیا ہے، کیوں کہ فریڈرک ایسا ہونے نہ دے گا اور قبل اس کے کہ ایسا ہو وہ روس کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا، اس کے بعد سفیر فرانس نے اس مسئلہ پر فاکس سے متعدد بار گفتگو کی اور انگلستان اور فرانس کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ اگر کیتھرائن کی فتوحات کو روکا نہ گیا تو بہت جلد روسی بیڑا باسفورس میں نظر آئے گا اور قسطنطنیہ پر بھی کیتھرائن کا قبضہ ہو جائے گا لیکن فاکس کی بے اعتنائی بدستور قائم رہی اور آخر میں ان تمام

---

[1] تاریخ دولت عثمانیہ از ڈلا ژون کئیر (اردو ترجمہ) سلسلہ نصاب علمیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، جلد اول، ص ۲۳۲ (Histoire del Empire Ottoman By Dela Jonquiere)

باتوں کا جواب اس نے یہ دیا کہ کریمیا سلطنت روس میں شامل کیا جا چکا ہے اور اس معاملہ میں مداخلت کرنے کا وقت اب باقی نہیں رہا، علاوہ بریں انگلستان اور زارنیہ کے درمیان کچھ معاہدے ہو چکے ہیں جن کو توڑنا مناسب نہیں، فاکس کی طرف سے مایوس ہو کر سفیر فرانس نے خود جارج سوم شاہ انگلستان سے ملاقات کی اور اس کو روسی فتوحات کی اہمیت سمجھائی اور بتایا کہ آسٹریا اور روس مل کر سلطنت عثمانیہ کو باہم تقسیم کر لینا چاہتے ہیں، جس طرح کہ انہوں نے پولینڈ پر چھاپا مار کر اس کے بڑے حصہ کو تقسیم کر لیا، جارج سوم ان واقعات سے بہت متاثر ہوا اور اس نے کہا کہ اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو چند دنوں میں یورپ مثل ایک جنگل کے ہو جائے گا جہاں زیادہ طاقت ور کم زوروں کو لوٹ لے گا اور کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے گا لیکن جارج اپنی وزارت اور پارلیمنٹ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا اور یہ دونوں دولت عثمانیہ کے مخالف اور روس کے طرف دار تھے، علاوہ بریں چوں کہ حال ہی میں امریکہ کی جنگ آزادی ختم ہوئی تھی اور اس میں فرانس کی اعانت سے امریکہ والوں نے انگلستان کو شکست دی تھی، اس لیے باوجود اس کے کہ فرانس اور انگلستان کی حکومتوں کے درمیان صلح نامہ ہو گیا تھا، انگریزوں میں اب بھی فرانس کے خلاف بےزاری کا جذبہ عام طور پر پھیلا ہوا تھا اور وہ اس کے ساتھ اتحاد کرنے پر آمادہ نہ تھے، چنانچہ مایوس ہو کر سفیر فرانس نے ۸/ اگست ۱۷۸۳ء کو اپنی حکومت کو اطلاع دے دی کہ روس کے خلاف انگلستان کا تعاون حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں۔

پرشا اور آسٹریا سے بھی فرانس کو ایسی ہی مایوسی ہوئی، فریڈرک نے ۱۷۵۶ء کے اس معاہدہ اتحاد کی شکایت کی جس کے رو سے فرانس اور آسٹریا ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے اور حکومت فرانس کو جواب دیا کہ پرشا سے اتحاد کی خواہش کرنے سے پہلے اسے چاہیے کہ آسٹریا سے اپنے دوستانہ تعلقات منقطع کر دے، اسی طرح حکومت آسٹریا نے بھی جو سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کے لیے روس سے سازش کر رہی تھی، سفیر فرانس کی گذارشات پر مطلق توجہ نہ کی[1]۔

[1] کریسی، جلد۲، ص۲۸۰-۲۷۷۔

فرانس تنہا دولت عثمانیہ کی حمایت میں روس سے جنگ کرنے پر تیار نہ تھا، چنانچہ جب اس نے آخری طور پر باب عالی کو یہ اطلاع دی کہ مغربی حکومتوں سے مدد ملنی ممکن نہیں تو مجبوراً ۸/جنوری ۱۷۸۴ء کو روس سے ایک صلح نامہ کر لینے پر جس کے رو سے کریمیا اور کیوبان پر کیتھرائن کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔

قسطنطنیہ کا راستہ لیکن کیتھرائن کا سب سے بڑا مقصد (یعنی قسطنطنیہ کی فتح) ابھی تک حاصل نہ ہوا تھا اور اس کی ساری توجہ اب اسی کے لیے وقف ہو رہی تھی، اس نے آسٹریا کے ساتھ باہمی امداد کا ایک جدید معاہدہ کیا اور اوائل ۱۷۸۷ء میں شہنشاہ جوزف کے ہم راہ کریمیا کے سفر کے لیے روانہ ہوئی، دوران سفر میں سلطنت عثمانیہ کی تقسیم پر اعلانیہ گفتگو ہوتی رہی، کیتھرائن کو قسطنطنیہ کی فتح کا اتنا یقین تھا کہ جب وہ شہر خرسن سے گزر رہی تھی تو شہر کے جنوبی دروازہ کی محراب پر یہ الفاظ جلی حروف میں لکھوا دیے تھے ''قسطنطنیہ کا راستہ''۔

اعلانِ جنگ کیتھرائن حملہ کے لیے بالکل تیار تھی لیکن وہ چاہتی تھی کہ پیش قدمی کا الزام ترکوں کے سر رہے، اس غرض سے اس نے اپنے ایجنٹ خفیہ طور پر مولڈیویا، ولاچیا، یونان اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے حصوں میں پہلے سے بھیج دیے تھے تاکہ عیسائی رعایا کو بغاوت کے لیے آمادہ کر رکھیں، روسی قونصل بھی جو صلح نامہ کینارجی کے بموجب سلطنت کے مختلف حصوں میں مقرر کر دیے گئے تھے، رعایا کو بھڑکا رہے تھے، امیر ولاچیا نے اعلانیہ خودسری کر کے روس کے دامن میں پناہ لی تھی، باب عالی نے حکومت روس سے یہ مطالبہ کیا کہ امیر ولاچیا کو پناہ نہ دی جائے اور ان قونصلوں کو معزول کر دیا جائے جو دولت علیہ کے خلاف رعایا کو ابھار رہے ہیں لیکن کیتھرائن نے اسے نامنظور کر دیا اور اس کے جواب میں بسرابیا کے صوبہ اور اوکزاکوف اور اکرمان کے شہروں کا مطالبہ کیا، اس بنا پر کہ یہ علاقے پہلے خان کریمیا کے زیر نگیں تھے، جس کی مملکت اب روس میں شامل ہو گئی تھی، ترکوں کے صبر کا پیمانہ لب ریز ہو چکا تھا، وہ اس توہین آمیز برتاؤ کو اب مطلق برداشت نہیں کر سکتے

تھے، جس کے ذریعہ سے کیتھرائن انہیں جنگ کے لیے برانگیختہ کر رہی تھی، مجبور ہو کر باب عالی نے ۱۵/اگست ۱۷۶۸ء کو روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

انگلستان کا فریب مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر باب عالی کی طرف سے اعلان جنگ بہر حال ناگزیر تھا، تاہم اسے جنگ کی ترغیب دینے میں انگلستان کے "دوستانہ مشوروں" کو بھی بہت کچھ دخل تھا، سفیر فرانس نے دولت عثمانیہ کی حمایت میں انگلستان سے اتحاد کرنے کی جو کوشش کی اور مسٹر فاکس نے روس کی دوستی کا جیسا کھلا ہوا ثبوت دیا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، بااین ہمہ انگلستان دولت علیہ کا ہمدرد بنا رہا اور دوستی کے پردہ میں دشمنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ایک طرف تو اس نے اس بات کی کوشش کی کہ فرانس اور دولت علیہ میں پھوٹ ڈال دے اور دوسری طرف اپنی مدد کا فریب دے کر باب عالی کو روس کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر آمادہ کر دیا، ژون کیئر انگلستان کی اس پالیسی پر لوالے کا حسب ذیل بیان نقل کرتا ہے:

> "انگلستان نے جس کے مشورے، جس کا توسط، جس کی غیر جانب داری ترکی کے حق میں سم قاتل کا کام کر رہی تھی، باب عالی کے سامنے فرانس کے اغراض کو بری روشنی میں پیش کیا اور یہ اتہام لگایا کہ فرانس دراصل اس سے عیاری اور بے وفائی کو کام میں لا رہا ہے اور دیوان کو ترغیب دی کہ وہ فرانسیسی تجاویز صلح کو رد کر دے، روس سے سازش کر کے اس نے باب عالی کو باور کرایا کہ روس دراصل خوف سے پیچھے ہٹ رہا ہے اور یہ کہ اسے سابقہ فتوح کے واپس لینے کا وقت آ گیا ہے، اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ آسٹریا کو لڑائی سے باز رکھے گا، سوئیڈن اور لہستان (پولینڈ) کو اس کی طرف سے لڑائی پر آمادہ کرے گا اور اپنی بحری قوت سے پوری مدد کرے گا۔"[1]

ترکوں کی ابتدائی شکست اعلان جنگ کے بعد سلطان نے غازی حسن پاشا کو فوراً

[1] تاریخ دولت عثمانیہ (اردو ترجمہ) از ژون کیئر، جلد اول، ص ۳۴۲۔

مصر سے واپس بلا لیا، جہاں وہ مملوکوں کی بغاوت فرو کرنے میں مشغول تھا اور اسے بحر اسود اور ملحق علاقہ کی بری اور بحری فوجوں کی کمان دے کر اوکزاکوف روانہ کیا تاکہ وہاں سے کلبرن پر حملہ آور ہو جو دریائے نیسٹر کے دہانہ پر اوکزاکوف کے بالمقابل دوسرے ساحل پر واقع تھا، کلبرن میں روسی فوج کا سپہ سالار سوارو تھا، جو اپنے وقت کا بہت مشہور جنرل تھا، اس نے عثمانی فوج کے نصف حصہ کو بغیر کسی مزاحمت کے دریا عبور کرنے دیا اور پھر دفعۃً اس پر حملہ کر دیا، ساتھ ہی روسی اور عثمانی بیڑوں میں بھی جنگ چھڑ گئی، جس کی وجہ سے بقیہ ترکی دستے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے کلبرن نہ پہنچ سکے اور چھ سات ہزار سپاہی جو کلبرن کے ساحل پر اتر چکے تھے، سوارو کے اچانک اور شدید حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور قریب قریب سب لڑتے ہوئے مارے گئے، بحری جنگ میں بھی ترکوں کو شکست ہوئی اور حسن پاشا کے جہازوں کا بیش تر حصہ برباد ہو گیا۔

آسٹریا کا فریب اس کے بعد ۱۷۸۷ء کی بقیہ مدت میں پھر کوئی لڑائی نہیں ہوئی بلکہ موسم سرما کے مہینے فریقین نے آئندہ جنگ کی تیاریوں میں صرف کیے، ۱۷۸۸ء کے شروع میں سوئڈن اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس کی وجہ سے کیتھرائن کو روسی فوجوں اور جہازوں کا معتد بہ حصہ بحر بالٹک اور اس کے ساحلی علاقوں کی طرف روانہ کر دینا پڑا، ابھی تک آسٹریا نے دولت عثمانیہ کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا، حالاں کہ روس اور آسٹریا میں معاہدہ اتحاد ہو چکا تھا اور اس کے رو سے آسٹریا کو شروع ہی سے روس کا ساتھ دینا چاہیے تھا، وجہ یہ تھی کہ جب لڑائی شروع ہوئی اس وقت جوزف صوبہ نیدرلینڈر کی شورش فرو کرنے میں مشغول تھا، چنانچہ جب تک ادھر سے کسی حد تک اطمینان نہ ہو چکا، اس نے دولت علیہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا، برخلاف اس کے اس نے اپنے سفیر کے ذریعہ سے باب عالی میں یہ پیغام بھیجا کہ وہ روس اور دولت عثمانیہ میں صلح کرا دینے کے لیے تیار ہے، لیکن ہمدردی اور دوستی کی یہ نمائش اسی وقت تک قائم رہی جب تک اسے اپنی سلطنت کی

اندرونی مشکلات کی طرف سے نجات نہ حاصل ہوئی، جوں ہی یندر لینڈر کی شورش ختم ہوئی اس نے دولت علیہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اعلان جنگ سے قبل ہی جب کہ وہ بظاہر روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے باب عالی کو اس فریب میں مبتلا رکھ کر بلغراد پر قبضہ کر لینا چاہا، چنانچہ ۲/دسمبر ۱۷۸۷ء کی شب میں آسٹرین فوج کے ایک دستہ نے بلغراد پر اچانک حملہ کر دیا، چوں کہ بقیہ دستے وقت پر پہنچ نہ سکے تھے، اس لیے یہ حملہ ناکام رہا اور قریب تھا کہ پورا دستہ ترکوں کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا لیکن آسٹرین کمانڈر نے بلغراد کے سرعسکر سے معافی مانگ کر اپنے سپاہیوں کی جان بچائی، سرعسکر نے ان حملہ آوروں کو صحیح وسالم واپس چلے جانے کی بھی اجازت دے دی، باب عالی نے حکومت آسٹریا کے اس شرم ناک طرز عمل کی شکایت جوزف سے کی اور اسے وہ زمانہ یاد دلایا جب شہنشاہ چارلس ششم کی وفات پر یورپ کی مسیحی سلطنتیں جنگ جانشینی کو برپا کر کے آسٹریا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھیں اور میریا تھریسیا کو اس کے حق سے محروم کر دینے پر تلی ہوئی تھیں لیکن دولت علیہ نے آسٹریا کے مصائب سے فائدہ اٹھانا گوارا نہ کیا، حالاں کہ اسے چارلس کے فریب کا بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع تھا بلکہ اس کے برخلاف وہ انتہائی دیانت داری کے ساتھ اپنے معاہدہ کی پابند رہی اور آسٹریا کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے قطعی طور پر انکار کر دیا لیکن جیسا کہ کریسی نے لکھا ہے کہ حکومت آسٹریا پر حرص وہوس کا اتنا غلبہ تھا کہ احسان مندی، ایمان داری اور وقار وعزت کے شریفانہ جذبات اس کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکے، چنانچہ ۱۰/فروری ۱۷۸۸ء کو جوزف نے دولت علیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

جوزف کو نہ صرف بوسنیا اور سرویا بلکہ مولڈیویا اور ولاچیا کی فتح کا حوصلہ بھی تھا، چنانچہ اس مہم کے لیے اس نے دو لاکھ فوج اور دو ہزار توپیں فراہم کیں، طے یہ پایا کہ ایک روسی فوج مولڈیویا میں داخل ہو کر آسٹریا کی فوج کے ساتھ آگے بڑھے گی لیکن چوں کہ اس زمانہ

میں سویڈن اور روس کے درمیان جنگ چھڑ گئی، اس لیے کیتھرائن آسٹریا کی مدد کے لیے دس ہزار سے زیادہ فوج روانہ نہ کر سکی، اسی معذوری سے روسی بیڑا بھی حسب وعدہ بحر الجین میں نہ پہنچ سکا، تاہم بحر اسود میں روس کا ایک طاقت ور بیڑا جنگ کے لیے تیار تھا اور روسی فوجیں بحر اسود اور بحر کاسپین کے درمیانی علاقوں میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، روس کی خاص فوج شہزادہ پوٹمکن کی سپہ سالاری میں دریائے بوگ کے قریب پڑی ہوئی تھی لیکن اگست ۱۷۸۸ء تک روسی فوجیں صرف تیاریوں میں مصروف رہیں اور کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔

جوزف کی مضحکہ خیز شکست باب عالی نے یہ دیکھ کر کہ روس کی طرف سے فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے، ایک زبردست فوج آسٹریا کے مقابلہ میں روانہ کی، جس نے دریائے ڈینوب کو عبور کر کے منڈیا کے مقام پر آسٹرین فوج کو شکست دی، جوزف اس شکست خوردہ فوج کی مدد اور ہنگری کی حفاظت کے لیے اسّی ہزار سپاہیوں کے ساتھ فوراً روانہ ہوا اور سلاطنیہ میں خیمے نصب کر دیے جہاں سے قریب ہی صدر اعظم کا لشکر پڑا ہوا تھا لیکن بالکل آخر وقت میں جب کہ عثمانی لشکر پر حملہ کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں جوزف کو اپنی کامیابی میں شبہ پیدا ہوا اور اس کی ہمت چھوٹ گئی، وہ ایسا گھبرایا کہ فوراً ہی کوچ کا فیصلہ کر لیا، اس خطرہ سے کہ مبادا ترکوں کو خبر ہو جائے اور وہ دفعۃً حملہ کر دیں، واپسی نہایت خفیہ طور پر آدھی رات کو شروع ہوئی، آسٹرین فوج میں سخت اضطراب برپا تھا، وہ تیزی کے ساتھ تمیسوار کی طرف بھاگی جا رہی تھی، اتنے میں کسی طرف سے یہ خبر اڑ گئی کہ ترک پیچھا کرتے ہوئے آ رہے ہیں اور عن قریب حملہ کیا چاہتے ہیں، اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ ساری فوج میں انتہا درجہ کی بدحواسی پھیل گئی، توپ خانے پیچھے تھے اور پوری رفتار کے ساتھ بھگائے ہوئے لائے جا رہے تھے، پیدل سپاہیوں نے یہ سمجھا کہ ترک سر پر آ گئے، انہوں نے فوراً چھوٹے چھوٹے دستے قائم کر کے ہر طرف بے تحاشا گولیاں چلانی شروع کر دیں، جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ دستے خود ایک دوسرے ہی پر گولیاں چلا رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہی ہاتھوں سے

دس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، اس کے بعد ترکوں نے پہنچ کر دراصل حملہ کیا، آسٹرین پہلے ہی سے ہمت ہار چکے تھے، مقابلہ نہ کر سکے اور سراسیمہ ہو کر بھاگے، ان کے توپ خانوں اور لاؤ لشکر کا بڑا حصہ ترکوں کے ہاتھ آیا، جوزف کا شوق سپہ سالاری پورا ہو گیا، اس نے پھر کسی فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں کی، یہ واقعہ ستمبر کا تھا، نومبر میں آسٹریا اور دولت علیہ کے درمیان تین مہینہ کے لیے عارضی صلح ہو گئی، اس ایک سال کی مہم میں آسٹریا کے تیس ہزار آدمی میدان جنگ میں اور چالیس ہزار وبائی بیماریوں سے ہلاک ہو گئے تھے[1]۔

سقوط اوکزاکوف اگست ۱۷۸۸ء میں پوٹمکن نے اوکزاکوف کا محاصرہ شروع کر دیا تھا لیکن دسمبر تک یہ قلعہ فتح نہ ہو سکا، آخر میں عاجز آ کر اس نے جنرل سوارو کو مدد کے لیے بلایا، سوارو کے پہنچنے سے محاصرہ کی شدت بہت بڑھ گئی، آخری حملہ ۱۶ر دسمبر کو ہوا، چار ہزار روسی ترکی بندوقوں کی باڑھ سے ڈھیر ہو گئے لیکن سوارو تازہ دستے پے در پے آگے بھیجتا جاتا تھا، آخر میں روسیوں کی کثرت تعداد غالب آئی اور وہ قلعہ میں داخل ہو گئے، اندر پہنچنے کے بعد بھی ترکوں نے حیرت انگیز جاں بازی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، مگر روسی فوجوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو وہ زیادہ دیر تک روک نہ سکے، روسیوں نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد قتل عام شروع کر دیا اور تین روز تک ناقابل ذکر درندگی کے ساتھ یہ خونیں کھیل کھیلتے رہے، بوڑھے، بچے اور عورتیں سب کے سب نہایت سفاکی سے تہ تیغ کر دیے گئے، چالیس ہزار کی آبادی میں سے صرف چند سو جانیں ''جن میں زیادہ تر بچے اور عورتیں تھیں'' روسیوں کی خوں خوار تلواروں سے سلامت بچ سکیں، یہ قلیل تعداد بھی بعض روسی افسروں کی ذاتی کوششوں سے بچ سکی۔

اوکزاکوف کے محاصرہ میں اٹین، شہزادہ پوٹمکن کے ساتھ تھا، ترکوں کی شجاعت اور سرفروشی کے مناظر تو اس نے پہلے بھی دیکھے تھے مگر اس موقع پر وہ ان کے صبر و استقلال کا مشاہدہ کر کے حیرت زدہ ہو گیا، وہ لکھتا ہے:

---

[1] ایورسلے، ص ۲۴۱۔

''ترکی عورتیں اور بچے (جن کی تعداد چار سو تھی) اوکزاکوف کی فتح کے بعد جب شہر سے نکال کر روسی فوج کے پڑاؤ پر لائے گئے تو پہلی رات کو سب کے سب ایک خیمہ میں ٹھہرا دیے گئے، موجودہ حالات میں ان کے قیام کے لیے اس سے بہتر کوئی انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا، گو اس رات کو سخت برف باری ہو رہی تھی اور ان غریبوں کو سردی کی شدت اور کپڑوں کے نہ ہونے سے بے حد تکلیف تھی، ان میں بہتیرے زخموں کی شدید تکلیف میں بھی مبتلا تھے، چوں کہ میں ترکی زبان بولتا تھا، اس لیے مجھے ان کی حفاظت اور نگرانی کی خدمت سپرد کی گئی، میں نے دیکھا کہ ان سبھوں پر کامل سکوت طاری ہے، کوئی عورت نہ روتی ہے نہ آہ و فغاں کرتی ہے، حالاں کہ ان میں شاید ہر ایک کا باپ یا بچہ یا شوہر قتل ہو چکا تھا، یہ عورتیں سکون اور استقلال کے لہجہ میں بات کرتیں اور جو سوالات میں ان سے کرتا ان کے جواب بغیر کسی اضطراب کے دیتی ہیں، میں حیرت میں تھا اور یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کی یہ حالت بے حسی کا نتیجہ ہے یا اس بات کا کہ انہوں نے قسمت کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے اور سنے ہیں اور یا پھر ان سب کا سبب تسلیم و رضا کی وہ تعلیم ہے جو ان کا مذہب انہیں دیتا ہے اور آج بھی میں اس کا سبب معلوم کرنے سے ویسا ہی قاصر ہوں، ان میں سے ایک عورت خاموش لیکن غیر معمولی طور پر غمگین انداز میں بیٹھی ہوئی تھی، میرا جی چاہا کہ اسے کچھ تسلی دوں، چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ تو کیوں نہیں ہمت سے کام لیتی اور مصیبت کو ایک مسلمان کی طرح برداشت کرتی جیسے کہ تیری ساتھی عورتیں برداشت کر رہی ہیں، اس نے میرا جواب ان مؤثر الفاظ میں دیا ''میں نے اپنے باپ، اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اب میرا ایک ہی بچہ رہ گیا ہے'' میں نے جلدی سے پوچھا کہ وہ بچہ کہاں ہے؟ ان نے سکون کے ساتھ جواب دیا کہ ''یہ ہے'' اور ایک بچہ کی طرف اشارہ کیا جو اس کے پہلو میں پڑا ہوا تھا اور جس نے اسی وقت دم توڑا تھا، میں اور وہ لوگ جو میرے ساتھ تھے، بے اختیار رو پڑے لیکن وہ ذرا بھی نہیں روئی، اس رات کو میں ان مصیبت زدہ

عورتوں اور بچوں کو زخموں اور سردی کی تکلیف سے مر رہے تھے اپنے گرم زمین دوز کمرے میں لے گیا اور جتنے آدمیوں کی اس میں گنجائش تھی، اتنوں کو وہاں ٹھہرایا، وہ لوگ بارہ روز میرے ساتھ رہے لیکن اس پوری مدت میں ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ کوئی شکوہ کیا اور نہ اپنے شدید اندرونی صدمہ کو ظاہر ہونے دیا، بلکہ ہر عورت خواہ وہ بوڑھی ہو یا جوان اپنی سرگذشت مجھ سے اس طرح بیان کرتی تھی جیسے وہ کسی غیر متعلق آدمی کا قصہ کہہ رہی ہو، بغیر فریاد، بغیر ٹھنڈی سانسوں اور بغیر آنسوؤں کے[1]۔"

سلطان کی وفات دوسرے سال مارچ ۱۷۸۹ء میں صدر اعظم یوسف پاشا تازہ فوجوں کے ساتھ آسٹریا کی مہم پر روانہ ہوا، اس نے فوج کا ایک حصہ پیچھے چھوڑ دیا تا کہ ولاچیا اور مولڈیویا میں غنیم کی نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی رہے اور خود نوے ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے ڈینوب کو عبور کر کے ٹرانسلوینیا میں داخل ہو گیا، وہاں سے اس کا قصد خود آسٹریا پر چڑھائی کرنے کا تھا لیکن ۷/اپریل ۱۷۸۹ء کو سلطان عبدالحمید کا انتقال ہو گیا اور سلیم ثانی کی تخت نشینی کے ساتھ ہی صدارت کے عہدہ پر بھی ایک دوسرا آدمی مقرر کیا گیا، نیا صدر اعظم ودین کا سابق والی تھا، فوجی لیاقت کے اعتبار سے وہ صدر اعظم کے عہدہ کا بالکل مستحق نہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف پاشا کہ مہم فسخ کر دی گئی اور عثمانی فوجیں ٹرانسلوینیا سے واپس بلالی گئیں۔

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۲۹۳-۲۹۲، فٹ نوٹ۔

سلیم ثالث

۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء

سلطان سلیم خاں ثالث ستائیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، وہ فطرتاً بہت ذہین اور حوصلہ مند تھا اور اس کے چچا سلطان عبدالحمید اول نے اس کی تعلیم و تربیت خاص توجہ کے ساتھ کی تھی، دولت عثمانیہ کے مروجہ دستور کے مطابق سلیم کو بھی عبدالحمید کے عہد حکومت میں نظر بند رہنا پڑا تھا لیکن یہ نظر بندی محض برائے نام تھی، سلطان مرحوم کی غیر معمولی شفقت نے اسے بہت زیادہ آزادی دے رکھی تھی، جس سے فائدہ اٹھا کر اس نے امور سلطنت سے متعلق بہت کچھ مفید معلومات حاصل کر لیے تھے، اس کے احباب میں ایک اطالوی طبیب لورنزو (Lorenzo) نامی تھا، اس کے ذریعہ سے اس نے مغربی یورپ کی سلطنتوں کے ملکی اور فوجی دستور و قوانین سے بھی کافی واقفیت حاصل کر لی تھی اور وہ اسباب بھی معلوم کر لیے تھے، جنھوں نے مغربی قوموں کو آل عثمان کے مقابلہ میں نمایاں طور پر فائق و ممتاز بنا دیا تھا، اس نے شاہ فرانس اور اس کے بعض وزراء سے خفیہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا تھا اور سلطنت عثمانیہ میں اصلاحات جاری کرنے کے بارہ میں ان سے مشورہ کیا کرتا تھا، اس کے والد مرحوم سلطان مصطفیٰ خان ثالث نے اس کے لیے اپنے عہد حکومت کی ایک سرگذشت چھوڑی تھی، جس میں اس عہد کے خاص خاص واقعات، ترکوں کے انحطاط و

زوال اور نظام سلطنت کے فساد وانتشار پر مفصل تبصرہ تھا اور آخر میں ان خرابیوں کو دور کرنے کی وصیت بھی درج تھی، چنانچہ تخت پر آنے سے پہلے ہی سلیم اصلاحات کے لیے تیار ہو چکا تھا اور زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کے بعد غالباً سب سے پہلا کام یہی کرتا لیکن روس و آسٹریا سے جنگ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا، اس لیے اس کو ساری توجہ اسی جانب مبذول کرنی پڑی اور اصلاحات کو مجبوراً کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دینا پڑا۔

جنگ کا سلسلہ شہنشاہ جوزف گذشتہ تجربہ کی بنا پر نیز علالت کی معذوری سے خود میدانِ جنگ میں نہ آسکا اور آسٹرین فوج کی کمان مارشل لوڈن (Loudon) کے سپرد کی جو جنگ ہفت سالہ کا ایک آزمودہ کار اور مشہور جنرل تھا، لوڈن نے بوسنیا اور سرویا پر حملہ کیا اور ان دونوں صوبوں میں اسے کامیابی ہوئی، سرویا کی عیسائی رعایا نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن بوسنیا کی مسلمان آبادی جاں بازی سے مقابلہ کرتی رہی، بہر حال بوسنیا اور سرویا کے بیش تر علاقوں پر لوڈن نے قبضہ کر لیا، آسٹریا کی ایک دوسری فوج شہزادہ کوبرگ (Coburg) کی سرکردگی میں جنرل سوارو کی روسی فوج کے ساتھ مولڈیویا کی طرف بڑھی، سلطان سلیم نے ان کے مقابلہ میں حسن پاشا کو سالار عسکر بنا کر روانہ کیا، حسن پاشا ایک بڑی فوج کے ساتھ شہزادہ کوبرگ کی طرف بڑھا جو مولڈیویا کی سرحد پر فوکشانی میں پڑا ہوا تھا، کوبرگ کی شکست یقینی تھی اگر سوارو ۳۶ رگھنٹے کے اندر ساٹھ میل کا دشوار گزار پہاڑی راستہ طے کر کے اس کی مدد کو عین وقت پر نہ پہنچ گیا ہوتا، اس نے ترکی حملہ کا انتظار نہ کیا بلکہ پہنچنے کے چند ہی گھنٹوں کے بعد خود حسن پاشا کے لشکر پر حملہ کر دیا، یہ حملہ پوری طرح کامیاب رہا، ترکوں کے پیر اکھڑ گئے اور ان کا تمام توپ خانہ اور بہت زیادہ سامان غنیم کے ہاتھ آیا، اس کے بعد سلطان نے ایک دوسری فوج روانہ کی، جس سے ۱۶ ستمبر ۱۷۸۹ء کو دریائے رینک کے قریب جنرل سوارو کی فوج سے سخت مقابلہ ہوا، اس معرکہ میں بھی ترکوں کو شکست ہوئی، ان پے در پے شکستوں سے قسطنطنیہ میں سخت شورش پھیلی اور لوگوں نے سارا الزام سالار

عسکر حسن پاشا کے سر عائد کر کے سلطان سے اس کے قتل کا مطالبہ کیا، حسن پاشا دولت علیہ کی خدمت میں بوڑھا ہو گیا تھا اور اس نے سلطنت کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے لیکن اس شورش کے فرو کرنے کے لیے سلیم کو مجبوراً اس کے قتل کا حکم دینا پڑا، اسی سال بلغراد اور سمندریا پر بھی آسٹریا کا قبضہ ہو گیا، ۱۷۹۰ء میں آسٹریا اور روس کی فوجیں متحدہ طور پر قسطنطنیہ کی جانب بڑھنے والی تھیں لیکن دو وجوہ سے یہ مہم ناتمام رہی۔

آسٹریا سے صلح پہلی بات تو یہ ہوئی کہ شہنشاہ جوزف نے اپنی وسیع سلطنت میں جو اصلاحات جاری کی تھیں، ان کے خلاف سلطنت کے تقریباً ہر حصہ میں بغاوت برپا ہو گئی اور اسے مجبوراً اپنی فوجیں اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ترکوں کے مقابلہ سے ہٹا لینی پڑیں، دوسرا سبب یہ ہوا کہ ۱۷۹۰ء ہی میں جوزف کا انتقال ہو گیا اور اس کا جانشین اس کا بھائی گرانڈ ڈیوک لیوپولڈ (Leopold) ہوا، وہ شروع ہی سے اپنی سلطنت کے اندرونی خلفشار اور حکومت پرشا کی دراز دستیوں کے اندیشہ سے دولت عثمانیہ سے ایک باعزت صلح کر لینے کا خواہش مند تھا، علاوہ بریں وہ دولت عثمانیہ کے خلاف روس سے اتحاد کرنے کو سلطنت آسٹریا کے لیے کچھ مفید نہیں خیال کرتا تھا، چنانچہ چند چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد جن میں سے ایک میں آسٹرین فوج نے اورسوا پر قبضہ کر لیا اور دوسری میں گرجیوو کے قریب میدان ترکوں کے ہاتھ رہا، باب عالی اور آسٹریا کے درمیان عارضی طور پر صلح ہو گئی، جس کا تکملہ ۴ اراگست ۱۷۹۱ء کو صلح نامہ سستوا (Sistsva) کے ذریعہ کر دیا گیا، اس صلح نامہ کی ترتیب میں انگلستان، پرشا اور ہالینڈ کی وساطت کو خاص دخل تھا، اس کے رو سے آسٹریا نے وہ تمام علاقے جو دوران جنگ میں بوسنیا، سرویا اور ولاچیا کے صوبوں میں فتح کیے تھے اور جن میں بلغراد اور سمندریا کے اہم قلعے بھی شامل تھے، دولت عثمانیہ کو واپس کر دیے، صرف کروشیا کے ایک مختصر سے خطہ اور اورسوا کے قدیم شہر پر اپنا قبضہ باقی رکھا۔

یونانیوں کی بغاوت لیکن کیتھرائن نے دولت علیہ سے صلح کرنے میں انگلستان پرشا

اور ہالینڈ کی وساطت قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا، حالاں کہ ان ہی کی مداخلت سے اسے سوئیڈن کے ساتھ صلح کرنی پڑی تھی، وہ اب تک قسطنطنیہ کی فتح کا خواب دیکھ رہی تھی اور فخریہ کہتی تھی کہ اگر مغربی سلطنتیں اسے سینٹ پیٹرس برگ چھوڑنے پر مجبور کریں گی تو وہ قسطنطنیہ کو اپنا دار السلطنت بنائے گی، اسی مقصد سے اس نے یونانیوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف بھڑکانے کی پوری کوشش کی اور ۱۷۸۸ء میں جنگ شروع ہونے سے قبل یونان کے ہر حصہ میں اپنے نمائندے بھیج کر وہاں کے باشندوں کو بغاوت کے لیے تیار کر دیا، چنانچہ ۱۷۹۰ء میں یونان کے چند ممتاز آدمیوں کا ایک وفد بھی اس کی خدمت میں سینٹ پیٹرس برگ حاضر ہوا اور ترکوں کے آزادی حاصل کرنے کے لیے اس سے فوجی مدد کی استدعا کی، کیتھرائن نے مدد دینے کا وعدہ کیا، پھر وفد شہزادہ قسطنطین کے پاس گیا، جسے کیتھرائن نے بازنطینی سلطنت کا پہلا تاج دار نام زد کیا تھا، قسطنطین نے ارکان وفد سے یونانی زبان میں کہا، جاؤ تم جیسا چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا، یونانیوں نے تیرہ جہازوں کا ایک بیڑا تیار کر رکھا تھا، کیتھرائن نے اس کے لیے توپیں فراہم کر دیں اور ایک یونانی افسر لمبرو کویزیانی (Lambro Caviaziani) کو اس بیڑہ کا امیر البحر مقرر کیا لیکن جب بحر الجین میں عثمانی جہازوں سے مقابلہ ہوا تو پورا یونانی بیڑا شکست کھا کر غرق ہو گیا۔

سقوط اسمٰعیل بحری جنگ کا یہ نتیجہ کیتھرائن کے لیے زیادہ تشویش کا باعث نہ ہوا کیوں کہ اس کی بری فوجیں کام یابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، ۱۷۹۰ء کو سب سے بڑا معرکہ اسمٰعیل کی فتح تھی، جو بحر اسود سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر دولت عثمانیہ کا ایک نہایت اہم قلعہ تھا، روسی فوجوں کے بلغاریا میں داخل ہونے کے لیے اس قلعہ کی فتح نہایت ضروری تھی، پوٹمکن نے مہینوں اس کا محاصرہ جاری رکھا لیکن اسے کام یابی نہ ہوئی، آخر میں اس نے یہ مہم جنرل سوارو کے سپرد کی، سوارو نے ۱۶ر دسمبر کو کمان اپنے ہاتھ میں لی اور ۲۲ر دسمبر کو روسی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں، ترکی دستہ نے مدافعت میں جاں بازی کا حق ادا کر دیا،

روسیوں کو اصلی مقابلہ شہر میں داخل ہونے کے بعد پیش آیا، بقول کریسی ہر سڑک ایک میدان جنگ تھی اور ہر مکان ایک قلعہ تھا، آخر میں روسی ہر طرف قتل عام کرتے ہوئے ناف شہر میں پہنچے جہاں ترکوں اور تاتاریوں کا ایک دستہ عثمانی شجاعت کے حیرت انگیز جوہر دکھانے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا، دو گھنٹے نہایت سخت لڑائی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس دستہ کا ایک ایک سپاہی لڑتے ہوئے مارا گیا، اس جنگ میں چونتیس ہزار ترک ہلاک اور دس ہزار گرفتار ہوئے، روسیوں نے شہر میں داخل ہو کر درندگی کی جو مثال پیش کی اس سے خود سوراروکی نگاہیں بھی نا آشنا تھیں، چنانچہ اس نے اپنے ایک دوست سے بعد میں اعتراف کیا کہ اس ناقابل دید منظر کو دیکھ کر میری آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے تھے[1]۔

صلح کی گفتگو سلطان سلیم نے روس کے مقابلہ میں تازہ فوجیں روانہ کیں لیکن انہیں بھی شکست ہوئی، اس درمیان میں انگلستان، پرشا اور ہالینڈ صلح کے لیے برابر کوشش کر رہے تھے، شروع میں تو کیتھرائن نے ان کی مداخلت کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور شاہ پرشا کو یہ جواب لکھوا دیا کہ "زارنیہ جنگ و صلح میں صرف اپنی خواہش کی پابند ہے اور امورِ مملکت میں کسی کی مداخلت گوارا نہ کرے گی" لیکن جب اکتوبر ۱۷۹۱ء میں جنگ کے سب سے بڑے محرک اور حامی پوٹمکن کا انتقال ہو گیا اور اتحاد ثلثہ (انگلستان، ہالینڈ اور پرشا) کی طرف سے بھی اصرار بڑھتا ہی گیا تو مجبوراً کیتھرائن نے صلح کے شرائط پر گفتگو کرنا منظور کر لیا، اتحادیوں نے روس کے سامنے بھی وہی شرط پیش کی، جس پر آسٹریا کو رضامند کیا گیا تھا، یعنی فریقین دوران جنگ کے تمام مفتوحات سے دست بردار ہو جائیں لیکن کیتھرائن کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئی اور صلح سے صاف انکار کر دیا، وہ کم از کم اوکزاکوف اور دریائے نیسٹر و دریائے بوگ کے درمیانی علاقہ پر اپنا قبضہ قائم رکھنا چاہتی تھی، اتحادی اس پر رضامند نہ تھے اور انہوں نے روس پر دباؤ ڈالنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

---

[1] ایور سلے، ص ۲۳۱۔

انگلستان کی نئی پالیسی انگلستان کے لیے روس کی مخالفت ایک بالکل نئی چیز تھی، اٹھارہویں صدی کے پیش تر حصہ میں روس کے ساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے اور اس نے کبھی ان جارحانہ تجاویز کی مخالفت نہیں کی جو دولت عثمانیہ کے خلاف حکومت روس کے پیش نظر تھیں اور جن پر وہ استقلال کے ساتھ عمل کرتی چلی آرہی تھی، لارڈ چیتھم (Lord Chatham) وزیر اعظم برطانیہ جس کی سیاست خارجہ پر اب تک عمل درآمد تھا، ترکوں کی حمایت کا مستقل طور پر مخالف تھا، یہ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۷۸۴ء میں کیتھرائن نے کریمیا کو زبردستی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تو انگلستان میں اس کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہیں ہوئی، برخلاف اس کے چارلس فاکس نے جو اس وقت وزیر خارجہ تھا، علانیہ کہا کہ "میری سیاست خارجہ ایک عمیق بنیاد پر قائم ہے، شمالی طاقتوں (بہ شمول روس) سے اتحاد رکھنا ہر روشن خیال انگریز کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"[1] اسی بنا پر جب ۱۷۹۱ء میں انگلستان کے نوجوان وزیر اعظم مسٹر پٹ (Pitt) نے حکومت کی قدیم سیاست سے جس پر خود اس کا باپ لارڈ چیتھم شدت سے عامل تھا، انحراف کر کے دولت عثمانیہ کی حمایت میں روس کو صلح کے لیے مجبور کرنا چاہا تو اور پارلیمنٹ سے ایک جنگی بیڑہ کی تیاری کے لیے روپیہ کی درخواست کی تاکہ اگر کیتھرائن اتحادیوں کی وساطت کو مسترد کردے اور صلح کے لیے راضی نہ ہو تو اسے جنگی جہازوں کے ذریعہ راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، تو انگلستان میں اس تحریک کی پرزور مخالفت کی گئی اور پارلیمنٹ میں فاکس نے جو اب مخالف پارٹی کا لیڈر تھا، نہایت شدت کے ساتھ اختلاف کیا، پٹ نے اس بیڑہ کو پرشا کے تحفظ اور یورپ میں توازن قوت کے قائم رکھنے کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے اپنی تقریر میں اصلی زور ان ہی دو مقاصد پر دیا، اس نے بتایا کہ ترکوں کی حمایت مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ ان مقاصد کے حصول میں دولت عثمانیہ کی بقا معین ہوتی تھی، پارلیمنٹ میں اس مسئلہ پر کئی بار بحثیں ہوئیں جن میں

---

[1] ایورسلے، ص ۲۳۲۔

مخالف پارٹی کے مقرروں نے ترکی کو محض ایک وحشی ملک ٹھہرایا اور کہا کہ نہ یورپ کے نظامِ مملکت میں اسے کوئی دخل ہے اور نہ اس کے حشر کا کوئی اثر توازنِ قوت پر پڑ سکتا ہے، انہوں نے کیتھرائن کی فراخ دلی اور عالی ظرفی کی تعریف و تحسین میں واقعات کو نظر انداز کر دیا اور روس کی دراز دستیوں کی طرف سے جو خطرہ مسٹر پٹ نے یورپین مملکتوں سے متعلق ظاہر کیا تھا، اس کا خوب مضحکہ اڑایا، فاکس نے کہا کہ سلطنت عثمانیہ پر روس کا قبضہ ہو جانا ایک خلاف قیاس بات ہے اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو بہتر ہی ہوگا، اس کی جماعت کے ایک رکن مسٹر وہٹ بریڈ (Whotbread) تھے، انہوں نے فرمایا ''فرض کیجیے کہ زارنیہ کے قصد و ارادہ کی نسبت جو باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ سب پوری بھی ہو جائیں اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے ترکوں کو ان کے تمام یورپین صوبوں سے نکال دے تو بھی کیا کوئی غیر جانب دار شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اس واقعہ سے نوعِ انسانی کو بہت کچھ فائدہ پہنچے گا''[1] ۱۷۹۲ء کے سیشن میں اس مسئلہ پر پھر بحث ہوئی اور مسٹر پٹ نے واضح طور پر بیان کیا کہ آئندہ انگلستان کی سیاستِ خارجہ کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ یورپ میں توازن کو قائم رکھا جائے اور اسی بنا پر جہاں تک ممکن ہو نہ سلطنت روس کی قوت کو بڑھنے دیا جائے اور نہ سلطنت عثمانیہ کی قوت کو گھٹنے دیا جائے[2]۔

فاکس وغیرہ کی شدید مخالفت کے باوجود پارلیمنٹ کے کثرت رائے سے پٹ کی تجویز منظور کر لی لیکن پٹ کو اس کا اندازہ بہ خوبی ہو گیا تھا کہ رائے عامہ روس سے جنگ کرنے کی مخالف ہے، چنانچہ اس نے اپنی تجویز واپس لے لی اور روس کے مقابلہ میں جنگی بیڑہ بھیجنے کا خیال ترک کر دیا لیکن وہ روس کی قوت کو بڑھنے دینے پر کسی طرح تیار نہ تھا، اس کے نزدیک روس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جلد سے جلد صلح ہو جانا نہایت ضروری تھا، اس غرض سے وہ کیتھرائن پر برابر دباؤ ڈالتا رہا۔

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۳۰۸ [2] ایضاً ص ۳۰۹۔

صلح نامۂ یاسی کیتھرائن بھی اب صلح کے لیے آمادہ معلوم ہوتی تھی، پولینڈ کے جو صوبے روس، آسٹریا اور پرشا کی غاصبانہ تقسیم کے بعد اہل ملک کے زیر حکومت باقی رہ گئے تھے، ان میں محبان وطن نے کوسی اسکو (Kosciusko) کے زیر قیادت اصلاحات شروع کر دی تھیں، جو کیتھرائن کے مصالح کے منافی تھیں، وہ پولینڈ کی دوسری تقسیم کا عزم کر چکی تھی اور اب چاہتی تھی کہ ترکوں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد جنرل سوارو کو روس کی فتح مند اور آزمودہ کار فوجوں کے ساتھ پولینڈ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کرے، چنانچہ ۱۷۹۱ء کے وسط ہی سے صدر اعظم اور جنرل ریپن میں صلح کی گفتگو شروع ہوگئی اور اگست میں تمام شرائط طے ہوگئے، ۹/ جنوری ۱۷۹۲ء کو یاسی کے مقام پر فریقین میں باضابطہ طور پر ایک صلح نامہ مرتب ہوگیا، اس کی ترتیب وتکملہ میں کوئی دوسری حکومت شریک نہیں کی گئی، روس نے قلعہ اوکزاکوف اور دریائے نیسٹر اور دریائے بوگ کے درمیانی علاقہ کے علاوہ تمام فتوحات جو بسرابیا، مولدیویا، ولاچیا اور کیوبان کے صوبوں پر مشتمل تھیں، دولت عثمانیہ کو واپس کر دیں اور دریائے نیسٹر سلطنت روس کی نئی سرحد قرار پایا، جس کے مغرب کے تمام مفتوحہ علاقے سلطنت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے، یونان بدستور باب عالی کے زیر حکومت رہا، اس صلح نامہ کے رو سے کیوبان کا صوبہ بھی دولت علیہ کو واپس مل گیا لیکن اس علاقہ میں جو چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں ان پر زارنیہ کی سیادت تسلیم کر لی گئی۔

کیتھرائن کی موت کیتھرائن نے یہ صلح محض حالات سے مجبور ہو کر کی تھی اور اس سے اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ پولینڈ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد پوری تیاری کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کے یورپی اور ایشیائی صوبوں پر بیک وقت حملہ کر دے، چنانچہ چار سال کے اندر اس نے پولینڈ پر اپنا تسلط مکمل طور پر قائم کر لیا، ۱۷۹۳ء میں پولینڈ کی دوسری تقسیم عمل میں آئی جس میں کیتھرائن اور فریڈرک نے آسٹریا کو شریک نہیں کیا لیکن ۱۷۹۵ء میں جب یہ بدقسمت ملک آخری طور پر تقسیم کیا گیا تو اس لوٹ میں روس، پرشا اور آسٹریا تینوں

شریک ہوئے، غرض پولینڈ کی طرف سے مطمئن ہو کر کیتھرائن نے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کی تیاریاں فوراً شروع کر دیں، اس نے تین لاکھ فوج اور ایک زبردست فوجی بیڑہ تیار کیا تھا اور جنگ کا اعلان بہت جلد کرنے والی تھی لیکن قضا نے مہلت نہ دی اور ۱۷۹۶ء میں اس کی موت کی وجہ سے یہ مہم جو دولت عثمانیہ کے لیے غالباً روس کی سابق جنگوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی ملتوی ہو گئی۔

ملکی نظم ونسق سلطان سلیم نے صلح نامہ یاسی کے بعد اپنی ساری توجہ ملکی اصلاحات پر مرکوز رکھنی چاہی کیوں کہ سلطنت کے ہر شعبہ خصوصاً محکمہ فوج کی حالت حد درجہ خراب تھی لیکن چند ہی سال کے بعد فرانس سے جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے اصلاحات کا کام جو شروع کر دیا گیا تھا ملتوی ہو گیا، اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ کے نظم ونسق کی جو حالت تھی اس کا اندازہ کریسی کے صفحات سے بہ خوبی ہوتا ہے، ہم اس کے بیان کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں:

پاشا سلیم کی سلطنت میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کی چھبیس ولایتیں شامل تھیں، یہ ولایتیں ایک سو ترسٹھ علاقوں میں تقسیم تھیں جن کو لوا کہتے تھے، ہر لوا میں متعدد قضا یا ضلع ہوتے تھے، ہر قضا اپنا انتظام خود کرتا اور وہ عموماً ایک شہر اور اس کے ماتحت علاقوں پر مشتمل ہوتا یا ایک صلغ (ناحیہ) پر جس میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قصبے یا گاؤں شامل ہوتے تھے، ولایت کا حاکم ایک پاشا ہوتا تھا جسے ''سہ اسپ دمہ'' نشان عطا ہوتا تھا[1]، ایسے پاشا کا منصب ایک وزیر کے منصب کے برابر ہوتا، وہ اپنی ولایت کے ایک یا چند خاص لواؤں پر براہ راست حکومت کرتا، بقیہ لواؤں کے مقامی حکام پر وہ ایک عام سیادت رکھتا تھا، بہتر لواؤں کی

---

[1] یہ عثمانی فوج کا نشان تھا، گھوڑے کی دم نیزہ کے سرے پر باندھ دی جاتی تھی اور پاشاؤں کے منصب کے لحاظ سے دموں کی تعداد معین ہوتی تھی، چنانچہ درجہ اول کے پاشا ''پاشائے سہ نشان'' اور درجہ دوم وسوم کے ''پاشائے دو نشان'' یا ''پاشائے یک نشان'' کہے جاتے تھے۔

حکومت ایسے پاشاؤں کے سپرد تھی جو"پاشائے دونشان" تھے،ان ہی لواؤں اور ولایتوں کو عموماً پاشالق کہتے تھے،عام طور پر پاشاؤں کا تقرر ہر سال ہوتا تھا لیکن اگر کوئی پاشا اتنا طاقت ور ہوتا کہ اسے برطرف کرنے میں باب عالی کو بغاوت کا اندیشہ ہوتا یا وہ دیوان عالی کے بعض وزراء کو رشوت کے ذریعہ سے اپنا حامی بنائے رکھتا تو ایک ہی شخص کئی کئی سال تک بلکہ کبھی کبھی تمام عمر اپنے عہدہ پر مامور رہتا،بائیس لواؤں کے پاشامدت العمر کے لیے مقرر ہوتے تھے۔

اعیان انتظام کے سلسلہ میں پاشا کی مدد کے لیے باب عالی کی طرف سے دو یا تین آدمی مقرر کیے جاتے تھے،جن کا انتخاب اس ولایت (صوبہ) کے باشندے کرتے تھے،یہ لوگ اعیان کہلاتے تھے،کبھی کبھی اعیان کا عہدہ موروثی ہوتا تھا لیکن اس صورت میں یہ ضروری تھا کہ نئے اعیان کو اپنے مورث کی جگہ پر مقرر ہونے کے لیے باشندوں کی کثرت رائے حاصل ہو،عیسائی رعایا کے افسران ہی کی قوموں میں سے مقرر کیے جاتے تھے،جو ٹیکس ان کے ضلع پر لگایا جاتا تھا،اس کی تشخیص افراد پر یہی افسر کیا کرتے تھے۔

باب عالی کا ضعف گو اٹھارہویں صدی کے آخر تک سلطنت عثمانیہ کے متعدد صوبے ہاتھ سے نکل گئے تھے،مثلاً ہنگری،ٹرانسلوینیا اور کریمیا میں اس کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، نیز بحر اسود اور بحر ازف کے شمالی ساحلی علاقوں سے بھی اس کا قبضہ اٹھ چکا تھا،تاہم سلطنت کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا،وہ اس وقت بھی دنیا کی عظیم الشان سلطنتوں کا ہم پلہ تھا لیکن اس وسیع سلطنت کے بہتیرے صوبوں پر سلطان کی حکومت محض برائے نام تھی،باب عالی کی کم زوری اور مقامی حکام کی خودسری قریب قریب ہر جگہ نمایاں تھی،عرب میں وہابیوں کا زور تھا،مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ جن پر ابھی تک ان کا قبضہ نہ ہوا تھا،باقی سارا ملک ان ہی کے زیر تسلط تھا،مصر میں باب عالی کے حکام کا اقتدار ختم ہو چکا تھا،اگرچہ قاہرہ میں سلطان کا علم اب بھی لہرا رہا تھا،اسی طرح شام میں دروزیوں اور لبنان اور فلسطین کے پہاڑی باشندوں نے تقریباً خودمختاری حاصل کر لی تھی،یونان کے شمالی علاقوں کے بعض فرقے بھی

خود مختار ہو گئے تھے، مونٹی نیگرو اور ہرزیگووینا کا بھی یہی حال تھا، مولڈیویا اور ولاچیا دولت عثمانیہ کو واپس کر دیے گئے تھے مگر یہ دونوں صوبے باب عالی سے زیادہ حکومت روس کے زیر اثر تھے، بغاوت اور خانہ جنگی بڑے بڑے پاشاؤں کا عام شیوہ تھا، مثلاً عکہ میں جزار پاشا نے محصول اور خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور سلطان کے آدمیوں کو جو یہ رقمیں وصول کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے قتل کرا دیا تھا، پاشائے بغداد کی خود سری بھی ایسی ہی تھی، چنانچہ کئی سال تک بغداد کی ولایت سے باب عالی کو کچھ بھی رقم وصول نہ ہوئی، ودین کا مشہور پاشا پزدان اوغلو سالوں افواج سلطانی کا مقابلہ کرتا رہا اور قریبی صوبوں پر ایک خود مختار فرماں روا کی طرح وقتاً فوقتاً حملے کیا کرتا تھا، ان کے علاوہ بہت سے دوسرے پاشاؤں کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی، ان تمام بغاوتوں اور شورشوں کا نتیجہ یہ تھا کہ سلطنت کے بہت کم حصہ میں امن و امان قائم تھا اور نہ عام طور پر رعایا بے اطمینان اور جان و مال کی طرف سے خطرہ میں مبتلا تھی۔

رعایا کے مصائب جن صوبوں کے پاشا باب عالی کے مطیع و منقاد بھی ہوتے وہاں بھی رعایا کے مصائب تھوڑے نہ تھے، پاشاؤں کا تقرر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عموماً سالانہ ہوا کرتا تھا اور اکثر رشوت کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا تھا، خود امیدوار کے پاس اس جلیل القدر عہدہ کی ''خریداری'' کے لیے کافی روپیہ مشکل سے ہوتا تھا، وہ عموماً کسی دولت مند یونانی یا ارمنی ساہوکار سے روپیہ قرض لیتا تھا اور وہ ساہوکار حقیقۃً اس پاشا بق کا مرتہن ہو جاتا تھا، اس کا ایک معتمد ایجنٹ پاشا کے ساتھ سکریٹری کی حیثیت سے رہا کرتا تھا اور اکثر وہی صوبہ کا اصلی حکم راں ہوتا تھا، یہ عیسائی ایجنٹ اپنی ہم مذہب رعایا کو خصوصیت کے ساتھ بہت ستاتے تھے، چوں کہ پاشا کو ہر سال اپنے عہدہ کی ''خریداری'' کے لیے روپیہ کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اس لیے ساہوکار کی گرفت سے آزاد ہونا آسان نہ تھا، کبھی کبھی باب عالی کی طرف سے یہ مطالبہ بھی ہوتا تھا کہ امیدوار سرکاری مال گزاری کی بروقت ادائیگی کے لیے کسی ارمنی صراف (ساہوکار) کی ضمانت پیش کرے، اس سے ساہوکاروں کا اقتدار اور بھی

بڑھ گیا تھا اور ان کا دست ستم رعایا پر زیادہ دراز ہوتا جاتا تھا، ان ساہوکاروں کے ایجنٹ رعایا سے مال گزاری وصول کرنے میں بے حد سختی کرتے تھے اور وصول کردہ رقم کا زیادہ سے زیادہ حصہ خود دبا لینے کی کوشش کرتے تھے، نتیجہ یہ تھا کہ محاصل کا بہت تھوڑا حصہ باب عالی میں پہنچتا تھا، اعیان ولایت جن کا فرض تھا کہ اپنے ہم وطنوں کو پاشا اور اس کے لٹیرے ساتھیوں کے مظالم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے، اکثر خود بھی شریک جرم ہو جاتے تھے، اعیان میں سے اگر کوئی ایمان دار شخص ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تو پاشا اس کا سخت مخالف ہو جاتا اور جھوٹے الزمات عائد کر کے قاضی کی عدالت کے ذریعہ اسے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتا، اس خوف سے اعیان بھی پاشا کی مخالفت کرتے ہوئے ڈرتے تھے، سالانہ مال گزاری اگر پابندی کے ساتھ خزانہ سلطانی میں پہنچتی رہتی تو باب عالی کی طرف سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھی جاتی کہ یہ رقم کن جائز یا ناجائز طریقوں سے وصول کی گئی ہے، البتہ اگر پاشا کے خلاف صوبوں کے باشندوں کی طرف سے پرزور شکایتیں باب عالی میں پہنچتیں اور تحقیقات کرنے پر وہ صحیح ثابت ہوتیں تو پاشا نہ صرف معزول کر دیا جاتا بلکہ اسے قتل کی سزا بھی دی جاتی لیکن اس سزا سے رعایا کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، کیوں کہ مقتول پاشا کی تمام املاک بحق سلطانی ضبط کر لی جاتی اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا پاشا مقرر کر دیا جاتا، جو مذکورہ بالا وجوہ سے ساہوکاروں ہی کی گرفت میں رہتا اور وہ بھی عموماً وہی طریقے اختیار کرتا جو اس کے پیش رو نے اختیار کیے تھے، ان تعدیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پاشا اپنی ولایتوں میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ رہا کرتے تھے جس کے قائم رکھنے کے لیے کافی روپیہ کی ضرورت ہوتی تھی، علاوہ بریں انہیں فوج بھی رکھنی پڑتی تھی جس کے اخراجات بھی صوبہ ہی کے باشندے پورے کرتے تھے۔

پاشا کے بعد بے اور آغا کا درجہ تھا، جو اپنے اپنے علاقوں میں ویسا ہی اختیار رکھتے تھے، جیسا پاشا اپنی ولایت میں رکھتا تھا، ان کے علاوہ تمام سلطنت میں ہزاروں چھوٹے

چھوٹے عمال تھے، جنہوں نے چار چار پانچ پانچ گاؤں میں مال گزاری کا ٹھیکہ باب عالی سے لے رکھا تھا، یہ لوگ رعایا سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کی سختیاں بھی ساہوکاروں کے ایجنٹوں سے کم نہ تھیں۔

نظام جاگیری کی ابتری سلطنت کا ضعف واختلال نظام جاگیری کی ابتری سے اور بھی ترقی کر گیا تھا، بہتیرے صوبوں میں تقریباً خودمختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں، سلیمان اعظم نے جن مضبوط بنیادوں پر نظام جاگیری کو قائم کیا تھا اور جاگیرداروں کو قابو میں رکھنے کے لیے جو ضوابط مقرر کیے تھے، وہ سب اٹھارہویں صدی کے اختتام سے پیش تر بدل چکے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے ہر حصہ خصوصاً ایشیائی صوبوں میں ایک بڑی تعداد خودسر جاگیرداروں کی پیدا ہوگئی تھی، جو نسلاً بعد نسل اپنی جاگیروں پر قابض چلے آتے تھے، یہ جاگیردار عموماً درہ بے کہے جاتے تھے، یہ لوگ صرف نام کے لیے سلطان اور پاشا کے مطیع تھے، ورنہ حقیقۃً بالکل آزاد تھے اور اپنے علاقوں میں جو چاہتے کرتے، باب عالی میں اتنی قوت نہ تھی کہ ان سے اپنے احکام کی تعمیل کرا سکتا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ جس بدنظمی میں مبتلا تھی، اس کا اندازہ سر جان باب ہاؤس (Sir John Hobhouse) کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے جو موصوف کے ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے، یہ بیان اگرچہ صرف ایک صوبہ البانیا سے متعلق ہے تاہم اس سے دوسرے صوبوں کے حالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، سر جان لکھتے ہیں:

> ”البانیا میں تقریباً ہر قسم کی حکومت کے نمونے ملتے ہیں، بعض ضلعوں اور شہروں پر ایک شخص کی حکومت ہے، جس کا ترکی لقب بولو باشی یا یونانی لقب کپتان ہے، جو مسیحی یورپ سے لیا گیا ہے، بعض اپنے اکابر کے زیر حکومت ہیں اور بعض کسی کی حکومت تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ہر شخص خود اپنے خاندان کا حاکم ہے، چند مقامات پر حکومت معرض تعطل میں ہے اور گو بظاہر طوائف الملوکی کی حالت نہیں ہے، تاہم کوئی حاکم بھی نہیں ہے، ہمارے زمانہ

میں آرجیروکاسٹرو (Argyro Castro) کے وسیع شہر کی یہی حالت تھی، مقصلات کے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں ہر آغایا بے جو گویا ہمارے قدیم تعلقہ داروں کا جواب ہوسکتا ہے، ایک چھوٹا سا سردار ہے اور گاؤں کے لوگوں پر ہر طرح کا حق رکھتا ہے، باب عالی کا احترام جس نے دولت عثمانیہ کے دور عظمت میں مملکت کو چھوٹی چھوٹی پاشائیوں اور امارتوں میں تقسیم کردیا تھا، اب بہت کم رہ گیا ہے اور مختلف علاقوں کے حدود جو اس نے قائم کیے تھے، درہم برہم اور فراموش ہو چکے ہیں۔"

مرکزی حکومت قسطنطنیہ کی برائے نام مرکزی حکومت میں صدر اعظم ملکی اور فوجی معاملات میں سب سے بڑا عہدہ دار تھا، مذہبی معاملات میں مفتی اعظم کا عہدہ سلطان کے بعد جو خلیفۃ المسلمین بھی تھا، سب سے بڑا تھا، صدر اعظم کے ماتحت قائم مقام کے علاوہ جو نائب صدر کی حیثیت رکھتا تھا ایک اور وزیر تھا جس کا تعلق ملکی اور فوجی دونوں شعبوں سے تھا، امور خارجہ رئیس آفندی کے سپرد تھے، چاؤش باشی صدر اعظم کے دیوان عدالت کا نائب صدر اور دارالسلطنت کی پولیس کا افسر اعلیٰ تھا، ان کے علاوہ نشانجی، دفتر دار اور متعدد دوسرے عہدہ دار تھے، ایک بہت بڑی تعداد حضوریوں اور ایسے لوگوں کی تھی جو بلحاظ اس امر کے کہ ان میں ضروری قابلیت ہے بھی یا نہیں سرکاری عہدوں پر مامور تھے اور سلطنت کی بدنظمی سے حتی الامکان پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

دیوان دیوان سلطانی اب عموماً ڈیڑھ مہینہ میں ایک بار منعقد ہوتا تھا، صدر اعظم کے دیوان کا اجلاس نسبتۂ جلد جلد ہوا کرتا تھا اور یہ بطور دیوان عدالت منعقد ہوتا، جس میں صدر اعظم کے علاوہ قپودان پاشا، دونوں قضاۃ عسکر، نشانجی اور دفتر دار شریک ہوتے، اہم مواقع پر تقریباً چالیس ارکان کی ایک بڑی مجلس منعقد ہوتی، جس میں سلطنت کے تمام شعبوں کے اعلیٰ عہدہ دار شرکت کرتے، ناگہانی ضرورتوں کے موقع پر ارا کین دیوان جب طلب کیے جاتے تو وہ مسئلۂ زیر غور پر کھڑے کھڑے مشورہ کرتے، ایسی مجلس کا نام "استادہ دیوان" تھا۔

مخصوص مراعات جماعت علماء اور خصوصاً اس کے پیشوا مفتی اعظم کی قوت پر بہ نسبت پہلے کے بڑھ گئی تھی اور برابر ترقی کرتی جاتی تھی، یہی حال اوقاف کی تعداد کا تھا، اشخاص کی ذاتی جائیدادوں کے علاوہ کہیں کہیں پورے پورے ضلع اور شہر مسجدوں اور دوسرے مذہبی اداروں پر وقف تھے، ان اوقاف کے متولی مقررہ زر استثناء کے سوا جس کی مقدار عموماً بہت کم ہوتی تھی، ہر قسم کے محصولوں اور مطالبوں سے بری تھے، ایسی ہی رعایتیں اکثر ان لوگوں کو بھی حاصل تھیں جو سلطانہ والدہ اور بعض دوسرے عالی مرتبہ اشخاص کے ذاتی علاقوں کے باشندے تھے، بہتیرے ضلعے ایسے بھی تھے، جہاں عیسائی رعایا قدیم رواج یا شاہی فرمان کے بموجب بلا شرکت غیرے قابض تھی اور جہاں کسی ترک کے لیے جا کر آباد ہونا قطعاً ممنوع تھا، سلطنت کے مختلف حصوں میں مغربی اقوام کے لوگ آباد تھے، جو باب عالی کے سایہ عاطفت میں خود اپنے ملکی قوانین اور قونصلوں کے ماتحت آسودگی اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس عام بدنظمی کے دور میں بھی کچھ حکام ایسے تھے جو نہایت لیاقت اور عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتے تھے، اسی طرح بعض پاشا بھی باوجود سخت گیر ہونے کے اپنی ولایتوں میں کامل طور پر امن وامان قائم کیے ہوئے تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ میں جو تھوڑی بہت تجارت اور خوش حالی پائی جاتی تھی، وہ ان ہی مراعات اور ایسے حکام اور پاشاؤں کی رہین منت تھی۔

فوج فوج جو اندرونی بغاوتوں کو فرو کر کے سلطنت میں امن وامان قائم کرنے اور اسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ تھی، اس کی حالت حکومت کے ہر شعبہ سے زیادہ خراب تھی، اس کی دو قسمیں تھیں، تنخواہ دار اور غیر تنخواہ دار، تنخواہ دار فوج کا سب سے بڑا اور اہم ترین حصہ ینی چری تھے، اٹھارہویں صدی کے آخر میں ان کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار تھی، ینی چری دستے سلطنت کے مختلف شہروں میں رہتے تھے، جہاں انہوں نے ایک طرح کی فوجی حکومت قائم کر رکھی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف کاروبار بھی کرتے تھے، اگرچہ

سرکاری رجسٹر میں ینی چری کا شمار ایک لاکھ پچاس ہزار درج تھا لیکن ان کی تعداد حقیقۃً اتنی نہ تھی، سیکڑوں ہزاروں نام فرضی درج رجسٹر کر لیے گئے تھے، جن کی تنخواہیں باب عالی سے وصول کی جاتی تھیں، پھر بھی ینی چری کی تعداد بہت زیادہ تھی اور جنگ و امن دونوں حالتوں میں ان کی اہمیت دوسرے فوجی دستوں سے بڑھی ہوئی تھی، وہ اپنے مذہب میں نہایت سخت تھے اور چوں کہ انہیں معلوم تھا کہ سلاطین ان پر کامل اعتماد نہیں رکھتے، اس لیے وہ بھی ہر ایجاد اور اصلاح کو حسد اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہمیشہ رعایا کو ستانے اور باب عالی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ رہا کرتے تھے۔

ینی چری کے علاوہ توپچیوں کی فوج تھی، جس کی تعداد تیس ہزار تھی، یہ بھی ینی چری دستوں کی طرح سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، اورنہ اور قسطنطنیہ کے بوستانجی یعنی قصر سلطانی کے باغبانوں کا شمار بھی فوج میں تھا اور ان کا مسلح دستہ سلطان کے ''باڈی گارڈ'' کی خدمت انجام دیتا تھا، ان کے علاوہ باقاعدہ پیدل فوج کے دوسرے دستے بھی تھے، ''سپاہیوں'' اور اسلحہ داروں کے قدیم سوار دستے بھی اب تک قائم تھے، اگرچہ ان کی تعداد اور قوت میں بہت کچھ کمی ہوگئی تھی، بے ضابطہ فوج میں خصوصیت کے ساتھ دو دستے شامل تھے جو زعامت اور تیمار کے جاگیر دار جنگ کے موقعوں پر فراہم کرتے تھے لیکن جاگیروں میں جو فساد و انتشار پھیلا ہوا تھا اس کی وجہ سے ان دستوں کی تعداد اور فوجی قابلیت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ یہ یقین تھا کہ جتنے سپاہی جاگیرداروں کے علم کے نیچے جمع ہوں گے وہ آخر وقت تک جنگ میں شریک بھی رہیں گے، علاوہ بریں جنگ کے زمانہ میں کچھ نئے دستے بھرتی کر لیے جاتے تھے جن کو میری عسکری کہتے تھے، انہیں صرف لڑائی کی مدت کی تنخواہ دی جاتی تھی، جب کسی ترکی شہر کا محاصرہ ہوتا تو محاصرہ کے قائم رہنے تک اس شہر کے مسلمان باشندوں کا ایک فوجی دستہ بنا دیا جاتا اسے برلی نفرات کہتے تھے، ان کے علاوہ رضا کاروں کے بے ضابطہ دستے بھی تھے، جو لڑائی کے موقعوں پر عثمانی لشکر کے ساتھ ہو جاتے۔

سلطان کی باضابطہ اور بے ضابطہ فوجوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا، صوبوں میں پاشاؤں کے فوجی دستے بھی ہوتے تھے، جنہیں پاشا خود بھرتی کرتے تھے اور جن کی تنخواہیں وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے، یہ دستے مستقل نہ تھے بلکہ صرف جنگ کی مدت تک رکھے جاتے تھے۔

ان مختلف ذرائع سے سپاہیوں کی ایک عظیم الشان تعداد علم سلطانی کے نیچے اکٹھا ہو جاتی تھی، چنانچہ جنگ کی ابتدا میں تین لاکھ آدمیوں تک غنیم کے مقابلہ میں روانہ کیے جا سکتے تھے اور اگر میدان عثمانیوں کے ہاتھ رہتا تو ان کے علاوہ بے اور بے شمار دوسرے رضا کار فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار ملتے لیکن یہ انبوہ زیادہ تر بے ضابطہ دستوں پر مشتمل ہوتا، جو نظم و تجربہ دونوں سے عاری ہوتے، یہ دستے بہت کچھ چھ مہینے سے زیادہ کے لیے بھرتی کیے جاتے، شکست کے لیے پہلے ہی موقع پر وہ ہزاروں کی تعداد میں میدان جنگ چھوڑ کر منتشر ہو جاتے اور اپنے گھروں کو واپس جاتے ہوئے راستہ میں دشمن یا سلطان کے جو علاقے بھی ملتے، بلا امتیاز انہیں لوٹتے جاتے، ترک سپاہی اپنی فطری شجاعت اور ملکۂ تیغ زنی کی وجہ سے اب بھی ایک خوف ناک حریف تھا اور ترک سواروں کی طوفانی یورش خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں کوئی دوسری سوار فوج گزرنے کی جرأت بھی نہ کر سکتی، دشمن کے لیے اور بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی لیکن جہاں تک فوجی ضبط و نظم کا تعلق تھا، مسیحی یورپ کی فوجوں کے مقابلہ میں عثمانی فوج بالفاظ نپولین محض ایک ایشائی بھیڑ تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ سوار اور پیدل دونوں فوجوں میں اسلحہ کے متعلق کوئی ضابطہ نہ تھا اور نہ ان کو باقاعدہ دستوں میں لڑنے کی تعلیم دی جاتی تھی، ہر سپاہی جو ہتھیار چاہتا، استعمال کرتا اور جب لڑائی شروع ہو جاتی تو جس طرح چاہتا لڑتا، فرانسیسی جنرل بوئیر (Boyer) اس زمانہ کے ترک سپاہی کی نسبت لکھتا ہے کہ:

''ان میں نہ کوئی ترتیب ہے نہ ثابت قدمی، وہ دستے بنا کر فوجی اصول کے مطابق چل بھی نہیں سکتے، بے ترتیب ٹولیوں میں آگے بڑھتے ہیں اور دفعۃً غضب ناک ہو

کر نہایت شدت کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیتے ہیں۔"

بحریہ بحریہ کی حالت غازی حسن پاشا کی کوششوں کے باوجود بری فوجوں سے بھی زیادہ خراب تھی[1]۔

غرض اٹھارہویں صدی کے آخر میں سلطنت عثمانیہ بحیثیت مجموعی اپنے زوال و پستی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی، سلطان سلیم کی اصلاحی کوششوں سے اس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا، یہ صحیح ہے کہ ان اصلاحات کی مخالفت شدت کے ساتھ کی گئی، یہاں تک کہ فوج نے علانیہ بغاوت کر دی اور سلیم کو اپنے تخت کی حفاظت کے لیے مجبوراً اصلاحات کو منسوخ کر دینا پڑا، گو اس کے باوجود وہ نہ صرف معزول کر دیا گیا بلکہ ایک سال کے بعد قتل بھی کر دیا گیا لیکن ان اصلاحات سے جو نئی روح پیدا ہوگئی تھی، وہ پھر کبھی فنا نہ ہوئی اور دولت عثمانیہ کے آئندہ فرماں رواؤں اور مدبروں نے سلیم ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، سلطان محمود ثانی اور سلطان عبدالحمید اول کے اصلاحی کارناموں کا سنگ بنیاد سلیم ہی کے ہاتھوں سے رکھا گیا تھا۔

اصلاحات سلیم نے اصلاحات کا آغاز صلح نامۂ یاسی کے فوراً بعد کر دیا تھا، اس نے سلطنت کے ہر شعبہ کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایک جامع اسکیم مرتب کی تھی، نظام جاگیری اس حد تک ابتر ہو چکا تھا کہ اسے منسوخ کر دینا ہی مناسب خیال کیا گیا، تجویز یہ تھی کہ موجودہ جاگیرداروں کے مرنے پر ان کی جاگیریں (زعامت اور تیمار دونوں) ضبط کر لی جائیں اور آئندہ ان جاگیروں کی آمدنی سرکاری خزانہ میں جمع کی جائے اور اس سے ایک نئی فوج کے مصارف ادا کیے جائیں، ولایتوں کے اصلاح نظم و نسق کے لیے یہ قرار پایا کہ پاشاؤں کے اختیارات کم کر دیے جائیں، ہر ولایت کا حاکم تین سال کے لیے مقرر کیا جائے اور اس مدت کے خاتمہ پر اس کا دوبارہ تقرر صرف باشندگان ولایت کی رضا مندی سے کیا جائے، ولایتوں سے متعلق ایک اور اصلاح بھی تجویز کی گئی، جس سے باشندوں کو

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۳۲۹-۳۱۴۔

بہت فائدہ پہنچتا، وہ یہ کہ مال گزاری وصول کرنے کے لیے جو ٹھیکے لوگوں کو دیے جاتے تھے، وہ سب موقوف کر دیے جائیں اور آئندہ تمام مال گزاری صرف سرکاری خزانہ کے عمال کے ذریعہ سے وصول کی جائے، مرکزی حکومت میں صدر اعظم کے اختیارات کسی قدر محدود کر دیے گئے اور تمام اہم مسائل پر دیوان سے مشورہ کرنا اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا۔

تعلیم | سلیم نے رعایا کے ہر طبقہ میں تعلیم پھیلانے کی کوشش کی اور تمام سلطنت میں مدرسے قائم کیے، اس کی سرپرستی سے یونانیوں نے خاص طور پر فائدہ اٹھایا اور اپنے قدیم مدرسوں کو مستحکم کرنے کے علاوہ بہت سے جدید مدرسے بھی قائم کر لیے لیکن ان کی انقلاب پسند جماعت نے مدرسوں اور مطبعوں کے ذریعہ سے اپنی قوم میں دولت عثمانیہ کے خلاف شورش برپا کرنے کی کوشش کی، باوجود اس کے سلیم نے یونانی مدرسوں اور چھاپا خانوں کو بند نہیں کیا بلکہ قسطنطنیہ میں ایک مطبع قائم کر کے یونانی پادریوں کے ذریعہ سے اس فتنہ کا سد باب کرنا چاہا، سلطنت عثمانیہ میں پہلا مطبع سلطان احمد ثالث کے عہد میں قائم ہوا تھا، سلیم نے علوم کی نشر و اشاعت کے لیے متعدد مطبعے قائم کیے، اس کے حکم سے مصافیات (Tactics) اور استحکامات کے فن کی بہت سی کتابوں کے ترجمے فرانسیسی زبان سے ترکی زبان میں کر کے شائع کیے گئے، اس نے عثمانیوں کی سیاسی تربیت کی غرض سے یورپ کے خاص خاص پایہ تختوں میں مستقل سفارت خانے قائم کرنے چاہے، چنانچہ لندن، پیرس، ویانا اور برلن میں ترکی سفارتیں قائم ہو گئیں اور سفیروں کے ساتھ عثمانیوں کی ایک جماعت روانہ کی گئی لیکن حکومت روس نے بعض حیلوں سے ترکی سفارت خانے کو اپنے یہاں قائم نہ ہونے دیا۔

فوج | سلیم نے سب سے زیادہ توجہ فوجی اور بحری اصلاحات پر کی، ینی چری کی خودسری پر نظر رکھتے ہوئے وہ خوب جانتا تھا کہ مذکورہ بالا اصلاحات کے جاری کرنے اور سلطنت کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک منظّم اور وفادار فوج کی کتنی ضرورت ہے، پیٹر اعظم کی مثال بھی ہمیشہ اس کے پیش نظر تھی، جس نے یورپین فوجوں کے نمونہ کے مطابق

جدید فوجیں تیار کر کے اندرونی اور بیرونی دونوں دشمنوں کو شکست دے دی تھی، ینی چری کی سرکشی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی، وہ سلطنت کے امن و امان کے لیے ایک مستقل خطرہ تھے، وہ اپنے نظام میں کسی اصلاح کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، یہی وجہ تھی کہ سلیم کو ایک ایسی فوج قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جو یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق مرتب کی گئی ہو اور جس پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکے، گذشتہ جنگ میں جو قیدی گرفتار ہو کر آئے تھے، ان میں ایک ترک بھی تھا جو مدت سے روسی فوج میں ملازم تھا اور ترقی کر کے لفٹنٹ کے عہدہ تک پہنچ گیا تھا، اس کا نام عمر آغا تھا، صدر اعظم یوسف پاشا اکثر اس سے روسیوں کے فوجی نظام پر باتیں کیا کرتا تھا، چنانچہ آغا عمر کی خواہش پر اس نے عثمانیوں کا ایک دستہ یورپین طرز پر مرتب کرنے کی اجازت دے دی، عمر آغا نے اس دستہ کو یورپین طریقے سے مسلح کر کے تربیت دینا شروع کیا، جنگ کے خاتمہ پر جب یوسف پاشا قسطنطنیہ کو واپس ہوا تو عمر آغا اور اس کے نئے دستہ کو بھی ساتھ لایا اور ان کے لیے قسطنطنیہ سے قریب ایک گاؤں میں چھاؤنی بنوا دی، جب سلیم کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے ایک روز خود جا کر اس دستہ کا معائنہ کیا اور دیکھتے ہیں عثمانی فوجوں پر اس کی برتری محسوس کر لی، اس نے نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ دیوان میں یہ تجویز پیش کی کہ ینی چری میں بھی یہ جدید نظام جاری کر دیا جائے، ینی چری نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلیم کو بالآخر وعدہ کرنا پڑا کہ جدید نظام کی پابندی ینی چری پر عائد نہ کی جائے گی، تاہم عمر آغا کا دستہ بدستور قائم رکھا گیا۔

۱۷۹۶ء میں جنرل ڈوبائے (Dubayet) جمہوریہ فرانس کے سفیر کی حیثیت سے قسطنطنیہ آیا، وہ سلطان کو نذر دینے کے لیے متعدد توپیں اور چند فرانسیسی توپچی اور انجینیر بھی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا تاکہ عثمانی توپچی ان کی مدد سے یورپ کے جدید حربی اصولوں سے واقف ہو جائیں اور اپنے سلاح خانوں اور توپ ڈھالنے کے کارخانوں میں ضروری

اصلاحات جاری کر سکیں، اس کے ساتھ فرانسیسی پیدل اور سوار فوجوں کے بہت سے افسر بھی تھے، جنہیں وہ ''سپاہی'' (سوار) اور ینی چری (پیدل) فوجوں کی تنظیم و تربیت کے لیے لایا تھا، سلیم نے اس تحفوں کو بہت خوشی کے ساتھ قبول کیا اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، چنانچہ توپ خانوں میں فرانسیسی توپچیوں کی مدد سے بہت کچھ اصلاحیں کی گئیں اور سواروں کا ایک دستہ بھی یورپین طرز پر مسلح اور مرتب کر لیا گیا، لیکن ینی چری نے برہم ہو کر یورپ کے اسلحہ اور جنگی طریقوں کے اختیار کرنے سے قطعی انکار کر دیا، مجبوراً فرانسیسی افسروں نے اسی فوج کو تعلیم دینے پر قناعت کی جو عمر آغا کی تربیت میں قائم کی گئی تھی، قسطنطنیہ پہنچنے کے چند ہی مہینوں کے بعد جنرل دوبائے کا انتقال ہو گیا اور اس کے بہتیرے افسر فرانس واپس چلے گئے لیکن قپودان کوچک حسین پاشا نے نظام جدید[1] کی قدر و اہمیت کا اندازہ کر کے کچھ افسروں کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا اور اونچی اونچی تنخواہوں کا لالچ دے کر مسلمانوں کو عمر آغا کی فوج میں داخل ہونے کی ترغیب دی، ۱۷۹۸ء میں جس فرانس اور دولت علیہ کے درمیان جنگ چھڑی تو اس نئی فوج کی تعداد چھ سو تھی۔

بحریہ کوچک حسین ۱۷۹۲ء میں قپودان پاشا مقرر ہوا تھا، وہ بارہ سال تک اس عہدہ پر مامور رہا اور اس مدت میں اس نے ترکی بیڑہ اور سلاح خانہ کی نئی تنظیم کی، اس نے فرانسیسی اور انگریزی بیڑوں کے نمونہ پر عثمانی بیڑے کو از سر نو منظم کیا اور بہت سے نئے جنگی جہاز بنوائے، اس نے سویڈن اور فرانس کے ماہر انجینیروں کی ایک بڑی تعداد بلوائی اور ان کی مدد سے عثمانیوں کو جدید طرز کی توپیں ڈھالنا سکھائیں، سلطان عبدالحمید اول کے عہد میں بیرن دی توت کے زیر نگرانی ایک مدرسہ توپچیہ قسطنطنیہ میں قائم ہوا تھا، کوچک حسین پاشا نے اسے نئے سرے سے منظم کیا اور ایک جدید بحری مدرسہ قائم کیا، ان مدارس کے طلبہ کے لیے اس نے

---

[1] ''نظام جدید'' اس نئی فوج کا بھی نام تھا جو یورپ کے جدید فوجی نظام کے مطابق مرتب کی گئی تھی اور سلیم کی اصلاحات کا مجموعی نام بھی ''نظام جدید'' تھا۔

فن استحکامات سے متعلق فرانسیسی پروفیسروابان اور دوسرے ماہرین فن کی کتابوں کے ترجمے ترکی زبان میں طبع کرائے اور مدرسہ توپچیہ میں ایک کتب خانہ قائم کیا، جس میں وہ تمام اہم کتابیں جمع کیں جو یورپ میں جدید فنون جنگ اور ریاضیات پر لکھی گئی تھیں، اس کتب خانہ میں چار سو کتابیں تھیں، جن میں بہترین فرانسیسی مصنّفین کی کتابوں کا انتخاب تھا فرانسیسی زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا، جو بقول ژون کیئر ''اس زمانہ کے لحاظ سے نہایت بے باکانہ بدعت تھی'' حسین پاشا نے بحری ڈاکوؤں کے استیصال کی بھی پوری کوشش کی، جنہوں نے بحر اسپین کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے، اس نے اپنے تقرر کے پہلے ہی سال میں لمبرد کویزیانی (Lambro Caviaziani) مشہور بحری ڈاکو کے بیڑہ کا قلع قمع کر دیا، اس کی سرگرمیوں سے ان ڈاکوؤں کی قوت بہت کچھ کمزور ہوگئی۔

نپولین اس درمیان میں انقلاب فرانس کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے اور فرانسیسی فوجیں حریت، مساوات اور اخوت کے نعرے بلند کرتی ہوئی سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں، چند سال کے اندر نپولین بوناپارٹ نے وینس کی قدیم جمہوریہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور پھر اپنی فاتح فوج کے ساتھ آسٹریا کی جانب بڑھا لیکن سلیم نے دولت عثمانیہ کے قدیم دشمنوں (وینس و آسٹریا) کے خلاف اس کے روایتی حلیف (فرانس) کے جارحانہ اقدام سے فائدہ اٹھانے کی مطلق کوشش نہیں کی، بلکہ اپنی توجہ تمام تر ملکی اصلاحات کی جانب رکھی، شاہ فرانس لوئی شانزدہم کے قتل سے وہ ضرور متاثر ہوا، لوئی کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات تھے، چنانچہ تخت نشینی سے پہلے بھی وہ اس سے خط و کتابت کیا کرتا تھا، پھر بھی اپنی سلطنت کی اندرونی حالت پر نظر رکھتے ہوئے نیز ان اصلاحات کی تکمیل کے لیے جو اس نے شروع کر دی تھیں، سلیم کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ یورپ کے اس ہنگامہ رست خیز سے الگ رہے، مگر اس کی یہ کنارہ کشی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی، ۱۷۹۷ء میں صلح نامہ کیمپو فورمیو (Campo Formio) کے رو سے جو آسٹریا اور جمہوریہ فرانس کے درمیان طے ہوا، جمہوریہ وینس کا خاتمہ

ہو گیا، خود وینس اور اس کے اطالوی مقبوضات کا ایک بڑا حصہ آسٹریا کے ہاتھ آیا اور بحر ایڈریاٹک کے مقبوضات جزائر آئیونین اور وہ شہر جو بحر ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر وینس کی ملک تھے، جمہوریہ فرانس کے قبضہ میں آئے، اس طرح فرانسیسی علاقے سلطنت عثمانیہ کی سرحد سے بالکل متصل ہو گئے، نپولین کی حیرت انگیز فتوحات نے جمہوریہ فرانس کے حوصلے بہت بڑھا دیے تھے، چنانچہ جزائر آئیونین کے حاصل کرنے کے بعد اسے عثمانی مقبوضات کی طرف بڑھنے کا خیال پیدا ہوا اور سلطنت عثمانیہ کے ضعف واختلال نے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچائی، بہتیرے صوبوں کے پاشا مثلاً علی پاشا والی یانینہ، عثمان پاشا (پیٹروان اوغلو) والی ودین اور جزار پاشا والی عکہ قریب قریب خود مختار ہو چکے تھے، مصر محض نام کے لیے سلطان کے زیر حکومت تھا، ورنہ اصلی حکومت مملوکوں کی تھی، باب عالی کی طرف سے جو پاشا وہاں مقرر ہوتا تھا، اسے حقیقۃً مملوکوں کے مقابلہ میں کوئی اختیار حاصل نہ تھا، سرویا اور یونان بغاوت کے جذبات سے لبریز تھے اور صرف موقع کا انتظار کر رہے تھے، سارے یورپ کی طرح فرانس کی مجلس عاملہ (ڈائرکٹری) کو بھی یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ بہت قریب ہے اور وہ اس سلطنت کی تقسیم میں سب سے بڑا حصہ لینے کا قصد کر رہی تھی، اسی غرض سے نپولین نے اپنے فرستادے ان میں سے کئی صوبوں خصوصاً یونان میں روانہ کیے تھے اور وہاں کے باشندوں کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر وہ دولت علیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کریں گے تو فرانسیسی فوج ان کی مدد کرے گی، چنانچہ طولوں میں پینتیس ہزار آزمودہ کار فرانسیسی سپاہیوں کی ایک فوج تیار کی گئی، جنگی جہازوں کے علاوہ سواری اور بار برداری کے تین سو جہاز تھے، عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ حملہ سلطنت عثمانیہ کے کسی یورپین صوبہ پر ہوگا لیکن آخر وقت میں نپولین کی تحریک سے حکومت فرانس نے یہ فیصلہ کیا کہ مصر کی راہ سے انگلستان پر ضرب لگائی جائے، نپولین کو یہ امید تھی کہ وہ مصر کو فتح کرنے کے بعد ہندوستان پر حملہ کرے گا اور سلطنت برطانیہ کو برباد کر کے فرانس کے لیے ایک عظیم

الشان مشرقی سلطنت قائم کرے گا لیکن مصر دولت عثمانیہ کے زیر حکومت تھا اور مملوکوں کی سرکشی اور عملی خودمختاری کے باوجود سلطان کی فرماں روائی سے آزاد نہیں سمجھا جاتا تھا، دولت عثمانیہ اور فرانس کے درمیان دوستانہ تعلقات مدت سے قائم تھے، اس لیے مصر پر حملہ کرنے کا کوئی معقول عذر فرانس کے پاس نہ تھا، مگر نپولین باب عالی کی کمزوری اور مملوکوں کی سرکشی سے پوری طرح واقف تھا، اس نے مصر پہنچ کر اپنی مہم کا مقصد یہ ظاہر کیا کہ میں سلطان کی حمایت اور اہل مصر کو مملوکوں کے مظالم سے نجات دلانے آیا ہوں، اسی مصلحت سے اس نے دولت عثمانیہ کے خلاف کوئی اعلان جنگ نہیں کیا۔

نپولین کو حکومت فرانس کی طرف سے یہ خفیہ احکامات ملے تھے کہ مصر پر قبضہ کر کے جہاں تک ممکن ہو انگریزوں کو ان کے ایشیائی مقبوضات سے نکال دیا جائے، بحراحمر پر فرانسیسی تسلط مکمل طور پر قائم کر دیا جائے اور مالٹا پر قبضہ کر لیا جائے، ان احکام کے علاوہ خود نپولین کی ذاتی اسکیم یہ تھی کہ ایشیا میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنے کے بعد یونانیوں اور دوسرے عیسائی فرقوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف ابھارے، ترکوں کو شکست دے کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لے اور پھر وہاں سے یورپ پر حملہ آور ہو۔

مالٹا | ۱۹ رمئی ۱۷۹۸ء کو نپولین نہایت خاموشی کے ساتھ طولون سے روانہ ہوا، اس کے ساتھ فرانس کے علما اور ماہرین فن کی ایک جماعت بھی تھی، جو مصر کے مطالعہ اور وہاں کے حالات کی اصلاح وترقی کے اسباب پر غور کرنے کے لیے اس مہم میں شریک کی گئی تھی، نپولین نے مہم کے اصلی مقصد کو یہاں تک خفیہ رکھا کہ فوج کو بھی اطلاع نہ دی، طولون سے روانگی کے تین ہفتہ بعد فرانسیسی بیڑا مالٹا پہنچا، مبارزین سینٹ جان کی وہ شجاعت جس نے سلیم اعظم جیسے فاتح کے حملہ کو بھی ناکام رکھا تھا، وہ صدیوں کے اندر عیش وعشرت کی نذر ہو چکی تھی، باہمی اختلافات نے ان کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا تھا، چنانچہ انہوں نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے اور یہ اہم جزیرہ سلطنت فرانس میں شامل کر لیا گیا۔

اسکندریہ مالٹا کی فتح کے بعد نپولین نے جزیرہ کویٹ کا رخ کیا، مگر یہ معلوم کر کے انگریز امیر البحر نیلسن (Nelson) اس کے تعاقب میں ہے، وہ فوراً اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گیا اور اب پہلی بار اس نے فوج کو اس کی منزل مقصود سے آگاہ کیا، اس نے اپنے اعلان میں فوج کو یوں مخاطب کیا:

> "سپاہیو! تم ایک ایسی فتح کے لیے جا رہے ہو جس کے اثرات دنیا کی تہذیب اور تجارت پر بے حساب ہوں گے، تم انگلستان پر موت کی ضرب لگانے سے پہلے ہی ایک نہایت یقینی اور کاری ضرب لگاؤ گے، ممالک جو تمام تر انگریزی تجارت کے حامی ہیں، تمہارے پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد نیست و نابود ہو جائیں گے۔"

نیلسن کو جب طولون سے فرانسیسی بیڑے کی روانگی کا علم ہوا تو یہ قیاس کر کے کہ نپولین مصر پر حملہ کرنا چاہتا ہے، خود بھی اپنے جنگی جہازوں کے ساتھ اسکندریہ کی طرف روانہ ہو گیا لیکن وہاں ۲۸/جون کو پہنچنے کے بعد اسے اطلاع ملی کہ فرانسیسی بیڑے کا کہیں پتہ نہیں، چنانچہ مایوس ہو کر وہ سسلی کو لوٹ آیا، اس کی واپسی کے دو ہی روز بعد یکم جولائی کو نپولین اسکندریہ پہنچا، وہاں کا مختصر تر کی دستہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا، ۱۷/محرم ۱۲۱۳ھ مطابق ۲/جولائی ۱۷۹۸ء کو نپولین نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔

اسکندریہ پر حملہ کرنے کا عذر نپولین اس کے سوا کچھ نہ پیش کر سکا کہ مصر پر اصلی حکومت مملوکوں کی ہے اور وہ انگریزی تجارت کے حامی ہیں، نیز یہ کہ انہوں نے فرانسیسی تاجروں کے ساتھ بدسلوکیاں کی ہیں، بہر حال اس نے باب عالی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مصر کا حملہ حقیقۃً ایک دوستانہ فعل ہے، کیوں کہ اس سے مملوکوں کی قوت کا خاتمہ ہو جائے گا جنہوں نے عثمانی اقتدار کو محض نام کے لیے باقی رکھا ہے[1] لیکن نپولین کی خاص کوشش

---

[1] سوانح نپولین اول از ڈاکٹر ہالینڈ روز، ص ۱۸۸، مطبوعہ لندن، ۱۹۱۹ء (The Life of Nepolean By- Halland Rose)

یہ تھی کہ مصر کے عام باشندوں کی حمایت حاصل کی جائے، چنانچہ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مسلمان باشندوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی جائے، اس نے اعلان شائع کیا جس میں مملوکوں کے مظالم کا ذکر کرنے کے بعد اپنے کو اہل مصر کا حامی اور مددگار ثابت کرنا اور انہیں اس امر کا یقین دلانا چاہا کہ فرانسیسی مہم کا مقصد صرف یہ ہے کہ مصر کو مملوکوں کے پنجہ سے نجات دلائی جائے، ایک طویل مدت سے جارجیا اور کوہ قاف میں خریدے ہوئے غلاموں کا گروہ دنیا کے سب سے زیادہ خوب صورت مقام کو اپنے مظالم کی آماج گاہ بنائے ہوئے ہے لیکن خداوند عالم جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، ان کی سلطنت کے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، اے اہل مصر! انہوں نے تم سے بیان کیا ہے کہ میں تمہارے مذہب کو برباد کرنے کی غرض سے آیا ہوں، ان کی باتوں کا یقین نہ کرو، انہیں یہ جواب دو کہ میں تمہارے حقوق کو دوبارہ قائم کرنے اور غاصبوں کو سزا دینے کے لیے آیا ہوں اور یہ کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ اور قرآن کی جتنی عزت مملوک کرتے ہیں، ان سے زیادہ میں کرتا ہوں، نہایت خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ہمارا ساتھ دیں گے، ان کی خوش حالی اور مرتبہ میں ترقی ہوگی لیکن سخت افسوس ہے ان کی حالت پر جو مملوکوں کے ساتھ ہو کر ہم سے لڑیں گے، ہر شخص مملوکوں کی تباہی پر خدا کا شکر ادا کرے گا اور پکارے گا:

بزرگی اور عظمت ہے سلطان کے لیے اور عظمت ہے فرانسیسی فوج کے لیے جو سلطان کی حلیف ہے، مملوکوں پر لعنت اور اہل مصر کے لیے خوش قسمتی[1]، نپولین نے مصریوں کے اطمینان کے لیے اٹلی اور مالٹا کی فتوحات کا بھی حوالہ دیا، کیا ہم نے پوپ کو برباد نہیں کر دیا جو لوگوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کا حکم دیتا تھا؟ کیا ہم نے مبارزین مالٹا کو برباد نہیں کر دیا، اس لیے کہ وہ احمق خیال کرتے تھے کہ مسلمانوں سے جنگ کرنا خدا کی مرضی کے مطابق ہے؟

---

[1] ایورسلے، ص ۲۴۱۔

قاہرہ کی مہم اسکندریہ میں ایک فوجی دستہ جنرل کلیبر (Kleber) کے زیر قیادت متعین کر کے نپولین ایک ہفتہ کے اندر قاہرہ کی طرف روانہ ہوگیا، ریگستان میں دھوپ کی شدت فرانسیسی فوج کے لیے ناقابل برداشت تھی، پیاس کی تکلیف سب سے زیادہ تھی، راستہ کے کنوؤں کو عربوں نے پتھر کے ٹکڑوں سے پاٹ دیا تھا اور تھوڑا سا پانی بھی بڑی مشکل سے دست یاب ہوتا تھا، نتیجہ یہ تھا کہ ایک ایک گھونٹ پانی کے لیے سپاہی آپس میں لڑ بیٹھتے تھے، اس فوج کا ایک اعلیٰ افسر بیان کرتا ہے کہ ایک گلاس پانی سونے کی تول بکتا تھا، سپاہیوں کے علاوہ افسروں میں بھی اس مہم کے شدائد سے سخت برہمی تھی، ان حالات کے باوجود خود نپولین کے عزم واستقلال میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا اور نہ اس کے بشرے سے خفیف سی پریشانی بھی ظاہر ہوتی تھی، ایک روز ایک فوجی دستہ، جس کا پیمانہ صبر لب ریز ہو رہا تھا، ایک سپاہی نے بے خوف ہو کر نپولین سے یہ سوال کیا کہ ''کیا آپ اسی طرح ہم لوگوں کو ہندوستان لے جائیں گے؟'' نپولین نے فوراً جواب دیا کہ ''نہیں، میں تم جیسے سپاہیوں کے ساتھ اس مہم پر روانہ نہ ہوں گا[1]'' سوال کرنے والا اور اس کے ساتھ اس جواب سے پانی پانی ہو گئے۔

جنگ اہرام مراد بے اور ابراہیم بے نے جو مملوکوں کے سردار اور حقیقۃً مصر کے اصلی حکمراں تھے، آگے بڑھ کر فرانسیسی فوج کو روکنا چاہا، پہلے آٹھ سو مملوک سواروں کا ایک دستہ سامنے آیا، جسے نپولین نے آسانی کے ساتھ منتشر کر دیا لیکن جب وہ قاہرہ کے قریب پہنچا تو ۷رصفر ۱۲۱۳ھ مطابق ۲۱ر جولائی ۱۷۹۸ء انبابتہ کے مقام پر مراد بے سے مقابلہ پیش آیا، جو دس بارہ ہزار سواروں کو لے کر پایہ تخت کی حفاظت کے لیے مستعد کھڑا تھا، اس معرکہ میں جو جنگ اہرام کے نام سے مشہور ہے (کیوں کہ اہرام مصر سامنے نظر آ رہے تھے) مملوکوں نے ایسی شجاعت دکھائی کہ فرانسیسی متحیر رہ گئے لیکن ان کی حیرت انگیز شجاعت گولیوں کی باڑھ

---

[1] ہالینڈ روز، ص ۱۹۰-۱۸۹۔

کے سامنے کارگر نہ ہوسکی، علاوہ بریں فرانسیسی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی اور یہ سب نہایت آزمودہ کار سپاہی تھے، برخلاف اس کے مراد بے کی فوج میں بارہ ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے، جن میں مملوک صرف پانچ ہزار تھے، باقی نو آموز فلاحین تھے، مراد بے کی شکست سے قاہرہ کا راستہ صاف ہوگیا اور چھ روز بعد نپولین نے اس پر باضابطہ قبضہ کرلیا، دو ہفتہ تک قاہرہ میں قیام کرنے کے بعد وہاں کے ضروری انتظامات سے فارغ ہوکر نپولین ابراہیم بے کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اسے شکست دے کر شام کی طرف بھگادیا۔

جنگ نیل اس درمیان میں نلسن یہ معلوم کر کے کہ فرانسیسی بیڑہ مصر پہنچ چکا ہے، اسکندریہ کی طرف روانہ ہوگیا تھا اور پہنچتے ہی ۱۷ رصفر مطابق یکم اگست کو اس نے فرانسیسی جہازوں پر جو خلیج ابوقیر میں لنگرانداز تھے، حملہ کردیا، یہ لڑائی تاریخوں میں جنگ نیل کے نام سے مشہور ہے، نلسن کو شان دار فتح حاصل ہوئی، فرانسیسی امیر البحر مارا گیا، اس کے تقریباً تمام جہاز برباد ہوگئے یا گرفتار کرلیے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ نپولین کی فوج جو قاہرہ پر قابض تھی، فرانس سے بالکل منقطع ہوگئی، نپولین کو اس حادثہ کی اطلاع اس وقت ہوئی جب ابراہیم بے کو شکست دینے کے بعد ۱۹ راگست کو وہ قاہرہ واپس آیا، اس نے یہ خبر سن کر صرف اس قدر کہا ''اب ضروری ہے کہ یا تو ہم ان ہی ملکوں میں رہ جائیں یا قدما کی طرح شان دار طریقہ سے یہاں سے نکلیں، انگریز ہمیں مجبور کررہے ہیں کہ ہم اپنے قصد وارادہ سے زیادہ کارنامے کر دکھائیں۔''

قیام مصر نپولین نے یہ دیکھ کر موجودہ صورت حال میں فرانس سے کمک نہیں پہنچ سکتی اور مصر میں مجبوراً قیام کرنا پڑے گا، ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے اس کی فوج کو خارجی مدد کی ضرورت باقی نہ رہی، طولون سے اس کے ساتھ مختلف علوم وفنون کے اہل کمال آئے تھے، چنانچہ ان میں سے بعض نے سامان رسد کی دشواریاں دور کرنے کے لیے بڑے پیمانہ پر غلہ کی کاشت شروع کی اور غلہ پیسنے کے لیے بڑی بڑی پون چکیاں قائم کیں، بعض نے

انگور کے باغ لگائے اور سپاہیوں کے لیے ایک قسم کی جو کی شراب تیار کی، آلات اور مشینوں کی فراہمی کے لیے کارخانے قائم کیے گئے، زمین سے خام شورہ نکالا گیا اور شورہ کے کارخانوں میں فوج کی ضروریات کے لیے کافی بارود تیار کی گئی۔

علمی سرگرمیاں علمی سرگرمیوں کا بھی یہی حال تھا، نپولین نے ایک کیمیاوی معمل قائم کیا جہاں فرانس کے مشہور علمائے سائنس برتھولے (Bertholell) اور مونج (Monge) تجربے کیا کرتے تھے، نپولین ان تجربوں کو دیکھنے کے لیے خود بھی ہفتہ میں کئی بار معمل میں جایا کرتا تھا، اس نے علمائے سائنس کی ایک مجلس ''ادارۂ مصریہ'' کے نام سے قائم کی جس کا افتتاح ۲۲/ اگست ۱۷۹۸ء کو ایک مملوک سردار کے محل میں بڑی شان و شوکت کے ساتھ کیا گیا، مونج اس مجلس کا صدر اور نپولین نائب صدر تھا، اس مجلس میں متعدد علمی شعبے تھے، نپولین نے اپنا نام شعبہ ریاضیات میں درج کرایا، ارکان مجلس کے کارنامے علمی تجربات تک محدود نہ تھے، بلکہ ان کی سرگرمیوں کا کافی حصہ مصر کے آثار قدیمہ، وادی نیل کی پیمائش اور ارضیاتی تحقیقات پر مشتمل تھا[1]، نپولین نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''اصلی اور واحد فتوحات جن پر بعد میں افسوس اور پشیمانی نہیں ہوتی وہی ہیں جو جہالت پر حاصل کی جائیں'' مصر کے چند روزہ قیام میں اس نے جو کچھ کر دکھایا وہ اس کے تمام کارناموں میں اس قول کی بہترین شرح ہے۔

مصریوں سے میل جول نپولین کی ان سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مصر میں گویا مستقل طور پر قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، ملکی باشندوں سے میل جول بڑھانے کے لیے اس نے ان کے رسم و رواج میں اختیار کر لیے اور اپنی قوم کے بعض رواج ان میں جاری کیے، وہ کبھی کبھی مصری لباس بھی پہنا کرتا تھا، اس نے مدرسے قائم کیے، سڑکوں اور نہروں کی مرمت کرائی اور نوجوان مصری عورتوں سے اپنے سپاہیوں کی شادی کر دی، فرانسیسی سپاہی بھی نئے ماحول سے جلد مانوس ہو گئے اور قاہرہ کے عیش و عشرت میں وطن کی یاد بھول گئے۔

---

[1] ہالینڈ روز، ص ۱۹۵-۱۹۴۔

قاہرہ کی بغاوت لیکن نپولین اگر یہ سمجھتا تھا کہ ان کارروائیوں سے اہل مصر فرانسیسی حکومت کو خوشی کے ساتھ قبول کرلیں گے تو اس کی غلط فہمی بہت جلد دور ہوگئی، ۲۱/اکتوبر ۱۷۹۸ء کو قاہرہ میں ایک زبردست بغاوت نمودار ہوئی، جس میں بہت سے فرانسیسی مارے گئے، تاہم محبان وطن کی یہ کوشش بالکل ناکام رہی، ان سے نہایت خوف ناک انتقام لیا گیا، فرانسیسی مؤرخ ارنسٹ ہامیل (Ernest Hamel) لکھتا ہے:

''یہ بغاوت ہول ناک، وحشیانہ اور ظالمانہ طریقہ سے فرو کی گئی، دستے قائم کرکے فوج باغیوں پر ٹوٹ پڑی اور انہیں بچ بچ ذبح کرکے ڈال دیا، بوناپارٹ نے حکم دے دیا کہ تمام مسلح باشندے جو سڑک پر پائے جائیں قتل کردیے جائیں، باغیوں نے جلد اطاعت قبول کرلی، اگرچہ ان کے پانچ ہزار سے زیادہ آدمی قتل ہوگئے، فاتح (نپولین) کی رحم دلی کی بہت کچھ تعریف کی گئی ہے لیکن اس رحم دلی کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے، ایک مقررمدت تک تیس قیدی روزآنہ قتل کیے جاتے رہے، مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں دہشت بیٹھ جائے، ایک روز صبح کو فرانسیسی دستے خچروں کا ایک جھنڈ جن پر بورے لدے ہوئے تھے، ہنکاتے ہوئے قاہرہ میں لائے، اس وقت وہاں آدمیوں کا بڑا اژدہام تھا اور ہر شخص یہ معلوم کرنے کا مشتاق تھا کہ بوروں میں کیا چیز ہے، سپاہیوں نے بیک وقت تمام بورے کھول ڈالے اور ان کے اندر سے سیکڑوں سر برآمد ہوئے، آخر ان بدنصیبوں کا جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانا چاہتے تھے، جسے دشمن نے حملہ کرکے برباد کرڈالا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ ریگستان کے سیاہ باشندے یورپین تہذیب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کریں گے[1]۔''

اعلانِ جنگ نپولین کے حملہ کے وقت مصر اگرچہ عملاً مملوکوں کے زیر تسلط تھا، تاہم دولت عثمانیہ کی سیادت بدستور تسلیم کی جاتی تھی اور وہاں کا حاکم اعلیٰ باب عالی ہی کا فرستادہ

[1] ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ، جلد ۱۲، ص ۴۶۷۔

پاشا ہوا کرتا تھا، چوں کہ سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت قابل اطمینان نہ تھی اور سمندر کی راہ سے فرانسیسی فوجوں کی کمک روکی نہیں جاسکتی تھی، اس لیے سلیم کو اعلان جنگ کرنے میں کسی قدر تامل تھا لیکن مصر کی فتح سے ہندوستان پر بھی زد پڑتی تھی اور نپولین کی ''مشرقی سلطنت'' کی اسکیم اب مخفی نہ رہ گئی تھی، اس لیے انگلستان نے اس خطرہ کے سدباب کے لیے باب عالی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، اسی طرح روس نے بھی فرانس کی دشمنی میں دولت علیہ سے اتحاد کرنے کی خواہش کی اور اپنا جنگی بیڑہ اس کی مدد کے لیے پیش کیا، چنانچہ سلطنت عثمانیہ، انگلستان اور روس کے درمیان ایک اتحاد قائم ہوگیا اور باب عالی نے ۲۱ ربیع الاول ۱۲۱۳ھ (۲ ستمبر ۱۷۹۸ء) کو جمہوریہ فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا، اس کے بعد روسی اور ترکی بیڑوں نے دردانیال سے نکل کر جزائر آئیونین پر قبضہ کرلیا، جو معاہدہ کیمپو فورمیو کے رو سے سلطنت فرانس میں شامل کرلیے گئے تھے، روس اور دولت عثمانیہ کا یہ پہلا اتحاد تھا جو ایک متفقہ جنگ کے لیے کیا گیا تھا، دونوں حلیف اب تک ایک دوسرے کے شدید ترین دشمن تھے۔

شام سلیم نے شام اور جزیرہ روڈس میں فوجوں کی تیاری کا حکم دیا، شام کی فوج کا سپہ سالار جزار پاشا مقرر ہوا جو اپنی سابق خودسری کے باوجود اس وقت دولت عثمانیہ کی خدمت کے لیے آمادہ ہوگیا تھا، تجویز یہ تھی کہ شامی فوج صحرا کو عبور کرکے فرانسیسیوں پر مصر میں حملہ آور ہو اور اسی وقت مصطفیٰ پاشا روڈس کی فوج کے ساتھ خلیج ابوقیر کی طرف سے حملہ کرے لیکن بجائے اس کے کہ نپولین مصر میں ان حملوں کا انتظار کرتا، وہ پچیس ہزار سپاہیوں کو لے کر جن میں کچھ مملوک بھی شامل تھے، جنوری ۱۷۹۹ء میں شام کی طرف روانہ ہوگیا اور ۱۵ فروری کو العریش، ۲۵ فروری کو غزہ اور ۷ مارچ کو یافہ فتح کرلیا، یافہ کے ترکی دستے نے جس کی تعداد پانچ ہزار تھی، اس شرط پر ہتھیار ڈالے تھے کہ انہیں فوجی قیدی سمجھا جائے گا لیکن شہر پر قبضہ کرنے کے بعد نپولین نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور پورے دستہ کو قتل

کرادیا۔

اس کے بعد وہ عکا کی طرف بڑھا جس کی فتح کے بعد پورے شام کی فتح میں کوئی روک باقی نہ رہ جاتی، ۲۰ / مارچ کو محاصرہ شروع ہوا اور دو مہینے تک جاری رہا لیکن نپولین کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور یہ شہر فتح نہ ہوسکا، محصورین کی غیر معمولی شجاعت کے علاوہ ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی بحری سمت سے عکا کو مدد برابر پہنچ رہی تھی اور محاصرہ کے لیے جو بڑی بڑی توپیں نپولین نے سمندر کے راستہ سے روانہ کی تھیں انہیں انگریز امیر البحر سر سڈنی اسمتھ نے چھین لیا تھا اور خود فرانسیسیوں کے خلاف استعمال کر رہا تھا، اس درمیان میں نپولین کو یہ اطلاع ملی کہ دمشق کی عثمانی فوج عکا کی مدد کے لیے روانہ ہو چکی ہے، اس نے جنرل کلیبر کو ایک دستہ کے ساتھ روانہ کیا کہ اس فوج کو آگے بڑھنے سے روکے، جبل طابور کے قریب فریقین کا مقابلہ ہوا اور ترکوں نے کلیبر کے پورے دستہ کو گھیر لیا، اگر نپولین عین وقت پر اس کی مدد کے لیے نہ پہنچ جاتا تو کلیبر مع اپنے سپاہیوں کے گرفتار ہو جاتا لیکن ۱۶ / اپریل کو جبل طابور پہنچتے ہی اس نے ترکوں کو شکست دے کر بھگا دیا، اس کے بعد وہ پھر عکا واپس آ گیا، ۷ / مئی کو روڈس سے فوجی کمک پہنچی، جس سے محصورین کے حوصلے اور بڑھ گئے، اس کے بعد کلیبر نے پوری قوت کے ساتھ ایک آخری حملہ قلعہ پر کیا، مگر وہ بھی اور حملوں کی طرح ناکام رہا، بالآخر مایوس ہو کر نپولین نے ۲۰ / مئی کو محاصرہ اٹھا لیا اور مصر کی طرف روانہ ہوا، اس کی ''مشرقی سلطنت'' کی اسکیم ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہوگئی، عکا کی طرف دیکھ کر اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ ''اس حقیر قلعہ سے مشرق کی قسمت وابستہ تھی۔''

جنگ ابو قیر نپولین کے مصر پہنچنے کے بعد ہی روڈس کی پندرہ ہزار عثمانی فوج مصطفیٰ پاشا کے زیر قیادت خلیج ابو قیر میں داخل ہوئی اور آسانی کے ساتھ وہاں کے فرانسیسی دستہ کو شکست دے دی، یہ سن کر نپولین فوراً قاہرہ سے روانہ ہو کر ۲۵ / جولائی کو ابو قیر پہنچا، مصطفیٰ پاشا پہلے سے تیار تھا، لڑائی گھمسان کی ہوئی اور ترک ایسی بہادری سے لڑے کہ فرانسیسیوں کے پیر

اکھڑ گئے لیکن فتح کے جوش میں انہوں نے منتشر ہو کر زخمی سپاہیوں کے سر کاٹنے شروع کر دیے، نپولین نے فوراً اس حالت سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تازہ دم دستوں کو جنرل میورا (Murat) کی سرکردگی میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا، میورا عثمانی سرعسکر کے خیمہ تک پہنچ گیا یہاں تک کہ دونوں میں دست بدست لڑائی ہونے لگی اور دونوں نے ایک دوسرے کو زخمی کیا، اس عرصہ میں ترک جو پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے، فرانسیسیوں کے تازہ حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگ کھڑے ہوئے، بہتیرے جان بچانے کے لیے سمندر میں کود پڑے اور ان میں سے زیادہ تر ڈوب کر ہلاک ہو گئے، ایسی صورت میں مصطفیٰ پاشا کے لیے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اس فتح نے عکا کی ناکامی کی کچھ تلافی کر دی اور مصر میں نپولین کا اقتدار قائم ہو گیا۔

مصر پر عثمانی تسلط ان ہی دنوں فرانس سے جو اطلاعات موصول ہوئیں ان کے لحاظ سے نپولین نے جلد از جلد وہاں پہنچ جانا ضروری خیال کیا، چنانچہ مصر کا انتظام جنرل کلیبر کو سپرد کر کے وہ ۲۲ راگست کو نہایت خفیہ طور پر اپنے بعض افسروں کے ساتھ اسکندریہ سے فرانس کو روانہ ہو گیا، کلیبر نے سڈنی اسمتھ سے جو مصطفیٰ پاشا کی فوج کے ساتھ مصر آیا تھا، صلح کی گفتگو شروع کی اور بالآخر تخلیہ مصر کا معاہدہ کر لیا لیکن جب برطانوی امیر البحر لارڈ کائتھ (Keith) نے اس امر پر اصرار کیا کہ فرانسیسی فوج کو اپنے ہتھیار رکھ دینے چاہیں تو کلیبر نے غصہ سے معاہدہ چاک کر ڈالا اور اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا ''سپاہیو! اس گستاخی کا جواب فتوحات کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا'' چنانچہ وہ چھ ہزار کا ایک دستہ لے کر عثمانی فوج پر حملہ آور ہوا جو اوائل ۱۸۰۰ء میں صدر اعظم کے زیر کمان مصر پہنچی تھی اور ۲۰ مارچ کو ہیلیو پولس (Helio Polis) کی جنگ میں اسے شکست دی لیکن اس کے چند روز بعد کسی نے اسے قتل کر دیا، کلیبر کا جانشین منو (Menou) اپنی فوجی لیاقت کے اعتبار سے اس کا ہم پلہ نہ تھا، جنگ ہیلیو پولس کے بعد ایک سال تک فرانسیسی فوج مصر پر قابض رہی، مارچ ۱۸۰۱ء

میں سرابرکرومبی (Abereromby) کی سرکردگی میں ایک انگریزی فوج مصر آئی، اس کے بعد ایک دوسری فوج جنرل بیرڈ (Baird) کے ساتھ پہنچی، فرانسیسی فوج کا کچھ حصہ قاہرہ میں تھا اور کچھ اسکندریہ میں، مارچ میں سرابرکرومبی نے اسکندریہ میں فرانسیسیوں کو شکست دی اور جون میں ترکی اور انگریزی فوجوں نے قاہرہ کے فرانسیسی دستہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا، ستمبر میں فرانسیسی سپہ سالار نے مصر سے نکل جانے کا معاہدہ کیا، فرانسیسی فوج کو انگریزی جہازوں پر فرانس واپس جانے کی اجازت دی گئی اور مصر پر دولت عثمانیہ کا تسلط از سرِنو قائم ہوگیا۔

فرانس سے صلح مارچ ۱۸۰۲ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان معاہدۂ امیان (Amiens) کے رو سے ایک عارضی صلح ہوگئی، ساتھ ہی فرانس اور دولت علیہ کے درمیان بھی صلح نامہ ہوگیا، نپولین نے فرانس کے قونصل اول کی حیثیت سے مصر پر دولت عثمانیہ کی فرماں روائی تسلیم کرلی اور سلطان نے ان حقوق اور مراعات کی تجدید کی جو اہل فرانس کو اپنے سابق بادشاہوں کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں حاصل تھے۔

اندرونی شورشیں ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہوجانے کے بعد سلیم کو چار سال کے لیے جنگ سے مہلت مل گئی لیکن جہاں تک سکون کا تعلق تھا وہ اس مختصر فرصت میں بھی میسر نہ آیا، وہابیوں نے شام پر از سرِنو حملہ شروع کردیا تھا، ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں انہوں نے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ کرکے تمام عرب پر اپنا تسلط قائم کرلیا، مصر میں فرانسیسی فوجوں کے چلے جانے کے بعد ممالک کی خودسری بدستور شروع ہوگئی، باب عالی کی طرف سے جو فوجیں ان کے مقابلہ کے لیے بھیجی گئیں ان سے وہ عرصہ تک لڑتے رہے، شام میں جزار پاشا پھر خودمختار بن بیٹھا اور مرتے دم (۱۸۰۴ء) تک سرکشی پر قائم رہا، ودین میں پزدان اوغلو کی بغاوت باب عالی کی انتہائی کوششوں کے بعد بھی فرو نہ ہوسکی، یہاں تک کہ سلیم نے مجبور ہوکر ۱۸۰۶ء میں اس کی پوری مدت حیات تک کے لیے اسے ان تمام علاقوں کا حاکم تسلیم کرلیا جن پر وہ بہ اختیار خود قابض ہوگیا تھا اور بطور سند اس کو درجہ اول کے پاشا کا نشان

عطا کیا، غرض صلح کے زمانہ میں بھی سلطنت کے مختلف حصوں میں شورش برپا تھی۔

سرویا سب سے زیادہ نازک سرویا کا حال تھا، اس وقت سرویا کا والی حاجی مصطفیٰ پاشا تھا، وہ ایک نہایت رحم دل اور دردمند شخص تھا اور رعایا میں اس قدر مقبول تھا کہ عیسائی اسے ''اہل سرویا کی ماں'' پکارتے تھے، اس کے عہد میں ہر طرف امن وامان تھا، تجارت ترقی پر تھی اور سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف ہوتا تھا[1] لیکن سلیم کی فوجی اصلاحات نے سرویا کے ینی چری دستوں کو اتنا برانگیختہ کیا کہ انہوں نے بغاوت کر کے تمام صوبہ میں قتل وغارت گری شروع کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ سرویا کے باشندے عاجز آ کر ان کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور سلطانی فوجوں کی مدد سے ان کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا مگر اس کامیابی سے ان کے اندر آزادی کا حوصلہ پیدا ہو گیا اور اب انہوں نے وطنی آزادی کے لیے خود دولت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔

اس جرأت کے مختلف اسباب تھے، سلطنت عثمانیہ اور آسٹریا کی گذشتہ جنگ میں جس کا خاتمہ صلح نامۂ سستوا پر ہوا تھا، جب آسٹریا کی فوجیں سرویا میں داخل ہوئیں تو وہاں کی عیسائی رعایا نے حملہ آوروں کا خیر مقدم کیا اور فوجی دستے قائم کر کے دولت علیہ کے خلاف آسٹریا کو بہت کچھ مدد پہنچائی، صلح نامہ سستوا کے رو سے سرویا پھر دولت عثمانیہ کو واپس مل گیا، عثمانی تسلط کے قائم ہونے پر عیسائی رعایا کے فوجی دستے توڑ دیے گئے لیکن پچھلی جنگ میں جو فوجی روح ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی وہ فنا نہ ہوئی، اس روح کو حاجی مصطفیٰ نے بھی زندہ رکھنا چاہا، اس نے رعایا کو ینی چری کی غارت گری سے محفوظ رکھنے کے لیے سروی کسانوں کے مسلح دستے قائم کر دیے، تحریک آزادی کا ایک دوسرا سبب وہ شورشیں تھیں جو خود مختار حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں متعدد صوبوں میں برپا تھیں، سرویا بھی ان شورشوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے باشندوں میں بھی آزادی کا جذبہ پیدا ہو

---

[1] ریاستہائے بلقان از ملر، ص ۳۰۹۔

گیا، یہ جذبہ انقلاب فرانس کی ہنگامہ خیزیوں سے اور بھی ترقی کر گیا لیکن ان اسباب کے باوجود سرویا میں قومی آزادی کی تحریک دفعۃً تیز نہ ہو جاتی اگر ینی چری نے اپنے مظالم سے وہاں کے باشندوں کو عاجز نہ کر دیا ہوتا۔

ینی چری کی قتل وغارت گری | یوں تو سلطنت کے ہر حصہ میں ینی چری کی خودسری بڑھی ہوئی تھی لیکن سرویا میں بالخصوص ان کی سرکشی کی کوئی انتہا نہ تھی، بلغراد اور دوسرے شہروں کے ینی چری دستے نہ صرف عیسائی رعایا میں لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے تھے، بلکہ اپنے ہم مذہب ''سپاہی'' جاگیرداروں پر بھی جن کو وہاں کی زمینیں سلطان کی طرف سے فوجی خدمات کے صلہ میں ملی تھیں، ان کا دست ستم اتنا ہی دراز تھا، چنانچہ عیسائی رعایا اور سپاہی جاگیردار دونوں نے ینی چری کے مظالم کے خلاف باب عالی میں فریاد کی، سلیم نے بکیر پاشا کو بلغراد کا والی مقرر کر کے روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ ینی چری دستوں کو بلغراد اور سرویا کے تمام علاقوں سے نکال دے، بکیر پاشا نے ینی چری سردار ولی احمد کو قتل کر کے انہیں سرویا سے نکال دیا، ینی چری نے پزدان اوغلو باغی ودین کے یہاں جا کر پناہ لی، پزدان اوغلو نے ان کی سفارش باب عالی میں کی اور اس بات کی اجازت دلوا دی کہ اگر وہ امن وسکون کے ساتھ رہنے کا وعدہ کریں تو بلغراد واپس آ سکتے ہیں لیکن سرویا میں داخل ہونے کے بعد ان کی غارت گری بدستور سابق پھر شروع ہو گئی، اس وقت حاجی مصطفیٰ پاشا نے جو بکیر پاشا کے بعد سرویا کا والی مقرر ہوا تھا، اہل سرویا کو ینی چری کے مقابلہ کے لیے ابھارا، چنانچہ سروی دستوں نے پاشا اور سپاہی جاگیرداروں کی مدد سے باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا، اس واقعہ کی اطلاع جب قسطنطنیہ اور سلطنت کے دوسرے حصوں کے ینی چری دستوں کو پہنچی تو ان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، علماء اور عام مسلمانوں کو بھی کفار کی مدد سے ینی چری کا سرویا سے نکالا جانا حد درجہ ناگوار ہوا، سلیم نے رائے عامہ سے مجبور ہو کر مصطفیٰ پاشا کو حکم دیا کہ ینی چری کو بلغراد واپس آنے کی اجازت دے دی جائے لیکن انہوں

نے سرویا میں آتے ہی اپنے دشمنوں سے پورا پورا انتقام لینا شروع کر دیا، چنانچہ بلغراد پہنچ کر انہوں نے مصطفیٰ پاشا کو قتل کر دیا اور پورے صوبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اپنی جماعت کے چار سرداروں کو ہر حصہ کا حاکم مقرر کیا، اپنی تعداد کو ناکافی دیکھ کر انہوں نے بوسنیا اور البانیا کے باغیوں کی ایک مسلح فوج بھی تیار کر لی اور اس کے بعد بے خوف ہو کر لوٹ مار کرنے لگے، یہاں تک کہ ان کے مظالم سے عیسائی رعایا اور مسلمان جاگیردار دونوں بالکل عاجز آ گئے، باب عالی کے پاس اس وقت اتنی فوج نہ تھی کہ انہیں قابو میں لا سکے، اس لیے اس نے صرف دھمکی سے کام نکالنا چاہا اور انہیں متنبہ کیا کہ اگر وہ اپنا ہاتھ نہ روکیں گے تو ان کی سرکوبی کے لیے غیر قوم اور غیر مذہب کے سپاہی متعین کر دیے جائیں گے، ینی چری نے یہ قیاس کر کے کہ ان سپاہیوں سے باب عالی کی مراد سرویا کے عیسائی باشندے ہیں، انہیں بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔

ینی چری کا استیصال سرویا کے باشندوں میں آزادی کی روح اس سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی، انہوں نے فوجی تربیت بھی ایک حد تک حاصل کر لی تھی، سلطانی فوج کی مدد سے ایک بار وہ ان ہی ینی چری دستوں کو شکست بھی دے چکے تھے، چنانچہ اب متفقہ طور پر انہوں نے اپنی قوم کے ایک کسان جارج پیٹروچ (George Petrowitcsh) کو جو تاریخ میں عموماً قرہ جارج کے نام سے مشہور ہے، سپہ سالار مقرر کر کے ینی چری کا مقابلہ شروع کیا، سپاہی جاگیرداروں نے بھی ان کی مدد کی اور باب عالی کی فوجیں بھی بکیر پاشا والی بوسنیا کی سرکردگی میں ان کی مدد کے لیے آ گئیں، باب عالی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کی بار بلغراد کے ینی چری دستوں کا کامل استیصال کر دیا جائے، عیسائی رعایا بھی انتہائی غیض و غضب میں ان کی بیخ کنی پر آمادہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ینی چری کو شکست ہوئی، کچھ بھاگ کر پزدان اوغلو کے پاس پناہ گزیں ہوئے، بقیہ قتل کر دیے گئے۔

سرویا کا مطالبہ آزادی ینی چری کے استیصال کے بعد باب عالی نے حکم دیا کہ چوں کہ

ملک میں امن وامان قائم ہوگیا ہے، اس لیے سروی دستوں کے باقی رکھنے کی ضرورت نہیں رہی، وہ توڑ دیے جائیں لیکن عیسائیوں میں اب آزادی کا حوصلہ پیدا ہو چکا تھا، ینی جری کو شکست دے کر ان کی ہمتیں بہت بڑھی ہوئی تھیں، بلغراد اور چند دوسرے قلعوں کے علاوہ سرویا کے باقی تمام علاقوں پر ان ہی کا قبضہ تھا، چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ باب عالی کے حکم کی تعمیل میں ہتھیار رکھ کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے اور جاگیرداروں کے ماتحت زراعت اور دوسرے کاروبار میں بدستور سابق مشغول ہو جاتے، انہوں نے ملکی آزادی حاصل کرنے کے لیے خود دولت علیہ کے خلاف جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور فوجی مدد کے لیے ایک وفد اگست ۱۸۰۴ء میں زار روس کی خدمت میں بھیجا، زار نے انہیں مشورہ دیا کہ جنگ شروع کرنے سے قبل اپنے مطالبات باب عالی میں پیش کریں اور وعدہ کیا کہ باب عالی پر دباؤ ڈال کر ان کے مطالبات منظور کرانے کی کوشش کرے گا، چنانچہ اس ہدایت کے بموجب ۱۸۰۵ء میں اہل سرویا نے ایک وفد قسطنطنیہ بھیجا اور باب عالی سے یہ درخواست کی کہ آئندہ سرویا کے تمام قلعوں میں سروی دستے متعین کر دیے جائیں اور چوں کہ گذشتہ ہنگاموں میں پورا صوبہ سخت مصیبتوں میں مبتلا تھا، اس لیے خراج اور محاصل کا تمام بقایا معاف کر دیا جائے، ان میں سے پہلا مطالبہ نہایت اہم تھا، اس کے معنی یہ تھے کہ دولت عثمانیہ کے زیر سیادت انہیں حکومت خود اختیاری دے دی جائے۔

روس کی جنگی تیاریاں اس وقت روس اور فرانس میں جنگ چھڑ چکی تھی اور روس باب عالی میں اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اس جنگ میں دولت عثمانیہ کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا، ۱۷۹۸ء کے بعد جب روس اور دولت علیہ میں اتحاد قائم ہوا تو سلیم نے روس کو بہت سی خاص مراعات دے دی تھیں، جن کو ترک نہایت خطرناک خیال کرتے تھے، مثلاً ۱۸۰۱ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد بھی اس نے روسی جہازوں کے لیے باسفورس اور درۂ دانیال سے گزرنے کی اجازت باقی رکھی، حالاں کہ

یہ اجازت ابتداءً محض ضرورت جنگ کی بنا پر دی گئی تھی، قسطنطنیہ میں ترکوں نے اس اجازت کے قائم رکھنے پر اس قدر برہمی کا اظہار کیا کہ بالآخر مجبور ہو کر سلیم کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ اگر روس کسی ایسی حکومت سے برسرپیکار ہوگا جس کے تعلقات دولت عثمانیہ سے دوستانہ ہوں گے تو یہ اجازت منسوخ کر دی جائے گی، اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر روس نے جزائر آئیونین میں اپنی فوجی قوت بہت بڑھالی تھی اور ترک افسروں کے احتجاج کے باوجود البانیا کے باشندوں کو بھی اپنی فوج میں داخل کرنا شروع کر دیا تھا، ۱۸۰۲ء میں باب عالی نے روس سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ مولڈیویا اور ولاچیا کے امیر اس کے مشوروں کے بغیر معزول نہ کیے جائیں گے اور تاجروں کے علاوہ دوسرے ترک ان علاقوں میں نہ رہ سکیں گے، یہ گویا مولڈیویا اور ولاچیا کو روس کی سرپرستی میں دے دینا تھا، ۱۸۰۵ء میں روس نے بحر اسود کے جنوبی مشرقی ساحل پر اپنا اقتدار اس سے بھی زیادہ قائم کر لیا، باب عالی نے اسے دریائے فاسیس (واقع منگریلیا) میں جہازوں کی آمد ورفت اور ان جہازوں کی حفاظت کے لیے دریائے مذکور کے ساحلوں پر قلعے تعمیر کر کے ان میں فوجی دستے رکھنے کی اجازت دے دی، پاشائے ارض روم کو حکم ملا کہ ان قلعوں کی تعمیر میں روسیوں کی مدد کرے نیز جنگ ایران کے سلسلہ میں جو اس وقت روس سے جاری تھی، ان کی اعانت کرے، اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روس نے ان ضلعوں پر بھی قبضہ کر لیا جو دریائے فاسیس سے کافی فاصلہ پر واقع تھے اور قلعہ انکریا (Anakria) پر قبضہ کر کے ایک دوسرا قلعہ بحر اسود کے ساحل پر تعمیر کر لیا۔

یہ سب تیاریاں مکمل ہونے کے بعد جب زار نپولین کے خلاف آسٹریا اور انگلستان سے اتحاد کرنے جا رہا تھا تو روسی سفیر اٹالنسکی (Italinski) نے اپنی حکومت کی طرف سے یہ مطالبات پیش کیے کہ باب عالی روس کے ساتھ فوراً ایک جارحانہ اور مدافعانہ اتحاد کر لے، نیز اپنی تمام رعایا کو جو کلیسائے یونان کی پیرو ہو زار کی سرپرستی میں دے دے اور اس بات کا وعدہ کرے کہ جب کبھی ترکوں کی طرف سے ان کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگی تو سفیر

روس کی درخواست پر باب عالی اس کی تلافی کرنے پر مجبور ہوگا، یہ مطالبات ٹھیک اس وقت پیش کیے گئے جب روس ہی کی تحریک پر سرویا کے وفد نے اپنے مطالبات باب عالی میں پیش کیے تھے، یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرویا کے عیسائی یونانی کلیسا کے پیرو تھے۔

سلیم کے لیے روس کے یہ مطالبات نا قابل برداشت تھے، خصوصاً وہ جس کا تعلق عیسائی رعایا کی سرپرستی سے تھا کیوں کہ اس کی منظوری حقیقۃً روس کی غلامی کے مترادف تھی لیکن اس خطرہ سے کہ روسی فوجیں جو بحر اسود کی بندرگاہوں میں جمع تھیں، آٹھ روز کے اندر قسطنطنیہ پہنچ سکتی ہیں، روس نے جو دستے جزائر آئیونین میں اکٹھا کر لیے تھے وہ فوراً البانیا میں داخل ہو کر البانی اور یونانی باغیوں کے ساتھ اورنہ پر چڑھائی کر سکتے تھے، جارجیا کی روسی فوجیں جو ایرانیوں کے مقابلہ میں فتح یاب ہو چکی تھیں، ایشیائے کوچک کی راہ سے دارالسلطنت کی طرف بڑھ سکتی ہیں اور سرویا کے عیسائیوں کو ملا کر روس بلغاریا پر قبضہ کر سکتا ہے، سلیم اور ارکان دیوان نے یہی مناسب خیال کیا کہ ان مطالبات پر گفت وشنید کا سلسلہ کچھ دنوں جاری رکھا جائے اور اس درمیان میں ان حملوں سے بچنے کے لیے جو تدبیریں ممکن ہوں، اختیار کی جائیں، چنانچہ اٹالنسکی سے گفتگو شروع ہوئی اور اس کا سلسلہ کچھ عرصہ تک قائم رہا، اس فرصت میں سلیم نہایت سرگرمی کے ساتھ مدافعت کی تیاریاں کرتا رہا۔

سرویا کی آزادی سلیم کو یقین تھا کہ روس سے جنگ ناگزیر ہے، اس لیے وہ سرویا کے مسئلہ کو جلد سے جلد طے کر لینا چاہتا تھا، آئندہ جنگ کے خیال سے وہ سرویا کے ساتھ برسرِ پیکار ہونا مناسب نہیں سمجھتا تھا لیکن چوں کہ سرویا کی وفاداری پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس بات کا قوی احتمال تھا کہ لڑائی میں سرویا روس کا ساتھ دے گا نیز اس اندیشہ سے بھی کہ اگر سرویا کا مطالبہ منظور کر کے بلغراد اور دوسرے قلعوں سے ترکی دستے نکال لیے گئے تو قسطنطنیہ میں سخت شورش برپا ہو جائے گی، سلیم نے اس مطالبہ کو نامنظور کر دیا اور سروی وفد کو قید کر لینے کا حکم دیا، ساتھ ہی اس نے نیش کے پاشا کو سرویا کی بغاوت فرو کرنے کے لیے

روانہ کیا، قرہ جارج نے پاشا کی فوج کا سرحد پر مقابلہ کیا اور اسے شکست دی، اس کے بعد سلیم نے دو فوجیں اور روانہ کیں، مگر اہل سرویا نے قرہ جارج کی سرکردگی میں انہیں بھی شکست دی اور بلغراد اور دوسرے سروی قلعوں پر جن میں ترکی دستے متعین تھے، قبضہ کر لیا، اس طرح ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں سرویا کے عیسائیوں نے بغیر کسی بیرونی مدد کے تقریباً کامل خود مختاری حاصل کر لی۔

فرانس سے اتحاد اس درمیان میں یورپ میں جنگ چھڑ چکی تھی اور ایک طرف فرانس اور دوسری طرف روس اور انگلستان، اس جنگ میں سلطنت عثمانیہ کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کر رہے تھے، اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے روسی سفیر کا تقاضا بھی برابر جاری تھا، برخلاف اس کے فرانسیسی سفیر سلیم پر زور ڈال رہا تھا کہ وہ ان مطالبات کو مسترد کر دے اور نپولین کو شہنشاہ فرانس تسلیم کر کے فرانس کے ساتھ اتحاد قائم کر لے، روسی اور برطانوی سفیر نپولین کو شہنشاہ تسلیم کرنے کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے متفقہ طور پر باب عالی کو دھمکی دی کہ اگر ایسا کیا گیا تو جنگ کا اعلان فوراً کر دیا جائے گا، قسطنطنیہ میں دونوں فریق کی کوششیں ابھی جاری تھیں کہ نپولین نے آسٹریا اور روس کی فوجوں کو زبردست شکست دے کر باب عالی کے لیت و لعل کا ایک حد تک خاتمہ کر دیا، ان شکستوں کا فوری اثر یہ ہوا کہ پندرہ ہزار روسی فوج جو سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کے لیے سیاسٹوپول میں تیار رکھی گئی تھی، وسط روس میں واپس بلالی گئی کیوں کہ وہاں کی فوجیں فرانسیسیوں کے مقابلہ میں مغرب کی جانب روانہ ہو رہی تھیں، نپولین کی ان فتوحات کا ایک دوسرا نمایاں اثر یہ ہوا کہ روسی سفیر کا لب ولہجہ بالکل بدل گیا اور اس کے مطالبات کی شدت باقی نہیں رہی، چنانچہ باب عالی کو اب روس کی طرف سے وہ خطرہ نہ رہا جو پہلے تھا اور وہ فرانس سے اتحاد کرنے پر مائل ہونے لگا۔

روس سے اعلان جنگ ۲۶ دسمبر ۱۸۰۵ء کو معاہدہ پرسبرگ (Presburg) کے رو سے فرانس اور آسٹریا کے درمیان صلح ہو گئی، من جملہ اور علاقوں کے ڈلماشیا اور کروشیا کا

ایک حصہ فرانس کے ہاتھ آیا اور اب فرانسیسی اور عثمانی سلطنتیں ہم سرحد ہوگئیں، فرانسیسی سفیر نے اس صلح نامہ کی ایک نقل صدر اعظم کے سامنے پیش کی اور ان فوائد کو مفصل طور پر بیان کیا جو نپولین کی دوستی سے دولت عثمانیہ کو حاصل ہو سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ باب عالی نے نپولین کو فرانس کا شہنشاہ تسلیم کر لیا، ۱۸۰۶ء میں نپولین نے جنرل سباستیانی (Sebastiani) کو اپنا غیر معمولی سفیر بنا کر سلیم کے پاس بھیجا، سباستیانی نے اس بات کی کوشش کی کہ دولت عثمانیہ اور روس میں جنگ چھڑ جائے تا کہ زار کو اپنی کچھ فوجیں پولینڈ سے ہٹا لینی پڑیں جہاں وہ فرانس کی فاتح افواج کے مقابلہ میں فریڈرک ولیم، شاہ پرشا کی مدد کر رہا تھا، چنانچہ سباستیانی کی تحریک پر سلیم نے مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کو جن کی نسبت تقریباً یقین تھا کہ وہ روس کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں اور اس سے سازش کر کے دولت علیہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں، ان حکومتوں سے برطرف کر دیا، چوں کہ یہ فعل ۱۸۰۲ء کے معاہدہ کے خلاف تھا، اس لیے روسی سفیر نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، سفیر برطانیہ نے بھی اس احتجاج میں روس کی ہم نوائی کی اور دونوں ملکوں نے باب عالی کو یہ دھمکی دی کہ عن قریب روسی فوجیں مولڈیویا میں داخل ہوں گی اور انگریزی بیڑہ قسطنطنیہ کی طرف بڑھے گا، سلیم نے معاہدہ مذکور کی خلاف ورزی کی تلافی کر دینی چاہی اور معزول شدہ امیروں کو دوبارہ مقرر کرنے کے لیے احکام جاری کیے لیکن اس سے قبل ہی روسی فوجیں مولڈیویا میں داخل ہو کر یاسی تک پہنچ چکی تھیں، زار الکزنڈر پہلے ہی سے جنگ کے لیے تیار تھا، مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کی معزولی سے اس کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور اس نے فوراً بغیر کسی اعلان جنگ کے پینتیس ہزار فوج جنرل میکلسن (Michelson) کے زیر کمان ان صوبوں پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی، میکلسن تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا ۲۷ دسمبر ۱۸۰۶ء کو ولاچیا کے پایہ تخت بخارسٹ میں داخل ہو گیا، اب مجبور ہو کر باب عالی کو بھی روس کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا۔

برطانیہ کا الٹی میٹم حکومت برطانیہ نے روس کو پوری مدد دی، برطانوی سفیر مسٹر ار بتھنات

(Arbuthnot) نے باب عالی کو الٹی میٹم دیا کہ اگر روس اور انگلستان کے ساتھ دولت عثمانیہ فوراً اتحاد نہ کرلے گی اور فرانسیسی سفیر رخصت نہ کردیا جائے گا تو روسی فوجیں نیز برطانیہ اور روس کے جنگی بیڑے حملہ کردیں گے، رئیس آفندی (وزیر خارجہ) نے ار بتھناٹ کو اس کے جواب میں یہ لکھا کہ دولت علیہ نے ہمیشہ جنگ سے احتراز کیا اور صلح قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن روس ا[illegible]گ پر مجبور کرتا رہا، اس نے اپنے خط میں مولڈیویا اور ولاچیا کے امیروں کا خاص طور پر حوالہ دیا کہ باوجود اس کے کہ سلطان نے انہیں معزول کردیا تھا تاہم صرف روس کے مطالبہ پر اس نے اپنے سابق حکم کو منسوخ کردیا اور انہیں دوبارہ مقرر کرنے کے لیے فرمان جاری کیا، سلطان نے یہ ذلت محض جنگ سے بچنے کی غرض سے گوارا کی لیکن روس نے اس کی پرواہ نہ کی اور بغیر کسی اعلان جنگ کے اپنی فوجیں مولڈیویا اور ولاچیا میں روانہ کردیں، آخر میں اس نے لکھا کہ ''اگر برطانیہ عظمیٰ روس کی مدد میں سلطان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرچکی ہے تو سلطان بھی قوت کا جواب قوت سے دے گا اور اس انتہائی نامنصفانہ حملہ سے بچنے کے لیے خدا کی ذات پر بھروسہ کرے گا اور اگر آخر کار ترکی کو فنا ہی ہونا ہے تو وہ اپنے پایہ تخت کی حفاظت کرنے میں فنا ہوگی اور اس وقت سب سے زیادہ خود انگریز قوم کو اس ناقابل تلافی نقصان کا تجربہ ہوگا جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی سے واقع ہوکر رہے گا۔''[1]

یہ جواب پاتے ہی ار بتھناٹ فوراً قسطنطنیہ سے روانہ ہوکر برطانوی بیڑہ پر پہنچا جو امیر البحر ڈک ورتھ (Duckworth) کی سرکردگی میں جزیرہ ٹینیڈوس کے قریب لنگر انداز تھا، ڈک ورتھ کو یہ ہدایت تھی کہ جلد سے جلد قسطنطنیہ پہنچ کر عثمانی بیڑہ کی سپردگی کا مطالبہ کرے اور اگر یہ مطالبہ پورا نہ کیا جائے تو عثمانی جہازوں میں آگ لگا کر قسطنطنیہ پر گولہ باری شروع کردے، چنانچہ ۱۹ر فروری ۱۸۰۷ء کو انگریزی بیڑہ بلا کسی نقصان کے دردانیال میں داخل ہوگیا اور بحر مارمورا میں پہنچ کر ترکوں کے ایک بڑے اور چار چھوٹے جہازوں پر گولہ باری کر

---

[1] کریسی، جلد ۲، ص ۳۶۷۔

کے انہیں ڈبو دیا، دردانیال کی مورچہ بندی اس قدر کم زور تھی کہ انگریزی بیڑہ کو اس سے گزرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی اور ترکی توپوں کی گولہ باری کے باوجود جنوبی ہوا سے فائدہ اٹھا کر اس نے آبنائے کو عبور کر لیا، ڈک ورتھ قسطنطنیہ سے چند میل کے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا اور مندرجہ ذیل شرائط صدر اعظم کی خدمت میں بھیجے:

۱- باب عالی روس اور انگلستان سے اتحاد کر لے۔

۲- عثمانی بیڑہ اور دردانیال کے قلعے انگلستان کے حوالے کر دیے جائیں۔

۳- روس کو مولڈیویا اور ولاچیا دے دیا جائے۔

۴- سباستیانی کو رخصت کر دیا جائے اور فرانس سے جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔

باب عالی نے دس روز تک اربتھنات اور ڈک ورتھ کو صلح کی گفتگو میں مصروف رکھا، اس فرصت میں انتہائی جوش و سرگرمی کے ساتھ قسطنطنیہ کی قلعہ بندی کا کام ہوتا رہا، دار السلطنت کی پوری مسلمان آبادی سلیم اور جنرل سباستیانی کے زیر ہدایت دن رات کام کرتی تھی اور اس نے اپنے حیرت انگیز عزم و جاں فشانی سے قسطنطنیہ کو اتنے مستحکم طریقہ پر قلعہ بند کر لیا کہ برطانوی امیر البحر کو بے نیل و مرام واپس ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا، اسے خطرہ پیدا ہوا کہ مبادا وہ خود اپنے تمام جہازوں کے ساتھ گرفتار ہو جائے، چنانچہ یکم مارچ کو اس نے لنگر اٹھانے کا حکم دیا اور ۳؍ مارچ کو دردانیال سے ہو کر واپس ہوا لیکن اب کی بار اس کا بیڑا بہ مشکل سلامت گزر سکا، قدیم ترکی توپوں نے بھی آٹھ سو پونڈ کے سنگی گولے انگریزی جہازوں پر برسانے شروع کیے، جن سے کئی جہاز زخمی ہوئے اور دو ڈوب گئے اور چھ سو آدمی ہلاک ہوئے۔

مصر کی ناکام مہم اس ذلت کی تلافی کے لیے برطانیہ نے پانچ ہزار فوج مصر پر حملہ کرنے کی غرض سے سسلی سے روانہ کی، یہ فوج ۱۸؍ مارچ ۱۸۰۷ء کو اسکندریہ کے قریب اتری اور آگے بڑھ کر شہر پر حملہ آور ہوئی، اسکندریہ میں اس وقت ساڑھے چار سو ترکوں کا

ایک دستہ متعین تھا جو مقابلہ نہ کر سکا اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا لیکن انگریزی فوج کی یہی پہلی اور آخری کامیابی تھی، اس کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں سے ہر ایک میں اسے شکست ہوئی اور سیکڑوں آدمی تلف ہو گئے، آخر کار یہ معلوم کر کے کہ ایک زبردست عثمانی فوج قاہرہ سے روانہ ہو کر مقابلہ کے لیے آ رہی ہے، جنرل فریزر (Fraser) نے صلح کا علم بلند کیا اور مصر سے نکل جانے کی یہ شرط پیش کی کہ تمام انگریز قیدی واپس کر دیے جائیں، یہ شرط منظور کر لی گئی اور ۲۵ ستمبر کو انگریزی بیڑہ ناکام و نامراد اسکندریہ سے روانہ ہو گیا۔

قسطنطنیہ اور مصر کی ان ناکام مہموں سے برطانیہ کے اقتدار کو شدید صدمہ پہنچا۔

روس سے جنگ کا سلسلہ ۱۸۰۲ء میں فرانس سے صلح ہو جانے کے بعد سلیم نے اصلاحات کا کام پھر شروع کر دیا تھا، دو تین سال کے اندر فوجی اصلاحات میں بہت ترقی ہو گئی تھی، فرانسیسی افسروں کی تربیت میں توپچیوں نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اب ان کی اہمیت ینی چری سے بھی زیادہ ہو گئی تھی، عکا کی مدافعت میں عمر آغا کی چھوٹی سی فوج نے ایسے جوہر دکھائے کہ "نظام جدید" کی برتری کا اعتراف دوست اور دشمن سب نے کیا، اسی فوج نے بلغاریا اور رومیلیا کے ڈاکوؤں کا بھی استیصال کر دیا جن کے زبردست جتھے ان صوبوں کے امن و امان کے لیے ایک مستقل خطرہ تھے، ان ڈاکوؤں کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ انہوں نے ینی چری کے دستوں کو بھی شکست دے کر بھگا دیا تھا، سلیم نے "نظام جدید" کے دو دستے اور قائم کر کے فرانسیسی افسروں کے زیر نگرانی انہیں یورپ کے بہترین فوجوں کے نمونہ پر تعلیم دلوائی، اس نے ان کی تنخواہ کے لیے ایک علاحدہ فنڈ بھی قائم کیا، بعض پاشاؤں خصوصاً عبدالرحمن پاشا والی کرمانیہ نے بھی ان فوجی اصلاحات میں سلیم کی پرجوش تائید کی اور اپنے صوبوں میں بھی یہ اصلاحات شروع کیں، سلیم کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ ۱۸۰۵ء میں اس نے ایک فرمان جاری کیا کہ آئندہ ینی چری اور سلطنت کی دوسری فوجوں میں سے بہترین نوجوان منتخب کر کے "نظام جدید" میں داخل کیے جائیں، اس فرمان کے جاری ہوتے ہی

ینی چری نے علانیہ بغاوت کردی، اس وقت ان کی قوت بلغراد میں ٹوٹ چکی تھی لیکن دوسرے صوبوں میں وہ اب بھی طاقت ور تھے، چنانچہ اورنہ میں دس ہزار ینی چری نے جمع ہوکر علم بغاوت بلند کردیا اور اگست ۱۸۰۶ء میں ''نظام جدید'' کے جو دستے انہیں قابو میں لانے کے لیے روانہ کیے گئے تھے، ان کو شکست دے دی، سلطنت کے اور حصوں میں بھی ان کی شورشیں اس قدر بڑھیں کہ سلیم کو نہ صرف یہ فرمان منسوخ کردینا پڑا بلکہ دوسری فوجی اصلاحات بھی فی الحال روک دینی پڑیں، مفتی اعظم صالح زادہ اسعد آفندی کے اثر سے بغاوت کا فتنہ جلد فرو ہوگیا، البتہ ینی چری کے مطالبہ پر صدر اعظم حافظ اسماعیل پاشا معزول کردیا گیا اور اس کی جگہ ینی چری کا آغا ابراہیم علمی پاشا صدر اعظم مقرر ہوا، ''نظام جدید'' کے خلاف شورش اتنی زیادہ تھی کہ ۱۸۰۶ء میں جب روس نے مولڈیویا اور ولاچیا پر چڑھائی کی تو باب عالی کو روسیوں کے مقابلہ میں ایک نئی فوج بھیجنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

سلیم کے خلاف سازش فوجی اصلاحات کے روک دینے سے ینی چری کی بغاوت اس وقت فرو ہوگئی لیکن اصلاحات کے خلاف جذبات اسی طرح برانگیختہ تھے، ۱۸۰۷ء کے شروع میں شیخ الاسلام اسعد آفندی کا انتقال ہوگیا، وہ سلیم کا ایک مخلص دوست اور اس کی اصلاحات کا پرجوش حامی تھا، اس کی موت سلیم کے لیے نہ صرف ایک ذاتی سانحہ تھی بلکہ اس کی معزولی اور کل اصلاحات کی منسوخی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی، علماء کی جماعت بہ حیثیت مجموعی پہلے ہی سے اصلاحات کی مخالف تھی، نیا مفتی اعظم عطاء اللہ آفندی بھی تمام تر ینی چری کے زیر اثر تھا لیکن سلیم کی معزولی میں جس شخص نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ قائم مقام موسیٰ پاشا تھا، اس وقت صدر اعظم فوج کے ساتھ محاذ جنگ پر تھا اور موسیٰ پاشا قائم مقام کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں اس کی جگہ کام کررہا تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے مفتی اعظم ینی چری اور دارالسلطنت کے بعض دوسرے فوجی دستوں کے ساتھ سلیم کے خلاف ایک گہری سازش کی، ''نظام جدید'' کا ایک حصہ اس وقت باسفورس کے قلعوں کی

حفاظت پر متعین تھا، بقیہ فوج ایشیا میں تھی، باسفورس کے دستہ حفاظت میں دو ہزار خام سپاہی بھی تھے، جو ''یمیقی'' کہلاتے تھے اور ''نظام جدید'' کے سپاہیوں کے ساتھ اس غرض سے رکھے گئے تھے کہ بتدریج ان سے متاثر ہوتے رہیں لیکن موسیٰ پاشا نے ان میں یہ افواہ اڑا دی کہ سلطان انہیں بہ جبر نظامی دستوں کے ساتھ ملا دینا چاہتا ہے، اس خبر سے ان میں سخت برہمی پیدا ہوئی، دوسری طرف اس نے یہ کیا کہ سلیم کو جو اس کی سازش سے بالکل بے خبر تھا، ترغیب دے کر ''یمیقیوں'' کے نام ایک حکم جاری کرایا کہ وہ نظامیوں کا سا لباس اختیار کرلیں، سلطان کا فرستادہ محمد آفندی جوں ہی یہ حکم لے کر پہنچا، بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، محمد آفندی کو تو اسی وقت باغیوں نے قتل کر دیا، اس کے بعد وہ دارالسلطنت کے ینی چری دستوں کو ساتھ لے کر وہ آت میدان میں جمع ہوئے اور وہاں ینی چری نے اپنے شوربے کی دیگیں الٹ دیں، یہ بغاوت کا اعلان تھا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ وہ سب سلطان کا دیا ہوا کھانا نہ کھائیں گے۔

سلیم کی معزولی

موسیٰ پاشا نے چوں کہ سلیم کو بالکل دھوکے میں رکھا تھا، اس لیے وہ اس صورت حال کے لیے مطلق تیار نہ تھا، باغیوں کا سردار قباقجی اوغلو جب آت کے میدان میں آیا، اس وقت بھی موسیٰ پاشا نے سلیم کو فریب دینے کی کوشش کی اور اسے اطمینان دلایا کہ یہ شورش بہت جلد فرو ہو جائے گی، چنانچہ بجائے اس کے کہ وہ نظامی دستوں کو باسفورس سے طلب کر لیتا اور ان کے آنے تک اپنے باڈی گارڈس کی مدد سے محل کی حفاظت کرتا، اس نے باغیوں کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں راضی ہونا تھا نہ ہوئے، قباقجی اوغلو کے ہاتھ میں اصلاحات کے خاص خاص طرف داروں کی ایک فہرست تھی، اس میں وزراء، اکابر و اعیان بھی شامل تھے، یہ سب کے سب گھسیٹ کر آت کے میدان میں لائے گئے اور نہایت بے دردی سے قتل کر دیے گئے، دو روز تک قتل کا سلسلہ جاری رہا، اصلاحات کے تمام طرف دار مارے گئے یا بھاگ گئے، آخر میں سلیم نے یہ دیکھ کر کہ اب خود اس کے تخت پر حملہ

ہوا چاہتا ہے، ایک فرمان کے ذریعہ تمام اصلاحات منسوخ کر دیں لیکن باغیوں نے اس کی معزولی کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا، مفتی اعظم نے جو اس سازش میں شروع سے شریک تھا، اپنے فتوے سے اس فیصلہ پر قانون کی مہر بھی ثبت کر دی، ۲۲ ربیع الاول ۱۲۲۲ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۸۰۷ء کو ینی چری موسیٰ پاشا کی سرکردگی میں قصر سلطانی میں داخل ہوئے، سلیم نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ نہایت وقار کے ساتھ تخت سے اترا اور محل کے اس حصہ میں چلا گیا جہاں شہزادہ مصطفیٰ اب تک نظر بند تھا، باغیوں نے مصطفیٰ کو لا کر تخت پر بیٹھا دیا، سلیم نے اپنی بقیہ مدت عمر جو صرف ایک سال اور رہ گئی تھی، سلطنت عثمانیہ کے آئندہ وارث شہزادہ محمود کو تربیت دینے میں گزار دی۔

مصطفیٰ رابع

۱۲۲۲ھ تا ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۷ء تا ۱۸۰۸ء

مصطفیٰ رابع تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس نے صرف تیرہ مہینے حکومت کی لیکن یہ حکومت محض نام کی تھی، اصلی اقتدار ان باغیوں کو حاصل تھا جنھوں نے سلیم کو معزول کر کے اسے تخت پر بیٹھایا تھا، قباقجی اوغلو، باسفورس کے قلعوں کا حاکم مقرر ہوا، سلیم کی تمام اصلاحات منسوخ کر دی گئیں۔

ان واقعات کی خبر سے عثمانی فوجیں جو دریائے ڈینوب کے ساحلی علاقوں میں روس سے جنگ کر رہی تھیں بہت مطمئن اور مسرور ہوئیں لیکن صدر اعظم ابراہیم علمی پاشا نے جو اس وقت سپہ سالار تھا، اس بغاوت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، اس پر ینی چری نے اسے قتل کر دیا اور اس کی جگہ چلپی مصطفیٰ پاشا کو سپہ سالار اور صدر اعظم مقرر کیا۔

ابراہیم پاشا کے قتل اور چلپی مصطفیٰ کے تقرر سے فوج میں کمزوری اور انتشار پیدا ہو گیا، اگر روسی فوجوں کا بڑا حصہ اس وقت پرشا میں نپولین سے جنگ کرنے میں مصروف نہ ہوتا تو اس کمزوری سے دولت عثمانیہ کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا لیکن اس کی خوش قسمتی سے اسی درمیان میں (۱۴ رجون ۱۸۰۷ء) نپولین نے روسیوں کو فریڈ لینڈ میں ایسی زبردست شکست دی کہ اس کے اثر سے ڈینوب کی روسی فوجیں بھی پسپا ہونے لگیں۔

نپولین کی غداری اس کے بعد زار الکزنڈر نے نپولین سے صلح کی درخواست کی لیکن قبل اس کے کہ فریقین ٹلسیٹ کے مقام پر شرائط صلح طے کریں، پرشا کے وزیر اعظم ہارڈنبرگ (Hardenberg) نے دونوں کے سامنے ایک دل چسپ اسکیم پیش کی، جس سے مقصود یہ تھا کہ نپولین کی توجہ پرشا پر قبضہ کرنے کے بجائے سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کی جانب مائل ہو جائے، اسکیم یہ تھی کہ ولاچیا، مولڈیویا، بلغاریا اور رومیلیا کے صوبے روس کو دے دیے جائیں، یونان اور جزائر آئیونین پر فرانس قبضہ کرلے، بوسنیا اور سرویا، آسٹریا کی سلطنت میں شامل کر دیے جائیں، پولینڈ کو از سر نو مرتب کر کے شاہ سیکسنی (Sexony) کو اس کا فرماں روا مقرر کر دیا جائے اور سیکسنی پر پرشا کی حکومت قائم کر دی جائے لیکن نپولین پرشا کو شکست دے کر پامال کر چکا تھا، وہ ایک حقیر دشمن کی پیش کردہ اسکیم پر غور کرنے کے لیے تیار نہ ہوا[1]۔

تاہم سلطنت عثمانیہ کی تقسیم کا مسئلہ خود اس کی ذاتی اسکیم کے لیے اہمیت سے خالی نہ تھا، اس وقت اس کا سب سے بڑا مقصد سلطنت برطانیہ کو نیست و نابود کر دینا تھا لیکن اس کا حصول روس کو برطانیہ کے اتحاد سے علاحدہ کیے بغیر محال تھا، فریڈلینڈ کی شکست نے روس کی قوت بہت کچھ توڑ دی تھی اور زار اب صلح کا خواہش مند بھی تھا لیکن نپولین سے مل کر اپنے سابق حلیف برطانیہ سے جنگ کرنے کے لیے الکزنڈر خاطر خواہ معاوضہ کا امیدوار تھا، نپولین نے اسے منظور کر لیا، چنانچہ معاہدہ ٹلسیٹ (۷؍ جولائی ۱۸۰۷ء) کے خفیہ دفعات میں یہ طے پایا کہ باب عالی نپولین کے پیش کردہ شرائط پر روس سے صلح نہ کرے گا تو فرانس اور روس متحد ہو کر ترکوں کو قسطنطنیہ اور رومیلیا کے علاوہ باقی تمام یورپین ولایتوں سے نکال دیں گے اور ان ولایتوں کو باہم تقسیم کرلیں گے، تقسیم کی شکل یہ تھی کہ فرانس، بوسنیا، البانیا، یونان اور مقدونیا پر قبضہ کرلے گا اور مولڈیویا، ولاچیا، بلغاریا اور دریائے مارٹیزا تک کے تمام علاقے روس کو دے دیے جائیں گے، آسٹریا کو راضی کرنے کی غرض سے سرویا کا صوبہ اس کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا[2]،

---

[1] میریٹ، ص ۱۸۵-۱۸۴ [2] فریڈرک، ص ۱۹۶۔

الکزنڈر کو قسطنطنیہ حاصل کرنے پر بھی اصرار تھا مگر نپولین نے اس سے قطعی انکار کر دیا، اس خفیہ معاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نپولین ذاتی اغراض کے لیے اپنے حلیف سلطنت عثمانیہ کو قربان کر دینے پر کہاں تک آمادہ تھا، حالاں کہ روس سے دولت علیہ کی موجودہ جنگ زیادہ تر اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھی، بہر حال اگست ۱۸۰۷ء میں اس کی وساطت سے فریقین میں عارضی طور پر صلح ہوگئی۔

حالاتِ آستانہ اس درمیان میں دارالسلطنت کی حالت روز بہ روز زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی، حکومت کے تمام اختیارات مفتی اعظم اور قائم مقام موسیٰ پاشا کے ہاتھ میں تھے اور یہی دونوں سلطان کے نام سے حکم رانی کر رہے تھے لیکن چند دنوں کے بعد خود ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور مفتی اعظم نے قباقجی اوغلو سے سازش کر کے موسیٰ پاشا کو نہ صرف معزول بلکہ جلاوطن بھی کرا دیا، اس کے بعد طاہر پاشا قائم مقام مقرر ہوا، مگر چوں کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے اختیارات استعمال کرنا چاہتا تھا، اس لیے مفتی اعظم نے اسے بھی برطرف کرا دیا، طاہر پاشا نے مصطفیٰ پاشا بیرقدار کے پاس جا کر پناہ لی جو روسنجق کا والی اور سلطان سلیم کے وفادار نمک خواروں میں تھا۔

سلطان مصطفیٰ کی تخت نشینی کے بعد بھی سلیم کے حامیوں کی ایک جماعت اسے دوبارہ تخت پر لانا چاہتی تھی، بیرقدار اس جماعت کا سردار تھا، چنانچہ طاہر پاشا کے آنے کے بعد اس نے اپنا ایک معتمد صدر اعظم چلپی مصطفیٰ پاشا اور دوسرے وزراء کے پاس بھیجا اور انہیں یہ سمجھایا کہ مفتی اعظم قباقجی اوغلو نے صرف اپنی قوت اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے فوج میں شورش برپا کر رکھی ہے اور فوج کے بھروسہ پر حکومت کے تمام نظم ونسق کے مالک بنے ہوئے ہیں، بیرقدار نے ابھی اپنے اصلی مقصد یعنی سلیم کو دوبارہ تخت پر بیٹھانے کی تجویز کو بالکل مخفی رکھا اور صدر اعظم وغیرہ پر محض یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ صرف مفتی اعظم اور قباقجی اوغلو کو سزا دینا چاہتا ہے، چوں کہ صدر اعظم کے اختیارات بھی ان دونوں کی وجہ سے پامال

ہو رہے تھے، اس لیے وہ بیرقدار سے مل گیا اور قباقجی اوغلو کے قتل کے حکم دے دیا، چنانچہ وہ رات کے وقت اپنے محل میں قتل کر دیا گیا۔

سلیم کا قتل اس اثنا میں بیرقدار ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ قسطنطنیہ کے قریب پہنچ چکا تھا، اس نے متعدد اعیان حکومت کو طلب کر کے باغی فوج کی بیخ کنی اور اور سلطنت میں امن و امان قائم کرنے کا حلف لیا، اس کے بعد وہ فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، سلطان مصطفیٰ نے یہ سمجھ کر کہ مظاہرہ مفتی اعظم اور یمیقی فوج کے خلاف ہے، مفتی کو برطرف کر دیا اور اس فوج کو توڑ دینے کا حکم دیا، مگر بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ بیرقدار کا اصلی مقصد کیا ہے، چنانچہ محل کا پھاٹک بند کر لیا گیا اور شاہی دستہ مدافعت کے لیے تیار ہو گیا، بیرقدار نے حملہ کا حکم دیا اور تھوڑی دیر میں محل کے اندر داخل ہو گیا لیکن اسی درمیان میں مصطفیٰ نے سلیم اور اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمود دونوں کے قتل کا حکم دے دیا تھا، وہ جانتا تھا کہ ان کے بعد تنہا وہی سلطنت کا وارث باقی رہ جائے گا اور پھر کسی عثمانی کو اسے قتل یا معزول کرنے کی جرأت نہ ہوگی، چنانچہ قبل اس کے کہ بیرقدار محل کے اس حصہ میں پہنچ سکے جہاں سلیم نظر بند تھا، مصطفیٰ کے جلادوں نے سلیم کا کام تمام کر دیا، سلیم اتنا طاقت ور تھا کہ وہ بغیر کسی ہتھیار کے ان جلادوں کا مقابلہ کرتا رہا اور ان میں سے کئی ایک کو مار کر گرا دیا لیکن آخر میں قلب پر ایک کاری ضرب لگنے کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکا اور جلادوں نے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے ختم کر دیا، اگر یہ مقابلہ چند منٹ اور جاری رہتا تو بیرقدار وہاں پہنچ گیا ہوتا اور سلیم کی جان بچ جاتی، جب بیرقدار نے محل میں داخل ہو کر سلیم کو ہر طرف تلاش کرنا شروع کیا تو جلادوں نے اس کی لاش اس کے سامنے پھینک دی اور پکار کر کہا لو جسے تم تلاش کر رہے ہو وہ یہ ہے، بیرقدار اپنے بادشاہ کی لاش پر گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، قبودان پاشا سعید علی قریب ہی کھڑا ہوا تھا، اس نے بیرقدار کا شانہ ہلا کر کہا کہ یہ وقت انتقام کا ہے رونے کا نہیں ہے، یہ سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس ایوان میں آیا، جہاں سلطان

مصطفیٰ اپنے عہد حکومت کے آخری لمحات نہایت سراسیمگی کی حالت میں گزار رہا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ تو یہاں کیا کرتا ہے، یہ جگہ اس شخص کے لیے خالی کر جو تجھ سے زیادہ اس کا مستحق ہے، بیرقدار نے اسے کھینچ کر تخت سے اتار دیا۔

مصطفیٰ نے سلیم اور محمود دونوں کے مار ڈالنے کا حکم دیا تھا، چنانچہ سلیم تو ختم کر دیا گیا لیکن محمود کی جان بچ گئی، اس کے ایک وفادار غلام نے اسے حمام کے آتش دان میں ایسی ہوشیاری سے چھپا دیا تھا کہ جلاد اس کی تلاش میں آخر وقت تک ناکام رہے، یہاں تک کہ بیرقدار کے سپاہیوں کے محل میں داخل ہونے کے بعد جلادوں کو خود اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور محمود کی تلاش سے مایوس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

مصطفیٰ کی معزولی اسی روز ۴؍جمادی الاول ۱۲۲۳ھ مطابق ۲۸؍جولائی ۱۸۰۸ء میں سلطان مصطفیٰ کی معزولی اور شہزادہ محمود کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا، چند دنوں کے بعد مصطفیٰ قتل کر دیا گیا تاکہ پھر کوئی فتنہ برپا نہ ہو۔